ہند و عرب سے متعلق

تاریخِ اسلام کی شاہکار کتاب

عرب و دیارِ ہند

تالیف

مولانا خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی

بھٹکل سنہ ۱۴۰۰ھ
۱۹۸۰ء

سلسلۂ انبیائے کرام از آدمؑ تا آخر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

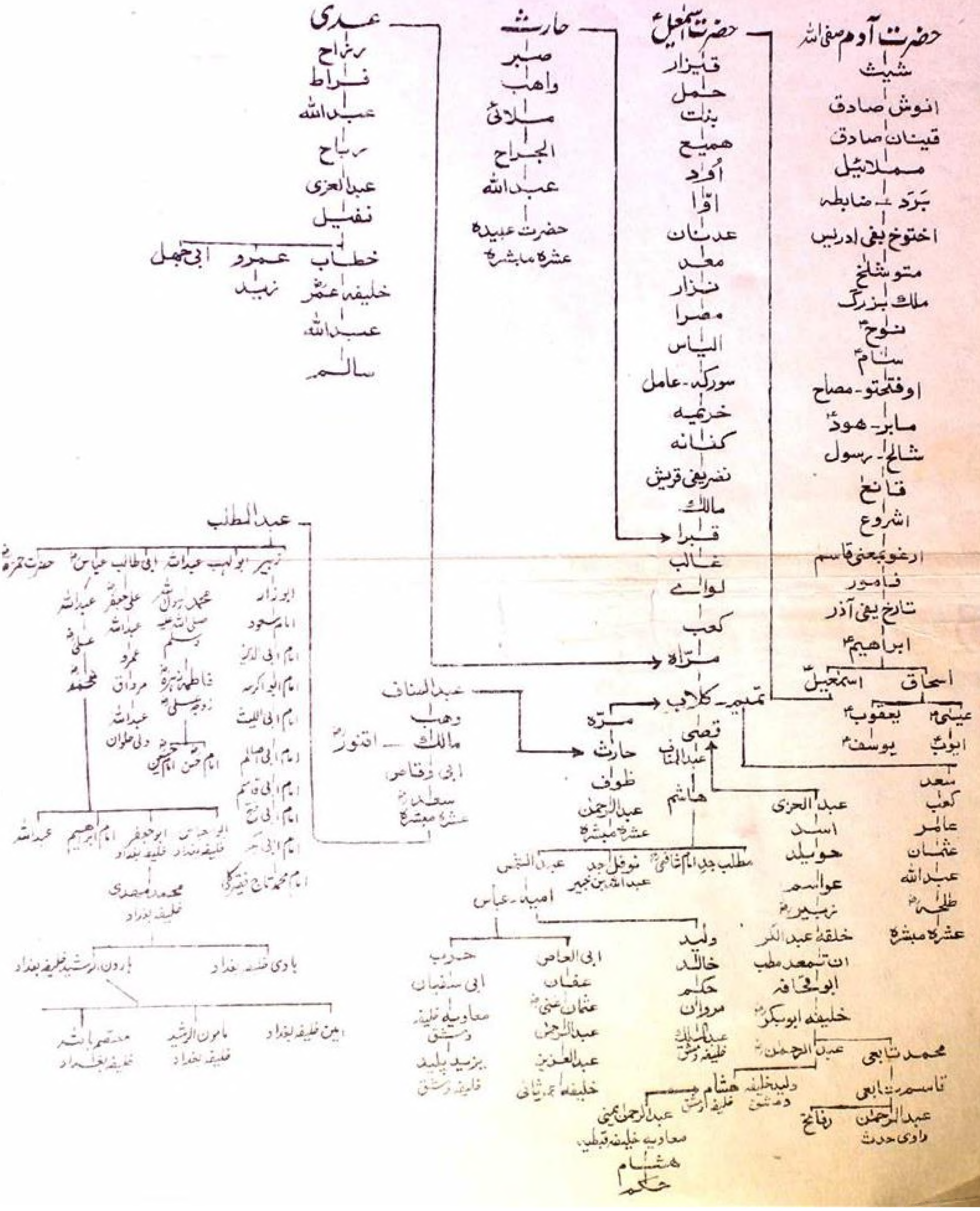

ہند و عرب کے متعلق

تاریخ اسلام کی شاہکار کتاب

عرب و دیارِ ہند

تالیف

مولانا خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی

ناشر:
محی الدین منیری
"دار السلام" نوایت کالونی بھٹکل (ضلع شمالی کنارا)

نام کتاب : "عرب و دیارِ ہند"

مصنّف : مولانا خواجہ بہاء الدّین صاحب اکرمی

ناشر : محی الدین منیری

کاتب : مولوی جلال الدین صاحب بستوی

صفحات : ۴۸۸

سائز : رائل

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۲۵ روپیہ

تاریخ اشاعت : ستمبر ۱۹۸۰ء

ملنے کا پتہ :-

۱- "دار السلام" نوایت کالونی - بھٹکل

۲- ایجنسی تاج کمپنی ۱۰ مسجد اسٹریٹ بمبئی ۳

استعذار : کاتب کی صبر آزما اور غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے طباعت حسب منشا نہ ہو سکی - اس کے علاوہ کتابتی غلطیوں کی تصحیح کے لئے اپنی والی تمام تر کوششوں کے باوجود چھپنے کے بعد پتہ چلا کہ اب بھی کافی کتابتی غلطیاں کم و بیش موجود ہیں، جس کے لئے ہم ناظرین کتاب سے خواستگارِ معذرت ہیں -

پرنٹر پبلشر محی الدین منیری نے نیشنل فائن لیتھو پرنٹنگ ورکس او کھلی پورم منگلور ۲۱ میں چھپوا کر نوایت کالونی - بھٹکل سے شائع کیا -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

پیش لفظ

نومبر ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے کہ راقم الحروف دار العلوم ندوۃ العلماء کے درس حدیث سے نکل کر زینے کے پاس اپنے رفقاء کے ساتھ درس کے بعض امور پر گفتگو میں مصروف تھا۔ زینہ میری پشت کی جانب تھا۔ اچانک ایک بزرگ کو نیچے اترتے دیکھ کر میرے رفقاء ادھر ادھر کھسک گئے اور میں نے بھی کچھ آہٹ پا کر مڑ کر دیکھا اور ذرا ہٹ کر سلام عرض کیا اب وہ میرے اور قریب ہو گئے اور میرے بارے میں مختلف باتیں دریافت فرمانے لگے۔ آپ سمجھے کہ یہ بزرگ کون تھے؟ یہ تھے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ راقم الحروف بھٹکل جیسے دور دراز مقام سے یہاں بغرض تعلیم آیا ہے اور اس کا تعلق قوم نوائط سے ہے۔ فرمایا! میں اس وقت باہر جا رہا ہوں کل صبح ۸ بجے میری قیام گاہ پر ضرور ملنا۔ یہ تھی حضرت مولانا سے میری پہلی ملاقات۔ اس اتفاقی ملاقات سے جہاں مجھے ایک گونہ خوشی تھی۔ وہاں ایک قسم کی فکر و پریشانی بھی لاحق تھی۔ وہ یہ کہ ایک علامۂ وقت کی خدمت عالی میں ایک معمولی طالب علم کی حاضری، خدا معلوم کیا سابقہ پیش آجائے۔

بہرحال صبح حاضر خدمت ہو گیا۔ مولانا کا تخاطب اس ناچیز خورد کے ساتھ نہایت مشفقانہ اور بزرگانہ تھا۔ تقریباً نصف گھنٹہ تک، جو زیادہ تر میرے ذاتی حالات، تعلیم، توطن، اور تربیت سے متعلق تھے۔ دریافت فرماتے رہے اس کے ساتھ کچھ قیمتی ہدایتوں اور نصیحتوں سے بھی مستفیض فرمایا۔ چونکہ درس کا وقت قریب تھا۔ اس لیے اجازت طلب کی تو فرمایا۔ اب جا سکتے ہو۔ لیکن میرے پاس وقتاً فوقتاً آتے اور ملتے رہنا۔ اس پر دو روز گذرے تھے۔ ایک صبح کو آفس کا ملازم پیغام لے کر آیا۔ چلیے۔ سید صاحب بلا رہے ہیں۔ جب میں پہونچا تو فرمانے لگے۔ "قوم نوائط پر مشتمل ایک مستند تاریخ لکھنے کی ضرورت ہے جس میں ان کے ترک وطن کرنے کے وجوہ و اسباب اور ہند میں ان کے آباد ہونے کے مقامات اور ابتدا میں جن مشکلات اور آزمائشوں سے انہیں گذرنا پڑا تھا۔ بالترتیب درج ہوں، اس میں سلطان جمال الدین کی سربراہی میں اہل نوائط کی جو سلطنت ہنور (موجودہ ہناور) میں قائم ہوئی تھی، اس کا تذکرہ بھی آنا چاہیے چونکہ تمہارا تعلق اس قوم سے ہے۔ اس لیے تم ہی بہتر طور پر اس خدمت کو انجام دے سکتے ہو۔ تمہارے یہاں قدیم تاریخی کتبات، اور قلمی بیاضوں کا

اچھا خاصا ذخیرہ تلاش و جستجو سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ آج ہی سے اپنے اوقات فرصت میں اس کام کو انجام دینے کا پختہ عزم اپنے پلے باندھ لو اور اپنا لکھا ہوا مسودہ میرے لکھنؤ آنے پر دکھاتے رہو۔

جب گیا تھا تو میرے حاشیۂ خیال کے کسی گوشے میں یہ وہم تک نہیں گذرا تھا۔ کوئی گراں بار بلکہ ناگوار خدمت میرے سر تھوپی جانے والی تھی، وہاں تو سر تسلیم خم ہے کہ مجال دم زدنی کا یارا ہی کس کو تھا؟ پھر درویش برجان درویش کے مصداق ابتدائی مطالعہ کے لیے چند کتابوں کے نام لکھا دیے اور رخصت کر دیا۔

یہ تھی اس کتاب کے لکھنے کی ابتدائی تحریک یا اولین تربیتی ترغیب، اس کے بعد زمانہ طالب علمی ہی میں کچھ تاریخی مواد فراہم کرنے اور اسے ترتیب دینے میں لگ گیا۔ اور وہ تمام تر قوم نوائط ہی سے متعلق تھا۔

ندوے سے فراغت کے بعد راقم الحروف مختلف قومی، ملکی، جماعتی اور تجارتی مشاغل میں پھنس کر رہ گیا اور اس کے ساتھ زیادہ تر میری غفلت سے وہ قیمتی مسودہ دیمک کی خوراک بنا اور میری دیدہ ریزی اور محنت کا سارا ذخیرہ ضائع ہو کر رہ گیا۔ اس کے تلف ہونے کا نہایت صدمہ اور دکھ اس وجہ سے بھی پہونچا کہ وہ سید صاحب موصوف کی نظر مبارک سے گزرا ہوا تھا۔ فیا للاسف۔

گلگونۂ عارض ہے، نہ ہے رنگ حنا تو   اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

.... ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ النوائط بمبئی سے میری ادارت میں نکلا تو اس میں تاریخ النوائط کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا گیا جس کو خاص طور پر قومی و علمی حلقوں میں سراہا گیا اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لیے بعض بزرگوں اور دوستوں کی طرف سے برابر تقاضا ہوتا رہا مگر افسوس کہ "النوائط" زیادہ دنوں جاری نہ رہ سکا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ تاریخی سلسلہ بھی پردۂ سیاہ کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گیا۔

پھر نومبر ۱۹۷۳ء میں راقم الحروف ایک تقریب کے سلسلہ میں مدراس پہنچا۔ جب مولانا قاضی محمد حبیب اللہ صاحب[1] کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت حضرت قاضی چند عمائدین سے گفتگو میں مشغول تھے۔ پھر موقع گفتگو کا رخ بدل کر ان حضرات سے فرمایا، "یہ میرے بھٹکل کے ایک عزیز ہیں ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۷ء ہمارے اس مدرسہ میں تعلیم پا گئے۔ اس دوران میرے والد مولانا قاضی عبید اللہ اور میرے چچا مولانا مفتی محمود رحمہما اللہ سے مختلف کتابوں کے درس سے فیضیاب رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ گئے۔ وہاں سے فراغت کے بعد شافعی فقہ کی تکمیل کے لیے دوبارہ اس مدرسہ میں آئے

(۱   ۱ے متوفی ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۸ء

اور مجھ سے و دیگر علماء سے فقہ پڑھی تاریخ کا ذوق رکھتے ہیں، اور اسی بنا پر ان کا مطالعہ بھی اچھا خاصہ ہے۔ انہوں نے النوائط ماہوار میں تاریخ نوائط کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا تھا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ چند مہینوں تک چل کر بند ہو گیا۔ اس کے بعد سے میں ان سے برابر درخواست کرتا آ رہا ہوں اور اب بھی آپ کے سامنے پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ وہ اس کام کو مقدم رکھیں اور مزید تاخیر روا نہ رکھیں اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق عطا فرمائے اس طرح ہاتھ اٹھا کر دیر تک دعا کرتے رہے اور حاضرین ان کے ہمنوا ہو کر آمین آمین کہتے رہے۔

غالباً قاضی صاحب کا مخلصانہ اصرار تھا یا ان کی دل سے نکلی ہوئی دعا کی تاثیر جو زخم کہنہ ابھر آیا۔ جذبۂ خوابیدہ جاگ اٹھا اور از سر نو اس کتاب کی تکمیل و ترتیب کے لیے مستعد ہو گیا۔ واللہ الموفق والمعین۔

جب قوم نوائط پر کافی حصہ مرتب ہو گیا تو اثنائے ترتیب محسوس ہوا کہ عرب سے آنے والے صرف اہل نوائط ہی نہیں تھے، بلکہ ان کی طرح دوسری قومیں اور فرقے بھی ہیں جن کا بنیادی تعلق عرب ہی سے تھا اور جن کو آج کل مختلف ناموں اور مختلف قومیتوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے نائطے، لبابیں، کوکنی، میمن، خوجے، بھوریٹے[1]، وغیرہ اس طرح سادات کرام کا تعلق بھی نسباً و اصلاً سرزمین عرب سے تھا۔

بہر حال عرب سے آنے والے مختلف اوقات میں، مختلف حالات اور مختلف وجوہ و اسباب کی بنا پر سرزمین عرب سے ہند آئے اور متفرق مقامات میں اپنے اپنے مصالح اور سہولتوں کے مد نظر آباد ہو گئے۔ تو ظاہر ہے ان سب قوموں کی قیمت تاریخی حقائق سے اغماض یا اعراض، ایک کھلی ہوئی تاریخی خیانت اور قومیت کی ایک گھناؤنی عصبیت اور ایک بھونڈی قسم کی قوم پرستی تصور ہوتی جس کا انتفاعی دائرہ بھی ایک مخصوص حلقہ تک محدود ہو کر رہ جاتا۔

چنانچہ راقم الحروف "آں خیال شکست، و آں ارادہ نماند" کے مصداق بن گیا۔ پہلے سارے مسودات کو کالعدم قرار دے کر نئے سرے سے عرب سے آنے والے تمام قوموں پر مشتمل تذکرہ مرتب کرنے کا ترجیحی رخ اختیار کیا اور اپنی سعی و کاوش کا حاصل اس کتاب کی صورت میں پیش کر دیا فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس میں بعض مورخین کی ثقاہت اور تحقیقی نکات پر بحث و گفتگو کا احتمال ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارے سامنے ماضی کے وقائع و حالات تک رسائی کے لیے ان کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا اس لیے انہیں کے تاریخی ماخذات کو رکھ کر گیا۔ اور ایسا کرنا تاریخی لحاظ سے ناگزیر بھی تھا اس لیے کہ

---

[1] جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں اپنے مواقع پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

باوجود ہمارے درج کردہ کتابوں کے حوالجات کا شمار اکثر مسلّم معروف اور معتبر مورخین میں کیا گیا ہے تاریخ نویسی کو رطب ویابس، سرد وگرم، قوی وضعیف، گل وریحان کے ساتھ خار مغیلاں سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک ہماری دسترس کا تعلق ہے جو باتیں قابل اخذ نظر آئیں انھیں لے لیا اور غیر ضروری امور سے آنکھیں موندھ لیں اور نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ لیکن بایں ہمہ مصنف کو اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہیں پر تسامح ہو گیا ہو ناظرین کرام اس سے مطلع فرما کر مشکور بنیں۔

پیش نظر کتاب میں عرب سے ترک وطن کرکے آنے والے تمام قوموں کا تذکرہ ہمارے علم ونظر کی حد تک سمیٹا گیا ہے۔ اس میں کوکن، گجرات، کیرالا، (ملابار، معبّر، کارومنڈل) دکن کرناٹک کے علاوہ جزائر دیپ، مالدیپ، سراندیپ، سری لنکا اور جنوبی ہند کے قدیم تاریخی آثار، اس دور کے حکمرانوں، راجاؤں کے حالات ان کی رزم بازیاں اور بزم آرائیاں اور ان کے کارناموں اور کارگزاریوں کو تاریخی پس منظر میں اجاگر کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس زمانے کے راجاؤں کا مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک، نیک برتاؤ، ان کی عدل پروری، انصاف پسندی کی جھلکیاں بھی نمایاں کی گئی ہیں اسی طرح مدراس، میسور، بنگلور، بیجاپور، دکن، کوکن، کرناٹک وغیرہ میں ہونے والی باہمی جنگوں، لڑائیوں اور اس کے نتیجہ میں ابھرنے والے نقوش وتغیرات کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ وجیانگر کا ایک نئی اور زبردست سلطنت کے روپ میں ابھرنا اور جنوب کے اکثر علاقوں پر اس کا چھاجانا اور آخر میں میدان کارزار میں اس کا عبرتناک انجام۔ شیواجی جیسے مرد آہن کا عروج واقتدار اس کے میدان جنگ کے حیرت انگیز واقعات کی بھی کماحقہ نشان دہی کی گئی ہے۔ آخر میں جنوبی ہند کے چند مشاہیر اسلام سلاطین عظام بزرگان دین وصالحین کرام کے حالات طیبات بھی درج کئے گئے ہیں۔

رفیق المحترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں زاد اللہ فضلاً وتوفیقاً کے جامع وبسیط مقدمہ کے بعد مزید کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن اس کتاب کے لکھنے کے محرکات اور اس کی تاخیر کے اسباب اور اس کے مندرجات پر مبنی تعارفی اشارات ناگزیر تھے اس لیے بطور وضاحت یہ چند سطریں لکھنی پڑیں۔

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
گلچیں نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

برادر محترم مولانا علی میاں دام فضلہ کے علمی ودینی وادبی مقام سے اب نہیں ان کے صغر سنی کے دور سے واقف رہا ہوں۔ مبداء فیاض کی طرف سے وہ فطری طور پر خلعت علوم ومعارف سے مخلّع ہی آئے۔ ان کی علمی وسعت، ذہنی رفعت اور بے نظیر موہوبی صلاحیت اور

ان کی پاکیزہ سیرت کی جھلکیاں ان کے زمانہ طالب علمی ہی سے برابر ابھرتی نکھرتی اور چمکتی نظر آرہی تھیں جن کی چند جھلکیاں یادیں راقم الحروف کے لوحِ قلب پر اب تک منقوش و محفوظ ہیں لیکن ان کے کشف باطنی اور نور بصیرت کا راز اب جاکر کھلا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں کے ساتھ اس نعمت عظمیٰ سے بھی انہیں بہرہ ور فرمایا ہے چنانچہ مولانا اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں "انہیں یہ تاریخی ذوق اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ملا جو اس ادارہ کے بانیوں علامہ شبلی مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور اس کے ابنین فرزنداں علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی میراث ہے الخ" یہ انکشاف کس قدر حقیقت اور واقفیت پر مبنی ہے جس کا بین ثبوت اور کھلی شہادت سطور بالا میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ اس کتاب کے لکھنے کی ابتدائی تحریک اور تربیتی ترغیب کا تعلق تمام تر استاذی المحترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔

مولانا علی میاں ایک ایسے جلیل القدر خاندان کے بقیۃ السلف ہیں جن کے پیش رو بزرگوں کے سلسلۂ ذہب سے بڑے بڑے پایہ کے علما، فضلا، مشائخین و صلحا یکے بعد دیگرے جلوہ افروز ہوتے رہے اور اپنے انفاس قدسیہ اور چشمۂ فیوض و برکات سے بے شمار اللہ کے بندوں کو بہرہ ور اور سیراب فرمایا۔ ان کے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحی متوفی ۲ر فروری ۱۹۲۳ء ایک ایسے یگانۂ روزگار بزرگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا وہ گوناگوں علمی اوصاف و کمالات کے جامع و حامل رہے تھے وہ ایک بڑے پایہ کے اردو ہی کے نہیں عربی کے بھی ممتاز ادیب تھے اس کے ساتھ وہ ایک وسیع العلم دقیق النظر مورخ اور مختلف علوم و فنون میں عربی اردو کی بیش بہا کتابوں کے مصنف بھی تھے اس کے ساتھ وہ اپنے وقت کے ایک نامور طبیب حاذق بھی ان مشاغل لاتعد کثیرہ کے ساتھ وہ ندوۃ العلماء کے ناظم بھی تھے جب کہ اس کا دائرہ خدمت محض علم و تعلیم تک محدود نہیں تھا بلکہ اسلامیان ہند کے مصالح و مفادات ثقافتی معاملات اصلاح رسوم و رفع اور باہمی نزاعات جیسے بے شمار وسیع تر مسائل سے برابر ان کا سابقہ رہتا تھا ایک ایسے عظیم ادارے کی گراں بار نظامت سے عہدہ برآ ہونا اور اس کے ساتھ اپنی دوسری علمی مشغولیتوں کو نبھانا اور ان سب کو بطیب خاطر برداشت کرنا مولانا جیسے صاحب عزم و ہمت پیکر ایثار و خدمت اور سراپا سرگرم عمل بزرگ کا ہی کام ہوسکتا ہے ہر ایک کا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ خدا کی بخشی ہوئی اپنی ساری صلاحیتوں اور توانائیوں کو اسی کی مرضیات اور اس کے بندوں کی فیض رسانی کے لیے وقف اور صرف فرمایا تھا۔

وما یلقٰھا الا الذین صبروا وما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

اسی طرح مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ کے فرزند اکبر اور مولانا علی میاں کے برادر بزرگ مولانا حکیم سید عبدالعلیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء (متوفی ۲۰ مئی سنہ ۱۹۶۱ء) بھی مختلف علمی اوصاف و کمالات کے جامع وحامل تھے وہ ندوہ اور دیوبند[1] کے فارغ التحصیل عالم دین ایک مستند ڈاکٹر اور ساتھ ہی طب یونانی کے سند یافتہ حکیم بھی تھے اس قدر علم و فضل اور مختلف اوصاف و کمالات کی جامعیت کے باوجود ان کی منکسر المزاجی پاکیزہ نفسی نام و نمود سے بے رغبتی خاموشی سے اللہ کے بندوں کی فیض رسانی، حاجت روائی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے والہانہ پیش قدمی خدمات دینی و ملی کے لیے بلا عذر ہمیشہ مستعدی اور ہمہ دم پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، یہ تھے ڈاکٹر صاحب کی چند ابھرے ہوئے نقوش وہ راقم الحروف کے حدیث کے ایک استاد بھی رہے تھے مسلم شریف پوری ان سے پڑھی تھی ڈاکٹر صاحب کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور ان ہی بلند پایہ اساتذہ سے خاص طور پر علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی اور انہیں سے سند اجازت ملی تھی۔

ان کے ذہن اور حافظہ اور فہم سلیم کا یہ حال تھا کہ دوران درس ان اساتذہ کے درس کی تقریریں، ان کی تحقیقات اور مطالب اس طرح برجستہ بیان فرماتے تھے جیسے وہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں۔ راقم الحروف کو انہیں نوٹ کر لینے کی برابر ہدایت فرماتے اور بعض اوقات بلحاظ احتیاط میرا نوٹ خود دیکھتے یا مجھ سنانے کے لیے کہتے کہ میرا نوٹ ان کی تقریر کے مطابق ہے کہ نہیں[2]

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہ نوٹ ڈاکٹر صاحب کے درس کے متعلق ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے چند چشم دید حالات ایسے ہیں جو راقم الحروف کے نہاں خانہ دماغ میں اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں اور وہ عجیب اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کے بیش بہا موتی جیسے ہیں ان کے اور ان کے ساتھ رفیق محترم مولانا علی میاں دام فضلہ کے بعض عینی مشاہدات اور ذاتی تاثرات پر مشتمل تذکرہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ انہیں ایک الگ کتابچہ کی شکل میں ان شاء اللہ آئندہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناچیز کی اس علمی سعی و کوشش کو قبول فرمائے اور عام ناظرین کو اس سے مستفید فرمائے! آمین!

وباللہ التوفیق۔

احقر خواجہ بہاءالدین اکرمی ندوی

دارالسلام نوائط کالونی بھٹکل ریاست کرناٹک

مورخہ ۱۷ر جون سنہ ۱۹۸۰

---

[1] ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات اور تقریروں کا یہ قیمتی ذخیرہ راقم الحروف کے پاس محفوظ تھا لیکن اب دیمک اور کیڑوں کے حملوں سے اس کا زیادہ حصہ ضائع ہو گیا جس کا بے حد افسوس ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی، ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد!

تاریخی حیثیت سے یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ عرب و ہند کے تعلقات بہت قدیم اور ظہور اسلام سے بہت پیشتر کے ہیں۔ جغرافیائی، طبعی، تجارتی اور بعد میں دینی و سیاسی حیثیت سے ایسا ضروری بھی تھا۔ زمانہ قدیم میں دو ملکوں کے ملانے کا (خواہ فاصلے کے لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی بعید ہوں) سب سے آسان اور مؤثر ذریعہ سمندر تھا۔ کہ وہ دور کشتی بانی اور جہاز رانی کا تھا۔ بحر عرب اس خدمت کے لیے ہزار ہا سال سے بلکہ شائد لاکھوں برس سے موجود تھا اور خلیج فارس بھی (جس کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ آبنائے کے بجائے کبھی خاکنائے تھی) تھوڑی بہت یہ خدمت انجام دیتی تھی۔ یہ تو ماقبل تاریخ کی باتیں ہیں۔ تاریخ کی تدوین و ترتیب کے بعد بھی یہ دونوں ملک جو اپنی اپنی جگہ براعظم نہیں تو برعظیم اور تحتی براعظم ضرور کہلائے جا سکتے ہیں ایک دوسرے سے محبت و استفادہ کا ہاتھ ملاتے بلکہ گرم جوشی سے بغلگیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی کی محققانہ کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" اس موضوع پر اس وقت تک حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کی تاریخ پر ظہور اسلام کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں وہ عام طور پر سیاسی و انتظامی رودادیں اور انقلاب سلطنت اور حکمراں خاندانوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہیں۔ اس تاریخی بلند نقطۂ نظر کے ساتھ مؤرخ کو صرف انھیں واقعات سے دلچسپی ہو سکتی ہے جن کا تعلق قیام سلطنت و توسیع مملکت حکام کے عزل و نصب اور ملک کے نظم و نسق سے تھا اشخاص اور خاندانوں میں بھی انہیں کی اہمیت ہوگی جو ان قوموں سے تعلق رکھتے تھے جو بیشتر وسط ایشیا، ترکستان، ایران اور افغانستان سے آئے۔ اس لیے تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کا اصل دور اس ملک میں سلطان محمود غزنوی کی آمد اور شمالی ہند میں سلطنت اسلامیہ کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔۔۔۔ ہندوستان کی بیشتر تاریخی تصنیفات جن پر مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کا دارومدار ہے چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہیں۔ اس طرح قدرتاً ظہور اسلام کے بعد سے تقریباً چار صدیوں کی روداد اور جنوبی ہند کی (جس کے متعلق تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عربوں اور پھر مسلمانوں کے تعلقات سب سے پہلے

اسی حصہ سے قائم ہوئے، تاریخ تقریباً تاریکی میں ہے۔ اس جغرافیائی اور علاقائی ناانصافی یا حق تلفی کے ساتھ جو اس طرز عمل سے ظہور میں آئی ایک نقصان یہ ہوا کہ سیکڑوں عربی النسل خاندان جن کی رگوں میں فاتح و مبلغ عربوں کا جوش مارتا ہوا خون تھا اور جو کشورکشائی اور دلکشائی دونوں صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور جن کے متعلق اقبال کے یہ شعر بالکل حسب حال ہیں ؎

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — نظر میں، خبر میں، اذان سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کشاد در دل سمجھتے ہیں اس کو — شہادت نہیں موت ان کی نظر میں

پس منظر میں چلے گئے۔ جس مورخ کی تاریخ حکومت و سیاست کے گرد گھومتی ہے اور اس کے نزدیک تاج و تخت کا وارث (جو تمام ذہنی و علمی صلاحیتوں سے عاری ہو) اس عالم ربانی اور شیخ روحانی سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے جو نہ کسی سلطنت کا بانی تھا نہ کسی بادشاہ کا جانشین و وارث اس میں ان خاندانوں کا تذکرہ تلاش کرنا فعل عبث ہے۔ جو دیوتاؤں کی اس سرزمین میں توحید خالص کا پیغام لے کر آئے اور انھوں نے اس ظلمت کدہ میں علم دین کی شمع روشن کی اپنے ذہنی و علمی کمالات سے اس ملک کا دامن بھر دیا۔ اپنی شرافت نفس، بلند ہمتی و فراخدلی کا نقش قائم کیا اور اگر کوئی انتظامی و سیاسی ذمہ داری ان کے سپرد ہوئی تو اپنی خداداد صلاحیت اور اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا بزرگان دین کے تذکرے بیشک بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان میں ان نفوس قدسیہ کا ذکر ملتا ہے جو حکومت و سیاست سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن ان کا بھی سارا زور خوارق و کرامات کے ذکر پر ہے اور وہ بھی انھیں بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن کا بقول مصنف "یاد ایام" محبوب مشغلہ قوانین قدرت کا توڑنا تھا اور جو ہر وقت موالید ثلاثہ اور عناصر اربعہ پر اپنی حکومت ثابت کرتے رہتے تھے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سمندر کی موجوں اور دریاؤں کی سیلابوں کی طرح اس ملک میں عرب کے نسیب و نجیب، ذکی و جری، روشن دل و روشن دماغ، پر جوش و سخت کوش، خدا پرست و انسان دوست خاندان آئے اور انھوں نے اس ملک کی ثقافتی و تہذیبی، علمی و اخلاقی، سیاسی و انتظامی ڈھانچہ میں جو خون کی کمی سے عرصہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔ تازہ اور گرم خون دوڑا دیا یہاں علم و فن ذہانت و جودت نے انگڑائی لی۔ درس و تدریس تصنیف و تالیف۔ بحث و تحقیق کے نئے نئے میدان سامنے آئے خلائق دوستی اور انسان پروری کے نئے نئے تجربے شروع ہوئے ویرانے آباد ہوئے ملک کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں اور مدرسے قائم ہوئے دشت و جبل اذان کی صداؤں سے اور در و دیوار قال اللہ و قال الرسول کے نغموں سے گونجنے لگے اور بقول شاعر۔

آنجا کہ بود نعرہ و فریاد مشرکاں — اکنوں خروش نعرہ اللہ اکبر است

ضرورت تھی کہ اس نقطۂ نظر سے بھی تاریخ کی پردہ کشائی کی جائے اور تاریخ ہند کی یہ کڑیاں جو اگر گم نہیں ہوئیں تو دب کر ضرور رہ گئی ہیں، برآمد کی جائیں اور منظرِ عام پر لائی جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خاندان انساب کی کتابیں جو ان خاندانوں نے اپنے سینے سے لگا رکھی ہیں یا مطبوعہ لیکن نایاب یا مخطوطہ لیکن کرم خوردہ شکل میں بڑے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ نیز مورخ ہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرے (مگر افسوس ہے کہ وہ بلگرام تک محدود ہیں) اور خاص طور پر مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی کتاب "نزھۃ الخواطر" نہ ہوتی تو اسلامی ہند کا یہ خزانہ دفینہ بن کر رہ جاتا اور اس کو برآمد کرنے کے لیے فرہاد کے جگر اور قیس کے جنون کی ضرورت ہوتی۔

اس پورے تاریخی دور کو روشنی میں لانے کے لیے حقیقتاً ایک آدمی کی مساعی کافی نہ تھی اس کے لیے تو منظم اداروں (اکاڈمیوں) کی ضرورت تھی اور حکومتوں کی سرپرستی کی لیکن "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول پر اگر مختلف علاقوں میں یہ کوشش شروع ہو کہ بلادِ عربیہ سے آنے والے خاندانوں کی تاریخ مرتب کی جائے اور علم و دین، ملک و وطن، حکومت و سیاست کی خدمت میں ان کے نامی گرامی افراد کا جو حصہ رہا ہے اس کو اجاگر کیا جائے تو یہ بھی بڑی مبارک کوشش اور سعی محمود ہوگی۔ خاص طور پر جنوبی ہند کو اس سلسلہ میں مرکز توجہ بنایا جائے جو عربوں کے قدم اور سیف و قلم سے سب سے پہلے آشنا ہوا تو مناسب نہ ہوگا کہ یہ خطہ مورخوں کی نظر سے جنھوں نے زیادہ تر فارسی میں تصنیفات کیں اکثر اوجھل رہا۔ ان فارسی تاریخ نویسوں میں بس محمد قاسم فرشتہ کے علاوہ گلزار ابراہیمی کا مصنف ہے اور بیجاپور کا باشندہ ہے کسی اور نامور مورخ کا نام نہیں ملتا۔ عربی تاریخیں بھی سوائے "تحفۃ المجاہدین" کے اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

اس بنا پر ہمارے رفیق قدیم، فاضل گرامی مولانا خواجہ بہاء الدین اکرمی ندوی تاریخ اور انساب سے ذوق رکھنے والے فضلاء کے عام طور پر اور ان حضرات کے خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جو اپنی نسبت کسی عرب قبیلہ یا شاخ کی طرف کرتے ہیں کہ انھوں نے "عرب و دیارِ ہند" کے نام سے ایک مفصل و مبسوط کتاب لکھی جس میں انھوں نے تاریخ کا یہ گمشدہ اور زیادہ صحیح الفاظ میں فراموش شدہ ورق بازیافت کیا۔ ان کو یہ تاریخی ذوق اپنی مادرِ علمی دار العلوم ندوۃ العلماء سے ملا جو اس ادارہ کے بانیوں علامہ شبلی و مولانا حکیم سید عبدالحئی اور اس کے اولین فرزندان علامہ سید سلیمان ندوی و مولانا عبد السلام ندوی کی میراث ہے۔ ان کو زمانہ طالب علمی ہی سے تاریخی و ادبی مطالعہ کا ذوق تھا اور ہندوستان کے ایک دور دراز خطہ میں پیدا ہونے اور رہنے کے باوجود وہاں کی زبان بھی اردو نہیں، ان میں اردو لکھنے کا اچھا سلیقہ پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے مطالعہ جاری رکھا اور خاص طور پر بحر عرب کے شمالی و جنوبی کنارے پر کرناٹک اور نوائط کی تاریخ اور اپنے وطن بھٹکل کی

قدیم علمی و دینی بیداری و ترقی کو اپنا موضوع بنایا اور اس پر ذرہ برابر کام کرتے رہے انھوں نے اس موضوع پر موجودہ مطبوعہ سرمایہ کا پورا جائزہ لیا۔ عربی و فارسی کی قدیم قلمی کتابوں اور مخطوطات کو بھی دیکھا اور جہاں ان کو کوئی کام کی بات ملی اس سے فائدہ اٹھایا ساتھ ہی انھوں نے شمالی ہند کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور وہاں کے بعض عربی النسل خاندانوں کو جن کی تاریخ تک رسائی ممکن تھی اپنے احاطۂ تحریر میں لینے کی کوشش کی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کئے اور اس سے انھوں نے شکر کا ایک انبار لگا دیا۔ جس کو عربوں کی مناسبت سے اگر ہم گنج شکر نہ کہیں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انھوں نے کتاب کے پڑھنے والوں کو ایک ہرے بھرے نخلستان میں پہونچا دیا جس کے میٹھے اور رسیلے رطب سے ہر ایک اپنا دامن بھر سکتا ہے یہ کام دوسروں کے حق میں جو کچھ بھی ہو ان کے حق میں صرف ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے کہ انھوں نے اس سے اپنے خاندان اپنی قوم اور اپنے وطن ہی کی خدمت نہیں کی علم دین اور ملک و ملت کی بھی خدمت انجام دی ہے میں ان کے خورد سال رفیق کی حیثیت سے جو زمانہ طالب علمی میں ان کا ہم درس و ہم استاد تھا اس کام پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب اپنے ناظرین کیلئے نہ صرف چشم کشا و معلومات افزا ہوگی بلکہ حوصلہ انگیز ہمت افزا بھی ثابت ہوگی اسکے تمام نتائج تحقیق اور مندرجات سے اتفاق ضروری نہیں لیکن مصنف کو ان کی محنت، جذبہ اور اس کامیابی پر جو انھوں نے اس مشکل کام میں حاصل کی ہے داد نہ دینا ظلم ہے۔

افسوس ہے کہ میں شدید مصروفیت اور بار یک تحریر کے پڑھنے سے جو سینکڑوں صفحات پر جاری ہے بینائی کی معذوری کی بنا پر اس کا حرف بحرف مطالعہ نہیں کر سکا۔ لیکن کتاب میں جتنی بھی نظر پڑی اس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے یہ کام بڑی جانفشانی اور سچی علمی لگن سے انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس سے پڑھنے والوں کو نفع پہونچائے۔

ابوالحسن علی
دائرہ شاہ علم اللہ
رائے بریلی
۱۶ ذی قعدہ ۱۳۹۸ھ
۱۹ اکتوبر ۱۹۷۸ء

عرب و ہند تعلقات

عرب و ہندوستان کے تعلقات بہت قدیم اور تاریخ کے نامعلوم زمانے سے ہیں۔ آریہ قوم کے وسطی ایشیا سے پنجاب میں پہونچنے کے صدیوں پہلے سے عربوں کے آمد و رفت اور ان کے تجارتی تعلقات و روابط ہندوستان سے قائم تھے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنی کتاب "سبحۃ المرجان فی آثار ھندوستان" میں لکھتے ہیں
جب آدم علیہ السلام سب سے پہلے ہندوستان اترے اور یہاں وحی آئی تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی اور چونکہ نور محمدی حضرت آدم کی پیشانی میں امانت تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہیکہ محمد رسول اللہ صلعم کا ابتدائی ظہور اس سرزمین میں ہوا۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ مجھے ہندوستان سے خوشبو آتی ہے"۔

اس پر مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: "یہ تمام روایتیں فن حدیث کے لحاظ سے بہت کم درجہ کی ہیں تاہم اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق ہندوستان سے زیادہ تر محمود غزنوی کی فتوحات کے سلسلے میں ہوا اور اس کے بعد مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے یہ کس قدر غلط ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کو اپنا مفتوحہ ملک نہیں بلکہ اپنا موروثی اور پدری وطن سمجھتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے انہیں سمجھنا چاہیئے۔

خیر یہ تو تاریخ کی یاد سے پہلے کی باتیں ہیں اگر تاریخی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محمود سے سیکڑوں برس پہلے ہندوستان آچکے تھے اور جگہ جگہ نو آبادیاں قائم کر لی تھیں[1]

تفسیر در المنثور کی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم جب جنت سے نکالے گئے تو ان کا نزول سب سے پہلے اسی ہندوستان میں ہوا تھا۔ سرزمین ہند کو یہ فخر حاصل ہے کہ ابوالبشر کا پہلا قدم عالم بالا سے عالم زیریں میں اسی دھرتی پر پڑا تھا۔ سری لنکا یا سراندیپ (آدم پیک) کے پہاڑ پر ان کے

[1] عرب و ہند تعلقات

قدم آج بھی دیکھنے والوں کے لیے اس تاریخی حقیقت کا ثبوت پیش کرتے ہیں چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کی لکھتے ہیں :-

"سراندیپ (لنکا) میں انھوں نے پہلا قدم رکھا جس کا نشان اس کے ایک پہاڑ پر موجود ہے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم میں ہے کہ ہندوستان کی اس سرزمین کا نام جس میں حضرت آدم اترے تھے "دجنا" ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دجنا دکھنا یا دکھن ہے جو ہندوستان کے جنوبی حصہ کا مشہور نام ہے ؟"

چونکہ عرب کے ملک میں متعدد قسم کی خوشبوئیں اور مسالے اسی جنوبی ہند سے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعہ وہ دنیا میں پھیلتے تھے اس لیے ان کا بیان ہے کہ یہ چیزیں ان تحفوں کی یادگار ہیں جو حضرت آدم جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان تحفوں میں جو ہمارے سے سوا دو پھل یعنی لیموں اور کیلے ہندوستان ہی میں موجود ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ اترج (کبھی جنت ہی کا میوہ تھا جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے ایک اور روایت میں ہے کہ جنت سے چار دریا نکلے ہیں، نیل، فرات، جیحون، سیحون نیل تو مصر کا دریا ہے جس پر مصر کی زراعت کا دارومدار ہے۔ اسی طرح فرات کی اہمیت عراق کی سرسبزی و شادابی کے لیے ہے وہ ظاہر ہے۔ جیحون ترکستان کا دریا ہے اور ترکستان کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے جو نیل و فرات کی مصر و عراق میں ہے اور سیحون کے متعلق ہے کہ ہندوستان کے دریا کا نام ہے کیا جنت کے اس چوتھے دریا کو گنگا سمجھا جائے ؟ بعض لوگوں نے اس کو دریائے سندھ قرار دیا ہے۔[1]

عربوں کی ہند میں آنے کی ابتدا

تاریخ کے محققین نے پہلی دریائی تاجر قوم کا نام فنیشین بتایا ہے۔ اس یونانی نام کی وجہ سے اس کا صحیح نام اور اس کی اصل حقیقت پر پردہ پڑا ہے دراصل اس کا نام کنعانی یا ارامی ہے اور اہل عرب اس کو اپنی بولی میں ارم کہتے ہیں۔ اس قوم کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے

الَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ -

محققین کی تحقیق کے بعد یہ عرب ہی تھے جو بحرین سے شام چلے گئے تھے اور وہیں آباد ہو گئے تھے اور انھوں نے بحر روم میں اپنی ایک مغربی بندرگاہ قائم کر رکھی تھی جہاں سے ان کی آمد و رفت ایک طرف یونان، یورپ اور شمالی افریقہ کے کناروں تک اور دوسری طرف مشرق میں ایران

---

[1] عرب و ہند ص ۳۰

ہندوستان اور چین تک رہتی تھی۔ چنانچہ اس ارامی یا ارمی قوم کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :- "یہ کون قوم تھی؟ محققین کا بیان ہے کہ یہ عرب تھے جو ساحل بحرین کے پاس سے اٹھ کر شام کے ساحل پر جا بسے تھے۔ بحرین گویا مشرقی ملکوں کی بندرگاہ ان کی تھی اور ناٹو شام میں بحر روم (میڈیٹرینین سی) کے کنارے ان کی مغربی بندرگاہ تھی جہاں سے وہ یونان کے جزیروں میں اور یورپ کے شہروں میں اور شمالی افریقہ کے کناروں تک کی خبر لیتے تھے۔ اس قوم کے ذریعہ یونان میں تہذیب و تمدن کا آغاز ہوا۔ ۱؎

عرب ممالک کا محل وقوع

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ عرب ایک جزیرہ نما ہے وہ تین طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے اس کا نقشہ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مغرب میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج فارس، شمال میں ملک شام ہے اس کے چاروں طرف دنیا کے بڑے بڑے ملک بکھرے ہوئے ہیں، اس کے ایک طرف عراق ہے، دوسری طرف شام تیسری طرف مصر و افریقہ اور سامنے ہندوستان اور اس کے ایک رخ پر ایران، ہندوستان اور عرب میں خلیج بیرہ عرب ہے۔ عرب کا وسطی علاقہ بے آب و گیاہ ہے۔ اس میں یمن کی وادی اور طائف کے پہاڑ جو اپنی سرسبزی اور پیداوار میں امتیاز رکھتے ہیں۔ باقی علاقے بے آب و گیاہ، بنجر، پتھریلی زمین یا ایک وسیع ریگستان ہے اور اسی بنا پر عربوں کو اپنی ضرورتیں اناج وغیرہ بیرونی ملکوں سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ سمندروں کے کناروں والے ملک قدرتی طور پر تجارت پیشہ ہوتے ہیں اسی لیے ہم زمانہ قدیم سے عربوں کو جو اکثر سمندری کناروں میں آباد علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں، سمندر اور خشکی کے ذریعہ تجارت و کاروبار میں مصروف پاتے ہیں۔

جہاں تک ہندوستان اور عربی ممالک کا تعلق ہے ایک حیثیت سے انھیں ہمسایہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے درمیان سمندر کی وسیع اور طویل راہیں حائل ہوگئی ہیں جنھیں سمندری خشکی کنارے باہم ملاتے تھے۔ عرب تاجر ہزاروں سال پہلے سے ہندوستان میں آمد و رفت رکھتے ہیں اور یہاں کی پیداوار، مال و اسباب کو براہ مصر و شام یورپ تک پہنچاتے تھے اور ادھر سے مختلف سامان بھر کر ہندوستان اور چین سے آگے جاپان تک لے جاتے تھے۔

عربوں کے اس زمانہ کے راستے کے بارے میں مورخین و محققین لکھتے ہیں کہ "مصر و شام کے

۱؎ عرب و ہند تعلقات ص۳۸

شہروں سے چل کر خشکی بحر احمر (ریڈسی) کے کنارے کنارے حجاز طے کر کے یمن تک پہونچتے تھے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر کچھ تو افریقہ اور حبشہ چلے جاتے تھے اور کچھ وہاں سے سمندر کے کنارے کنارے حضر موت، عمان، بحرین، اور عراق کے کناروں کو طے کر کے خلیج فارس کے ایرانی ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ تیز میں اتر پڑتے تھے یا پھر آگے بڑھکر سندھ کی بندرگاہ دیبل (کراچی) میں چلے آتے تھے۔ اور پھر اور آگے بڑھ کر گجرات کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تانہ (تھانہ بمبی) کھمبائت چلے جاتے تھے۔ پھر آگے بڑھتے تھے اور سمندر سمندر کالی کٹ اور راس کماری تک پہونچ جاتے تھے اور پھر مدراس کے کسی کنارے پر ٹھہرتے تھے اور کبھی سرندیب دانڈمان ہو کر سیدھے مدراس کی بندرگاہوں پر ہیکر لگاتے ہوئے خلیج بنگال میں داخل ہو جاتے تھے اور بنگال کی ایک دو بندرگاہوں کو دیکھتے ہوئے۔ برما، سیام ہو کر چین چلے جاتے تھے پھر اسی راستے سے لوٹ آتے تھے۔ لہ

ہند

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس پورے ملک کا کوئی واحد نام نہ تھا بلکہ صوبوں اور ریاستوں کے نام الگ تھے۔ ہر ریاست اپنے راجہ یا راج دھانی کے نام سے منسوب تھی حکومت فارس جب ہندوستان کے ایک حصہ پر قابض ہو گئی تو انھوں نے دریائے سندھ کا نام سندھ رکھا۔

نام کی تبدیلی کے بارے میں "عرب و ہند" کے مصنف لکھتے ہیں "ایرانی ایرانی زبان اور سنسکرت میں 'س' اور 'ھ' آپس میں بدلا کرتے ہیں جس کی متعدد مثالیں ہیں اس لیے فارس والوں نے اس کو ہندو کہہ کر پکارا اور اسی سے اس ملک کا نام ہند پڑ گیا۔ ؎

مگر عربوں نے سندھ کو سندھ ہی کہا اور ہندوستان کے دیگر حصوں کو ہند کے نام سے پکارا اور یہی نام دنیا کی مختلف زبانوں میں کچھ تبدیلی کے ساتھ پھیل گیا۔ فرنچ میں حرف 'ھ' الف سے بدل کر انڈ اور انڈیا بن گیا۔ اس کے بعد خیبر سے آنے والوں نے اس کو ہندوستان نام دیا جو فارسی تلفظ میں ہندوستان ہو گیا ؎ یہ ہند جو ہمارے پیارے وطن کا نام ہے عربوں کو اتنا پسند آیا کہ وہ اپنی کتابوں میں اس کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ گویا وہ ان کی کوئی محبوب اور عزیز چیز ہے۔ عربوں نے اپنی کتابوں میں اس کی تعریف و توصیف میں کئی کئی صفحے لکھ مارے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس لفظ ہند سے ان کے پیار و محبت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں اور بیویوں کا نام ہند

لہ عرب و ہند تعلقات ؎ ایضاً ؎ ایضاً

رکھ دیتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد عربوں کے ساتھ شعرائے فارس پر یہ رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے جس کی ایک مثال فارسی کا یہ مشہور مصرعہ ہے "بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"۔

اب اس کے ہندوستان کے متعلق کچھ حالات مختلف قدیم مورخوں اور سیاحوں کی زبانی پیش کئے جاتے ہیں۔

سُلیمان تاجر یہی وہ سیاح تاجر ہے جس کے سفرنامے سے ہم کو آج سے گیارہ سو سال پہلے کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں، اس کے سفرنامے کا نام "سلسلۃ التواریخ" ہے۔

سلیمان عرب تھا اور ایک بہت بڑا تاجر۔ اس نے اپنا یہ سفرنامہ ۲۳۷ھ میں لکھا تھا وہ اپنا تجارتی مال لے کر عراق سے کر چین تک سفر کرتا تھا۔ اس دوران اکثر وہ ہندوستان کی بندرگاہوں کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ وہ جنوبی ہند کے کناروں میں بہنے ہوئے سمندر کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ:۔

"اس میں انیس سو جزائر ہیں۔ جہاں ناریل کے درختوں اور عنبر کی کثرت ہے۔ سب سے آخر جو جزیرہ ہے اس کو سراندیپ کہتے ہیں اور اس پہاڑی پر حضرت آدم کا نقش پا ہے اور ان جزیروں میں حکمران ایک عورت کی ہے" وہ ہندوستان کے ساحلی مقامات کے چار راجاؤں کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے جن میں ایک راجہ کا نام بلہرا ہے یہ کلکم (کوکن) کا راجہ تھا یہ اس زمانے کا بہت بڑا راجہ تھا یہاں کے راجہ عربوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ بات ان کے دماغوں میں بس گئی تھی کہ ان کی محبت و حسن تعلق کی بنا پر وہ زیادہ عرصہ تک جیتے ہیں اور کم و بیش نصف صدی تک راج کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ گجرات کے راجہ کا ذکر کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ فوج اور دیگر سامان جنگ کی بنا پر یہ ایک طاقتور حکمراں تھا۔ یہ راجہ عربوں کا دوست نہیں بلکہ ان کا مخالف تھا اس کے بعد وہ دکن کی ایک ریاست کا ذکر کرتا ہے۔ بعض مورخین کی تصریح کے مطابق اورنگ آباد سے قریب یہ ریاست واقع تھی۔ اس کے بعد وہ ایک برہما راجہ کا ذکر کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ اس کے پاس ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کے بہ نسبت فوج زیادہ تھی، اس کا ملک صنعتی اعتبار سے ممتاز تھا اس کے ملک میں جو کپڑے تیار ہوتے تھے وہ کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آئے (کپڑوں کی اس نادر صنعت کی بنا پر بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس برہمی راجہ کی ریاست بنگال میں ڈھاکہ یا اس کے قریب واقع تھی) اس راجہ کا اصلی نام رام تھا۔ اس کے علاوہ سلیمان نے ہندوستان کے اس وقت کے ملکی قوانین رسم و رواج اور مختلف حالات بھی تفصیلاً بیان کیا ہے۔

بزرگ بن شہریار یہ تیسری صدی کا ایک جہاز راں تھا اس نے "عجائب الھند" کے نام سے ایک سفرنامہ عربی میں لکھا ہے اس میں اس نے سمندر کے ساحلی مقامات کا تذکرہ اور کچھ اپنے چشم دید حالات بیان کئے ہیں وہ اپنے جہازوں کو عراق سے ساحل سمندر

اور جزائر سے گزارتے ہوئے چین اور جاپان تک برابر آمد و رفت رکھتا تھا۔ اس میں اس نے زیادہ تر گجرات اور خاص کر جنوبی ہند کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس میں کولم، جبور، ٹھٹھہ، بنیا فہ، مہانگر اور سیلون کا ذکر ملتا ہے ہندی تاجروں کے سلسلہ میں جا بجا بنیانہ کا ذکر کیا ہے۔ (اس کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ یہ ہند کے تجارت پیشہ قوم بنیا کا معرب ہے)

۳۔ مسعودی ابوالحسن نام ہے ۳۴۶ھ کا جلیل القدر عظیم مورخ ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کا مورخ ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ علم الارض کا ماہر اور جغرافیہ داں بھی تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سیاح بھی تھا۔ وہ بغداد کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال سیاحت میں گزارے تھے اس نے عراق، شام، روم، ارمینیا، افریقی ممالک ہندوستان اور سراندیب وغیرہ کا سفر کیا۔ پھر اس نے بحری راستہ سے بھی فارس، حبش، عربی ممالک، ہندوستان، تبت، چین کی سیاحت بھی کی۔ اس نے ہندوستان، اس کے دریا، اس کے پہاڑ، اس کی مختلف قوموں اور زبانوں کا اور حکمرانوں کا اپنی ضخیم کتاب "مروج الذہب" میں ذکر کیا ہے۔ اس کی یہ کتاب معلومات کا خزانہ اس زمانے کے حالات کا قیمتی ذخیرہ اور اس وقت تک کی اسلام کی ایک مکمل اور بے مثال تاریخ ہے علامہ سید سلیمان ندوی مسعودی کے بارے میں لکھتے ہیں "مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب سیر و سیاحت ختم کرنے کے بعد لکھی ہے۔ پیرس میں یہ کتاب فرنچ ترجمہ کے ساتھ نو جلدوں میں شائع ہوئی اور مصر میں کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔" [1]

۴۔ ابن حوقل یہ بھی بغداد کا ایک تاجر تھا۔ اس کا سفر ۳۳۱ھ میں شروع ہوا۔ اس نے یورپ، افریقہ، اسپین، سسلی اور ہندوستان کے مختلف ملکوں کا سفر کیا وہ ایک جغرافیہ نویس بھی تھا۔ اس لیے وہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں کے عام حالات کے ساتھ اس کے نقشے بھی تیار کرتا تھا۔ اس طرح اس نے ہندوستان کا جغرافیہ بھی لکھا تھا جس سے اس میں ہندوستان کے اس وقت کا طول و عرض بھی دکھایا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ہندوستان کا نقشہ کھینچنے والا یہ سب سے پہلا عرب سیاح تھا۔ اس کے نقشہ میں گجرات سے لے کر سیناتان تک کے حالات اس کا محل وقوع اس کی آبادی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

۵۔ بشاری شمس الدین محمد ابن احمد بشاری بیت المقدس کا باشندہ تھا اور اسی نسبت سے وہ مقدسی مشہور ہے۔ اس کی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" ہے۔ جس کو اس نے ۳۷۵ھ میں لکھا تھا۔ اس کی کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا سفر صرف اسلامی

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۳۸

دنیا تک محدود رہا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اپنے زمانے کے مروجہ مذاہب، تجارت، صنعت و حرفت پیداوار، شہروں اور صوبوں کے حالات کافی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

٦- البیرونی چوتھی صدی ہجری کا یہ ایک جلیل القدر، مشہور و معروف مورخ تھا۔ اس کا اصلی وطن خوارزم تھا وہ متعدد کتابوں کا مصنف تھا ان میں ایک کتاب "کتاب الہند" ہے۔ اس میں اس زمانے کے مختلف حالات کے علاوہ سرزمین ہند کا جغرافیہ مفصل طور سے لکھا گیا تھا اس کے علاوہ اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: "قانون مسعودی خاص ذکر کے قابل ہے جو ابتک چھپی نہیں۔ اس میں ہندوستان کے بہت سے شہروں کے نام اور ان کے طول البلد اور عرض البلد تحریر کیا ہے ۱ہ۔

٧- اصطخری ابراہیم بن محمد اس کا وطن بغداد تھا اور اصطخری کے نام سے مشہور تھا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سیاح تھا۔ اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ سیاحت میں گزرا تھا وہ ۳۴۰ھ ۹۵۱ء میں سندھ اور ہند میں بھی آیا تھا۔ جغرافیہ میں اس کو نہایت ممتاز مقام حاصل تھا اس کی دو کتابیں نہایت مشہور ہیں (۱) کتاب الاقالیم (۲) مسالک الممالک (۳) ان کتابوں میں اصطخری نے عرب، ایران وغیرہ کے ساتھ ہندوستان اور سندھ کا بھی ذکر کیا ہے۔ خاص طور پر دلچسپ رائے کی راجدھانی بہانگر ملتان، منصورہ، دریائے سندھ کے حالات اور اس کے جغرافیائی نقشے ملتے ہیں۔

٨- ابوزید حسن سیرافی یہ عرب تاجر اور سیاح تھا۔ فارس کی تاریخی اور مشہور بندرگاہ سیراف میں بود و باش رکھتا تھا۔ اس لیے سیرافی کہلایا۔ اس کی سیاحت کا زمانہ کب سے کب تک تھا متعین طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۲۶۳ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ اس نے سلیمان تاجر کے سفرنامہ کو پڑھ کر اس کے تیس برس بعد اس کا تکملہ لکھا ہے ۲ہ۔ اس کا ثبوت تاریخی کتابوں سے اس طرح ملتا ہے کہ سلیمان اور سیرافی معاصر تھے اور ۳۰۳ھ میں سلیمان تاجر کی سیراف میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔

ابوزید اپنے ملک سیراف سے براہ سمندر ہندوستان اور چین کا سفر کرتا رہتا تھا۔ اس کا یہ سفر نامہ تجارتی ہوتا تھا لیجئے کچھ باتیں اس کے خود قلم حقیقت رقم سے سن لیجئے وہ لکھتا ہے:-

"ہمارے زمانے میں چین کے سیاسی انقلابات کے سبب وہاں سے لوگوں کے تجارتی کاروبار بند ہو گئے ہیں۔"

اس کا دعویٰ ہے کہ میں پہلا شخص ہوں جس نے یہ دریافت کیا کہ ہندوستان اور چین کا سمندر

ملہ عرب و ہند کے تعلقات ص ۳۰ ۲ہ ...

ادھر سے ہوکر بحر متوسط میں مل گیا ہے یہ سب سے پہلا عرب سیاح ہے جو جاوہ کے بادشاہ "مہراج" کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مقابل میں ملک کیار (راس کماری) کا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہاں کا راجہ مہاراج کے ماتحت ہے۔ اور یہاں بدکاری اور شراب نوشی دونوں کا نام و نشان نہیں ہے[1] اس کے علاوہ وہ ہندوستان اور چین کے مختلف حالات اور رسوم کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ان ملکوں کا جغرافیہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کی دریائی مسافت بھی بتاتا ہے۔ جنوبی ہند کی سیاحت میں وہ ساحل والے ملکوں کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ملتان کا مشہور بت خانہ بھی۔

۹۔ ابو دلف بن منحل ینبوعی

یہ بھی عرب کا ایک بہت بڑا سیاح تھا اس نے ۳۳۱ھ سے ۳۷۷ھ تک اپنی زندگی کے چھیالیس سال مسلسل سیاحت میں گزارا ہے۔ یہ بغداد اور ترکستان سے ایک چینی سفیر کے ہمراہ چین پہنچا اور پھر وہاں سے ترکستان، بخارا، کابل، تبت، کشمیر، ملتان، سندھ ہوتا ہوا ہندوستان کے جنوبی ساحل کولم وغیرہ مقامات کا سفر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں خشکی کے راستہ سے آیا تھا۔ یہ پہلا سیاح ہے جو خشکی کے راہ سے آیا تھا۔ یہ بھی جنوبی ہند اور اس کی پیداوار کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے۔

۱۰۔ شیخ ابو عبد اللہ ابن بطوطہ

یہ مراکش کے شہر طنجہ کے قصبہ میں ۱۳۰۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۷۷ء میں شہر فیض میں رحلت پائی۔ سیاحت کے وقت اس کی عمر ۲۲ سال تھی۔ اس کا سفر ۷۳۵ھ سے ۷۶۰ھ تک کم بیش ۲۵ سال جاری رہا افریقہ اور ایشیا کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں اس سیاح کے قدم نہ پہونچے ہوں۔ اس نے اپنے مشاہدات و تاثرات سفر پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام "تحفۃ النظار فی عجائب الاسفار" ہے اس نے اپنے سفرنامہ میں ہند کے حالات جس شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کسی دوسری کتاب میں اتنی تفصیل سے نظر نہیں آتے یوں تو اس سفرنامہ کا ہر حصہ دلچسپ، حیرت خیز، اور معلومات افزا ہے۔ لیکن جنوبی ہند کے متعلق جو حالات اس نے لکھے ہیں وہ خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔ اس کے سفرنامہ سے بہت سے تاریکی کے پردے میں چھپے ہوئے تاریخی واقعات سامنے آ گئے ہیں۔ اسی سفرنامہ کی بدولت ہناور میں عربوں کی مسلم سلطنت اور اس کے سربراہ سلطان جمال الدین ہنوری کے کچھ حالات ہم تک پہونچ گئے۔

۱۱۔ سیدی علی قلبی

یہ سیاح ترکی کا امیر البحر تھا اور وہ سولہویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب "محیط" میں ہندوستان کی بندرگاہوں اور شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب مشہور ماہر بحر احمد بن مجید کی مدد سے تالیف کی تھی یہ احمد بن مجید

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات

دیکھا ہے جس کی رہنمائی میں پرتگال والوں نے ہندوستان کا راستہ دریافت کیا تھا۔ واسکوڈی گاما جو پرتگال کا امیر البحر تھا وہ مغربی قوموں میں پہلا ہندوستان آنے والوں میں پہلا شخص تھا وہ علم بحری[1] حصوں میں احمد بن ماجد کا شاگرد تھا۔ اس کے علاوہ بلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" میں معلومات کا ایک بہت مفید ذخیرہ ہے اس نے یہ کتاب ۲۷۹ھ میں لکھی تھی۔ اس کے بعد مصنف ثانی کے مورخین و محققین میں یاقوت کی ایک ضخیم کتاب "معجم البلدان" ہے جو ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اس نے ہندوستان کے ملکوں اور شہروں اور بندرگاہوں اور ان کے حکمرانوں کے حالات لکھے ہیں۔ ایران کے ذکریا قزوینی کی کتاب "آثار الهند" میں اس ملک کے کافی حالات ملتے ہیں۔

سسلی کے مشہور عرب جغرافیہ اور تاریخ کے ماہر ادریسی کی کتاب میں ہندوستان کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔ یہ کتاب ۵۶۰ھ / ۱۱۶۵ء کی تصنیف ہے۔ میں ہمارے بھی اس ملک ہندوستان کے متعلق کافی موجود ہے۔ شہاب الدین عمری کی کتاب "مسالک الابصار و ممالک الامصار" یہ کتاب ۷۴۸ھ / ۱۳۴۸ء کی تصنیف ہے اس میں بھی ہمارے ملک ہندوستان کے متعلق کافی تاریخی ذخیرہ محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ بکثرت غیر ملکی سیاح یہاں وقتاً فوقتاً آئے اور انہوں نے اپنی اپنی کتابوں میں ہندوستان کے حالات و مشاہدات و تحقیقات لکھے ہیں۔ ان میں یونانی سیاح میگس تھنیس، بطلیموس، اطالوی سیاح پلینی اور ایریا ہے۔ چینی سیاح ہیونگ سیانگ اور پرتگالی سیاح مارکوپولو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان قدیم غیر ملکی سیاحوں کی کتاب کے چند ضروری اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ اطالوی سیاح پلینی لکھتا ہے:-

"مصر سے ساحل ملبار تک جہازات دو مہینے دس دن میں پہونچ جاتے ہیں مسرزس (ملبار میں مغربی ساحل پر) اور نوباد (مشرقی ساحل پر) میں اس زمانے میں بہت بارونق بندرگاہیں ہیں یہاں سے رومی جہازوں پر ہندوستان کی اجناس لادی جاتی ہیں۔ روفتہ الکبری ہر سال ساڑھے پانچ کروڑ سسٹرس (رومی سکہ) ہندوستان کے مال پر صرف کرتا ہے۔ یہ رقم روم والے اپنی تفریح اور عورتوں کے بناؤ سنگار پر صرف کرتے ہیں۔ پہلی اور دوسری صدیوں میں رومی باشندوں کی بہت بڑی تعداد ان بندرگاہوں پر آکر آباد ہوگئی تھی۔ مسرزس میں ان لوگوں نے قیصر اگسٹس Augustus. کے نام سے ایک عالیشان کلیسا بھی تعمیر کیا تھا۔[1]

یہ واضح رہے اور تاریخ روم سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ یہ تجارت عربوں اور مصریوں کے قبضہ میں تھی۔ رومی ہندوستان کے راستہ سے ناواقف تھے۔ حضرت عیسیٰ کے ۲۰ سال قبل قیصر

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۴۵۔

آگسٹس کے عہد میں جب رومیوں نے مصر فتح کر لیا تھا تو اس کے بعد رومیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جنوبی ہند میں شروع ہوگیا اور یہ تجارتی سلسلہ تقریباً ڈھائی سو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد یہ تجارت عربوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ پھر جب پرتگیزی ہندوستان میں آئے تو انہوں نے اس تجارت کو عربوں سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس زمانے میں یہاں سے یہ چیزیں روم بھیجی جاتی تھیں۔ یونانی فلفل۔ پنا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جنوب کے سمندروں میں تناولی کے قریب سے نکالا جاتا تھا۔ پنا زمرد کی قسم کا ایک قیمتی پتھر ہے۔ اس کی کانیں اضلاع کوئمبتور، امنت پور، کرنول میں پائی گئی تھیں اور فلفل (سیاہ مرچ) کی پیداوار زیادہ تر ملابار میں تھی۔ سیاح پیٹر و لکھتا ہے:۔

"نیشن زدہ عورتیں آج کل اپنے بناؤ سنگار اور نمائش کے لیے ایک ایسا کپڑا استعمال کرتی تھیں جسے ہوا کا جال کہا جاتا ہے":

ہو سکتا ہے کہ مصنف کی مراد اس سے ڈھاکہ کی ململ یا آب رواں جو ہندوستان کی مشہور صنعت تھی۔ دی بگننگس آف ساؤتھ انڈین ہسٹری کا مصنف لکھتا ہے۔

"چولا خاندان کا پایہ تخت چو بار مشرقی ساحل پر تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کی منڈی میں ہر قسم کا مال ملتا ہے [1]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ بندرگاہ تونڈی کے بارے میں لکھتا ہے:۔ (یہ بندرگاہ نہوہ کے قرب و جوار میں واقع تھی۔)

"اس بندرگاہ میں علاوہ مال تجارت کے اگر (ایک قسم کی خوشبودار لکڑی جسے عرب عود کہتے ہیں) ریشم، کافور، مصری، صندلی نمک وغیرہ ملتے تھے۔ اطالوی سیاح اسٹرابو لکھتا ہے۔ "پانڈیا خاندان کے راجہ نے حضرت مسیح علیہ السلام سے ۲۰ سال قبل اپنا ایک سفیر رومی قیصر آگسٹس کے دربار میں بھیجا تھا"

یونانی سیاح میگس تھنیز لکھتا ہے (یہ سیاح تین سو سال قبل مسیح جنوبی ہند آیا تھا۔) یہاں ملک کی حکومت پانچ طبقوں میں منقسم ہے (۱) ایک پنچایت جو ملک کے امن کی ضامن ہے (۲) مذہبی پیشوا جن کے ذمہ مذہبی تہواروں اور مندروں کا انتظام ہے (۳) طبیب جو ملک کی صحت و صفائی کے نگران ہیں (۴) نجومی جو آئندہ ہونے والے واقعات کی پیشگوئی کرنے کے علاوہ شاہی جشنوں، تہواروں اور شادی بیاہ کی تاریخ مقرر کرتے ہیں (۵) راجہ کے وہ ملازم جو حکومت کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔

مارکو پولو:۔ یہ سیاح ۱۲۹۰ء میں مسلمانوں کے حملے سے چالیس سال پہلے جنوبی ہند آیا تھا۔ اپنا سیاحت نامہ میں لکھتا ہے:۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص۸ بگننگس آف ساؤتھ انڈین ہسٹری، ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند ص۱۱۴

"سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس ملک میں فقیر سے لے کر امیر تک ننگے رہتے ہیں یہاں تک کہ بادشاہ جس کے گلے میں اس قدر قیمتی موتی جواہرات کے ہار ہیں جن کی قیمت سے ایک سلطنت خریدی جا سکتی ہے سوائے ایک دھوتی کے اور کچھ نہیں پہنتا، جنوبی ہند کے اکثر راجاؤں کے حرم میں پانچ سو سے زیادہ عورتیں اور بہت سے بچے ہیں راجہ کی حفاظت خاص طور پر ان لوگوں کے ذمہ ہے جو قسم کھا کر زندگی اور موت میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر نباتات پر گزارا کرتے ہیں۔ ملبار کے لوگ تجارت میں بہت مشہور ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی تاجر ہیں ملبار کے سوا ملک کے دوسرے حصوں میں تمام تجارت ویسیا (ویس) قوم کے ہاتھ میں ہے۔ ہر جگہ سونے کی افراط ہے اور یہ سونا ہمیں مختلف مقامات سے زمین سے نکالا جاتا ہے۔ ہیرے بھی گولکنڈہ اور اس کے نواح میں ملتے ہیں۔ ملک میں ہر جگہ ململ اور دوسرے قیمتی کپڑے بنائے جاتے ہیں مدورا اور سیلون کے قریب دریا سے موتی نکالے جاتے ہیں ان چیزوں کے علاوہ کالی مرچ، سونٹھ اور دوسرے گرم مسالے، نیل اور دوسرے رنگ غیر ممالک کو بھیجے جاتے ہیں اور ان کے عوض چین کا ریشم، یونان و مصر کی سوغات اور ایران و خراسان کے قالین، گھوڑے آکر یہاں فروخت ہوتے ہیں ان میں جو تجارت سب سے ممتاز ہے وہ گھوڑوں کی تجارت ہے۔ اس لیے کہ گھوڑے اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے اور اگر کہیں ہوتے ہیں تو اس قدر جفاکش اور تیز رفتار نہیں ہوتے جس قدر عرب اور ایران کے گھوڑے ہیں۔ اس لیے ملک میں ہر جگہ ان کی منڈیاں ہیں اور عرب اور ایران کے لوگ اس تجارت سے خوب نفع اٹھاتے ہیں"۔[1]

اس ملک پر ایک مسلم مورخ وصاف سے کچھ باتیں سن لیجیے، وہ جنوبی ہند کے اپنے مشاہدات اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"جنوبی ہند کا ملک کولم سے لے کر شمال میں نیلور تک تین سو فرسخ کے طول میں پھیلا ہوا ہے یہاں کے لوگ اپنے حکمران کو "دیور"[2] کہتے ہیں چینی ادوات اور ہند اور سندھ کی سوغات جہازوں میں بھری ہوئی یہاں آتی ہیں۔ خلیج ایران کے جزائر، عراق و خراسان، روم، یورپ کے تحائف معبر کی منڈیوں میں ملتی ہیں معبر[3] سے مراد کرنا ٹک ہے[4] یہی مصنف ایک جگہ اور لکھتا ہے:۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند [2] کارومنڈل کو عرب معبر کہتے ہیں [3] تاریخ وصاف مترجم محمد علی ایم۔ اے۔ [4] ایضاً

اس دیگ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ساحل ہے سمندروں کے کناروں میں سے۔ قدیم و جدید اور نادر اشیاء سے پر اور جنس جنس کے خزانوں اور گرانمایہ جواہرات اور عمدہ سامانوں اور گراں قدر، برگزیدہ متاعوں کی کثرت سے بے مثال کاریگری قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس علاقہ کے اطراف و جوانب عود اور قرنفل کی خوشبو سے مہکتے ہیں اور گرد و نواح کے علاقے طوطیوں کی زبان سے چہکتے ہیں۔

جنوبی ہند اپنے تاریخی آئینہ میں

ماہرین علم الارض کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوبی ہند اپنے قدیم تاریخ کے اعتبار سے براعظم ایشیا کا کوئی جز نہیں تھا بلکہ لیموریا نام کے ایک دوسرے براعظم کا حصہ تھا اور یہ اپنی وسعت میں جنوبی ہند، افریقہ سے گزرتا ہوا آسٹریلیا تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ثبوت میں کہا جاتا ہے کہ جنوبی افریقہ اور ملایا، بحر الکاہل کے جزائر کی آب و ہوا میں اور پیداوار میں کافی مماثلت اور یکسانی پائی جاتی ہے اس کے برعکس جنوبی ہند اور شمالی ہند کی آب و ہوا میں اور پیداوار میں بالکل مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی بڑھتی ہوئی تیز و تند لہروں نے کرۂ ارض کے رد و بدل کے ساتھ لیموریا کے ایک وسیع حصہ کو اپنی لا انتہا وسعت میں ختم یا گم کر دیا گیا ہے اور اب لیموریا کے باقیات میں صرف وہی بچا کھچا حصہ باقی رہ گیا ہے جس کو آج ہم جنوبی ہند سے یاد کرتے ہیں۔[1]

جزیرہ نمائے ہند میں جنوبی ہند کا یہ علاقہ تین طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے جس کے جانب مشرق

---

[1] تاریخ جنوبی ہند

خلیج بنگال میں مغرب میں بحیرۂ عرب، جنوب میں بحر ہند اور شمال میں اس کی حد دریائے کرشنا قرار دی گئی ہے اس طرح جنوبی ہند دریائے کرشنا سے شروع ہو کر جنوب میں راس کماری تک پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کی قدیم تاریخ خواہ وہ شمال کی ہو یا جنوب کی اس پر ایک گہری تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے بعض مقامات اور حالات جو آثار قدیمہ کی چھان بین سے دریافت ہوئے ہیں ان سے کچھ قدیم تاریخ کی جھلکیاں سامنے آگئی ہیں لیکن ان سے ٹھیک ٹھیک یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سرزمین پر سب سے پہلے کون سی قوم یا قومیں آباد تھیں۔ ان کی طرز حکومت کس طرح کی تھی؟ ان کی معاشرت کیسی تھی ان کی زبان کیا تھی؟ ان کے حکمراں کون تھے؟ وہ کس خاندان کے تھے؟ ان کے نام کیا اور ان کا زمانۂ حکومت کب سے کب تک تھا؟۔

ہندوستان کی قدیم آبادی کے بارے میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"یہ تو صحیح ہے کہ ایک زمانے سے یہاں ڈریویڈن (ڈراوڑی) قوم کی نسل آباد ہے لیکن تاریخ پتہ دیتی ہیں کہ جس طرح آرین قوم کے ظلم وستم سے تنگ آکر ڈریویڈن قوم شمال سے جلا وطن ہو کر جنوب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی تھی اس طرح ڈریویڈن قوم نے بھی اس ملک میں آکر ان قوموں کو جلا وطن کر دیا تھا جن کی نسلیں آج بھی پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لے کر زندگی بسر کر رہی ہیں"

مدورا، مناؤلی اور نیلگری کے پہاڑوں پر جو جنگلی قومیں پائی جاتی ہیں وہ انھیں قوموں کی یادگار ہیں۔ انالے پہاڑیوں پر پلیار قوم پائی جاتی ہیں جو جنگلی نباتات، چوہوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں سے پیٹ بھرتی ہے۔ منڈوار قوم بھی ابھی تک پہاڑوں میں خانہ بدوش ہے یہ اپنے مویشیوں کے ساتھ پہاڑوں کے دروں اور گھنے جنگلوں میں رہتی ہے موٹے ہونٹوں والی کدار قوم بھی آج صرف شکار پر زندگی بسر کرتی ہے وہ کبھی اس ملک پر حکمراں تھی۔ لوڈا قوم بھی کسی اگلی قوم ہی کی یادگار ہے [1]۔

سر ولیم ہنٹر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"ساحل ملیبار پر نائر قوم بھی کسی اگلی قوم کی نشانی ہے اور ان میں شادی بیاہ کا وہی رواج ابھی تک جاری ہے جو ہزاروں سال پیشتر تھا۔ ایک ایک عورت کئی کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے لیکن مرد کو اجازت نہیں کہ ایک عورت کے سوا دوسری عورت سے شادی کر سکے اور ان کی

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱

جائداد اپنے بچوں کو نہیں بلکہ بہن کے بچوں کو ملتی ہے۔ یہ رسم و رواج ہمالیہ اور ہمالیہ کے سوا شمال میں ملک تبت میں بھی پائی جاتی ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ اس قوم کے آبا و اجداد بھی ہمالیہ عبور کرکے آئے ہوں۔ علم انسانی کے محققین اور ماہرین نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جنوبی ہند میں جو قدیم اقوام تھیں ان کی آبادی دنیا کی آبادی کے ساتھ ساتھ معرض وجود میں آگئی تھی یا اس زمانے سے جب بحیرۂ یا افریقہ اور ایشیا مل کر ایک بر اعظم تھا اس وقت افریقہ سے یہاں چلی آئی تھی۔ ان کے گھنگھریالے بال ان کا کالا رنگ ان کا قد و قامت اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق افریقہ سے تھا اس کا بات کا پتہ کسی ذریعے سے نہ چل سکا کہ ان قدیم قوموں کا دھرم کیا تھا؟ ان کی تہذیب و تمدن کا رنگ ڈھنگ کیا تھا۔

مدراس کے عجائب خانہ میں ان کے بہت سے پتھر کے بنے ہوئے برتن اور ہتھیار بطور یادگار رکھے ہوئے ہیں جن کے دیکھنے سے ان کے قدیم تمدن کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی بنا پر مورخین نے اس کو پتھر کا زمانہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے ملکوں سے لوہے کی مختلف صنعتیں، برتن اور ہتھیار برآمد ہوئے ہیں، انھیں مدراس، بنگلور کے عجائب گھروں میں بطور آثار قدیمہ آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان برتنوں میں اکثر گائے بھینس اور بکریوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں ان کے ساتھ گھوڑے ہاتھی، اونٹ اور سور کی منقش تمثیلیں بھی ملتی ہیں۔ جنگلی جانوروں میں صرف چیتے اور ہرن کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان لوہے کے اسباب اور سامان کی بنا پر مورخین اس کو لوہے کے زمانے سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈریویڈن سطور بالا میں جن قوموں کا ذکر کیا ہے ان کا نہ کوئی مخصوص نام ملتا ہے نہ کوئی متعین زمانہ۔ مورخین ان کے موقع و محل کے لحاظ سے انھیں مختلف ناموں سے یاد کیا ہے اور ان کے زمانے کا تعین آثار قدیمہ والوں کے کھودنے سے نکالے ہوئے بعض کتبوں کی تحقیق اور قیاس و قرائن سے کیا ہے۔

ڈریویڈن

جنوبی ہند کے ان قدیم باشندوں کے بعد تاریخ میں جس قوم کا ذکر ملتا ہے وہ ڈریویڈن کا ہے۔ اور یہی جنوبی قوم جنوبی ہند میں ہر جگہ کثرت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے ان کی اصلیت کے بارے میں مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق تورانی نسل سے تھا۔ وہ شمال مغرب و درۂ بولان کے راستے سے ترک وطن کرکے ہند میں داخل ہوئے اور شروع میں شمال میں آباد ہو گئے لیکن جب آریہ قوم کا شمال پر غلبہ ہو اقوام و خواص نے اپنی درازدستیوں اور ظلم و ستم کی سختیوں سے ڈریویڈن کو شمال

سے بے تعلق اور بے دخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ جنوب میں پہونچکر وہیں بس گئے۔ اس کے بعد ڈریویڈین وہی سبق یہاں دہرایا جو وہ آرین اساتذوں سے شمال سے سیکھ کر آئے تھے۔ یعنی جنوب کے قدیم باشندوں کو مشقِ ظلم وستم بنایا۔ جس سے وہ آبادیوں سے نکل کر کوسوں دور پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے بعد ڈریویڈین قوم نے اپنی اچھی خاصی حکومت قائم کیں اور ان کے اپنے زمانے کے لحاظ سے صنعت، پیداوار، زراعت، تمدن اور کاروبار میں ترقی کے کمال کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ ان کا کچھ ذکر عہد عتیق کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ "حضرت سلیمان ؑ نے اپنے زمانے میں دو بحری جہیں ترسیس اور اوفیر کی بندرگاہ پر اس مقصد سے بھیجی تھیں کہ وہاں سے سونا، چاندی، ہاتھی دانت، صندل اور بندر لائی جائے۔" ترسیس جنوبی ہند کی ایک معروف بندرگاہ تھی جس کو اب مرورِ زمانہ نے مٹا کر رکھ دیا ہے۔ صندل اور مور جنوبی ہند کی خاص چیزیں تھیں۔" یونانی تاریخوں میں ہندوستان کے چاول کا ذکر اسی طرح کیا گیا۔ "ہندوستان سے جو چاول یونان آتے تھے وہ وہاں کی غذا میں کام آتے تھے۔

اب ملاحظہ ہو "آرین رول انڈیا" سے یہ عبارت "تامل زبان کے قدیم کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی ہند سے سونا، موتی، ہاتھی دانت، چاول، گرم مصالحہ، مور، بندر ڈریویڈین جہازوں میں بھر کر یورپ، بابل، نینوا، یونان، روم، مصر، چین اور دوسرے ممالک کو بھیجے جاتے تھے، ارض نینوا اور بابل کے کھنڈرات میں ساگوان کی لکڑی برآمد ہوئی ہے۔ ماہرین کا اس کے متعلق خیال ہے کہ کسی زمانے میں یہ جنوبی ہند سے لائی گئی ہوگی۔ لہ تاریخ جنوبی ہند ص۲۲

ڈریویڈین قوم یوں تو مختلف کمالات سے بہرہ ور تھی لیکن تین باتوں میں انھیں بہت ہی ممتاز مقام حاصل تھا۔ (۱) سونے، ہیرے، جواہرات کی کانیں کھود نکالنا۔

۲۔ انھیں اپنے طرز خاص اور حسن کارکردگی سے دیدہ زیب اور قابل استعمال بنانا اور ان سے ہر طرح نفع اندوز ہونا۔

۳۔ شاندار عمارتیں تعمیر کرنا۔

قیمتی پتھروں کی کانیں دریافت کرنے کا ثبوت ان کتبوں سے بھی ملتا ہے جو ان کانوں کے قریب ہاتھ آئے ہیں۔ قیمتی پتھروں کی تراش وخراش سونے اور جواہرات میں ان کی صنعت کاریاں آج بھی ان کے نام اور کام کی یاد دلاتی ہیں۔

فن تعمیر سے انھیں نہایت گہرا لگاؤ تھا اور اس میں وہ نہایت ممتاز درجہ رکھتے تھے جنوبی ہند کے اکثر کھنڈر انھیں کی تعمیر کردہ ہیں۔ لیکن ان میں کانجی ورم اور مدورا کے مندر ان کی تعمیری شاہکار کی عظمت بھی داد تحسین دینے پر مجبور کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک خاص قسم کی طرز تعمیر

اس قوم کے نام سے منسوب ہے جس کو انگریزی میں ڈریویڈن اسٹائل کہا جاتا ہے۔

آرین قوم

یہ قوم وسط ایشیا سے چل کر افغانستان، کشمیر ہوتے ہوئے شمالی ہند میں داخل ہوئی اور جو قوم نامعلوم زمانے سے یہاں رہتی آئی تھی انھیں ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا۔ جس وہ تنگ آکر جنوب کی طرف چلے گئے۔ اور وہیں اقامت اختیار کرلی آرین ضروری ہتھیاروں سے لیس تھے۔ اور ان کی آپس میں یکجائی تھی ان کی قومیت کا رشتہ مربوط تھا وہ قوی اور جفاکش تھے شکل وصورت میں بھی انھیں امتیازی خصوصیت حاصل تھی۔ ان کا قد و قامت متوازن اور رنگ گورا تھا۔ شمال کی آب وہوا انھیں طرح راس آئی تھی کہ اس نے انھیں قوی سے قوی تر بنا دیا۔ ان کے مقابلہ میں جو قوم یہاں پہلے سے آباد تھی وہ ان سب باتوں میں ناپید تھی۔ اس لیے انھیں آرین قوم کے مقابلہ میں قدم قدم شکست اٹھانی پڑی اور آرین قوم غالب اور فتحیاب ہوئی اب سارا شمالی ہند بے روک ٹوک ان کے قبضہ و اختیار میں تھا۔ اور وہ یہاں آزادی کی زندگی گزارنے لگے اور اپنے دھرم اور سنسکرتی کو پھیلانے میں لگ گئے۔

مسٹر ولیم ہنٹر نے تاریخ ہند کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ " وید کی نظموں میں آرین قوم کی ترقی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ پچھلی نظموں میں ان کے اصلی وطن کا ذکر ہے۔ بعد میں دریائے سندھ، کوہ ہمالیہ کا تذکرہ[1] ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح یہ قوم آہستہ آہستہ ہندوستان پر اپنا قدم جماتی چلی گئی۔

" رگ وید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آکر یہ قوم مختلف طبقوں میں تقسیم ہوگئی تھی کبھی متحد ہوکر یہاں خام قوموں پر حملہ کرتی اور کبھی آپس ہی میں خانہ جنگیاں ہوتی تھیں[2]۔ آریہ قوم کا دھرم کیا تھا اور ہندوستان آنے پر شروع میں وہ کس خدا کو مانتے تھے۔ اس کے متعلق وہی تاریخ ہند کا مصنف لکھتا ہے۔ انھیں صرف ایک خدا پر اعتقاد تھا اس کے متعلق رگ وید میں نظم موجود ہے۔

" ابتدا ایک سنہرے بچے سے ہوئی اس نے زمین و آسمان بنائے۔

وہی ہے جو ہم کو طاقت اور زندگی بخشتا ہے۔ اس کے حکم پر تمام دیوتا چلتے ہیں ہم اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کا سایہ رحمت ہے، اس کا سایہ موت ہے۔

---

[1] تاریخ ہند از سر ولیم ہنٹر۔ [2] ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند

"وہی ایک بادشاہ ہے جس کی طاقت سے دنیا سانس لیتی ہے۔ وہی زندہ ہے اور ہر جاندار پر حکومت کرتا ہے۔ ہم اس کی پرستش کرتے ہیں۔"

"وہی ہے جس کی قدرت سے آسمان چمکدار اور زمین مضبوط بنی اسی کے حکم سے آسمان بنا وہ آسمان جو اونچا ہے۔ ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں۔"

"اسی نے ہوا اور روشنی بنائی۔ ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں۔"

"وہی ہے جو برابر حکمرانی کرتا ہے۔ وہی سب خداؤں کا خدا ہے۔ ہم اسی کی پرستش کرتے ہیں۔"

رگ وید کی نظم کا یہ خلاصہ ہے جس کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آرین خدا کی وحدانیت کے قائل تھے۔ جس کا ثبوت رگ وید کی مندرجہ بالا نظم سے بخوبی مل جاتا ہے۔ اس نظم میں خدا کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ کتنے پاکیزہ، ستھرے اور پیارے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں ان کے اعتقادات میں تغیر پیدا ہوا اور ان کے اصلی دھرمی خیالات بدل کر ایک دوسری جانب بہنے لگے۔ یہ تبدیلیاں ان میں کس طرح پیدا ہوئی اس کا کچھ ٹھیک پتہ تو نہیں چلتا۔ بجز اس کے کہ ہندوستان کی زرخیزی ان کے ذہن و اعتقاد پر اثر انداز ہوئی ہو۔ ہندوستان کی سرزمین نہایت زرخیز اور قدرتی اسباب و وسائل سے مالا مال تھی۔ اس کی فرحت افزا اور راحت نصیب سرسبزی اور شادابی دیکھ کر انھیں کو اپنا حقیقی ان داتا اور روزی رساں اور محافظ کل تصور کر لیا ہو اور انھیں مظاہر قدرت کی پوجا پاٹ کے لیے نئے دیوتا چن لیے ہوں۔ اس کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ آرین دیوتا ہندوستان کے قدیم قوموں کے دیوتاؤں سے بالکل مخالف اور جداگانہ نوعیت کے دکھائی دیتے ہیں ہندوستان کی پرانی قوموں کے دیوتاؤں کو نہایت بدنما، نازیبا، ناپسندیدہ شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے رنگ کو گہرے سیاہی مائل، ان کے چہرے مہرے کو خوفناک، ان کے اعضا کو کریہہ المنظر غرض ممکن طریقہ سے انھیں ڈراؤنی اور بھیانک روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

غرض آرین قوم کو ہندوستان آئے کافی زمانہ گزر گیا اور شمالی ہند میں ان کا دھرم اور کلچر اکیلے نقشے کے ساتھ ابھرا اور پھیل گیا۔ انھیں اپنی روز افزوں بڑھتی ہوئی قوت اور زور بازو کا احساس ہوا تو اب ان کی نگاہیں جنوب کی جانب برابر اٹھنے لگی۔ وہ جانتے تھے کہ جنوب میں دراویڈین کا غلبہ اور اقتدار ہے لیکن ان کے نزدیک ان کی کچھ اہمیت نہیں تھی کیونکہ یہ بازو ان کے آزمائے ہوئے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح انھوں نے شمالی ہند سے دراویڈین قوم کو بھاگنے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی طرح جنوب سے بھی نکال باہر کر دیں گے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آرین قوم کو جنوب کے یہ حلقے لوہے کے چنے ثابت ہوئے جو نہ نگلتے بنے اور نہ سر ہو سکے۔ اس حملہ کے متعلق مسٹر کے آر جی معبد اکر جو جنوبی ہند کی تاریخ میں ایک مستند اور معتبر مورخ تسلیم کئے جاتے

ہیں۔ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ "یہ حملے تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوئے اور اس کا سلسلہ چوتھی صدی عیسوی تک جاری رہا"[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آریہ قوم اور دراوڑین قوم چار سو سال تک بر سر پیکار رہی۔ اس طویل عرصہ میں طرفین کو بے انتہا جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا ہوگا۔ لیکن اس کی تفصیل کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گذری۔ اب دھیرے دھیرے حالات بدلنے لگے اور کشت و خون سے تھکی ہاری ہندی دو قوموں کے لیے اب صلح صفائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پھر وہ وقت آیا کہ دونوں قومیں آپس میں شیر و شکر کی طرح گھل مل کر یکجائی کے پر امن دور میں پہونچ گئیں۔ ان دونوں قوموں کے گٹھ جوڑ نے ایک نئے دھرم اور نئے کلچر اور نئی سنسکرتی کو جنم دیا جس کو آج کل کی زبان میں عام طور پر ہندو دھرم کہا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ تعجب اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد اونچ نیچ، ذات، پات رنگ و نسل کے امتیاز پر رکھی گئی۔ اعلیٰ ذات والوں نے ایک ایسا منتر پھونک دیا جس کی سحر آفرینی سے ادنیٰ ذات والوں کی گردنیں ——— جھکی کی جھکی رہ گئیں منتر کے شبد بظاہر دودھ کی طرح صاف و شفاف تھا مگر اس میں کٹورا سا زہر ملا ہوا تھا۔ لیجئے آپ بھی اس منتر کو ذرا سن لیجئے۔ "آخر برہمن (آریہ) کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار کیوں؟ برہمن بذات خود کوئی فضیلت نہیں رکھتا یہ صرف ان کے نیک کاموں کا جو انھوں نے اگلے جنم میں کیے تھے اس کا ثمرہ ہے۔ موت کے بعد تمھاری زندگی میں بھی انقلاب آنے والا ہے۔ اور اگلے جنم میں تم بھی برہمن پیدا ہوں گے اور تمھاری سیادت کو دنیا تسلیم کرے گی"[2]

اس کے ثبوت میں آرین رول ان انڈیا کا مصنف لکھتا ہے۔ "برہمنوں یا دوسرے الفاظ میں آریوں ظلم و ستم کے متعلق ہوئے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جب کسی قوم میں حکومت آجاتی ہے تو وہ ظالم بن جاتی ہے، لیکن ذہنی ظلم ایک ایسا ظلم ہے جو بہ نسبت جسمانی ظلم کے آسانی سے سہا جا سکتا ہے۔ برہمن قوم جو فطرت انسانی سے بہت زیادہ واقف تھی اس راز کو پا لیا تھا جس کو موجودہ زمانہ میں یورپ آہستہ آہستہ اختیار کر رہا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ تمام انسان بلحاظ پیدائش یکساں نہیں ہوتے اگر ہر ایک کو مساوات دے دی جائے تو تمدن کو سخت دھکا لگے گا"[2]

دھرم کے پردے میں پھیلائے گئے اس دام زریں میں دراویڈین قوم بری طرح پھنس کر رہ گئی انھیں اس کا اندازہ ہو ہی نہ سکا کہ دھرم کے نام پر وضع کئے گئے یہ اصول ان کی قومی زندگی کے لیے کس قدر ہلاک اور تباہ کن ہیں۔ انھیں کیا خبر تھی کہ اس اصول کو اپنانے کا مطلب ان کی قومی خودکشی کے مترادف

۱؎ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۵   ۲؎ آرین رول صفحہ ۲۲۴

ثابت ہوگا۔ حالانکہ وہ اس وقت وہ بہت خوش تھے اور انھیں اطمینان تھا کہ وہ آئندہ برہمن کی حیثیت میں جنم لیں گے اور آریہ قوم کے مساوی اور برابری کے درجہ پر آجائیں گے۔ چنانچہ اس عقیدے کو ہندو دھرم کا سنگ بنیاد قرار دینے اور اس نئے نظریہ کو برضا و رغبت تسلیم کرنے کے بعد ان کی علاحدگی پسندی کے سارے رجحانات ختم ہوگئے اور ان کے باہمی تنازعات و اختلافات بھی ختم ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو دھرم کے ایک مذہبی رشتہ کو برقرار رکھ کر باقی تمام امور میں فرق و امتیاز اور چھوت چھات کے مضبوط بندھنوں میں جکڑ دیے گئے۔ اس نظریہ کے ماتحت ہر قوم کو ہندو دھرم میں شامل ہونے یا انھیں اپنے اندر سمیٹ لینے کا راستہ بھی کھل گیا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ ہندو دھرم کسی خاص عقیدے یا کسی خاص دھرم اور سنسکرتی کا نام نہیں بلکہ وہ مختلف عقائد مختلف کلچر اور مختلف تہذیبوں کا معجون مرکب ہے جو صدیوں کے اختلاط اور ارتباط سے پیدا ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان مختلف عناصر کے مختلف نمونے، مختلف ناموں اور مختلف مذہبوں کے ساتھ آج بھی جنوبی ہند میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جہاں اعلیٰ و ادنیٰ ذاتوں میں فرق و امتیاز کی جو آہنی حد فاصل ہے وہ تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جن کو پست ذات کہا جاتا ہے ان میں بھی عقائد اور رسم و رواج، شادی بیاہ، اور مذہبی طور طریقہ میں بہت ہی نمایاں فرق و امتیاز پایا جاتا ہے اور اگر ان میں کوئی چیز مشترک نظر آتی ہے تو وہ صرف برہمن کی سیادت اور ان کی ذاتی فضیلت اور برتری کی ہے جو ان کے دلوں اور ذہنوں، دماغوں میں نہ مٹنے والے نقوش کی طرح بس اور رچ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام مذہبی رسوم اور پوجا پاٹ اور دھرم کے سارے امور برہمنوں کی رہنمائی کے محتاج رہتے ہیں۔

ہند میں اسلامی تعلقات کی ابتداء

مشہور رہے کہ اسلامی سیاسی تعلقات کی ابتداء ملک سندھ سے شروع ہوئی۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے اسلامی سلطنت قائم کی جس کی سرحدیں ایک طرف راجپوتانہ سے دوسری طرف کشمیر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ حکومت تقریباً بارہ سو سال تک اسلامی اقتدار میں رہی۔

مسلمانوں کا پہلا حملہ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تاریخی واقعہ بھی ناقابل انکار ہے کہ ۱۵ھ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پانچ سال بعد حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں بحرین و عمان کی امارت عثمان بن ابی العاص ثقفی کو جن کا شمار صحابہ کرام میں تھا سپرد فرمایا۔ انھوں نے عمان حکومت سنبھالنے کے ساتھ اپنے بھائی حکم بن ابی

ابی العاص کو بحرین کا امیر مقرر کیا۔ اور اس کے ساتھ ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا۔ حکم ابن ابی العاص نے کشتیوں کے ذریعہ نہایت دشوار گزار بحری سفر طے کیا اور اپنی فوج کے ساتھ گجرات کے ساحل پر پہونچے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین ہند میں گجرات ہی ایسا مقام ہے جہاں سب سے پہلے پیروانِ حق کی ایک باکمال جماعت پہونچی۔ اس طرح سرزمین گجرات ہی اولاً مسلمانوں کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوئی اور اس کے دشت وجبل رب العزت جلِ جلالہٗ کی توحید کی اذانوں سے اور تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھے۔ اس حملے میں جن نفوس قدسیہ کو شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ان میں صحابہ کرام بھی تھے۔ مورخین کے بیان کے مطابق یہ فدایان اسلام اسی سرزمین میں سپرد خاک ہوئے چنانچہ مولانا حکیم سید عبدالحئی اپنی کتاب "یاد ایام" میں لکھتے ہیں اگرچہ ہم کو اس کنز مخفی کا پتہ نہیں ہے مگر یہ یقینی ہے کہ بھڑوچ اور کھمبایت کے گرد و نواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا۔[1]

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب بمبئی محض ایک ٹاپو تھا۔ پہاڑوں سے ڈھکا ہوا اب تک غیر آباد ویران خطہ تھا۔ مگر اس کے قریب تھانہ جس کو عرب تانہ کہتے ہیں وہ ایک آباد اور بارونق شہر تھا اور اس کا بندر بہت مشہور تھا اور اسی پر سب سے اول مسلمانوں کا حملہ ہوا تھا۔[2] اس کے بعد دوسرا حملہ حکم بن ابی العاص نے بھڑوچ پر کیا جس کو عربی زبان میں بروج یا بروص سے یاد کیا جاتا ہے اور جو اس زمانہ میں نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا پررونق اور آباد بندر تھا۔[3] ان دونوں حملوں میں حکم کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی مگر چونکہ فاروق اعظمؓ کی رائے دریائی سفر کے خلاف تھی۔ اس واسطے مدت تک مسلمانوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ۹۳ھ تیسرے حملہ میں ملک سندھ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ اور ۱۰۷ھ میں ہشام بن عبد الملک خلیفہ دمشق نے جنید بن عبد الرحمان کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ جنید ایک مدبر اور ایک باہمت شخص تھا۔ اس نے چند روز میں اپنے علاقہ کا بندوبست کر کے گجرات کی طرف توجہ کی اور اپنی طرف سے لوگوں کو عربی فوجوں کے ساتھ کچھ روانہ کیا۔ جب کو عرب کے لوگ تنہ لکھتے ہیں۔ یہ فوجیں بھڑوچ کو تہ و بالا کرتی ہوئی مالوہ میں گھس آئیں اور ہر طرف جا جا کر انھوں نے فتوحات حاصل کیں۔ دشمنوں کو ہر جگہ پسپا کیا اور غنیمتیں حاصل کیں۔[4]

چوتھا حملہ

چوتھے حملے کے بارے میں مورخ بلاذری کے بیان کے مطابق ۱۵۹ھ میں خلیفہ بغداد المہدی باللہ عباسی عبد الملک بن الشہاب المسمعی کے ماتحت جنگی ساز و سامان سے لیس فوج سندھ وسعتان کی طرف بھیجا۔ اس کے ساتھ فوج مطوعہ (رضاکار) بھی تھی۔ یہ فوج خطہ موضع باربد پہونچی۔ یہ باربد کہاں ہے؟ اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ مورخین

---

[1] یاد ایام صفحہ ۳ (نوٹ: مولانا حکیم سید عبدالحئی مولانا علی میاں کے والد بزرگوار تھے) [2] فتوح البلدان بلاذری
[3] معجم البلدان بحوالہ یاد ایام [4] یاد ایام

واقعہ یہ ہے کہ یہ سندھ کا ہی ایک شہر ہے اور بعض محققین کو اس سے اتفاق نہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حکیم عبدالحیؒ "یادِ ایام" کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "اب تک یقینی طور پر نہیں معلوم کہ بارہ کس نام کا معرب ہے۔ اور کہاں یہ تھا؟ عربی تاریخوں میں بتایا ہے کہ یہ شہر سندھ کا کوئی شہر ہے مگر مجھ کو اس کا کوئی یقین نہیں۔ عرب مورخوں کا دستور ہے کہ وہ ہندوستان کے ہر شہر کو سندھ بنا دیتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ مقام خلیج کنبانہ (کھمبات) میں کہیں واقع تھا[1]

یہ اسلامی فوج ابتدا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ اس کو ایک نہایت کٹھن امر آزمائش مرحلہ سے بھی گزرنا پڑا۔ اس وقت وہاں کے دریا کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے انتظار میں مجبوراً اسلامی فوج کو کچھ دنوں تک وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اسی اثنا میں وہاں ایک بدبودار ہوا چلی جس سے وبا پھیل گئی اور مورخین کے بیان کے مطابق کم و بیش ایک ہزار بندگانِ خدا لقمۂ اجل بن گئے اور وہ اسی سرزمین میں سپرد خاک ہوئے، ان میں ابو بکر بن ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے جو ایک تابعی تھے اور جیسا صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق هُوَ أَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ فِي الْإِسْلَامِ اسلام میں حدیث کے پہلے مصنف تھے۔

تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں۔ "ظہور اسلام کے بعد جب نئے دین کے علمبردار شام و عراق کے مالک بن گئے تو شہنشاہ ایران یزدجرد ساسانی کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی اور ایوان کسریٰ کے کنگرے گرنے لگے نئے دین کی نئی قدروں کی تجلی سے اہورمزدا کی روشنی ماند پڑ گئی اور آتش کدوں کی پرانی آگ سرد پڑنے لگی۔ ایران کی فتوحات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ھ ۶۳۶ء میں عثمان ابن ابی العاص الثقفی کو بحرین میں اپنا نائب مقرر کیا۔ الحکم نے خلیفۃ المسلمین کی رضامندی لیے بغیر ایک بحری بیڑہ تانہ کی مہم پر بھیجا یہ مہم ناکام ثابت ہوئی[2]

تھانہ کا افتخار

تھانہ کی بندرگاہ کو ساتویں صدی میں بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی تھی عرب دنیا کو کوکن کی تجارتی فتوحات اور اقتصادی مہمات کو علم تاریخ کے پچھلے کئی دور سے تھانے مسلم مقبوضات میں بصرہ کی بندرگاہ کا تجارتی منڈی تھانہ سے براہ راست رابطہ نئی اسلامی مملکت کے لیے مزید اقتصادی اور سیاسی فتوحات کا سلسلہ بن سکتا تھا۔ اس ایک مہم سے تھانہ کی جغرافیائی عسکری، تجارتی اہمیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس عہد ۶۳۶ء میں معلوم ہوتا ہے کہ سامراجیہ میں کوکن کی بندرگاہ پر اقتدار جمانے کی کشمکش عروج پر تھی چلوکیہ راجہ پل کیشن (دوم) کے بیڑوں کے جال میں یہ ساری سونے کی مچھلیاں پھنس چکی تھیں مگر عرب ملاحوں کے بیڑے بھی بروچ (بھڑوچ) اور دیبل کی بندرگاہوں کے گرد منڈلانے لگے تھے۔ المغیرہ جو عثمان ابن ابی العاص کے بھائی تھے پر جس

---

[1] "یادِ ایام" [2] فتوح البلدان بلاذری بحوالہ تاریخ دکن ص ۹۸

اور دیبل کی مہمات کے سربراہ تھے[1]

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت ۳۹ھ سے ایک عرب رئیس حارث بن مرہ عبدی ان سرحدوں کی باقاعدہ نگرانی کرنے لگے تھے۔ یہ عرب سردار دو سال بعد مارا گیا[2] (ان بحری گشتوں کے کئی اور وجوہ تھے) ہندوستان کے مغربی ساحل کو گجرات سے لے کر ملیبار تک اور کوکن میں بالخصوص تھانہ کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے صحابہ کرامؓ اور نہ جانے کتنے تابعین کی قدم بوسی کی۔ آنحضرت صلعم کی رحلت کے بعد پانچ سال سے عرب مسلمان مالابار کے ساحل علاقہ میں کیرالا تک آنے جانے لگے تھے موجودہ خطہ میں جب قبروں کی انتہائی قدامت سے یہ کلیہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ ثقہ روایت کے مطابق جن اصحاب کرام نے ہندوستان کی سرزمین کو نوازا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ عاصم بن عدی، الحکم ابن ابی العاص۔ عبداللہ بن عتبان۔ عبید اللہ بن معمر التیمی (یہ رسول اکرم صلعم کے وصال کے وقت بچے تھے) ان کے لڑکے عمر بن عبید اللہ التیمی کابل کی مہم میں شہید ہوئے) عبد الرحمٰن ابن سمرہ بن حبیب بن عبد الشمس بن عبد مناف فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سجستان ابن سلمہ بن المحبق الہذلی ۵۵ھ میں ہندوستان کی مہم میں شریک تھے[3] اس کے لیے ڈاکٹر محی الدین لکھتے ہیں "بحرین کا جزیرہ غارت گروں کا مسکن تھا اور یہ خلیج ساتویں صدی میں ابو القیس قبیلہ کی بحری قزاقی دیوانگی بن چکی تھی۔ خلیج فارس تجارتی جہازوں کے لیے گذرگاہ کا کام دیتی تھی۔ قادسیہ اور نہاوند کی فیصلہ کن جنگوں ۶۳۶ء، ۶۴۲ء میں ایرانی مدنیت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ زرتشتی مہاجرین ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پناہیں ڈھونڈھ رہے تھے یہاں سندھ پارہ اور کلیان میں ان کے ہم وطن نسطوری عرصہ دراز سے آباد تھے۔ ان کا پہلا مہاجر قافلہ اسی عہد میں سنجان میں پہونچا یہ پردیسی نئے ملک میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اس لیے نہیں کرتے تھے کیونکہ ساسانیوں کے سیاسی تعلقات معاصر چلوکیوں سے عہد ناموں اور سفارتوں کے ذریعہ مستحکم ہو چکے تھے۔ عربوں کو اندیشہ تھا کہ ان کی طرف کوئی فوجی کمک ایران کو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نہ بن جائے اس بحری گشت اور نگرانی سے عرب تاجروں اور داعیان اسلام کی حفاظت بھی مقصود تھی جو تجارتی اسباب کے علاوہ اپنے تمدن کی تعلیمات کے جواہر پارے بھی ساتھ لانے لگے تھے۔"[4]

گنگا اور دجلہ کا ملاپ

خلفائے عباسیہ کے سنہری دور میں جب عجمی ثقافت اور مدنیت کے زیر اثر تمدن تکلف کے حریم ناز میں انگڑائیاں لینے لگا تو اسباب معاشرت

---

[1] سیر الصحابہ دارالمصنفین میں تذکرہ موجود ہے مگر ہندوستان آنے کا ذکر نہیں ہے (ڈاکٹر محی الدین مومن) [2] ذہبی ترجمہ فتح بیگ کراچی ص ۵۸۰، ۵۸۵ مختلف ماخذات بالخصوص الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (حیدرآباد دکن) ۱۳۱۹ھ مگر اس کتاب میں مذکورہ بالا کوئی نام نہیں ملتے [3] تاریخ کوکن ص ۱۰۰

اور کاروبار زندگی پر بھی نیا رنگ و روغن چڑھنے لگے اس کی سب سے بڑی وجہ دولت کی فراوانی تھی۔ جس کے نتیجے میں لوازمات عیش کی ارزانی تھی۔ عراق کے معاشرہ میں نو دولتیوں کا ایک طبقہ وجود میں آ چکا تھا جو سونے اور چاندی میں لوٹتا تھا ان امراء کی زندگیاں بغداد کی راتوں کی طرح رنگین اور ہوشربا تھیں اور جن کے خزانوں کی داستانیں الف لیلیٰ کی ہزار داستانوں سے زیادہ طلسم انگیز تھیں ان الف لیلوی کرداروں میں بوذا وسٹ، ابن الجصاص جیسے پونجی پتی جوہری تھے اور سیراف اور بصرہ کے اور دوسرے تجارتی منڈیوں کے تجار اور مالکان جہاز تھے۔ انھیں کی بدولت دولت کا دریا ہندوستان اور دور دراز چین وجاوا سے بہہ کر دجلہ و فرات میں آ رہا تھا۔ جس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور علوم کے موتی، اور مرجان بھی بہہ بہہ کر رہے تھے۔ طب کے نرالے دید اور نجوم کے نابغے۔ ریاضی کی گتھیاں، ادب اور ساہتیہ کی چاشنی اور اخلاق کے نکات کتابوں اور دانشوروں کے توسط سے عباسی دربار میں باریابی حاصل کر رہے تھے۔ "سدھانت" کی، پنچ تنترا اور چرک سمہتا کی کتابیں قبول عام کی خلعتیں پا چکی تھیں ہندوستانی نجومیوں کی قسمتوں کے ستارے عہد عباسیہ کے علمی افق پر چمک اٹھے تھے۔ بغداد کے مرمریں محلوں اور قصروں میں ہندوستانی شطرنج اور چوسر کی بساطیں بچھنے لگی تھیں۔ ہندوستانی مصنوعات کے عرب طلبگار لمبی عباؤں کے نیچے کمر سے دینار اور درہم کی تھیلیاں باندھے بصرہ اور سیراف کی منڈیوں اور بغداد کے چھت دار بازاروں میں "بانانیہ"[1] سے سودا بازی کرتے نظر آتے تھے[2] عرب تاجران کی دعوتیں کر کے اپنی قومی روایت کو خوب نبھاتے تھے[3]۔

عرب مدنیت اور ادبیات ہندوستانی ناموں اور کرداروں میں تقلید اور تشبیہ کی راہیں ڈھونڈنے لگ گئی تھیں بانس جسے عربی میں خیرزان کہتے ہیں نزاکت حسن اور قامت محبوب کا معیار قرار پایا تھا اور بغداد کے عشرت کدوں میں نازک اندام حسیناؤں کو خیرزان سے تشبیہ دیتے تھے اور یہی نام مہذب سوسائٹی کی خواتین میں بھی مقبول تھا خلیفہ مہدی کی ملکہ یعنی ہارون رشید کی والدہ کا نام خیرزان تھا۔

سیراف اور بصرہ کے شارع سوق اور محلے ہندوستانی بنیوں اور تاجروں کے لیے اجنبی نہ رہے تھے ان کے ہم وطن اور ہم پیشہ کیش اور خلیج فارس کے شہروں میں برسوں سے چلے آ رہے تھے ملابار راج کے عہد میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا اپنے جہاز کے کر تھانہ اور مضافاتی بندرگاہوں میں آتا تھا تو بعض دفعہ ہزار سے زیادہ بنیا یہ مسافر ہوتے تھے۔

---

[1] "بانانیہ" سے مراد ہندوستان کی مشہور تاجر پیشہ قوم بنیا مراد ہے [2] تاریخ کوکن ۔۔۔
[3] ابو زید کا بیان

ابن خرداذبہ (سنہ ۲۵۰ھ) جیسے عرب سیاح اور مصنف جو ناریل اور ساگوان کے ملک کی زیارت سے محروم تھے اور اپنے ہم وطن تاجروں اور جہاز رانوں سے اس کی داستانیں بڑے شوق سے سنتے تھے ابن خرداذبہ کی جغرافیہ پر "کتاب المسالک الممالک" میں سب سے پہلے کوکن کی بندرگاہوں کا ذکر کیا گیا تھا۔[1]

بعض مورخین کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد عرب تاجروں کی آمد کا سلسلہ عہد خلافت صدیقی سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ عرب تاجر ابتدا میں مغربی علاقوں میں پہنچے اور ملیبار کو کارومنڈل اور اپنی اقامت گاہ بنایا اور یہیں پہلے اسلام کی ضیا باریاں ہونے لگیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق سب سے اول مبلغین اسلام اور داعیان دین کی جو جماعت ہندوستان میں آئی تھی وہ حضرت وہب ابن ابی کبشہ کی تھی وہ سنہ ۶ھ (۶۲۸ء) میں ہندوستان آئے اور یہاں سے چین چلے گئے چنانچہ آرنالڈ اپنی کتاب "دعوت اسلام" میں لکھتا ہے۔

"حضرت وہب کے بعد بہت سے تاجر چین میں بس گئے تھے۔ اسی تجارت نے ان کو ساحل ملیبار کارومنڈل، لنکا، سماترا، جاوا میں پہونچایا تھا کیونکہ ان میں عرب کی تجارت کثرت سے نظر آتی ہے اور چین کی پیداوار بھی انھیں عرب تاجروں کے ذریعہ دکن اور میسور میں نظر آتی تھی سماترا اور جاوا کی آبادی تقریباً تمام مسلمان ہے۔ انھیں تاجروں نے یہاں اسلام کی اشاعت کی تھی۔ ایک عربی مبلغ جن کا نام جہاں شاہ تھا یہاں پہونچے تھے بہتوں کو مسلمان بنا کر انھوں نے یہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اپنا نام سری پارک سلطان رکھ لیا آج بھی حضرت وہب کا مزار کیانٹن میں موجود ہے۔"

دوسری جماعت عہد فاروقی میں امیر عمان نے سنہ ۱۵ھ (۶۳۶ء) میں ہندوستان کی طرف بھیجا۔ عراق فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے سنہ ۱۴ھ میں بندرگاہ ابلہ کو مسلمانوں کی بندرگاہ بنا دیا تھا۔ یہ جماعت زیادہ تر علماء فقہاء اور تجار پر مشتمل تھی۔ ہندوستان سے واپسی پر ایک عرب سیاح سے حضرت عمرؓ فاروق اعظم نے ہندوستان کا حال دریافت کیا تو اس نے ہندوستان کی تعریف نہایت مختصر مگر نہایت بلیغ انداز اس طرح پیش کیا۔ "بحرها درٌّ وجبلها یاقوتٌ وشجرها عطرٌ"۔ اس کے بعد انھیں مورخین کے بیان کے مطابق حسب ذیل سالوں میں مختلف جماعتیں وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آئی تھیں سنہ ۲۳ھ میں حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں سندھ کے راجہ ساہسی نے اپنی فوجی طاقت کا ایک دستہ اسلامی مقبوضہ ممالک پر حملے کے لیے بھیجا۔ عبدالرحمن بن سمرہ نے اس کا مقابلہ کیا اور اس کو ناکامی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر حضرت علیؓ کے دور خلافت میں حضرت حارث کی سربراہی میں ایک جماعت سندھ پہونچ گئی تھی جماعت سنہ ۴۴ھ (?) میں مہلب ابن صفرہ کی رہبری میں ملتان پہونچی پانچویں جماعت سنہ ۶۴ھ (?)

---

[1] تاریخ کوکن ص ۱۴۳

میں حضرت عائشہ کی زیارت میں ملیبار کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف بخشا پھر ۸۶ھ میں عبدالملک ابن مروان کے زمانہ حکومت میں عرب تاجروں کا ایک قافلہ جزیرہ سیلون جا کر آباد ہو گیا تھا۔

اس پر قلندر برحق کے مصنف لکھتے ہیں "جنوبی ہند کے راجاؤں نے عربوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کے لیے انھیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں۔ عربوں کی تجارت پورے ساحلی علاقہ پر پھیل چکی تھی)۔ عربوں کا رسوخ سرکار دربار میں اور عوام میں بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے محض صداقت و اخلاص، رواداری اور ہمدردی بنی نوع انسانی کا اچھا مظاہرہ کیا تھا۔ اور ان کی ساری تجارت کا دار و مدار صرف انھیں اخلاقی پہلو پر تھا۔ اسی بنا پر اگر کبھی کوئی عرب جھوٹ کہہ دیتا تو کہا جاتا کہ تم مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو"

یہی وہ اخلاقی پہلو تھا جس نے یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے اخلاق اور رواداری سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ اس وقت ان کی تعلیم و تربیت کے لیے باقاعدہ خانقاہیں نہیں تھیں جو ان کی روحانی تربیت کر سکے اور نہ کوئی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ تھا[1] لیکن بعض مورخین مسلمانوں کا پہلا مرکز سراندیپ قرار دیتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ "یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہوئی تھیں اور اس کا سلسلہ درحقیقت تجارتی آمد و رفت سے وابستہ ہے اس علاقہ میں نہ صرف مسلمان باہر سے آ کر آباد ہوئے بلکہ خود ملک کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس اثر و نتیجہ کے پیدا ہونے کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں اور تاریخ کی کتابوں اور سفرناموں میں لکھی ہوئی ہیں۔ ان کا مشترکہ مضمون یہ ہے کہ یہ اثر دو طرفہ کششوں کا نتیجہ تھا ایک تو عرب تاجروں کی آمد و رفت اور دوسرے سراندیپ کے نقش قدم کی زیارت کو آنے والے صوفیوں اور درویشوں کی کرامت[2]"

سراندیپ عرب مسلمانوں کا پہلا مرکز تھا۔ اس کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے "چونکہ اسلام کے پہلے ہی سے عرب ان جزیروں میں تاجرانہ آتے جاتے تھے اس لیے سراندیپ کے راجہ کو اسلام اور مسلمانوں کا حال سب سے پہلے معلوم ہوا۔ یہ صحابہ کرام کے زمانہ میں ۳۰ھ (دوسری صدی عیسوی کے شروع میں) وہ مسلمان ہو گیا۔[3]" فرشتہ نے اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ لیکن عرب و ہند کے تعلقات کے مصنف کے بیان کے مطابق دیگر ذرائع سے بھی اس واقعہ کی تصدیق ہو جاتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ایک قدیم البند تصنیف "عجائب الہند" سے جو تقریباً ۳۰۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس روایت کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے بزرگ بن شہریار ناخدا جو ان جزیروں کا جہازراں تھا سراندیپ کے بیان میں لکھتا ہے۔ "ہندوستان کے

---

[1] قلندر برحق ص ۲۶ [2] عرب و ہند تعلقات ص ۲۵۹ [3] تاریخ فرشتہ جلد دوم

کے پجاریوں، سنیاسیوں، جوگیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک "بیکور" ہوتے ہیں جن کی اصل سراندیپ سے ہے۔ یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور ان کی طرف بہت میلان رکھتے ہیں۔ وہ گرمی کے موسم میں ننگے رہتے ہیں۔ صرف چار انگل لنگوٹی ایک ڈوری لگا کر باندھ لیتے ہیں اور جاڑوں میں کپاس کی چٹائی اوڑھ لیتے ہیں۔ اور ان میں بعض ایسا کپڑا پہنتے ہیں جس کو مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر سی لیتے ہیں۔ اور بعض مردہ جانوروں کی جلی ہوئی راکھ مل لیتے ہیں اور سر اور داڑھی اور مونچھ کے بال منڈاتے ہیں اور دوسرے بال بڑھاتے ہیں گلے میں انسان کی کھوپڑی لٹکاتے ہیں اور عبرت و خاکساری کے لیے اسی میں کھاتے ہیں یہ بیکور کون تھے جن کی تصویر بزرگ بن شہریار نے کھینچی ہے اور دوسرے سیاحوں کے بیانات سے بھی اس بات کو تسلیم کر لینے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ دراصل بدھ مذہب کے حلقہ بگوش تھے اس کے بعد ناخدا آگے لکھتا ہے :-

"سراندیپ اور اس کے آس پاس والوں کو پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال جب معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھدار آدمی کو تحقیق حال کے لیے عرب روانہ کیا وہ رکتے رکتے جب مدینہ پہونچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے تھے اور حضرت ابو بکرؓ کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا۔ وہ ان سے ملا اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کئے حضرت عمرؓ نے تفصیل بیان کئے۔ جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) کے قریب پہونچ کر مر گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہندی نوکر تھا۔ وہ صحیح سلامت سراندیپ پہونچ گیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا۔ دوران کے فقیرانہ اور درویشانہ طور طریق کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ اس قدر محبت اور میلان رکھتے ہیں وہ اسی سبب سے ہے[1]"

اس روایت کی تیسری تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں امویوں کی طرف سے حجاج عراق کا گورنر تھا۔ جزائر ہند کی طرف سے عراق میں کئی بندرگاہ سے جہازات آتے تھے تو سراندیپ (جس کو عرب یاقوت کا جزیرہ بھی کہتے تھے) کے راجہ نے اپنی دوستی اور محبت کے اظہار کے طور پر ایک جہاز میں دوسرے تحفوں کے ساتھ ان مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کو عراق روانہ کیا جن کے باپ وہاں تجارت کرتے تھے اور وہاں ان کو مسافرت میں لاوالی و وارث چھوڑ کر مر گئے تھے اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں سراندیپ میں مسلمانوں کی نوآبادی قائم ہو چکی تھی۔ ابو زید سیرافی نے ۳۰۳ھ تیسری صدی ہجری کے آخر میں یہاں عرب سرداروں کے نام اور ان کی آمد

---

[1] عجائب الہند [illegible]

رفت کا تذکرہ کیا ہے۔ لہ

الغرض مختلف روایتوں سے اتنا مشترک نتیجہ نکلتا ہے کہ ان اطراف میں اسلام اور عربوں کی پہلی نو آبادی سراندیپ میں قائم ہو گئی تھی اور اس کی تاریخ کا آغاز پہلی صدی ہجری اور ساتویں صدی عیسوی تک پہونچ جاتا ہے۔ ٢ہ

"سراندیپ" سری لنکا عربوں اور ہندوؤں کا متبرک مقام

سری لنکا کے ایک پہاڑ کی چٹان پر ایک نشان قدم ہے اور وہ عربوں، ہندوؤں اور بدھوں کے نزدیک عقیدتوں کا ایک متبرک مقام ہے یہ نشان قدم کیا ہے؟ کب سے ہے؟ اور دراصل کس کا نشان قدم ہے؟ اسے تاریخ کے تاریک پردوں سے ڈھونڈ نکالنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس پہاڑ کی انتہائی چٹان پر چڑھنا تھا۔ لیکن یہ نشان قدم ہندوؤں، مسلمانوں، بدھوں کی عقیدت اور زیارت کا ایک متحدہ نشان بن گیا ہے۔ مذہبی دنیا میں مختلف مذاہب کے عقیدتوں کا اس قسم کے اتحاد کا نمونہ دوسرا کوئی نظر نہیں آتا۔

بدھوں کے نزدیک وہ شاکیہ موتی کا نشان قدم ہے۔ ہندو اس لیے اس کی حرمت کرتے ہیں کہ وہ اس کو شیوجی کے پاؤں کا نشان سمجھتے ہیں اور اس کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ مسلمان اس کو حضرت آدم علیہ السلام کا نقش قدم سمجھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں دور دور سے لوگ اس مقام کی جاترا یا زیارت کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں عربوں اور عراقی درویشوں میں اس کی زیارت کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ وہ اس کے لیے بحری راستے کی کٹھن اور پر صعوبت مشقتیں برداشت کر کے پہونچ جاتے تھے۔ اکثر عرب سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اور یہی کشش بالآخر عربوں کی آمد و رفت کا ذریعہ ہو گئی۔ اس طرح عربوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پہونچ گئے۔ رفتہ رفتہ اسلام کے قدم وہاں جمتے گئے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راون کے ملک، سری لنکا کے متعلق ابن بطوطہ کے سفر کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

"ان جزیروں سے معبر کا فاصلہ فقط تین دن کا ہے لیکن ہم سفر کرتے اور نویں دن سیلان (سیلون) کے جزیرے میں جا نکلے۔ سراندیپ کے پہاڑ جس کی چوٹی آسمان میں لگتی دکھائی دیتی تھی نظر آیا۔ وہ دور

لہ فتوح البلدان سنہ ۲۷۹ھ ص ۴۳۲ ٢ہ عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۶۴

سے ایسا نظر آتا تھا گویا دھوئیں کا ستون ہے۔ جب ہم پہونچے تو جہاز والوں نے کہا کہ یہ بندرگاہ اس راجہ کا نہیں جہاں تاجر بے خوف و خطر جا سکتے ہیں۔ بلکہ یہ شہر ڈاکوؤں کے سردار کا ہے اس کے جہاز سمندر میں غارت گری کرتے پھرتے ہیں۔ ہم نے وہاں لنگر ڈالنے سے خوف کیا۔ لیکن ہوا تیز ہو گئی تھی اور ہمیں غرق ہونے کا خوف تھا میں نے ناخدا سے کہا کہ مجھے ساحل پر اتار دے میں اس راجہ سے تیرے لیے امان لے کر آتا ہوں۔ اس نے مجھے کنارے اتار دیا۔ میرے پاس کچھ لوگ آئے اور کہا کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ بادشاہ معبر کا ہم زلف ہوں اور راجہ سے تیرے لیے امان لے کر آتا ہوں۔ اس نے مجھے کنارے اتار دیا۔ میرے پاس کچھ لوگ اور اس جہاز میں راجہ کے لیے تحفے بھرے ہوئے ہیں انھوں نے جا کر راجہ کو خبر دی۔ راجہ نے مجھے بلا بھیجا اور میں بطالہ شہر میں اس سے ملنے کے لیے گیا۔ یہ اس راجہ کا پایہ تخت ہے اور ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اس کے بعد وہ راجہ سے ملاقات اور اس کی نوازشوں کا اور عنایتوں کا ذکر کرتا ہے اور آگے لکھتا ہے "میں نے راجہ سے کہا کہ میری غرض یہاں آنے سے یہ ہے کہ میں قدم شریف کی زیارت کروں۔ سیلان میں آدم کو بابا اور حوا کو ماما کہتے ہیں۔ راجہ نے کہا میں تیرے ساتھ آدمی کر دوں گا وہ تجھے پہنچا دیں گے۔ آگے لکھتا ہے۔ "راجہ نے مجھے ایک ڈولہ اور غلام دیے جو مجھے ڈولے پر اٹھا لے جاتے تھے۔ اور چار جوگی میرے ساتھ کیے جو ہر سال قدم شریف کی زیارت کو جاتے تھے۔ اور تین برہمن اور دس راجہ کے اہلکار اور پندرہ آدمی میرا زاد راہ اٹھانے کے لیے میرے ساتھ کیے۔ پانی اس راستہ میں بکثرت ہوتا ہے پہلے دن ہم نے دریا کو عبور کیا وہاں سے ہم منار منڈل پہونچے یہ اچھا خاصا شہر ہے اور اس راجہ کی عملداری کی حد پر واقع ہے۔ وہاں کے راجہ اور اہلکاروں نے ہماری دعوت کی۔ اس شہر میں سوائے ایک خراسانی کے اور کوئی مسلمان نہیں تھا جو بسبب مریض ہونے کے راستہ میں ٹھہر گیا تھا وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیا۔ پھر بندر سلاوات پہونچے یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ اس کے بعد جنگل میں آئے جس میں پانی بکثرت تھا اور ہاتھی بھی۔ لیکن یہ ہاتھی پردیسیوں اور زائرین کو تکلیف نہیں پہونچاتے تھے۔ اور یہ سب شیخ عبد اللہ ابن خفیف کی برکت ہے شیخ موصوف نے اول اول یہ راستہ دریافت کیا تھا اور وہاں کے کافر مسلمانوں کو اس راستہ سے جانے سے روکتے تھے اور ان کو تکلیف دیتے تھے۔ نہ ان کے ساتھ کھاتے تھے اور نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچتے تھے۔ انھیں کی وجہ سے کافر مسلمانوں کی تعظیم کرتے اور اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں اور ان کے ساتھ کھانا کھا لیتے ہیں۔ اور اپنے اہل و عیال اور بال بچوں میں ان کو اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کچھ فکر نہیں کرتے اور وہ شیخ عبد اللہ ابن خفیف کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں"

اس کے بعد کنکار، شنگ یاقوت کی چٹانیں، اور اس کے عجیب و غریب مشاہدات، دریائے یاقوت اور کنکار شہر کے باہر شیخ عثمان شیرازی کی مسجد اور ان کی درگاہ کا ذکر کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہاں کے لوگ

اس کی زیارت کو آتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ راجہ کنار کی شان و شوکت اور اس کے یاقوت کے ذخیرے اور مال و دولت کو بیان کرتا ہوا آخر میں لکھتا ہے۔ "کنکار سے چل کر ہم ایک غار میں پہنچے اس کو استاد محمود لوری کا غار کہتے ہیں۔ یہ شخص ولی تھا۔ اور اس نے یہ غار پہاڑ کے اوپر ایک چھوٹے سے چشمہ کے کنارے بنایا تھا۔ دریائے خیزران (بیدر) پہنچے پھر ایک جگہ پہونچے اس کو "بڑھیا کا گھر" کہتے ہیں اس کے آگے آبادی نہیں ہے اس کے آگے بابا طاہر کا غار ہے جو ایک ولی تھے اس کے بعد اپنے سیاحت کے اصل مقصد کی طرف یعنی کوہ سراندیپ، اڑنے والی جونک غار اور قدم شریف کی زیارت کی طرف آتا ہے۔ لکھتا ہے کہ اس کے آگے سبک کا ایک غار آتا ہے۔ سبک ایک راجہ تھا جو دنیا ترک کر کے اس غار میں آرہا تھا۔ جہاں ہم نے اڑنے والی جونک دیکھی۔ وہ پانی کے قریب جو درخت اور گھاس ہوتی ہیں میں رہتی ہے۔ جب کوئی انسان قریب جاتا ہے تو کود کر چمٹ جاتی ہے اور جہاں چمٹتی ہے وہاں سے بہت سا خون چوس لیتی ہے۔ لوگ لیموں تیار رکھتے ہیں۔ وہ نچوڑ دیتے ہی گر پڑتی ہے پھر ہم ہفت غار کی طرف گئے۔ پھر عقبہ سکندریہ کی طرف، پھر غار اصفہانی کی طرف، پھر چشمہ کی طرف وہاں ایک غیر آباد قلعہ ہے اس کے نیچے ایک دریا بہتا ہے۔ جس کو غوطہ گاہ عرفان کہتے ہیں۔ وہاں ایک غار ہے اس کو غار نارنج کہتے ہیں وہاں ایک دوسرا غار ہے اس کو راجہ کا غار کہتے ہیں۔ اس کے پاس پہاڑ کا دروازہ ہے جس کو جبل سراندیپ کہتے ہیں۔ یہ پہاڑ دنیا کے بلند پہاڑوں میں سے ہے[1]۔ ہم نے اس کو سمندر میں سے دیکھا تھا حالانکہ وہ ساحل سے نو منزل کے فاصلہ پر ہے۔ جب ہم اس کے اوپر چڑھے تو بادل نیچے نظر آتے تھے۔ اس پہاڑ میں ایسے بہت سے درخت ہوتے ہیں جن کے پتے کبھی نہیں جھڑتے اور رنگ برنگ کے نکلتے ہیں۔ سرخ گلاب کا پھول ہتھیلی کے برابر ہوتا ہے لوگوں کا گمان ہے کہ اس پھول میں اللہ محمد کا نام قلم قدرت سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اس پہاڑ سے قدم تک جانے کے دو راستے ہیں ایک کو باوا کا راستہ کہتے ہیں اور دوسرے کو ماما کا۔ یعنی آدم و حوا کے راستے۔ ماما کا آسان راستہ ہے لیکن باوا کا راستہ دشوار گزار ہے اور اس پر چڑھنا بہت مشکل ہے۔ پہاڑ میں سیڑھیاں کھود رکھی ہیں جن پر چڑھتے ہیں اور ان میں لوہے کی میخیں گاڑ کر ان سے لوہے کی زنجیریں لٹکائی ہیں تا کہ چڑھنے والا چڑھتا جائے پکڑتا جائے۔ یہ دس زنجیریں ہیں۔ دسویں زنجیر سے لے کر غار خضر تک سات میل کا فاصلہ ہے۔ وہ ایک وسیع میدان میں واقع ہے اس کے پاس پانی کا ایک چشمہ ہے وہ بھی خضر کی طرف منسوب ہے۔ غار خضر میں زائر جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے چھوڑ جاتے ہیں اور دو میل اوپر جہاں قدم ہے چڑھتے ہیں یہ قدم باوا آدم کے قدم کا نشان ہے جو ایک سخت سیاہ پتھر میں ہے جو سطح سے اونچا ہے اور میدان میں پڑا ہوا ہے۔ قدم مبارک پتھر میں گھسا ہوا تھا اور اس کا نشان

---

[1] اس پہاڑ کی بلندی ۷۴۲۰ فٹ ہے۔

ہو گیا تھا۔ اس کی لمبائی بارہ بالشت ہے۔ پہلے یہاں اہلِ چین آتے تھے۔ وہ انگوٹھے کی جگہ پتھر میں سے توڑ کر لے گئے تھے۔ اور شہر زیتون میں ایک مندر میں اس کو رکھا ہے۔ سندہ زائر اس میں سونا اور یاقوت اور موتی بھر جاتے ہیں۔ اس لیے فقیر جب غارِ خضر میں پہونچتے ہیں جو جلدی کر کے سب سے پہلے پہونچتے ہیں تاکہ جو کچھ ہو لے لیں۔ ہم جب آئے بہت تھوڑا سا سونا اور جواہرات اس میں تھے وہ ہم نے اپنے بدرقہ کو دے دیا۔ دستور یہ ہے کہ زائر لوگ غارِ خضر میں تین دن تک ٹھہرتے ہیں اور تین[۱] دن صبح وشام برابر قدم کی زیارت کر آتے ہیں۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ تین دن بعد ہم بابا حوا کے راستے سے واپس ہوئے۔ راستے میں گاؤں اور منزلیں پہاڑ میں ہیں[۲]

غرض سراندیپ اور لنکا سے مسلمانوں، عربوں کا تعلق بہت قدیم اور تاریخی ہے۔ اور مورخین کے بیان کے مطابق پہلی صدی ہجری سے وہاں عرب مسلمانوں کی نو آبادی قائم ہو گئی تھی۔

مالدیپ

ان اطراف میں مسلمانوں اور عربوں کا دوسرا مرکز مالدیپ کا جزیرہ تھا جس کو عرب جزیرۃ المہل اور کبھی ان چھوٹے سب جزیروں کو دیبات کہتے ہیں۔ دیپ سنسکرت میں جزیرہ کو کہتے ہیں۔ ان جزیروں کا سب سے مفصل حال ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے۔ اس کے زمانے میں یعنی سلطان محمد تغلق کے زمانے میں سنہ ۷۴۳ھ میں یہ جزیرہ پورا کا پورا مسلمان تھا اور ان میں عربوں اور دیسی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں اور سلطانہ خدیجہ نام ایک بنگالی خاتون ان پر حکمراں تھی۔ ابن بطوطہ کے زمانہ میں یہاں یمن وغیرہ کے بہت سے علما اور جہاز راں موجود تھے۔ اہلِ دیپ کے اسلام لانے کی تفصیل میں ابن بطوطہ لکھتا ہے۔ ان جزیروں کے بعض ثقہ آدمیوں نے جیسے فقیہ عیسیٰ اور فقیہ معلم علی اور قاضی عبداللہ وغیرہ نے مجھ سے یہ روایت کی۔ اس جزیرہ کے باشندے پہلے بت پرست تھے اور ہر مہینہ سمندر کی طرف سے ایک جن (دیو) آتا تھا۔ ان کا دستور تھا کہ جب اسے دیکھتے تھے تو ایک ناکتخدا عورت کو بناؤ سنگھار کے ساتھ بتخانہ میں جو سمندر کے کنارے پر تھا چھوڑ دیتے تھے صبح کو آتے تھے اور اس کو مردہ اور بکارت زائل شدہ پاتے تھے۔ ہر مہینہ میں قرعہ جس کے نام پر پڑتا تھا اسے اپنی بیٹی پہونچانی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ان کے جزیرہ میں شیخ ابو البرکات بربری مغربی بطور مسافر کے وارد ہوئے۔ یہ شخص

---

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ صفحہ ۳۴۲ ؛ [۲] عرب و ہند صفحہ ۲۶۱

حافظ قرآن تھا۔ وہ جزیرہ محل میں ایک بڑھیا کے گھر ٹھیرا۔ ایک روز جب گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ بڑھیا اور اس کے رشتہ دار رو رہے ہیں۔ اس نے حال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس بڑھیا کی بیٹی کے نام قرعہ پڑا ہے۔ اور اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ابوالبرکات نے کہا کہ تیری بیٹی کے بجائے میں جاؤں گا۔ یہ شخص کوسہ تھا، داڑھی مونچھ نہ رکھتا تھا اسے اٹھا کر بت خانے چھوڑ آئے اس نے وضو کر کے کلام اللہ پڑھنا شروع کیا۔ جن ظاہر ہوا لیکن جب اس نے کلام اللہ کی تلاوت سنی تو واپس چلا گیا۔ صبح ہوئی تو مغربی کھڑا ہوا تلاوت کر رہا تھا جب بڑھیا اور اس کے رشتہ دار لاش لینے آئے تو اسے زندہ پایا اسے بادشاہ کے پاس لے گئے جس کا نام شنورازہ تھا اور کل حال سنایا۔ وہ بہت متعجب ہوا۔ مغربی نے اس کو مسلمان ہونے کی ترغیب دی۔ بادشاہ نے کہا اگلے مہینہ تک صبر کر۔ اگلے مہینہ بھی تو سالم رہا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ مغربی وہاں ٹھہر گیا اور ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ کے دل میں اسلام کی محبت پیدا ہو گئی اور وہ مع اپنے امیروں اور کنبہ کے مسلمان ہو گیا بت خانے توڑ دیے گئے۔ اور کل جزیرے کے باشندے مسلمان ہو گئے۔ مغربی کے سبب سے یہ لوگ بھی امام مالک کے مذہب کے پیرو ہو گئے۔ یہ لوگ مغرب کے لوگوں کی نہایت تعظیم کرتے ہیں۔ شنورازہ نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جو ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے اور اس مسجد کے محراب پر کھدا ہے کہ "سلطان احمد شنورازہ ابوالبرکات مغربی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔" اس بادشاہ نے ان جزیروں کے محاصل کا تہائی مسافروں کے لیے مقرر کر دیا کیونکہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب ایک مسافر ہوا تھا۔ اب تک وہی عملدرآمد چلا آتا ہے[1]

ملیبار (کیرالا)

اس کا رقبہ اڑتیس ہزار آٹھ سو پچھتر (۳۸۵۷۵) آبادی دو کروڑ تیرہ لاکھ سینتالیس ہزار تین سو پچھتر (۲۱۳۴۷۳۷۵) تعلیمی شرح ساٹھ فی صد۔ ناگالینڈ کے بعد یہ ہندوستان کی سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ موسم معتدل، بے انتہا بارش، ندیوں اور نالوں کی بہتات، ۴۴ سے زیادہ ندیاں یہاں بہتی ہیں مگر ان میں زیادہ تر کا وجود بارش کے پانی پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ ربڑ یہاں پیدا ہوتا ہے۔ چار لاکھ لوگ کوئر انڈسٹری میں کام کرتے ہیں اس کی لمبائی چار سو میل اور اسکی چوڑائی اسّی میل ہے۔ اس کے خاص مقامات کالیکٹ، کنانور، تلیچری، ٹراونکور

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ

کوچین وغیرہ ہیں۔ راس کماری کے قریب ہندوستان کا وہ آخری کنارا ہے۔ اس کا نام پرانے راجاؤں کے زمانے میں کیرالا تھا۔ بعد میں غالباً انگریزوں کے زمانے سے وہ ملیبار کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ملے ملیالم زبان میں پہاڑ کو اور بار کے معنی ملک کے ہیں۔ یعنی پہاڑی ملک اور اب انگریزی راج کے خاتمہ کے بعد اس کا پرانا نام کیرالا ہی رکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہودی اور عیسائی یہاں آکر مختلف شہروں میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ یہ تو ہم کسی جگہ لکھ آئے ہیں کہ قدیم زمانے سے عراق اور مصر اور عرب کا تجارتی سلسلہ جنوبی ہند کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ اس طرح جب کچھ یہودی تاجر یہاں آکر بس گئے تھے تو ان تاجروں کے ذریعہ یکے بعد دیگرے یہودی جماعتیں ملیبار میں آنے لگیں اور انھوں نے کوچین، کرانگنور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہودیوں کے ترک وطن کا سبب مورخین بتاتے ہیں کہ جب شام میں عیسائی غالب ہوگئے تو عیسائیوں اور یہودیوں کی باہمی آویزش اور کشمکش شدید تر ہوگئی۔ اس کی تفصیل میں ریو نڈر سیل لکھتا ہے "دونوں مذہبوں کے مرد ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔ ان لڑائیوں میں مسیحی غالب رہے اور انھوں نے یہودیوں پر طرح طرح کے ظلم کیے۔ جن سے بچنے کے لیے بہت سے یہودی عراق وشام وعرب سے نکل کر ملیبار اور کرانگنور کے ساحل پر سکونت پذیر ہوگئے۔ لہ

ابوالفدا اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ "ملیبار کے شمالیات اور سنگل شہروں میں خالص یمن کے یہودی کی نوآبادی تھی۔ یہودیوں کے بعد عیسائیوں کی آمد کا سلسلہ انھیں تاجروں کے ذریعہ سے ہوا جو عرب ومصر وشام وعراق سے آئے تھے اور انھوں نے یہودیوں کے دوش بدوش اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ اس طرح ابتدا میں جو عیسائی ملیبار میں آکر آباد ہوگئے انھیں سریانی عیسائی کہا جاتا ہے۔ مذہبی اعتبار سے یہودیوں کی بہ نسبت عیسائیوں کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی اس کے اسباب میں ایک تو یہ تھا کہ مسیحیوں نے شام وغیرہ میں اپنی حکومتیں قائم کر کے تمام تجارت اپنے قبضہ میں لے رکھی تھی۔ دوسرا یہ تھا کہ ان کے یہاں تبلیغ کا منظم انتظام تھا۔ اور اس کے مبلغین باقاعدہ اسی خدمت کے لیے مامور اور اس کے لیے برابر مصروف رہتے تھے۔ مسیحی تاریخ نے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ سینٹ تھامس نے محض اسی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا اور بندرگاہ مزرس (کرنگانور) پر جہاز سے اترا اور یہاں اپنے مذہب کے پھیلانے کا کام کرتا رہا۔ سینٹ تھامس نے اپنے دوران قیام کلیسا کی آٹھ عمارتیں مندرجہ ذیل مقامات پر تعمیر کی۔

کرنگانور، کوئلم، پارور، ملیاپورم، کوتمنگلم، تیرانر اور چل کل، اساسے دُراعت پاکردہ

لہ ریو نڈر سیل بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ

زاعت پاکر وہ مشرقی ساحل کی طرف چلا گیا اور ایک پہاڑ پر سکونت اختیار کرلی۔ یہی وہ پہاڑ ہے جس کو Cent Thamas Maunts (سینٹ تھامس ماونٹ) کہتے ہیں اور یہ مدراس سے پانچ میل پر واقع ہے جس کو مقامی طور پر مے ورم بھی کہتے ہیں۔ شروع عیسائی اور یہودی ابتدا میں پر امن رہے اور یہ کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا ہے کہ انھوں نے مقامی جھگڑوں اور ملکی لڑائی میں کسی قسم کا حصہ لیا ہو۔ لیکن عیسائیوں کا اصل رنگ یورپ اور ان کا سلسلہ تذکرہ مغربی قوموں کی تجارت کی غرض سے ہند میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

بعض مورخین دانستہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی سنہ ۱۲۱۰ء میں جنوبی ہند میں مسلمانوں کے حملے کے بعد سے شروع ہوئی ہے جو سراسر غلط اور خلاف واقعہ ہے۔

عیسوی مذہب کے چھ سو سال بعد اسلام آیا اور عرب جو پہلے بت پرست تھے اس کو قبول کرکے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے اور جو تجارت بحالت شرک اور زمانۂ جاہلیت میں کرتے تھے اس کو اسلام لانے کے بعد بھی جاری رکھا۔ اور اسی تجارت کے لیے وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہند میں بھی برابر آتے رہے چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :-

"دنیا میں یہودیت اور عیسائیت کے بعد اسلام آیا۔ اسلام لانے سے پہلے عرب تقریباً سب کے سب بت پرست تھے۔ اس زمانہ میں عرب کی تجارت بہت وسیع پیمانے پر تھی ان کے جہاز بندرگاہ بصرہ اور ساحل حضرموت اور یمن سے چین تک آیا جایا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد عرب تاجر تجارت کے لیے جن جن علاقوں پر پہنچے وہاں اسلام کی آواز کو بھی پہنچایا۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اسلام انھیں لوگوں کی مقدس کوششوں سے پھیلا ہے ۷۵ھ میں خلیفہ عبد الملک بن مروان کے زمانے میں بہت سے عرب تاجر جزیرہ سیلون میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اسی زمانہ میں مسلمان تاجروں نے اپنی ایک نو آبادی ملیبار میں بھی قائم کرلی حال میں جو قدیم کتبے ملے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے راجاؤں نے ان عربوں سے تجارتی تعلقات قائم رکھنے کے لیے انھیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں اور یہ تجارت ان بندرگاہوں میں ہوتی تھیں جو معبر (کورومنڈل) اور ملیبار کے ساحل پر تھے۔ مشرقی ساحل پر منیلی (موجودہ مچھلی بندر کے قریب) اور جنوب میں بندرگاہ کایل اس تجارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ مغربی ساحل کھمبائت، کالی کٹ اور کولم وغیرہ میں تجارت کی بہت بڑی بڑی منڈیاں تھیں[1]۔

ظہور اسلام سے قبل تجارت کی غرض سے یہود و نصاریٰ جنوبی ہند میں آباد ہو گئے تھے۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۵۵

ان کے آنے کا حال شیخ زین الدین معبری اس طرح لکھتے ہیں۔ وذلك ان جماعة من اليهود والنصارى دخلوا بلدة من بلاد مليبار يقال لها كودنكلور وهي مسكن ملكها في مركب كبير بعيالهم واهلهم وطلبوا منهم الاراضي والبساتين والبيوت و توطنوا فيها ——
—— یعنی یہود و نصاریٰ کی ایک جماعت اپنے اہل و عیال کے ساتھ ایک بہت بڑی کشتی کے ذریعہ ملیبار کے ایک شہر کونکلور پہونچ گئی اور راجہ سے انھوں نے اپنے لیے مکانات باغات اور زمینوں کے لیے درخواست کی اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔

تحفۃ المجاہدین کی روایت کے مطابق جس کو فرشتہ نے نقل کیا ہے اس کو عرب و ہند کے تعلقات کے مصنف اس طرح لکھتے ہیں " اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد یہود کا اور عیسائی سوداگر یہاں آیا کرتے تھے اور یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے جب اسلام پر دو سو برس گزرے تو عرب و عجم کی عجمی مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم کے قدم نقش کی زیارت کے لیے سراندیپ جس کو لنکا کہتے ہیں جارہی تھی۔ اتفاق یہ کہ ان کا جہاز ہوا کے جھونکوں سے بہک کر ملیبار کے شہر کونکلور (کوڈنگانور) کے کنارے آکر لگا۔ شہر کے راجہ زیمورن (سامری) نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی باتوں باتوں میں اسلام کا ذکر آگیا۔ راجہ نے کہا میں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زبانی تمھارے پیغمبر کا حال سنا ہے۔ اب تم خود سناؤ درویشوں نے اسلام کی حقیقت کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا۔ اس نے راجہ کا دل موہ لیا راجہ نے ان سے وعدہ لیا کہ تم واپسی میں کل وہ ادھر ہی سے گزرتے جائیں چنانچہ وہ وعدے کے مطابق آئے۔ راجہ نے سب امراء کو بلاکر کہا کہ میں اب خدا کی یاد کرنا چاہتا ہوں اور یہ کہہ کر ملک برابر برابر سب افسروں میں تقسیم کردیا۔ اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہوگیا دوران عرب درویشوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام پھیلانے کی صورت یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار سے تجارت سوداگری کا کاروبار شروع کرو اور اپنے امراء کے نام ایک وصیت نامہ لکھ کر سپرد کردیا کہ ان پردیسی مسافروں کے ساتھ ہر قسم کی مہربانی اور لطف کا برتاؤ کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کی جائے اور ان کو اپنی عبادت گاہیں بنانے کی اجازت دی جائے اور اسی طرح ان سے سلوک کیا جائے کہ ان کو وہاں رہنے کی اور اس کو وطن بنانے کی خواہش پیدا ہو اس وقت سے عرب سوداگر اس ملک میں آنے جانے لگے اور رہنے سہنے لگے[۱]

ایک دوسری روایت جس کو فرشتہ نے پہلے سے زیادہ صحیح تسلیم کیا ہے لکھا ہے " زیمورن کے اسلام لانے کا واقعہ خود پیغمبر اسلام کے زمانے میں پیش آیا۔ بہرحال یہ درویش پھر ملیبار میں واپس آئے اور

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۶۵

اور کونکور میں مسجد بنائی۔ اور کچھ لوگ وہاں مقیم ہوئے اور کچھ لوگ جو دھڑا نکور کے شہر کولم جاکر رہے اور وہاں بھی مسجد بنائی پھر ہیلی، مارادی، جرمین، درئین، تندرینا (پنڈرانی) جایات، اخاکور اور منگلور میں مسجدیں بنائیں اور نو آبادیاں قائم کیں۔ له

لیکن عرب و ہند تعلقات کے فاضل مصنف کے نزدیک یہ پہلے سے زیادہ غلط ہے اور ہمارے نزدیک بھی فرشتہ کی یہ دوسری روایت تاریخی اعتبار سے محل بحث نظر آتی ہے کیونکہ در ویشوں کا ملیبار آنے کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زمانۂ سعادت کے سالوں بعد پیش آیا تھا اور فرشتہ تحفۃ المجاہدین کا جو حوالہ دیا ہے اس میں تو وہ صاف لکھتے ہیں۔

"اما تاریخہ فلم یتحقق عندنا وغالب الظن انہ انما کان بعد المائتین من الهجرة النبوية على صاحبها افضل الصلوٰة والتحية۔ له یعنی اس کی تاریخ کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری صلعم کے بعد کی کوئی تاریخ ہی ہو۔ اسکے بعد انھوں نے ملیبار میں مسلمانوں میں عام طور سے جو بات مشہور تھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "ملیبار کے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ راجہ مذکور کے اسلام لانے کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شق القمر کے مشاہدہ سے ہوا تھا۔ اس روایت کی بنا پر وہ حضور صلعم کی طرف سفر کیا اور آپ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے بعد مذکورہ جماعت کے ساتھ ملیبار واپس ہو رہا تھا کہ شحر نامی مقام پر اس کی موت واقع ہو گئی۔

"وانما ما اشتهر عند مسلمی ملیبار ان اسلام الملک المذکور فی زمن النبی صلی اللہ علیہ وسلم برؤیة انشقاق القمر لیلة وانه سافر الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلقائہ ورجع الی شحر قاصد ملیبار مع الجماعة المذکورة وتوفی فیها۔ ٢ه

اور آخر میں "لایکاد یصح شیئ منها" کہہ کر ساری بحث ہی ختم کر دی۔ مسلمان درویشوں کے ملیبار آنے کے ذکر کے سلسلہ میں شیخ معبری لکھتے ہیں "وبعد ذلک بسنتین وصل الیها جماعة من فقراء المسلمین معهم شیخ قاصدین زیارة قدم ابینا آدم علیه السلام بسلان۔ فلما سمع الملک بوصولهم طلبهم واضافهم وسألهم عن الاخبار فاجزه شیخهم بامر نبینا صلی اللہ علیہ وسلم وبدین الاسلام ومعجزة انشقاق القمر فادخل اللہ سبحانه فی قلبه صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم فامن به ودخل فی قلبه حب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی اس کے چند سال بعد (یہود و نصاریٰ کے ملیبار آنے کے) بعد مسلمان درویشوں

له تاریخ فرشتہ ۔ ٢ه تحفۃ المجاہدین ۔ ٣ه تحفۃ المجاہدین صـ ١٦

کی ایک جماعت مع اپنے شیخ کے سیلانی (سری لنکا) حضرت آدم علیہ السلام کے قدم کی زیارت کے لیے جاتے ہوئے ملیبا پہونچی۔ جب ان کے آنے کی اطلاع راجہ تک پہونچی تو اس نے انھیں اپنے دربار میں بلایا اور ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ان سے حالات دریافت کیا۔ شیخ قافلہ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دین اسلام اور معجزہ شق القمر کے بارے میں تمام حالات بیان کیے۔ اس کو سن کر اس کے دل میں گہرا اثر ہوا۔ وہ آپ پر ایمان لایا اور اس کے دل میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا ہوگئی۔

راجا رامودن سامری کا سفر مکہ

مسلم درویشوں نے راجہ کے سامنے اسلام کی حقانیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور راستبازی کو نہایت دلنشیں انداز میں بیان کیا۔ جس کا اس کے دل میں گہرا اثر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے چند معجزات کا خاص طور پر شق القمر کا ذکر کیا۔ اس کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے کہ "راجہ رامودن نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے بچشم خود دیکھا تھا۔ اور اس کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ عرب میں ایک رسول پیدا ہوگئے ہیں اور معجزہ شق القمران ہی کی طرف سے ظہور میں آیا ہے[1]

آگے شیخ معبری لکھتے ہیں کہ راجہ نے شیخ قافلہ سے کہا قدم حضرت آدم علیہ السلام کی زیارت سے واپسی پر وہ بھی ان کے ہمراہ چلے گا۔ اور کہا میرے سفر کی بات راز میں رہے اور کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ حسب وعدہ وہ درویش قدم کی زیارت کی بات سیلون سے واپس آئے ادھر راجہ بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ روانگی سے پہلے وہ اپنے اہل بیت اور وزیروں کو بلا کر کہا وہ اب امور سلطنت سے کچھ دن کے لیے الگ تھلگ رہنا اور خدا کی بندگی میں گزارنا چاہتا ہے اس نے اپنی غیر موجودگی میں انتظام مملکت کی بجا آوری کے لیے ایک دستور العمل لکھ دیا جس میں ہر ایک کے لیے انتظامی اختیارات کی تقسیم اور ان کے حدود کی تعین کی گئی تھی اس طرح وہ رات کے وقت خفیہ طور پر خاموشی کے ساتھ ان درویشوں کے ہمراہ کشتی کے ذریعہ روانہ ہوا۔ یہ کشتی اول فندریہ (غالباً ترنا گیری) پہونچی اور وہاں سے مختلف بندرگاہوں سے گزرتے ہوئے شحر نامی مقام پر پہونچکر سب اتر پڑے۔ وہاں انھوں نے ایک مسجد بنائی اور اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ اس اثنا میں اتفاق سے راجا رامودن علیل ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی علالت نازک صورت اختیار کر گئی یہاں تک کہ راجہ کو اپنا موت قریب تر نظر آئی تو

---

[1] تاریخ فرشتہ

خریطۂ سواحلِ ہندوستان

اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اگر میری موت واقع ہوگئی تو آپ کو چاہیے کہ اپنا ملیبار کا سفر منقطع نہ کریں بلکہ میری خواہش ہے کہ ملیبار اور کوکن میں اسلام کی خوب اشاعت ہو۔ اور یہ کام آپ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں، رفقائے سفر نے کہا ہم کو وہاں جانے میں کوئی عذر نہیں ہے جب کہ اس کا مقصد اشاعت اسلام اور خدمت دین ہو لیکن ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ ہم نہ آپ کے وطن سے واقف ہیں اور نہ آپ کے مقام ولایت اور نہ اس کے حدود سے باخبر ہم تو آپ کے ساتھ سفر کرنا چاہتے تھے۔ راجہ کچھ دیر سوچ کر اپنی حکومت کے برسر اقتدار امراء کے نام ملیبالی زبان میں خطوط لکھ کر ان کے سپرد کر دیے اور ہدایت کی کہ وہ کونگلور، زرمقتن، قندریہ اور کولم کی بندرگاہوں میں سے کسی بندر پر اتر جائیں میرا خط وہاں کے حاکم کے پاس پہونچا دیں ساتھ ہی انھیں تاکید کی کہ وہ اس کے بیمار ہونے اور اس کے رحلت کر جانے کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ آخر میں لکھتے ہیں "ثُمَّ إِنَّهُ تُوُفِّيَ رَحْمَةِ اللهِ عليه رَحْمَةً وَّاسِعَةً" اس کے بعد مشرقی راجہ کی وصیت کے مطابق اس کے رفقائے راہ میں شرف بن مالک، مالک بن دینار مالک بن حبیب اور ان کی زوجہ محترمہ بنی اولاد اور بیر والد کے ساتھ ایک کشتی کے ذریعہ کونگلور پہونچے اور وہیں اتر کر ٹھہر گئے۔ اور متوفی راجہ کا خط وہاں کے راجہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ راجہ نے اس کو پڑھا اور خط کی ہدایت کے مطابق انھیں باغیچے اور زمینیں دی گئیں۔ وہاں انھوں نے مسجد بنوائی اور مالک بن دینار نے وہیں کی اقامت اختیار کی اور مالک بن حبیب اپنی زوجہ اولاد اور مال کے ساتھ کولم چلے گئے اور وہاں انھوں نے سب سے پہلے مسجد تعمیر کی پھر اس کے بعد ہیلی مارامیں، فاکنور، کاسرکوٹ، منگلور گئے اور ان سب مقامات میں مسجدیں تعمیر کیں۔ کہیں تین مہینے، کہیں پانچ اور کہیں اس سے کم و بیش قیام رہا۔ اس کے بعد کونگلور اپنے چچا مالک بن دینار کی خدمت میں پہونچے اور پوری سرگزشت ان کے سامنے رکھی اور انھیں ان تمام مسجد بنانے گئے جہاں انھوں نے ہر مسجد میں نماز پڑھی اور سرزمین کفر آباد میں دین اسلام کے ظہور و کامرانی پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی اقامت گاہ کونگلور کی طرف لوٹے اور وہاں سے مالک بن دینار اور مالک بن حبیب اپنے اصحاب اور خدام کے ساتھ کولم گئے لیکن مالک بن دینار اپنے بعض اصحاب کے ساتھ شحر کا سفر کیا اور متوفی راجہ کے قبر کی زیارت کی۔ پھر مالک خراسان کی طرف گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا اور مالک بن حبیب اپنی بعض اولاد کو کولم میں چھوڑ کر کونگلور چلے آئے اور وہیں وہ اور ان کی بیوی رحلت کر گئے۔ یہ باتیں ملیبار میں ظہور اسلام کے دور اول کی ہیں۔[1]

---

[1] تحفۃ المجاہدین مع تاریخ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۲ تا صفحہ ۱۶ خلاصہ ترجمہ

یہی وہ اللہ کے پاکباز بندے تھے جن کے دم قدم سے ملیبار میں اسلام پھیلا۔ کلمۂ حق و عدل کی دلنواز صدائیں بلند ہوئیں۔ جابجا رب العزت کی کبریائی کی اذانیں گونجنے لگیں۔ دین اسلام کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ جن کی قسمت میں ایمان کی سعادت مقدر تھی وہ حلقۂ اصنام سے نکل کر زمرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ان مسلم دینداروں کے اعمال صالحہ اور اخلاق کریمانہ دیکھ کر ملیبار کے لوگ ان کے اس قدر گرویدہ ہوگئے کہ انھیں ہر ایک عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگا۔ یہ مسلمانوں کی پہلی جماعت تھی جو مستقل اقامت کے لیے آکر آباد ہوگئی تھی اور جس نے دین حنیف کی اشاعت کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور یہ انھیں انفاس قدسیہ کی مساعی جمیلہ اور خدمات مسلسل کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ملیبار میں لاکھوں مسلمانوں کو آباد دیکھ رہے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین کے حوالہ سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب و ہند تعلقات" میں مزید دو اقتباسات پیش کئے ہیں جن سے بعد کے زمانہ کا طرز عمل ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی افادیت کے پیش نظر انھیں کے قلم سے یہاں پیش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کی مغربی ساحل کی بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان میں آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں۔ یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ سردار اور ان کی رعایا بت پرست ہے مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیونکہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہونا انھیں مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے۔"

ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن ہیں جو موپلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزیوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی۔ ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوگئے ہیں جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہوگئے ہیں یا شادی بیاہ کے ذریعہ سے ان کی برادری میں آگئے ہیں[1]

کولم :- عرب جہازراں پرانے زمانے سے اس کا نام برابر لیتے رہے ہیں۔ اور اس کو مبالے والے ملک کا آخری شہر کہتے ہیں۔ یہ شہر آزادی سے پہلے ریاست تراونکور میں داخل

---

[1] عرب و ہند تعلقات صفحہ ۲۶۹

تھا۔ یہاں سے جہاز عدن جایا کرتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کا ایک محلہ آباد ہوگیا تھا اور ان کی ایک جامع مسجد بھی تھی[1]

تاریخ ملیبار کا مصنف لکھتا ہے۔ "چیرا خاندان کا آخر راجہ چیرومن پرومال جس کو عربی میں سامری لکھا گیا ہے۔ اسلام قبول کر لیا تھا۔ امپریل گزیٹر ملیبار میں لکھا گیا ہے کہ راجہ چیرومن پرومال ۲۵ اگست ۸۲۵ء مطابق سنہ ۲۱۲ھ میں بعزم سفر ملیبار سے روانہ ہوا ۸۳۷ء میں عرب پہونچا اس کے چار سال بعد اس کا انتقال ہوا[2]

ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔ "یہاں کا راجہ پیرومل تھا اس نے ۸۲۷ء میں عرب تاجروں سے متاثر ہوکر مسلمان ہوا اور حجاز ہجرت کرگیا۔ اس نے راج پاٹ تقسیم کر دیا اور وصیت کی کہ عرب تاجروں کو جہاں وہ مسجد، مکان، سرائے بنانا چاہیں اجازت اور سہولت دی جائے جس پر عرصہ تک عمل ہوتا رہا اور اسلام پھیلتا رہا[3]

ابن بطوطہ اپنے زمانہ سیاحت مالابار بھی پہونچا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں اپنے مشاہدات کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا ہے:

وہ مالابار کے متعلق لکھتا ہے۔ ہم دن کے بعد ملیبار کی حد میں پہنچے۔ یہ وہ ملک ہے جہاں سیاہ مرچ پیدا ہوتی ہے۔ اس ملک کا طول دو مہینے کا راستہ ہے اور دریا کے کنارے کنارے سندا پور سے کولم تک چلا گیا ہے اور سڑک پر برابر دو رویہ درخت ہیں۔ پھر نصف میل کے بعد لکڑی کا مکان آتا ہے۔ جس میں دوکانیں اور چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ہر مسافر ہندو یا مسلمان آرام کرتا ہے اور ہر مکان کے پاس ایک کنواں ہے جس پر ایک ہندو پانی پلاتا ہے ہندو کو کٹوروں میں اور مسلمانوں کو اوک سے۔ جب وہ اشارہ سے منع کرتا ہے تو بند کر دیتا ہے۔ ملیبار میں دستور ہے کہ مسلمان کو گھر میں آنے نہیں دیتے اور نہ اپنے برتنوں میں کھانا کھلاتے ہیں اور اگر کھلاتے ہیں تو یا وہ برتن توڑ ڈالتے ہیں یا مسلمان ہی کو دے دیتے ہیں۔ اور جس جگہ مسلمان نہ ہو تو وہ مسلمانوں کے لیے کھانا پکا دیتے ہیں اور کیلے کے پتے پر رکھ دیتے ہیں اور اس پر سالن ڈال دیتے ہیں۔ جو باقی بچ جاتا ہے اس کو پرندے اور کتے کھا لیتے ہیں اور ان راستہ پر تمام منزلوں میں مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ان کے پاس مسلمان مسافر جا اترتے ہیں اور وہ ان کے لیے کھانا پکا دیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے گھر نہ ہوتے تو یہاں مسلمان کے لیے سفر کرنا بہت مشکل تھا۔ اس دو مہینے کے راستے میں ایک چپہ بھر بھی ایسا نہیں جو آباد نہ ہو۔ ہر آدمی کا گھر علاحدہ علاحدہ ہے اس کے گرد باغیچہ ہوتا

---

[1] تقویم البلدان صہ ۲۶۱ [2] امپریل گزٹ بحوالہ تاریخ ملیبار [3] ہسٹری آف انڈیا۔

ہے اور ہر باغیچہ کے گرد لکڑی کی دیوار ہوتی ہے۔ سڑک باغوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ جہاں ہر باغ کی دیوار میں سیڑھیاں لگی ہوتی ہیں اس سے چڑھ کر دوسرے باغ میں پہنچتے ہیں کوئی شخص گھوڑے یا کسی اور سواری پر سوار ہو کر نہیں چلتا۔ گھوڑے پر فقط بادشاہ سوار ہوتا ہے اکثر لوگ ڈولہ یا پالکی پر سوار ہوتے ہیں۔ جس کو مزدور یا غلام اٹھا کر لے جاتے ہیں اور یا پیدل چلتے ہیں خواہ کوئی ہو۔ اگر کسی شخص کے پاس اسباب تجارت وغیرہ یا ساز وسامان زیادہ ہو تو مزدور کرایہ پر لیتا ہے وہ پیٹھ پر اسباب لے جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض آدمی ایسے نظر آئیں گے کہ ان کے ساتھ سو سو آدمی اسباب اٹھانے والے ہوتے ہیں ہر مزدور کے ہاتھ میں ایک موٹا عصا ہوتا ہے جس کے نیچے لوہے کی میخ لگی ہوتی ہے اور اوپر لوہے کا آنکڑا ہوتا ہے جب وہ تھک جاتا ہے اور کوئی دکان ٹھہرنے کے واسطے قریب نہیں ہوتی تو زمین میں اپنا عصا گاڑ دیتا ہے اور اس پر اسباب کی گٹھری لٹکا دیتا ہے۔ جب سانس لے چکتا ہے تو اسباب اٹھا کر چل پڑتا ہے۔ میں نے کوئی راستہ اتنا پر امن نہیں دیکھا جتنا کہ یہاں کا ہے۔ یہاں ایک ناریل کی چوری پر بھی چور کو مار ڈالتے ہیں۔ جب کوئی پھل گر پڑتا ہے تو کوئی شخص نہیں اٹھاتا۔ جب مالک آتا ہے تو وہی اٹھاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو نے ایک ناریل اٹھا لیا۔ حاکم کو خبر ہوئی تو اس نے ایک لکڑی زمین میں گاڑی اور اس کے سرے پر جو لوہے کی انی تھی۔ ایک تختہ لگا دیا اور اس سے انی پار کر دی پھر اسے تختہ پر لٹا دیا انی پیٹ میں سے پار ہو کر پیٹھ میں جا نکلی لاش لوگوں کی عبرت کے لیے وہیں لٹکی رہی۔ ایسی لکڑیاں بہت جگہ رستے میں لگی ہوئی ہیں تاکہ مسافروں کو معلوم ہو جائے۔ آگے ابن بطوطہ لکھتے ہیں۔

"رات کو ہمیں بہت سے ہندو راستے میں ملتے تھے۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو جاتے تھے جب ہم بڑھ جاتے تو چلنا شروع کر دیتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کی بدرجہ غایت تعظیم کرتے ہیں یہ ضرور ہے کہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے اور نہ گھروں میں داخل ہونے دیتے ہیں۔ ملیبار میں بارہ راجہ ہیں۔ سب سے بڑے راجہ کا لشکر پچاس ہزار ہے اور سب سے چھوٹے کا تین ہزار۔ یہ کبھی نہیں لڑتے اور قوی ضعیف کا ملک چھیننے کی کوشش نہیں کرتا۔ ایک راجہ کا علاقہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے راجہ کا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک لکڑی کا دروازہ ہوتا ہے اس پر آگے والے راجہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فلاں راجہ کی اماں (پناہ) کا دروازہ ہے۔ اگر کوئی ہندو یا مسلمان ایک علاقہ میں جرم کر کے دوسرے دروازے میں داخل ہو جائے تو اسے کچھ ڈر نہیں رہتا۔ اگرچہ وہ راجہ قوی ہو لیکن وہ ضعیف کو مجبور نہیں کر سکتا کہ اس مجرم کو حوالہ کرے"۔ پھر آگے لکھتا ہے۔

"ان راجاؤں کے بیٹے راج کے وارث نہیں ہوتے بلکہ بھانجے وارث ہوتے ہیں۔ یہ دستور میں نے سوائے ملک سوڈان کی قوم مسوتا کے اور کسی جگہ نہیں دیکھا ملیبار کے کسی راجہ کو اگر منظور ہوتا ہے کہ کسی دوکان دار کی خرید و فروخت بند کر دیے تو راجہ کے غلام آ کر اس دوکان پر درختوں کی شاخیں لٹکا دیتے ہیں جب تک وہ شاخیں رہتی ہیں تو کوئی شخص اس دوکان سے خرید و فروخت نہیں کر سکتا۔

سیاہ مرچ کا بوٹا انگور کی بیل سے مشابہ ہوتا ہے۔ اسے ناریل کے ساتھ بوتے ہیں یہ ناریل کے درخت پر بیل کی طرح چڑھ جاتا ہے۔ اس درخت کی شاخیں نہیں ہوتیں اس کے پتے گھوڑے کے کان کی طرح ہوتے ہیں۔ اس کا پھل چھوٹے چھوٹے گچھوں میں لگتا ہے۔ جب خریف کا موسم ہوتا ہے تو توڑ کر بوریہ پر دھوپ میں سکھا دیتے ہیں جیسے کشمش بنانے کے لیے انگور سکھاتے ہیں اور الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ خشک ہو جانے کے بعد سیاہ رنگ ہو جاتا ہے۔ تو سوداگر وں کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عوام کا خیال ہے کہ آگ میں بھونتے ہیں جس سے کرارہ پن آجاتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ بلکہ کرارہ پن دھوپ سے پیدا ہوتا ہے۔ شہر قالقوط (کالی کٹ میں) میں نے دیکھا ہے کہ اسے پیمانے سے ناپتے ہیں جیسا کہ ہمارے ملک میں جوار کو ناپتے ہیں۔

مالابار کے بعض شہروں اور اہم مقامات کے حالات

ملیبار کا سب سے پہلا شہر جس میں ہم داخل ہوئے ابی سرور تھا یہ ایک چھوٹا سا شہر ایک بڑی کھاڑی کے کنارے پر ہے۔ ناریل کے درخت بہت ہیں۔ مسلمانوں میں سب سے بڑا آدمی وہاں شیخ جمعہ ہے۔ جو ابی رستہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص بڑا سخی ہے۔ ساری دولت فقیروں اور مسکینوں پر خرچ کرتا ہے۔ دو دن کے بعد ہم فاکنور کے شہر میں پہنچے یہ بھی ایک کھاڑی پر واقع ہے یہاں گنا بہت عمدہ ہوتا ہے جس کی نظیر اس ملک میں کہیں نہیں ہوتی۔ اس شہر میں بہت سے مسلمان ہیں۔ ان میں سب سے بڑا حسین سلاط ہے۔ اس شہر میں قاضی اور خطیب بھی ہیں اور حسین سلاط نے ایک جامع مسجد بھی وہاں بنوائی ہے۔ اس شہر کے راجہ کا نام باسدیو ہے تیس جنگی جہاز اس کے پاس ہیں ان سب کا افسر لولا نامی مسلمان ہے پہلے یہ شخص سمندر کا ڈاکو تھا جو سوداگروں کو لوٹا کرتا تھا۔ جب ہم نے اس شہر کے پاس لنگر ڈالا تو راجہ نے اپنا بیٹا ہمارے پاس بھیجا وہ جہاز میں ہمارے پاس بطور یرغمال کے رہا۔ اس کے بعد ہم شہر گئے۔ راجہ نے ہماری تین دن تک ضیافت کی

تین دن بعد ہم شہر منجرور پہونچے (منگلور) پہونچے یہ بڑا شہر ہے اور خلیج کے کنارے پر ہے جس کو ذنب کہتے ہیں۔ یہ کھاڑی اس ملک میں سب سے بڑی ہے اور اس شہر میں فارس اور یمن کے اکثر سوداگر آتے ہیں یہاں سیاہ مرچ اور سونٹھ بکثرت ہوتی ہے اس شہر کا راجہ ملیبار میں سب سے بڑا ہے اس کا نام رام دیو ہے۔ اس شہر میں چار ہزار کے قریب مسلمان رہتے ہیں ان کی آبادی شہر کے باہر ایک طرف ہے۔ کبھی کبھی شہر والوں کی ان کی لڑائی ہو جاتی ہے تو راجہ صلح کرا دیتا ہے کیونکہ وہ تاجروں کا محتاج ہے اس شہر میں ایک شافعی قاضی ہے جس کا نام بدرالدین معبری ہے وہ تعلیم بھی دیتا ہے۔

اس کے بعد ہم ہیلی کی طرف گئے اور دو دن میں وہاں پہونچے۔ یہ ایک بڑا شہر ہے عمارتیں عمدہ ہے۔ ایک بڑی کھاڑی کے کنارے بسا ہوا ہے اس کھاڑی میں بڑے بڑے جہاز بنتے ہیں۔ اس شہر میں چین کے جہاز آتے ہیں اور سوا قالیقوط (کالی کٹ) اور کولم اور ہیلی کے اور کسی جگہ نہیں ٹھہر سکتے۔ ہیلی کے شہر کو ہندو اور مسلمان متبرک سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں ایک جامع مسجد ہے جو برکت والی مشہور ہے۔ مسافر خیر و عافیت سے پہونچنے کے لیے اس جامع مسجد کی نذر مانتے ہیں۔ خطیب حسین اور حسن وزان کے تحت اس کا خزانہ ہے۔ ہیلی سے چل کر ہم جر فتن پہونچے جو ہیلی سے فقط تین فرسنگ ہے۔ وہاں ایک فقیہہ سے ملا وہ بغداد کا رہنے والا ہے صرصری کہلاتا ہے۔ صرصر بغداد اور کوفہ کے راستہ پر بغداد سے دس میل کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ یہاں سے ہم فتن پہونچے یہاں کیلا بہت ہوتا ہے۔ دلی کے مقابل جامع مسجد ہے۔ مسجد سے نیچے اترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں لوگ نیچے جا کر وضو اور غسل کرتے ہیں۔ فقیہہ حسین نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ یہ تالاب اور مسجد راجہ کویل کے دادا نے تعمیر کی تھی اور وہ مسلمان ہو گیا تھا۔

ایک مسجد کی بے حرمتی کا انجام

پھر ہم شہر برشمین پہونچے۔ یہ بھی ایک بڑا شہر ہے اور ایک بڑے دریا کے کنارے آباد ہے۔ سمندر کے کنارے پر ایک مسجد ہے اس میں سافر مسلمان آکر ٹھہرتے ہیں۔ کیونکہ اس شہر میں کوئی مسلمان نہیں ہے اس شہر کا بندرگاہ نہایت خوبصورت ہے اور پانی بہت میٹھا ہے۔ یہاں چھالیہ بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ وہاں سے چین اور ہندوستان کو لے جاتے ہیں اکثر باشندے برہمن ہیں ہندو ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں لیکن وہ مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے ہیں اور اسی سبب سے اس شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہتا۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اس مسجد کی اس لیے منہدم نہیں کیا کہ ایک

برہمن نے مسجد کی چھت گرا کر اس کی کڑیاں اپنے مکان میں لگائی تھیں۔ اس کے گھر کو آگ لگ گئی وہ اور اس کی اولاد اور مال و اسباب سب جل کر راکھ ہو گئے۔ اس کے بعد یہ لوگ مسجد کی تعظیم کرنے لگے پھر اس کی کسی نے حرمتی نہیں کی۔ ایک حوض بھی بنا دیا تاکہ مسافر پانی پی سکیں اور دروں پر جالیاں لگا دیں تاکہ پرندے داخل نہ ہو سکیں۔ وہاں سے چل کر ہم قندریہ پہونچے یہ بھی ایک بڑا شہر ہے۔ بازار اور باغات بکثرت ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے تین محلے ہیں ہر محلہ میں مسجد ہے اور جامع مسجد سمندر کے کنارے پر ہے اس میں سمندر کی طرف سے نشستگاہیں بنی ہوئی ہیں اور ایک عجیب نظارہ ہے اس کا قاضی اور خطیب عمان کا رہنے والا ہے۔

کالی کٹ

ہم شہر کالی کٹ پہونچے۔ ملیبار میں یہ بہت بڑا بندر ہے۔ چین، جاوا، سیلون اور مالدیپ اور یمن، فارس کے سوداگر یہاں آتے ہیں بلکہ دنیا کے تمام تاجر یہاں جمع ہو جاتے ہیں اور اس کا بندرگاہ دنیا کے بڑے بڑے بندرگاہوں میں ہے۔ یہاں کا راجہ ہندو ہے جس کو سامری کہتے ہیں۔ عمر میں زیادہ ہے اور اسی طرح داڑھی منڈواتا ہے جیسے فرنگی۔ امیر التجار کا نام ابراہیم شاہ بندر ہے وہ بحرین کا باشندہ ہے۔ بڑا عالم اور سخی ہے اور ہر طرف کے سوداگر جمع ہو کر اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ اس شہر کا قاضی فخر الدین عثمان بھی بڑا سخی ہے خانقاہ کا شیخ شہاب الدین گازرونی ہے جو اشخاص چین اور ہندوستان میں شیخ ابو اسحاق گازرونی کی منت مانتے ہیں وہ اسی کو نذر دیتے ہیں۔ ناخدا مثقال بھی اسی شہر میں رہتا ہے۔ یہ شخص بہت مشہور اور مالدار ہے اور اس کے جہاز ہندوستان اور چین یمن اور فارس میں تجارت کرتے ہیں۔ جب ہم اس شہر کے پاس پہونچے تو شیخ شہاب الدین اور ابراہیم شاہ بندر اور بڑے بڑے سوداگر اور راجہ کا نائب جس کو فلاح کہتے ہیں استقبال کو آئے اور ہم بڑے جلوس کے ساتھ بندرگاہ میں داخل ہوئے۔ بندرگاہ بڑا وسیع تھا۔ اس وقت یہاں چین کے تیرہ جہاز ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم جہاز سے اتر کر شہر میں آ رہے اور مکان کرایہ پر لے لیا تین مہینہ تک چین کی طرف چلنے کے موسم کا انتظار کیا۔ اتنی مدت تک ہماری ضیافت راجہ کے محل سے آتی رہی"

ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملیبار کے بہت سے شہروں کا ذکر ملتا ہے۔ مختلف مقامات مسلمانوں کی آبادی کا حال اور ان کی متعدد مساجد کا بھی ذکر کیا ہے۔

۶۶۱۲

ابوزید سیرانی لکھتا ہے :۔

"دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں مسلمان مالوہ اور ملیبار میں پھیل چکے تھے۔ چنانچہ شرف بن مالک مالک ابن دینار اور مالک ابن حبیب نے راجہ راموڈن کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ اور مسلمانوں کو اس راجہ کی بہت حمایت حاصل تھی۔ مالک ابن دینار اور مالک بن حبیب نے کونکلور اور کالی کٹ میں مسجد بنائی تھی۔ اور مالک بن دینار نے راجہ کے ایک سرحدی مقام کاسرگوڈ میں بھی ایک مسجد بنائی تھی جو ابتک وہاں موجود ہے۔ حضرت مالک بن دینار کس سنہ میں ملیبار پہونچے تھے ہمیں اس کا ثبوت کسی معتبر تاریخ سے نہیں ملا۔ لیکن قلندر برحق کے مصنف لکھتے ہیں کہ وہ ۲۲ھ میں تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اس سنہ کے متعلق کوئی حوالہ نہیں دیا۔" اس کے بعد آئینہ حقیقت نما جلد اول سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں بھی ان کے آنے کا سنہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔" آئینہ حقیقت نما میں لکھا گیا ہے۔" ان تجارتی تعلقات کی بنا پر مالک بن حبیب کا خاندان اور عرب کے قبائل جنوبی ہند میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی اقامت نے جنوبی ہند میں رشتہ داریاں پیدا کیں۔ عربوں نے یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ آج جنوبی ہند میں مسلمانوں میں مختلف جماعتیں مختلف ناموں سے پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اسی اختلاط کا نتیجہ ہیں۔

تحفۃ المجاہدین کے مصنف شیخ زین الدین معبری نے جنوبی ہند بالخصوص ملیبار میں اشاعت اسلام کے اسباب میں لکھتے ہیں۔

"ملیبار کے ہندوں میں رسم و رواج کی بندشیں اور ذات پات کی پابندیاں مدت سے قائم تھیں اگر اعلیٰ ذات کا کوئی آدمی کسی ادنیٰ ذات کے آدمی سے چھو جاتا یا حد مقررہ سے قریب ہو جاتا تو غسل کیے بغیر کھانا کھانا اسے جائز نہیں ہے۔ اگر بغیر غسل کے کھا لیتا ہے تو اپنی ذات سے باہر ہو جاتا ہے۔ ادنیٰ ذات والوں کا بچایا ہوا کھانا اعلیٰ ذات والوں کے لیے منع ہے اگر اعلیٰ ذات کا مرد کسی ادنیٰ ذات کی عورت سے شادی کر لیتا ہے یا کسی اعلیٰ ذات کی عورت کے ساتھ کسی ادنیٰ ذات کے مرد کی شادی ہو جاتی ہے تو اعلیٰ ذات والا اپنی ذات سے خارج ہو جاتا ہے[1]۔

تیبھو سیاح لکھتا ہے کہ :۔

"ملیبار میں دو قومیں آباد ہیں ایک نائر اور دوسرے پلٹے اگر کوئی نائر کسی پلٹے کے اس قدر قریب ہو جائے کہ اس کا سانس اس تک پہونچ سکے تو نائر سمجھتا ہے کہ وہ ناپاک ہو گیا اور

---

[1] تحفۃ المجاہدین

مجبوراً اس پولیے کو قتل کر دیتا ہے۔ اگر وہ نائر اس پولیے کو قتل نہ کرے اور راجہ کو معلوم ہو جائے تو راجہ نائر کو مروا دیتا ہے۔ جب کبھی پولیے گھروں سے باہر کھیتوں میں نکلتے ہیں تو اس اتفاق سے بچنے کے لیے متواتر پو پو پکارتے ہیں کہ نائر موجود ہوں تو ہٹ جائیں اور جب نائر اس آواز کو سن لیتا ہے تو چلا کر ہو ہو کہہ دیتا ہے۔ اس پولیا سمجھ لیتا ہے کہ یہاں کوئی نائر موجود ہے اور وہ راستہ چھوڑ کر دور ہٹ جاتا ہے۔"

اونچی ذات کے لوگ گاؤں میں جو بستیاں ہیں گھر داخل نہیں ہو سکتے۔ ان کی عورتوں کو اپنی ساڑی کا پلو دائیں طرف چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ ساڑی کا پلو دائیں طرف صرف اعلیٰ ذات کی ہندو عورتیں چھوڑ سکتی ہیں۔ ملیبار میں یہ بھی رواج ہے کہ نیچ ذات کی عورتیں اپنا سر اور سینہ اونچی ذات والوں کے سامنے چھپا نہیں سکتیں۔ اس لیے عورتیں صرف ایک کپڑا سینہ سے نیچے باندھتی ہیں۔ رسم و رواج کی پابندی اور ذات کے احساس نے جہاں جنوبی ہند کی چند ادنیٰ قوم والوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا وہ ان کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے بھی اسلام قبول کیا جب رسم و رواج کے خلاف کوئی فعل ہوتا تھا تو بدنامی سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ مذہب تبدیل کر لیا جائے اس کے متعلق تفصیلی ذکر کتاب ملیبار میں لکھا گیا ہے۔

معبر (کارومنڈل)

معبر کا مشہور نام کارومنڈل ہے۔ ملیبار کے مقابل دوسرے ساحل کو عرب سیاح اور تاجر ہمیشہ معبر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۱۳۱۲ھ کا مشہور مورخ ابوالفداء نے معبر کی یہ حد لکھا ہے کہ یہ ملیبار کے پورب کولم سے تین چار دن کی مسافت پر ہے اور اس کا آغاز کولم کے پورب سے ہوتا ہے۔ دارالحکومت کا نام بیرداول دبیر دھول ہے وہ راس کماری کو راس کمری لکھا ہے[۱]۔

ذکریا قزوینی ۶۸۲ھ نے ساتویں صدی ہجری میں اس کا نام مندل لکھا ہے۔ اور یہاں کے عود کی لکڑی کی بہت تعریف کی ہے[۲] اور اس کے قریب راس کامران (راس کماری) کو

۱۔ تقویم البلدان ص۳۵۵ ۲۔ آثار البلاد قزوینی ص۸۲

جگہ دی ہے۔ جس کی نسبت سے اس عود کو کامرانی عود کہتے ہیں۔[1]

عرب چھٹی صدی ہجری کے آخر سے زیادہ تر اس کا نام لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس ساحل سے ان کا کچھ عمل دخل نہیں تھا۔ جامع التواریخ کے مصنف المتوفی ۷۱۸ھ لکھتے ہیں کہ معبر کولم سے لے کر نیلاور تک کنارے کنارے تین فرسنگ تک لمبا ہے اس کے اندر بہت سے شہر اور گاؤں ہیں راجہ کو یہاں کے لوگ دیورا کہتے ہیں جس کے معنی دولت والے کے ہیں۔ چین کے بڑے جہاز جن کو جنک کہتے ہیں یہاں سے چین ماچین اور سندھ اور ہند کے ملکوں سے بیش قیمت سامان اور کپڑے لاتے ہیں اور معبر سے ریشمی کپڑے اور خوشبودار لکڑی لے جاتے ہیں اور اس کے دریا سے بڑے بڑے موتی نکالے جاتے ہیں۔ یہاں کی پیداواریں عراق، خراسان، شام، روم، یورپ تک جاتی ہیں اس کے سمندر میں بکثرت ہوتی ہیں۔ معبر ہندوستان کی کنجی ہے چند سال پہلے سندر پانڈے یہاں کا دیوان تھا۔ جس نے اپنے تین بھائیوں کے ساتھ مختلف سمتوں میں قوت حاصل کی۔

ملک تقی الدین بن عبدالرحمان بن محمد الطیبی جو شیخ جمال الدین کا بھائی ہے اس راجہ کا وزیر اور مشیر تھا جس کو پٹن، ملی پٹن (پیٹم، ملی پٹم) اور بیاول کی ریاست کے راجہ نے اس کے سپرد کر دی تھی۔ چونکہ معبر میں گھوڑے اچھے نہیں ہوتے اس لیے ان کے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ جمال الدین ابراہیم دیوان کو چودہ سو مضبوط عرب کے گھوڑے کیس کی بندرگاہ پر لادیا کرے سال بھر دس ہزار گھوڑے خلیج فارس کی دوسری بندرگاہوں سے جیسے قطیف، الحاد، بحرین ہرمز وغیرہ سے آتے تھے اور ہر گھوڑے کی قیمت ۲۲۰ طلائی سکے (دینار) مقرر تھی۔

۶۹۲ھ (۱۲۹۳ء) میں دیوان مرگیا اور اس کی دولت امراء کے وزیروں، مشیروں اور نائبوں میں تقسیم ہوگئی۔ اور شیخ جمال الدین کو جو اس کا جانشین ہوا کہتے ہیں کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات ہاتھ آئے اور تقی الدین کے معاہدے کے مطابق اس کا نائب مقرر ہوا۔[2]

مسلمان اپنے ہندو راجہ کی حمایت میں مسلمان حملہ آور کے مقابلہ میں

سنہ ۱۳۱۰ء میں سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کو جنوبی ہند پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ خلجی فوج جنوب کے مختلف شہروں کو روندتی اور کچلتی ہوئی کارومنڈل پہنچ گئی۔ کارومنڈل کا پایۂ تخت

۱؎ عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۷ ۲؎ ترجمہ جامع التواریخ جلد اول ص ۹۹ تا ص ...

بیرڈھول تھا۔ اس راجہ کی رعایا میں مسلمان بھی تھے ۔ جس میں زیادہ تر تعداد عربوں کی اور عراقیوں کی تھی ۔ اس وقت یہ عجیب واقعہ پیش آیا ۔ شاید اس ہندوستان میں پہلی دفعہ پیش آیا کہ ان مسلمانوں نے ترک حملہ آوروں کے مقابلے میں سینہ سپر اور شمشیر بکف ہوگئے اور خوب لڑے لیکن ترک بہادروں کا مقابلہ آسان نہیں تھا ۔ راجہ کو شکست اٹھانی پڑی اور اس کے ملک پر سلطان علاء الدین کے سپہ سالار ملک کافور کا قبضہ ہوگیا ۔ یہ واقعہ سنہ ۱۳۱۰ء میں پیش آیا تھا کہ کندور میں مسلمانوں کی ایک جماعت ملک کافور کے سامنے حاضر ہوئی جو بیر دھول راجہ کی رعایا تھی جو اس کی حمایت میں اس کی فوج کا مقابلہ کر رہی تھی ۔ ان کے بارے میں خزائن الفتوح کے مصنف امیر خسرو لکھتے ہیں :۔ " یہ لوگ نیم ہندو نیم مسلمان تھے ۔ صرف کلمہ پڑھنا جانتے تھے یہ لوگ واجب القتل تھے لیکن کافور نے ان کی جان بخشی کی ۔"

دلبن صاحب اپنی تاریخ علائی میں اس میں رنگ بھر کر اس کو اور اچھالنے کی کوشش کی ۔ "مسلمانوں نے اپنے عہد و پیمان نباہے اور ایک اچھے شہری اور اپنے ملک کے وفادار کی حیثیت سے بیر دھول کے راجہ کی حمایت کی اور ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔ چونکہ ان کے لیے راجہ بیر دھول کی ریاست ایک دار الامن کی سی حیثیت رکھتی تھی ۔ جس راجہ کی طرف سے ان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں اور ضروری رعایتیں حاصل ہوں اس پر اگر کوئی حملہ آور ہو تو کیا ان مسلمانوں کو ہاتھ پر ہاتھ دھر بیٹھے رہنا چاہیے تھا ۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کیا ان کی وفاداری مشتبہ اور مجروح نہیں ہوتی ؟ ان مسلمانوں نے جو کچھ کیا اپنے ملک کے دفاع کی خاطر کیا اور اپنے راجہ کی حمایت کے لیے کیا اور ایسا کرنا اس کے ایک شہری کی حیثیت سے ناگزیر تھا ۔"

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

اس کے بعد ہی سلطان علاء الدین خلجی نے گجرات سے کارومنڈل تک زیر و زبر کر ڈالا اس وقت تمام ہندوستان میں پہلی دفعہ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ کارومنڈل جس کا پایہ تخت اس وقت بیر دھول تھا اس کے راجہ کی طرف سے مسلمان عراقیوں عربوں نے مسلمان ترک حملہ آوروں کا مقابلہ کیا ۔

امیر خسرو دہلوی کی خزائن الفتوح میں جو علاء الدین خلجی کی انھیں فتوحات کی ایک رنگین اور بے معنی لفاظی سے بھری تاریخ ہے ۔ اس واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے :۔

"مسلمانوں نے اپنے عہد و پیمان اور دار الامن کی بنا پر بیر دھول کے راجہ کی پوری مدد کی اور اس کی طرف سے ترک مسلمانوں سے خوب لڑے ۔ لیکن ترک بہادروں کا مقابلہ آسان نہ تھا راجہ نے شکست کھائی اور ملک پر سلطان علاء الدین کے سپہ سالار نے قبضہ کر لیا ۔ ان مسلمانوں

کو جو اس سے لڑے تھے وہ سخت سزا دینا چاہتا تھا۔ لیکن انھوں نے قرآن اور کلمہ پڑھ پڑھ کر اپنا مسلمان ہونا ثابت کیا۔"

آگے لکھتے ہیں :-

"ایلین صاحب نے اس واقعہ کے ضمن میں خسرو کے ایک فقرہ کا ایک ترجمہ یہ لکھ دیا ہے کہ یہ مسلمان نیم ہندو اور اپنے دین و مذہب سے بے خبر تھے۔ لیکن یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے شاعرانہ مبالغہ اور انشاپردازی کی نزہت لفاظی میں ان مسلمانوں کو ہندو راجہ کے ساتھ دینے کے جرم میں بہت کچھ برا بھلا کہا ہے۔ جس کا کوئی مقصود اور مطلب نہیں ہے چہ جائیکہ اس کے معنی نیم ہندو کے ہوں۔[1]

گجرات

اس زمانے میں گجرات کے راجہ دلبھ رائے کی حکومت تھی اور اس راجہ کا ذکر عربی سیاح اور مورخین نہایت دلچسپی اور محبت بھرے لفظوں میں کرتے ہیں بلکہ اس کو عربوں کا محبوب راجہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس راجہ کی پہلی راجدھانی دلبھی پور تھی جو بہت بڑا شہر تھا اور وہ موجودہ بھاونگر کے پاس آباد تھا اور عرب اکثر اس کو بالابا یا بہانگر کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ آثار قدیمہ کی جدید انکشافات سے اس شہر کا احاطہ پانچ میل تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کے راجاؤں کا دھرم مختلف تھا۔ بعض کا تعلق جین دھرم سے تھا اور بعض بدھ مذہب کے پیرو۔ اور یہ دونوں مذہب اکثر ایک دوسرے سے جھگڑتے ٹکراتے رہے اور اسی میں ان کی ساری قوتیں اور توانائیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔

سلیمان تاجر $\frac{۳۰۳}{۲۸۵}$ھ میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں بلہرا راج اور ککم اور کوکن کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "راجہ بلہرا اور اس کی رعایا کے تعلقات عربوں سے نہایت

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۸۵ تا صفحہ ۲

نقشۂ گجرات بعہدِ مغلیہ

دوستانہ اور خوشگوار رہے۔ گجرات جس کو عرب جوز کے نام سے پکارتے رہے اکثر ان میں باہمی چھیڑ چھاڑ اور لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کے ساٹھ سال بعد ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء جب مسعودی کھمبات پہنچا تو اس وقت ایک برہمن بنیا وہاں کا حکمراں تھا۔ اور وہ راجہ بلہیرا کا ماتحت تھا۔ عرب کے سیاح اور جغرافیہ نویس نے بلہیرا کی راجدھانی کا نام مانکیر سے ذکر کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مانکھیٹ یا مانکھیٹ کی معرب شکل ہو۔ مسعودی کے بیان کے مطابق بلہیرا پورے کوکن کا بھی راجہ تھا اس کے ماتحت مختلف صوبے تھے۔ جس میں ایک صوبہ لار بھی تھا۔ جو کھمبایت سے لے کر چیمور (چیول) تک پھیلا ہوا تھا۔ اور جس میں اتری علاقوں میں سوپارہ اور انبالہ بھی شامل تھے۔ اور ان میں لاری زبان بولی جاتی تھی۔ آخر میں اس نے عربوں کے ساتھ بلہیرا راجہ کا دوستی اور ہمدردانہ برتاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱]

سلاہار کی بحث کے سلسلہ میں تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں:-

"گومنت کے سلاہار ۷۶۵ء تا ۱۰۲۰ء (۲) کولہاپور یا کرہاڑ کے سلاہار ۹۴۰ء تا ۱۲۱۵ء (۳) اور دسا کے سلاہار ۸۱۰ء تا ۱۲۶۰ء۔ انھیں تھانہ کے سلاہار بھی کہتے ہیں۔"

وقت اور سیاست کا آہنی ہاتھ ان کی اطاعت کا رخ اور جو کھٹ بدلتے رہے۔ یہ پہلے راشٹر کوٹوں کی اطاعت کا دم بھرتے رہے مگر درپردہ اپنی خودمختاری کا بھرم رکھتے تھے۔ پھر جالوکیوں نے دوبارہ سر بلند کیا تو انھوں نے ان کے آگے سر جھکا دیا۔ جب برمارکی اور یادو آئے تو ان کی اطاعت گذار بن گئے۔ اور جب گومنت کے کدمبوں نے قدم بڑھایا تو ان کے قدم بوس بن گئے۔ جب ان کے عہد میں عرب سیاحوں اور تاجروں کی آمد و رفت بڑھی تو ان کے کانوں میں سلاہار نام ہی کی گونج سنائی دی۔ جس نام کے گجرات سے لے کر گومنت تک گن گائے جاتے تھے ان کے ذہنوں میں طاقت (دکھن) کے راشٹر کوٹ راج کے وسیع تسلط کا تصور تھا مگر زبان پر کوکن، کھمکر، کمکم، کے سلاہاروں ہی کا نام تھا جس نام کو یاد یہ پیما ڈالنے قافیہ پیمائی کر کے بلہیرا اور بلبھارا بنا دیا جو ممکن ہے کہ بلبھ (دلبھ رائے) کا مخفف ہو جیسا کہ فارسی کی ایک قدیم ترین کتاب جغرافیہ پر تصنیف حدود العالم سے علم ہوتا ہے۔ بلہیرا نام کی اصلیت پر محققین کو اختلاف ہے۔ بعض اسے دلبھی پور کا دلبھ رائے بناتے ہیں اور دلبھی پور کو بہانگر (مانکیر) راجدھانی سمجھتے ہیں جو موجودہ بھاؤنگر کے پاس ایک بستی تھی مگر مانکیر تاریخ کی سمت مانکھیٹ کے خلاف بتلاتی ہے جو دکن عربوں

---

[۱] سلسلۃ التواریخ مروج الذہب صفحہ ۲۴۰۔ عرب و ہند تعلقات صفحہ ۲۵ تا ۲۸

کے طاقن میں راشٹرکوٹوں کا صدر مقام تھا۔ طاقن کے راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر تمام سیاح کرتے ہیں۔ طاقت کا تسلط اس عہد میں کم از کم کوکن میں کمزور ہو چکا تھا کیونکہ سارا کوکن مہاسامنتوں اور مہامنڈلیشوروں کے بیچ بندر بانٹ کا تماشا دکھلا رہا تھا۔ اور عربوں کی دشمن جرز (گجرات) کے جو اپنے ساربانوں اور گھوڑوں اور سواروں کے دستوں کے سبب بلہراؤں پر فوقیت رکھتے تھے اور ان کے دیس پر دست درازی کیا کرتے تھے۔ سلاہاروں کے عہد کے مختلف سکوں اور کتبوں سے تلفظ کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ سلاہار ایک دوسرے تلفظ سریلادکا ہم قافیہ ہے۔ سلار اور شلار میں نقطوں کا فرق ہے[1] عرب کا سب سے پہلا سیاح تاجر مسلمان تھا اس کا سفرنامہ ۲۳۵ھ میں لکھا گیا ہے اس میں اس نے راجہ دبھی کے عدل و انصاف اور رواداری کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"اس کو اس کی رعایا کو عربوں اور مسلمانوں سے بڑی محبت ہے اور اس کی رعایا کا عقیدہ ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی لیے بڑی ہوتی ہیں کہ وہ عربوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں[2]

ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عرب تاجروں اور نو وارد مسلمانوں سے یہاں کے ہندوں کے تعلقات نہایت دوستانہ اور ہمدردانہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے راج کے مختلف شہروں میں عربوں کی نوآبادیاں کثرت سے قائم ہو گئی تھیں جو کم و بیش اب تک قائم ہیں۔ اسی طرح دکھن جس کو عرب طاقن کہتے ہیں اس کے راجہ کے بارے میں بھی وہ اسی قسم کا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ دکن کا راجہ بھی راجہ بلہیرا کی طرح عربوں سے محبت، ہمدردی اور رواداری کا برتاؤ کرتا ہے لیکن گجرات کے راجاؤں کے بارے میں جس کو عرب جیزر کہتے ہیں لکھتا ہے کہ وہ عربوں کے دشمن ہیں"

اس کے بعد تیسری صدی ہجری اور چوتھی صدی ہجری کی شروع میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا ادھر اپنے جہاز لاتا تھا تو ان اطراف میں عربوں اور عام مسلمانوں کی بڑی آبادی تھی ایک نومسلم سندر جہاز راں بھی اس کو ملتا ہے جس نے اپنے جہازوں کے ذریعہ سے بڑی دولت کمائی تھی۔ اور حج بھی ادا کیا تھا[3] محمد بن مسلم سیراف کا ایک تاجر اس کو ملتا ہے جو تھانہ (بمبی کے پاس) میں بیس برسوں سے زیادہ رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس نے سفر کیا تھا اور تمام حالات سے واقف تھا۔ جیسور (صیمور) واقع گجرات میں فارس کے ایک مسلمان ابوبکر سے اس کی

---

[1] تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین ص۴۶ [2] عرب ہند تعلقات ص۲۷۷ (۳)

اس کی ملاقات ہوئی۔ گوا جس کو عرب سنداپور کہتے ہیں اس کے راجہ کا مصاحب موسیٰ نام کا ایک مسلمان تھا[1]

چوتھی صدی ہجری کے شروع میں مسعودی ہندوستان آیا تھا۔ ۳۰۳ھ میں وہ کھمبایت میں تھا۔ اس کے علاوہ وہ گجرات کے مختلف شہروں میں پھرا۔ ولبھ رائے (بلہرا) راجاؤں کے متعلق اس کی بھی شہادت دی ہے۔ جو ابن کے ساٹھ ستر برس پہلے مسلمان تاجر نے ظاہر کی تھی۔ کہتا ہے کہ :۔ سندھ اور ہندوستان کے تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا کے راج کی طرح اور کسی راج میں عربوں اور مسلمانوں کی اتنی عزت نہیں۔ اسلام اس راجہ کی حکومت میں معزز اور محفوظ ہے اور اس کے ملک میں مسلمانوں کی مسجدیں اور جامع مسجدیں بنی ہوئی ہیں جو ہر طرح آباد ہیں۔ یہاں کے راجہ چالیس چالیس، پچاس پچاس برس حکومت کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اسی عدل و انصاف اور مسلمانوں کی عزت کرنے کے سبب سے لمبی ہوتی ہیں۔ گجرات کے راجہ کی دشمنی کا وہی حال ہے اور طافن یا دکن کے راج میں بھی مسلمانوں کی وہی عزت ہے[2]

یہی مورخ لکھتا ہے :۔

"۳۰۴ھ میں صیمور میں جو ولبھ رائے کی حکومت میں ایک شہر ہے عربوں اور مخلوط النسل مسلمانوں کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" وہ لکھتا ہے "میرے سیاحت کے زمانہ میں اسی ایک شہر صیمور میں مسلمانوں کی دس ہزار کی آبادی تھی۔

چھٹی صدی کے آخر میں ابن سعد مغربی نے ملکی جغرافیہ پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے جنوبی ہند کے بعض شہروں کے ناموں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اس میں وہ تھانہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ گجرات (لار) کا آخری شہر ہے۔ تاجروں کی زبان پر اس کا نام بہت مشہور ہے۔ اس ہندی ساحل پر بسنے والے سب ہندو ہیں۔ جو بت پوجتے ہیں مگر اپنے ساتھ وہ مسلمانوں کو بھی بسا لیتے ہیں[3] آگے کھمبات کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ بھی ہندوستان کے ساحلی شہروں میں سے ہے جہاں تاجر جایا کرتے ہیں۔ اس میں مسلمان بھی آباد ہیں۔ اس کے بعد عوفی جو جامع الحکایات کا مصنف ہے وہ ۶۲۵ھ میں سندھ سے کھمبایت آیا تھا لکھتا ہے کہ :۔

"یہاں کھمبایت میں خوش عقیدہ اور دیندار مسلمانوں کی آبادی ہے اور ان کی ایک جامع

---

[1] عجائب الہند ص ۳۶ ؛ [2] مروج الذہب مسعودی ص ۳۸۲ تا ۳۸۴ ماخوذ از عرب و ہند تعلقات
[3] تقویم البلدان بحوالہ عرب و ہند تعلقات ص ۳۰۲

جامع مسجد بھی ہے۔ اور اس کا ایک امام اور خطیب بھی ہے۔ گجرات کا راجہ نہروالہ میں رہتا تھا ان لوگوں کے ساتھ نہایت عدل و انصاف سے پیش آتا تھا۔[۱]

ابن حوقل سے بھی کچھ سن لیجیے: یہ چوتھی صدی ہجری کا ایک مشہور سیاح اور مورخ ہے یہ سندھ ہوتے ہوئے گجرات آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

"کھمبایت سے صیمور تک راجہ بلہرا (وبھ رائے) کی حکومت ہے۔ اس میں غالب آبادی تو ہندؤں کی ہے لیکن اس میں مسلمان بھی ہیں اور مسلمانوں پر حکومت خود مسلمانوں کی ہے یعنی راجہ کی طرف سے ایک مسلمان والی ان کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ دبھ رائے کے علاقوں میں مسجدیں ہیں جن میں جمعہ کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔ اور اسی طرح ان میں اور نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں اور اذان بھی علی الاعلان دی جاتی ہے"[۲]

آٹھویں صدی کھمبایت سے کاردمنڈل تک

گجرات سے کاردمنڈل تک جتنا علاقہ ملک کافور نے فتح کیا تھا وہ ایک تیز و تند آندھی تھی جو آئی اور گزر گئی مگر ابتدا اور انتہا فتح علائی کا جھنڈا گڑ گیا تھا وہ نہ اکھڑ سکا۔ تاہم وہ دونوں خود مختار ہو گئے۔ اور نہر گجرات اور کاردمنڈل۔ بیچ میں سینکڑوں میل کے علاقہ بدستور ہندو راجاؤں کے زیر فرماں رہے۔ گجرات تو پھر ہمیشہ کے لیے اسلامی ہو گیا تھا مگر کاردمنڈل جس پر تغلق اور اس کے جانشینوں نے آٹھویں صدی کے وسط تک تقریباً چالیس برس تک حکومت کی۔

ہنرمند

تاریخی کتابوں اور سیاحوں کے سفرناموں میں خاص کر راجہ دبھ رائے کے زمانہ میں حکومت میں ہنرمند کا ذکر ملتا ہے۔ ہنرمند کا لفظی تعلق فارسی زبان سے ہے فارسی زبان میں ہنرمند کے معنی ہنر والے کے ہیں۔ لیکن عربوں نے اس کو ایک نیا معنوی لباس پہنایا اور ہنرمند کو عہدہ بنا یعنی ہنرمند ہونا بتلایا۔

مورخین اور سیاحوں نے اپنی اپنی کتابوں میں ہنرمند کو خاص اصطلاحی معنی میں استعمال

---

[۱] جامع الحکایات عوفی بحوالہ عرب و ہند تعلقات۔ [۲] ابن حوقل ماخوذ از عرب و ہند تعلقات صفحہ

کیا۔ یعنی ہنرمند کے معنی اس مسلمان قاضی یا کونسل کے تھے جو غیر مسلم حکومتوں میں انھیں حکومتوں کی طرف سے مسلمانوں کے معاملات فیصل کرنے کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ اس پر مولانا ندوی لکھتے ہیں:۔

"عربوں اور مسلمانوں کی حکومتوں کو جب دنیا میں پورا عروج حاصل تھا تو جس طرح آجکل یورو بین قوموں کو ایشیا اور افریقہ کی سلطنتوں میں خاص خاص امتیازات حاصل ہیں اور ان کا مقدمہ کسی غیر یوروپین کی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا اسی طرح عربوں اور مسلمانوں کی کیفیت بھی تھی۔ اور اسی طرح کے حقوق انھوں نے بھی اپنے تعلق اور آمدورفت کے غیر اسلامی ملکوں میں حاصل کر لیے تھے، ترکستان، روم، چین اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ان امتیازی حقوق کا پتہ چلتا ہے[1] بہرحال اس قاضی یا کونسل یا غیر حکومت کے مقرر کردہ مسلمان آفیسر کا نام "ہنرمند" تھا۔ تیسری صدی ہجری کے آخر میں اور چوتھی صدی ہجری کے شروع میں صیمور میں عربوں کی اتنی بڑی آبادی ہو گئی تھی کہ ان کے لیے راجہ کو ایک ہنرمند مقرر کرنا پڑا تھا جس کا نام عباس ابن ماہان تھا[2]۔

بیسر

وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے انھیں بیسر لکھا گیا ہے۔ اس کی جمع بیاسرہ ہے اس کی تفصیل میں مسعودی کا حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو:۔

"۳۰۴ھ میں لار کی سرزمین سے جو بلہرا کی حکومت میں ہے شہر صیمور (چیمور) میں موجود تھا اس شہر کے حاکم کا نام جانج (دراصل راجہ کا نام جنجہ تھا) اور اس وقت وہاں دس ہزار مسلمان آباد تھے جو ہندوستان کے پیدا شدہ (بیاسرہ) اور سیراف، عمان، بصرہ اور بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے جنھوں نے یہاں بود و باش اختیار کر لی تھی ان میں سے بہت سے معزز سوداگر ہیں۔ جیسے موسیٰ ابن اسحاق صدرا دنی (صدابوری) اور ہنرمند کے عہدے پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا ممتاز تھے۔ ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ راجہ مسلمانوں پر انھیں کے رئیسوں میں سے کسی کو سردار بنا لیتا ہے اور مسلمانوں کے معاملات اس کے سپرد کر دیتا ہے اور بیاسرہ کے معنی ہیں وہ مسلمان جو کہ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں[3]"

---

[1] عرب و ہند ص ۲۶۹ [2] عجائب الہند ابن حوقل۔ [3] مروج الذہب مسعودی ماخوذ از عرب و ہند

بیاسرہ یا مخلوط النسل مسلمان دسویں صدی کے اوائل میں صرف صیمورہ کے ایک شہر میں مسلمانوں کی دس ہزار آبادی تھی۔ اس میں سیراف، عمان، بغداد کوفہ، اور خلیج فارس کے شہروں کے مہاجر اور تاجر گھرانے تھے۔ بڑی تعداد بیاسرہ مسلمانوں کی تھی۔ جو انھیں تاجروں، ملاحوں، مہاجروں اور داعیوں کی اولاد سے تھے۔ معاشرہ کے ابتدائی عوامل اقتصادی محرکات اور کسی حد تک جغرافیائی کارفرمائیوں نے ملبار سے لے کر کوکن کی انتہا تک پھیلی ہوئی اس قوم کو قوس و قزح کے تمام رنگوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ اصل رنگ و روپ چھپ گیا ہے[1]۔"

کوکن

راشٹر کوٹ چکرورتی راجاؤں کی تقلید میں گومنت سلاہار دور میں وید اور پرانوں کی عبارتیں نئی رسموں میں بدل گئیں۔ اور نئی عبادت گاہیں چٹانوں اور سلوں کے ڈھانچوں میں ڈھل گئیں۔ بہتارے (گوا) کا مہالکشمی مندر سلاہاروں کی یادگار ہے۔ ربورا کا کیلاش نامنہ مندر بھی اسی عہد کی یادگار ہے۔ دت راجہ یار اہو راجہ نے وجے راگ کے غریب کرشن مندی کا گرام یا نزہوں، و دیا لوں اور بہ گیوں کے سبہا کے لیے دکشنا میں دے دیا تھا یہاں شبھو کی ارادھنا کی جاتی تھی۔ مورت کاروں کی بھاؤ نایئی نٹ راج (وشنو) کی صنم تراشی میں اپنے بھید بھاؤ دکھانے لگیں۔ اس فن میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا کہ بصرہ کے مشہور فلسفی اور ادیب "الجاحظ" ۸۶۹ء نے بھی ہندوستانی کلاکاروں کی تعریف میں قلم سرنگوں کر دیا۔ جس طرح نٹ راج کے رقص کے ایک سو آٹھ مختلف مظاہر تھے۔ اس طرح اس کے پرستش کے سینکڑوں مظاہرے مندر اور مورتیوں میں ڈھل کر آج بھی کوکن کی دھرتی پر موجود ہیں۔ نٹ راج جو مہاکالی بھگا ہے یعنی وقت اور موت کا دیوتا وہ سب کو فنا کر دینے والا تانڈو ناچ بھی کبھی کبھی ناچ اٹھتا ہے۔ اور دکشنا پیٹھ کے رنگ منچ پر دسویں صدی کے اس منظر میں ایک ایسا ہی تانڈو ناچ ہو رہا تھا[2]۔

---

[1] تاریخ کوکن از ڈاکٹر محی الدین مومن

[2] تاریخ کوکن صفحہ ۵

مسلم عرب سوداگروں کی آمد

بحری تجارت کی لہروں نے مسلم سوداگروں (عرب سوداگروں) کو مغربی ساحل کے کنارے پرے دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ عرب نو آباد کاروں کی بستیاں ظہور اسلام کے بعد جزائر سراندیپ اور مالدیپ کے، علاوہ معبر (کاروہ منڈل) ملیبار، کوکن اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں ظہور میں آچکی تھیں۔ معبر میں ان کی مخلوط اولاد کو لبّی۔ ملیبار میں مو پلا اور کوکن اور گجرات میں نایت (نوائط) کہتے تھے۔ طاقتور دکن) کے راشٹر کوٹ اور لار دس کے بلہرا (ملیہارا) راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر معاصر عرب مصنفین کرتے ہیں۔ بلہرا راجہ چالیس سے پچاس برس تک حکومت کرتے تھے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ راجاؤں کی لمبی عمروں کی وجہ عرب دوستی، عدل اور مذہبی رواداری تھی۔ ان کے راج میں مسجد میں آباد تھیں اور مسلم نو آبادیاں نئے شہروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ بدیسی تجارت کا بازار گرم تھا اور شہری زندگی کے تصورات ہندوستانی مدنیت کو نئی وسعتیں دے رہے تھے۔ عربوں اور عجمیوں کا یہ ایک بڑا سماجی کارنامہ اور بدیسی تجارت کا یہ اقتصادی کرشمہ تھا کوکن کے دیار اور راجاؤں کے دربار عربوں کی سرپرستی کے لیے کھلے رہتے تھے۔ گومنت کا سلاہار راجہ کا ایک مصاحب موسیٰ نام عرب تھا اور للہ دس کے مالابار راجہ اننت پال (اننت دیو) کا ایک منتری السعود الرخ عربی تھا[1]

قبائلی اور سماجی زندگی کا آغاز

قبائلی اور سماجی زندگی کے آغاز نے تجارتی اور معاشرتی رشتوں کو استوار کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کی یاد سے پہلے اور ویدزمانوں سے قبل مغربی ساحل کی بندرگاہوں کے تجارتی مواصلات بالخصوص اس سرزمین سے مستحکم ہو چکے تھے جو بابل اور نینوا کی تہذیبوں کے

---

[1] تاریخ کوکن ص ۲۵/۲۶

کی تہذیبوں کے گہوارے تھے اور جہاں کہیں پیغمبر نازل ہو چکے ہیں، چپا دتی، سترا کوٹ، سوپارہ شری التھانک اور کلیان کے بحری رابطے بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ذریعہ عراق وعجم، مصر و شام اور روم یونان سے عرصہ سے قائم ہو چکے تھے۔ ان ہی ملکوں کے ساتھ جیبوں والی بادبانی منقش کشتیاں یہیں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ ان میں اجنبی زبان بولنے والے یونانی (یونانی)، لمبی عباؤں والے بازار مصر کے سوداگر اور گھنی داڑھیوں والے اور ہرمز کی پرستش کرنے والے عجمی تاجر آتے تھے۔ ان کے لیے یہ نارنیل اور ساگوان کا ملک تھا۔ جس کے دریاؤں میں موتی اور مونگے رلتے تھے۔ جس کے پہاڑوں میں یاقوت کی کانیں تھیں اور درختوں میں عطر بسا ہوا تھا۔ سونے چاندی کی جھنکاروں اور عود کی و عنبر کی مہکاروں نے ان کے دلوں اور دماغوں پر ایسا سحر طاری کر دیا کہ مصر کا جادو اور سامری کا طلسم بھی ٹوٹ کر رہ گیا۔ جمبو دیپ کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولا کہ یہ اپنی بولیاں بھول گئے اور اپنے دیوتاؤں کی الویٹس اور منتر کی حمد و ثنا کے بجائے اندر اور ورنا کے بھجن گانے لگے۔ انھوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیے اور یہی ایران کے پہلے بدیسی نو آباد کار کہلائے۔ جن کی بستیاں میلاد مسیح کے عہد تک سترپارک، کلیان اور گومنت کے علاوہ دیگر ساحلی علاقوں اور مقدس مقاموں میں آباد ہو چکی تھیں [۱]

موریہ اور نل ۵۰۰ء تا ۶۰۰ء

گو بادامیوں چالوکیوں کے آٹھویں صدی کے اول نصف تک مہاراشٹر کے معتدبہ علاقوں پر راج کر رہے تھے مگر تلابہ، تھانہ، جزائر بمبئی اور شیشتی پر موریہ اور نل کے مقامی گھرانے ایک عہد تک حکمرانی کرتے رہے۔ کلیان مغربی ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں ایک ریاست کا صدر مقام تھا۔ کلاچوری عہد کی مرکزی حیثیت اسے اس دور میں بھی حاصل رہی۔ مصری راہب قسمس جب ۵۳۵ء میں یہاں آیا تو اسے بین الاقوامی حیثیت کی ایک تجارتی منڈی پایا۔ جہاں سے تانبا، لوہا، آبنوس اور کپڑے سیلون برآمد کیے جاتے تھے۔ اور وہاں سے ریشم، لونگ اور عود و صندل یہاں آتا تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ مرچ، سنبل، مسالے، ریشمی اور سوتی کپڑوں کا بیوپار بھی منافع بخش تھا۔ خلیج فارس کے ذریعہ کلیان کی بدیسی تجارت کو فروغ

---

[۱] عرب و ہند تعلقات ص۵۔ تاریخ کوکن ص۶

قریب جدہ اور ابلہ سے قریب بندرگاہوں میں عروج پر تھی۔ جہاں بانس، ساگوان کی بڑی مانگ تھی اس تجارت کے سلسلے میں بنی اسرائیل قبیلہ یمن سے ہجرت کر کے شمالی کوکن کے بندرگاہوں میں آباد ہونے لگے تھے۔ چھٹی صدی میں قلابہ میں خصوصاً راجپوری بندر میں ان کی بڑی تعداد نے توطن اختیار کر چکی تھی۔ کلیان میں ایران کے نسطوری خاندان اپنی تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایران کے کلیسا کی پیروی کرتے تھے اور وہیں سے احکام حاصل کرتے تھے۔ کلیان کا راہب ایران سے مقرر ہوا کرتا تھا۔ قو ٹمس جب کلیان آیا تو یہاں نل گھرانہ راج کرتا تھا۔ نل راجہ کی زبردست عسکری طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پاس پانچ سو سے زیادہ لے کر چھ سو تک جنگی ہاتھی تھے۔ اس خاندان کی یادگار کلیان سے قریب مشہور پہاڑی بالا حصار کا قلعہ ہے۔ عبد غزنویہ میں جب حاجی عبدالرحمان مع دیگر مبلغین کے کوکن آئے تو اسی قبیلہ کی ایک راج کماری ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔ نل خاندان کا موریہ گھرانے سے نسبتی اور قومی تعلق کا ثبوت ملتا ہے۔ ابتدا ہی میں یہ راشٹرکوٹوں اور بعد میں کلاچوریوں کے جانشین اور بادامی چالوکیوں کے حریف تھے۔ ـلہ

بادامی چالوکیہ راج ۵۵۰ء تا ۷۵۳ء

پل کشن کوکن بندرگاہوں کا ناخدا اور گومنت سے لے کر شتشتی کے دیپالپور تک کا حکمراں بن بیٹھا۔ اس کی شہرت ایوان کسریٰ کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ سیاسی اور تجارتی استحکام کی غرض سے پارسیکاؤں کے شہنشاہ خسرو پرویز نے ۹۰۲ھ ۶۲۶ء سفارتی وفد پل کشن کے دربار میں بھیجا۔ ایرانی مدنیت اور معاشرت نے ہندوستانی کلاکاروں کو اتنا متاثر کر دیا تھا کہ تخیل کی تمام پرکاری حقیقت نگاری بن چکی تھی۔ اجنتا کی مصوری میں ایرانی سفارت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور گومنت کی ایک پراچین مورتی گج لکشمی کی دیوداسیاں ایرانی پوشاک میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ چینی سیاح ہیونگ سانگ انہی راجہ کے آخری دور میں ہندوستان آیا تھا اور اس کے راج اور پرچار کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔ چیلول کے ایک دان پتر میں پل کشن کی دیپرنا دیوا اور سادھوتا کو سندر شبدوں میں سراہا گیا۔ گپت سامراج کے راجہ ہرش وردھن کو پسپا کرنے والا پل کشن راجہ اپنے پرانے پڑوسی حریف پلاؤ راجہ نرسمہا راو دیو تشنو (ورمن) کے خطاب والی کونڈ سے برسوں جھلکتی رہی اور راج سنگھاسن مدتوں

ـلہ تھانہ گزیٹیئر جلد ۱۳ ص۷ بحوالہ تاریخ کوکن ص۳۷

اپنے راجہ وکرمادتیہ (اول) کے لیے آغوش کھولے ڈانواڈول رہا[1]

دانائی یا بادامی کا یہ چالوکیہ راج جیسے مغربی چالوکیہ گھرانہ بھی کہتے ہیں۔ ساہتیہ ودیا سمبھیا اور سانسکرتی کی اہتمام میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اور سب سے زیادہ اس کی اہمیت ہندوستانی تاریخ میں اس وجہ سے بھی ہے کہ اس عہد میں دور عرب کے صحراؤں میں نور الہٰی کی بجلی چمکی اور جب کہ کوکن اور دکن کے صنم کدوں میں گہرے غار کھودے جا رہے تھے۔ غار ثور میں توحید کا نعرہ گونج رہا تھا۔ عرب کے صنم کدوں میں لات و ہبل منھ کے بل گر کر ھو اللہ احد کہنے لگے تھے۔ عرب کے بادیہ نشینوں میں ایک کالی کملی والا اٹھا اور جو چاند بن کر چمکا اور چمن زاروں کی طرح مہکا اور نکہت بیز ہوائیں اس کے پیغام حق کی برکتوں کو برہما ورت کی طرف چلنے لگیں[1]

سلاہار کے عہد کے آخر میں تاریخ دکن کے مصنف لکھتے ہیں :-

سلاہار کے دور میں منگوری (ایلفنٹام کی راجدھانی) بن جانے سے سورییہ دور کی تاریخ اپنی شاندار ماضی کے ساتھ پرچھائیاں بن کر ابھرنے لگی۔ جب چیمولی اور سری استھانک (تھانہ) کی بہار پر ادس پڑ گئی تو ایک مرتبہ پھر یہی جھیلی سمندر کی لکشمی دیوی پوری ستانند کا اوتار بن گئی۔

شرپارک (سوپارہ) سری استھانک، جیموتی (چیول) اور صجان وسنجان کی بندرگاہوں میں چین اور جاوا کے چھ مستولوں اور بادبانوں والے دیو پیکر جہازوں (جنگ) کی لنگرگاہیں بن گئیں۔ یہی بغداد، سیراف، ابلہ، ہرمز، عدن، جدہ اور سقطرہ کے تجارتی جہاز (عراذب و دھاؤ) لنگر انداز ہوتے ہوتے۔ سلاہار راج کی سیاسی عظمت اور تجارتی رونق کیفہ اور بغداد پر پڑنے لگی تھی اور سیحان سے لے کر ساوتری تک پھیلی ہوئی اس چھوٹی سی ریاست کی سطوت کی داستانیں مدتوں تک تاریخ کے ایوان میں گونجتی رہیں[3]

"باربرداری اور سفر کے لیے بیلوں کے چھکڑے اسی عہد میں لاڈس کی سڑکوں پر نظر آنے لگے تھے۔ سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی کو اپنے وطن کے تحملوں اور کاروانوں سے کہیں مختلف بیل گاڑیوں کے شور مچاتے ہوئے بے ہنگم قافلے عجیب سے لگتے ہوں گے۔ عراقی گھوڑے کوکن کے کوہستانوں اور گائے اور بیل کے سموں سے بنی ہوئی پگڈنڈی سے مانوس ہو چکے تھے۔ دکن کے رجواڑیوں میں ان کی بڑی مانگ تھی کیونکہ ترک دیس کے رہنے والے داسوں نے

---

[1] ANCINT. SNIINES. OF GOA. P. 9 بحوالہ تاریخ دکن صـ۴۲

[2] گوا کی قدیم عبادت گاہیں انگریزی از تاریخ دکن صـ۴۴ [3] ادریسی بحوالہ ایلیٹ جلد ۱ صـ۲۳ بحوالہ تاریخ دکن صـ۶۵۔

جب سے دلی میں ایک منٹ راج کی بنیو ڈالی تھی ان میں بوکھلاہٹ پھیل گئی تھی۔ سمندری ڈاکو جنھیں عرب بوراج کہتے تھے۔ ان گھوڑوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اور سلاہار راجہ کو جس کی اس کو نیابت حاصل تھی۔ لوٹ کا حصہ دے دیا کرتے تھے۔ انھیں اصیل گھوڑوں پر سوار سلاہار راج کے سپناپتی اور نائک گلے میں شرہارک اور جھولی کی کھاڑیوں سے نکالے ہوئے موتی کی مالا گلے میں ڈالے اور ہاتھوں میں ہار سہ گاؤں سے لائی گئی تلواریں لیے ایلس کی دھنش اور بید کے بان باندھے اکڑتے پھرتے تھے۔ موجودہ شاہراہ کا تصور جسے آج تعمیری منزل ملی ہے راج پتھ کے روپ میں تعمیر ہو چکا تھا۔ ششٹی کے کنارے گوم وتی کے گاؤں سے۔ لے کر، نمکساروں، دلدلوں اور پہاڑی سلسلے کے درمیان اتری راج پتھ ستری استھانک راجدھانی تک چلا گیا تھا۔ تھانہ کھاڑی کے پرلی جانب اور ان کو جانچنے کے کونتھا لیسمن کی بارڈیوں تک دتی راج پتھ گزرتا تھا۔ لال بجری والے راج پتھ پر راجہ سونے کا کنڈل کانوں میں ڈالے اور گلے میں جواہرات کے زیور پہنے اپنے چار گھوڑوں والے منقش رتھ پر بیٹھ کر راجدھانی سے نکل کر ششٹی کے دیہاتوں تک جاتا تھا۔ سیراف کے سیاح ابوزید کو آدمیوں کے گردن پر آدمی کو سوار دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا تھا۔ بزرگ بن شہریار اس انوکھی سواری کو "ہندول" کہتا ہے جو دراصل ڈولے یا ڈولی تھی ان مرصع ساگوانی پالکیوں میں لوبجی بتی اور شرلیستی میور پنکھ کا چترہ (چھترہ) لگائے الف لیلیٰ کے طلسمی تابیوں کے دیوؤں کی طرح دوڑتے پھرتے تھے۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے دونوں طرف ناریل کے ان گزنت پیڑوں کی سپنا کھڑی تھی۔ جو برسوں پہلے برہ سمدر سے پرے ملایا کے جزیروں سے سنگدیپ کے راستے لائے گئے تھے۔ جیسا کہ ناسک گپھا کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے۔ عرب اس علاقے کو کن کو (نارجیل) ناریل والا ملک کہتے تھے۔ یہی ناریل دیگر پیداواروں کے ساتھ عراق و عرب بھیجا جاتا تھا۔ اور ناریل اور تاڑ کے بے حیا باغوں میں ململ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس سنہری اور صرف لنگوٹی کسے ہوئے ادیباسی اور ادریسی اور مسعودی کو اجنبی ضرور لگے ہوں گے[۱] اکھیورہ کی راہبوں کو دیکھ کر سیراف کے ابوزید کی آنکھوں کے سامنے اپنے وطن کی مستورات کا سخت پردہ پھر جاتا ہوگا ابن مہلہل کو جو شاہ بخارا النصر بن احمد سامانی متوفی ۳۳۱ھ کے دربار سے چینی سفیر کے ساتھ خاقان چین کے دیار کی طرف جا رہا تھا۔ صیمور کے باشندے ترکان شیرازی اور چینی گڑیوں سے زیادہ دلکش نظر آتے تھے۔ حدود العالم کے مصنف کو بیا تو ل نے بتایا ہوگا بلہرا دیس کے باسی لمبے بال اور موٹے زرد ہشتہ رکھتے تھے۔ شری استھانک راجدھانی میں اتنی سخت

---

[۱] ادریسی بحوالہ البلیت حدود العالم فارسی تہرانہ بحوالہ التاریخ دکن ص۹۵

گرمی پڑتی تھی کہ اگر کوئی تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں کھڑا ہو جاتا تو گرمی اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتی[1] حدود العالم تھانہ گزیٹیر بحوالہ تاریخ دکن ص ۹

لار دیس کے شہروں اور شاہراہوں پر عجمی یا عرب سیاحوں سے جب ان کے ہم وطنوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہوگی تو وہ اپنے وطن کی باتوں میں کھو جاتے ہوں گے۔ بزرگ بن شہریار جو دسیں عیسوی صدی میں اپنے جہاز اس طرف لایا کرتا تھا۔ ایسے کئی نو آبادکاروں سے ملا تھا جو برسوں سے کوکن میں بستے چلے آتے تھے۔

سیراف کا ایک تاجر محمد بن مسلم سے ملا تھا جو تھانہ میں بیس برسوں سے زیادہ رہا تھا اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس نے سفر کیا تھا چیمور میں خلیج فارس کے شہر نسا کے ایک سوداگر ابوبکر سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس شہر میں سیراف، عمان، بصرہ اور بغداد اور دوسرے ملکوں کے ہزاروں مہاجر اور تاجر آباد تھے۔ ملابار کے کسی دور میں عرب سے ایک مبلغ مع اپنے حواریوں سلطان اور بختیار کے کوکن آئے تھے۔ اور مرہٹوں میں اشاعت اسلام نل قبیلہ کی ایک راجکماری کو مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ حاجی ملنگ کے نام سے مشہور ہیں۔ کوکن کے اولین مبلغین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ راجپوری میں حبش کے سدی اور یمن کے بنی اسرائیل اپنے وطن کو بھول چکے تھے۔ سنجان کے پارسی بڑی بڑی جاگیروں کے مالک بن چکے تھے۔ ان کے "دوباشی" یا ایر دار جہاز ریولی تک دوڑنے لگے تھے۔ بدیسیوں بیوپاریوں اور بردہ فروشوں میں خلیج فارس کے یہودی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے تھے۔ اور اگر وہ فارسی یونانی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی اور رومی بول سکتے تھے تو یقیناً وہ ساحلی بولی لاریہ میں بھی شد بد ضرور رکھتے ہوں گے۔ جو مسعودی کے بیان کے مطابق صیمور، سوپارہ اور تانہ میں بولی جاتی تھی (لغتہ ساحلۃ مثل صیمور وتانہ) تیرہویں صدی کے اواخر میں جب کہ مارکوپولو یہاں آیا تو اسے بھی مقامی بولی سنائی دی۔

لاری دراصل عربوں کے بانائیہ یعنی بنیا بیوپاریوں کی گجراتی زبان تھی جس میں راجہ کے شاسن (احکام) وہ تھاف (فتوائین) اور دان پتر لکھے جاتے تھے۔ سر ایب یا بددعائیں پرانی مرہٹی میں نظر آتی ہیں۔ اپرادتیہ (اول) نے سٹریارک کے پیلھکھیوں کو کاشمیر کی ایک ساہتیہ سبھا میں شرکت کے لیے بھیجا تھا۔ اپرادتیہ (دوم) نے شاکنبرا کی تیندہ سنسکرت میں لکھی ہے گھاروے پاٹن کے دان پتر سے اس عہد کی ثقافت کے خطوط ابھرتے ہیں کہ کس طرح مندروں کے پاسخت شالائیں اور مندر پڑتی تھیں جبکہ دنیا سانسکرتی اور ساہتیہ کے کیندر سمجھے جاتے تھے۔

بغداد کے ابن حوقل کو سلاہار راج کنبایت سے لے کر صیمور تک پھیلا ہوا نظر آیا اور دیس کی وحدت میں چودہ سو گاؤں کی اکائیاں پھیلی ہوئی تھیں جو کھاڑیوں اور ندیوں کے کنارے آباد تھیں یا کسی کنوئیں یا تالاب کے ارد گرد گھاس پھوس کا گاؤں نظر آتا ہے۔ ارتھ شاستر میں جنگلوں کو صاف کرکے نئی بستیاں بسانے کا اندیشہ ملتا ہے۔ سلاہار راج کے کئی دال پتروں سے کئی پراچین بستیوں کے خاکے ابھرتے ہیں پوری، ستر پارک، ستری استھانک، چیمولی اور ہمکان کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی دریا کے کنارے دن اور دھارنگ استھانوں کے نام ملتے ہیں بلے

چیمولی یسوع مسیح سے قبل

پانچ ندیوں کے سنجوگ پر ایک راجہ کی راجدھانی جو چیمودیپ کی ایک سندر نگری اور تجارتی منڈی تھی، چمپاوتی کہلاتی تھی۔ راجہ کی سینا میں سولہ سو ہاتھی، ڈیڑھ لاکھ پیادہ فوج اور پانچ ہزار گھوڑ سوار تھے۔ چمپاوتی دلدلوں سے گھرا ہوا اور مگرمچھوں سے پٹا ہوا تھا چمپک کلیوں کی یہ بستی جب اور کھلی تو چیمولی بن گئی۔ جس کے سوگندھ دیشانیر تک پہنچ گئی۔ یہ شہر بدیوں، سملہ محلہ اور سیمور بن کر چھکا۔ اور عرب کے ملک میں صیمور اور چیمور بن کر چمکا۔ مگر اسے کوئی نام راس نہیں آیا۔ اور اب صدیوں کی خلیج پار کرکے صیمور کے نواح میں براہمے کا اس کی نام کی خوشبو اڑ کر چیمور بن گیا ہے۔ جو آج پٹرول اور تیل کی بو باس میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناموں کا یہ اُدل بدل اور تکرار چیمولی کی عظمت اور وسعت کا اقرار ہے۔ جس کا دامن ممبئی کے مضافاتی ماحول تک پھیلا ہوا ہے۔ چیمور کے قریب ماحول کی بستی کیا عجب کہ عربوں کے اسی ماحول لی! بنا...بلے

مسعودی جب سلاہار راجہ جنجہ کے عہد میں صیمور آیا تو یہاں دس ہزار مسلمان آباد تھے جن میں بڑی تعداد مخلوط النسل مسلمانوں کی تھی۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان عربوں اور عجمیوں کی نسل سے تھے جو یہاں بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ مقامی مسلمانوں کو مسعودی بیاسرہ کہتا ہے۔ چیمولی کے تجارتی رابطے مضافاتی بندرگاہوں اور شہروں سے ہونے کے سبب یہاں تاجروں کی آمد و رفت مسلسل رہتی تھی۔ مسعودی صنداپور (گوا) کے موسیٰ بن اسحاق کا ذکر کرتا ہے جس سے وہ ملا تھا۔ اس وقت صیمور کا ہنرمند معروف بن زکریا تھا۔ بزرگ بن شہریار کے زمانۂ قیام میں عباس بن ماہان اسی عہدے پر فائز تھا۔ ایرانیہ کے دال پتر میں چیمولی کو ساہوکاروں کی بستی کہا گیا بلے

ابو نصر بن مہلہل قنوسی کے بیان پر زکریا حمزوینی اپنی کتاب آثار البلاد میں لکھتا ہے کہ بعد

لے حدود العالم فارسی تھانہ گزیٹر بحوالہ تاریخ دکن صفحہ ۹،

لے جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۳۵ء ج ۳ صفحہ ۲۹۶ بحوالہ تاریخ کوکن $\frac{81}{82}$ سے مروج الذہب ...

"صیمور کے مقامی باشندوں کے حسن وجمال میں چین وتوران کی جھلکیاں دکھاتا ہے کہ کس طرح رنگوں کی تازگی اور چینیوں کی شیرینی، ہندوستانی لاوٹ کے ساتھ عجب نکھار اور بہار پیش کرتی تھی۔ یہ سارے سبزی خور تھے۔ ایک پہاڑ کی بلندی پر مندر تھا۔ جس میں لعل وفیروزہ سے سجائی ہوئی مورتیاں تھیں۔ مسجدوں سے سلامتی کی طرف بلانے کی بانگ بلند ہوتی تھی۔ کلیسا میں ارگن کا آہنگ گونجتا تھا۔ یہودی عبادت گاہوں میں عبرانی اہل کا فوری شمعیں روشن کئے توریت کی تلاوت کرتے نظر آتے تھے۔ زرتشتی موبد سفید دستار باندھے دستور، عود وصندل اور خوشبودار لکڑیوں کی تیز خوشبوؤں میں اوستا کی دعائیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ عود، لوبان اور خوشبودار لکڑیوں کے سب سے بڑے بیوپاری ترک ہی تھے۔ گو کہ بعض خوشبودار لکڑیاں یہاں پیدا ہوتی تھیں مگر چونکہ صیمور کی منڈی میں فروخت ہوتی تھیں اور یہیں سے دساور بھیجی جاتی تھیں۔ اس لیے یہ لکڑیاں صیمور کی کہلاتی تھیں۔ اسی سے صیمور کی تجارتی مرکزیت اور شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں عرب سوداگر بانکوٹ کی کھاڑی سے عمارتی لکڑیوں کی بدیسی تجارت میں اپنا اجارہ داری کے ستون گاڑ چکے تھے۔ [1]

سلاہار

سلاہار در اصل کوکن کے نہیں تھے۔ بلکہ وہ کنارہ کے باشندہ تھے۔ ان کے وزراء اور دیگر افسران اعلیٰ کا تعلق بھی کرناٹک اور تیلگو کے کنڑ علاقے سے تھا۔ وہ قومی حیثیت سے دراویدی اور وطنی لحاظ سے کرناٹکی تھے۔ ان کے ناموں کے آخر کار یہ جوڑ ان کی قومیت اور وطنیت کا کھلا ثبوت مہیا کرتا ہے۔ اور اس کی توثیق ان کے عہد کے دال پتروں سے بھی ہوتی ہے ان کے بہت سے القاب یا لقارے اور پربھوؤں میں رائج ہیں۔ سومناتھ پر غزنوی حملوں کے دوران پربھوؤں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور وہ زیادہ تر کوکن میں آباد ہو گئے۔ دستی میں بھی سلاہاروں کی حکومت تھی۔ اور وہاں سلاہار حکمرانوں، راجکماروں اور راج پروہتوں کے ذاتی وسیع باغ تھے ان میں بانسوں کے اوپر پان کی بیلوں کی چھاؤنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مسعودی یہاں کے تمبول (پان) اور فوفل (ڈلی) کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ہندوستان کی سپاری کی یمن، حجاز اور مکہ میں بہت

---

[1] عرب وہند تعلقات ص ۲۸۴/۲۸۷ ایضاً تاریخ کوکن ص ۸۲

مانگ تھی۔ جنھیں وہ چباتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ سپاری کے درختوں کے ساتھ ناریل کے درخت بھی اپنے سروں کو اونچا کئے کھڑے رہتے تھے جو عرب جہاز رانوں کو دور ہی سے نظر آتے تھے۔ ابوزید کے بیان کے مطابق عمان کے تاجر اوزار لے کر آتے تھے اور ناریل کے درختوں کو کاٹ کر سکھاتے پھر ان کے تختے تراش کر ناریل ہی کی چھالوں سے بنی ہوئی رسیوں سے تختوں کو جوڑ کر کشتیاں بنا لیتے۔ اس کے مغز کو مستول بنا لیتے اور اس کے کھجور جیسے پتوں کو بن کر بادبان تیار کر لیتے اور ان کشتیوں میں بھر کر ناریل عمان لے جاتے۔ عرب ناریل کے درخت کو سونے کا درخت کہتے تھے۔ اور اس سے خوب نفع حاصل کرتے تھے۔ مسعودی نے ہندوستانی آموں کی بھی بڑی تعریف کی ہے۔ یہاں کے آموں کی سی لذت کسی اور جگہ کے آموں سے وہ نہیں پایا تھا۔

آم، لیموں، ناریل، پان۔ دیبل بری راستے سے سری استھانک تک کی منڈی سے سندھ خلیج فارس اور عرب کے ساحلی علاقوں میں بھیجے جاتے تھے اور وہاں سے کھجور، ریشم، سفید لوبان، بحیرہ احمر سے مرجان، سقوطرہ اور افریقی ساحلوں سے صندل اور عنبر، لوبا اور خراسان سے درہم اسی بندرگاہ میں لائے جاتے تھے۔ دستا کے قریب سوپارہ کی کھاڑی میں موتی نکالے جاتے تھے۔ انھیں سلاہاروں کی سلطنت میں ایک شہر ہجمان تھا۔ جس کو عرب صندال کہتے تھے۔ وہ زمرد کی تجارت کے لیے خاص طور پر مشہور تھا۔ یہاں تسمے دار جوتے بنائے جاتے تھے اور چمڑا بھی اسی بندرگاہ سے ٹوئیل کے جہازوں میں عرب بھیجا جاتا تھا۔ سنجان میں عمارتی لکڑیوں کی تجارت بہت ترقی پر تھی۔ اس کے ڈانڈے خلیج فارس سے ملے ہوئے تھے۔ یہاں ساگوان، ماج اور بانس کی بہت بڑی منڈی تھی۔ بحرین کے ایک شہر کو اسی مناسبت سے عرب القطیف بھی کہتے تھے۔ حدود العالم میں صیمور کے ساتھ سندال کے بانس کے جنگلوں کا ذکر ملتا ہے۔ سنجان، سوپارہ اور جیمولی میں یہودی تاجر عورتوں اور مرد غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ [1]

ٹھاکی راجدھانی

نگرکوٹ کے زوال سے جنجہ راجہ کی قسمت جاگ اٹھی۔ البیرونی کو جغرافیہ دانوں نے بتایا

---

[1] ایلیٹ جلد اول ص ۱۷ جلد دوم ص ۳۳/۴۴۴

کہ تانہ (تھانہ) شمالی کوکن کا دارالحکومت ہے۔ سمندری خلیج کے سنگم پر آباد لارس کی راجدھانی عرب کے ایک مشہور جغرافیہ نویس ادریسی کو بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ یہ خلیج بھیونڈی سے آگے تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں پر شیرازی کشتیاں اور عربی یوراح، جنگ جہاز بوار سمندر کے شہروں، جاوا چین سے سراندیپ گزرتے ہوئے یہاں آکر لنگر انداز ہوتے تھے[۱]۔ یہاں کے سوداگر، وہاں کے سوداگر، گرم مسالے، عود، کافور، سندل، چینی برتن، ریشم وغیرہ دے کر تجارتی اسباب تھانہ میں لاتے تھے۔ اس طرح تھانہ مقامی پیداوار اور دیسی مصنوعات کی بہت بڑی منڈی بن گئی تھی۔ اور یہاں سوتی کپڑے، روئی، مسولی پٹم، عربوں کی مبیت (چھینٹ، ململ اور دیگر مصنوعات، سراندیپ، چین، عرب و ایران بھیجے جاتے تھے[۲]۔

تانہ (تھانہ) تناسی کپڑے کے بارے میں ابوالفدا لکھتا ہے :۔

"یہاں کے بنکر مصنوعی ریشم سے کس طرح کپڑے بنتے تھے۔ یہ مصنوعی ریشم، بانس کے ریشوں سے کشید کی ہوئی طباشیر (شکر) اور نیشکر کے گودے سے کیمیاوی طور سے تیار کیا جاتا تھا، تناسی یا تھانہ کا کپڑا اسی سے تھانی مشتق معلوم ہوتا ہے[۳]۔ طباشیر کی مانگ دوسرے ملکوں میں بھی تھی یہ بہت ساری دواؤں کا جزو خاص تھی۔ اور تھانہ میں دوا سازی کے کارخانوں میں اسکی ضرورت پڑتی تھی[۴]۔ یہاں عطریات کی صنعت کو بہت عروج حاصل ہو گیا تھا۔ یہاں نمک کے لیے چوڑے طالس تیار کئے جاتے تھے۔ اور یہ نمک بوروں میں بھر چار بادبانوں والے جہازوں سے ۱۲۹۰ء تک دکن بھیجا جاتا تھا۔ مارکو پولو جب یہاں آیا تو اس وقت یہ سارا علاقہ بحری قزاقوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ اس وقت تھانہ کی تجارت سوتی کپڑوں، نفیس لباسوں اور چمڑوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور سونا چاندی بیرونی ملکوں سے آتا تھا وہ نیز ہو بہ صدی آخر بھا تھانہ پہونچا[۵]۔ منگولوں کے وزیر اور مورخ رشید الدین فضل اللہ ۱۳۱۰ء اپنی کتاب جامع التواریخ میں اسے تھانہ کوکن لکھا تھا[۶]۔

سلاہاروں کا زوال

سلاہاروں کے زوال کے اسباب پر مورخین کی رائیں گو مختلف ہیں لیکن تجزیہ کے بعد غالب

---

۱ ادریسی بحوالہ الیٹ صفحہ ۷۱، جلد ۱ ۔ ۲ مارکوپولو صفحہ ۵۵، ۵۰، ۸۵، ۶۰ ۔ ۳ تاریخ کوکن صفحہ ۹۷
۴ ادریسی بحوالہ الیٹ صفحہ ۱۵ تاریخ کوکن صفحہ ۹۷ ۔ ۵ جلد ۲ صفحہ ۳۳۰/۳۴ ۔ ۶ ابوالفدا بحوالہ تھانہ گزیٹیر ایضاً مارکوپولو۔

سبب یہ نظر آتا ہے کہ وہاں بحری قزاق بری طرح چھا گئے تھے ان کی ستم سوز سرگرمیاں ، ستم ظریفیاں حد سے تجاوز کر گئیں تھیں ۔ یہاں کی کھاڑیاں اور بمبئی کے جزائر ان کی چھاؤنیاں تھیں ۔ بحری قزاقوں کو طاقتور بنانے والے اور ان کی پشت پناہی کرنے والے خود اس کے حکمراں تھے ۔ کیونکہ ان کے لوٹے ہوئے مال میں حکومت بھی حصہ دار تھی ۔ مال کی درآمد و برآمد کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اقتصادی حالت ابتر ہو گئی ۔ اور مالی نظام کمزور ہو گیا ۔ بیرونی تاجروں کے مال لانے لے جانے کا سلسلہ رک گیا ۔ اور وہ تھانہ چیمول کے بجائے گومنت کی بندرگاہوں کا رخ کرنے لگے تھے ۔ جہاں عراق و عجم کے جہاز اور گھوڑوں کے سوداگر اس نئی منڈی کے گرد منڈلانے لگے تھے ۔

پہلے گومنت کی وسعت چودہ سو دیہاتوں تک پھیلی ہوئی تھی مگر بعد میں سمٹ سمٹ کر اس کا احاطہ صرف ساٹھ دیہاتوں سشتی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا ۔ اگر ہارول کے برہمن دیوگری کے راجہ کی حمایت پر مندروں سے نکل کر میدان جنگ میں داد شجاعت نہ دیتے تو کوکن کے مہامنڈلیشور گدیوں پر براجمان ہوتے نیوبل دیرات کے مہامنڈلیشور کا گڑھ بن گیا ۔ سنہ ۱۲۷۱ء سے سنہ ۱۳۰۹ء کے درمیان مہامنڈلیشور کافی طاقتور ہو گئے اس کے ساتھ انھوں نے اپنے چکرورتی کے جبر اتی مراسم اور دال بن کی ریت روش کو بدستور قائم رکھا ۔ اور سشتی ، بھیونڈی اور کالوار کے دیہاتوں کو دکشنا میں دیدیئے ۔

شری کرشن دیو سنہ ۱۲۶۰ء تا سنہ ۱۲۷۹ء پورے کوکن کے علاقہ کا خود مختار بن گیا اور اسی زمانہ میں مارکوپولو تھانہ آیا تھا اس کے راجہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے : ۔

سانسکرتی اور پرمپرا کی

چند یادگاریں عبادت اور عمارت کے روپ میں مندروں اور دال بتروں میں آج بھی موجود ہیں شیلاگاؤں کا نام اور سیلر کا مرہٹی لقب ہزاروں سال گزرنے کے باوجود آج بھی شلاہاروں کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ ساتھ ہی افسوسناک بات یہ ہے کہ شلاہاروں کے زوال کے ساتھ کنڑی بولنے والے حکمرانوں سے حلقہ اثر و اقتدار سے دکن کا علاقہ نکل گیا اور یادو راج کی سیاسی اکائی میں ختم ہو کر رہ گیا اور اس اکائی میں نئی تہذیب اور ایک نئی بھاشا ابھرنے لگی ۔

عرب و عجم سے جو مسلمان کوکن میں آباد ہو گئے تھے ان کا شمار اب کوکن کے قدیم باشندوں میں ہونے لگا تھا ۔ ان کی اب مستقل بستیاں بس گئی تھیں ۔ شمالی ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا بتدریج حد کا کے ابتدائی زمانہ ان کی اپنی قوت اور طاقت کے لحاظ سے کافی مستحکم اور مضبوط ہو گئی تھی لیکن سیاسی اور معاشی اور مالی اعتبار سے ان کو استحکام اور استقلال ابھی کو حاصل نہیں ہوا تھا اس لیئے ان کو سرمایہ کی ضرورت تھی اور ان کو اس سے اس کا خزانہ

خالی تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سرمایہ کی فراہمی کا موثر ذریعہ کسی دوسرے ملک پر یورش اور فتح کے بعد اس کے مالِ غنیمت پر قبضہ تھا گو اس طرح کی ملک گیری کو موجودہ اصطلاح میں توسیع پسندی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن اس زمانہ میں حکومت کی آمدنی کا ذریعہ خراج اور محصولات تک محدود تھا یا کوئی منصوبہ بندی جیسا پیدا نہیں ہوا تھا۔ جنگ بازوں کی نظر میں تجارت کے ذریعہ حصولِ مال کا طریقۂ عمل دیر طلب تھا اور صبر آزما تھا۔ یہاں تو دولت کو تلاش کرنے والی نگاہیں سنگین قلعوں میں محفوظ گنجہائے گراں مایہ کی طرف اٹھتی تھیں یہاں سیم و زر کے بے اندازہ ذخیرے پوشیدہ رہتے تھے۔ دیوگیری کے راجہ کے پاس سونے چاندی سے معمورات خزانوں کی خبریں علاءالدین کے کانوں تک مسلسل پہونچ رہی تھیں۔ ۱۲۹۴ء میں جلال الدین کا بھتیجا آندھی کی طرح آیا اور بے اندازہ مال و دولت سمیٹ لے گیا اس کا سارا اندوختہ لوٹا اور اپنے ہمراہ لے کر چلا گیا لیکن اس نے اپنے لیے مسلم اقتدار کے لیے راہ ہموار کرگیا۔ اب علاءالدین دہلی کا بادشاہ تھا۔ اس لیے اپنے سپہ سالار ملک کافور کو ایک لشکر جرار کے ساتھ بھیجا اس کی تفصیل میں تاریخ دکن کے مصنف لکھتے ہیں :-

"ملک کافور جیول اور دھول سے لیکر رائچور اور ورنگل تک سارے جنوب میں غارت گری کا ایسا ہولناک کھیل کھیلا کہ لوگوں کے دل دہل گئے۔ شہر اجڑ گئے سلطنتیں لوٹ گئیں۔ دکن میں نراج پھیل گیا مگر کوکن میں ایک نئے راج کی نیو پڑگئی۔ ایک روایت کے مطابق اسی عہد میں شاہ نصیرالدین اعظم خاں نامی ایک امیر نے سمندر کے راستہ سے دابھول کے راجہ ناگوجی کے اوپر حملہ کرکے اس کے راج پر قبضہ کر لیا۔ اور اپنے بیٹے کے نام پر اس کا نام مصطفٰے آباد رکھ لیا۔ جھگ اسی دور میں راج پور بھی مسلم مقبوضہ بن گیا" ۔[۱]

ہند میں اسلامی تعلقات کی ابتدا

اسلام کے آفتابِ حق جب طلوع ہوا تو اس کا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا۔ اس وقت کی دنیا کا سب سے طاقتور فرماں روا یزدجرد ساسانی شہنشاہ ایران تھا۔ اس کے عالیشان ایوان کے کنگرے لوٹنے لگے بحیرۂ طبرس کے چشمے خشک ہونے لگے۔ ساوہ کی وادی اجڑ گئی۔

---

[۱] تاریخ دکن ص ۱۳۰

نئے دین کے پرانوار بجلیوں سے ہر مرزوبوم کی روشنی ماند پڑ گئی اور فارس کے آتشکدے میں سالہا سال سے جلتی ہوئی آگ سرد پڑ گئی۔ اہل عرب کو اسلام لانے کے بعد قدرتی طور پر دین کی تبلیغ کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ اس ولولہ کو لے کر عزم کے ساتھ مختلف ممالک کی تسخیر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ان میں صحابہ کرام تھے اور تابعین عظام بھی رفتہ رفتہ وہ عرب و عجم کے اکثر ملکوں کے وارث بن گئے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ اسلامی سیاسی تعلقات کی ابتدا سندھ سے ہوئی تھی۔ سندھ پر حملے کا واقعہ ۹۳ھ میں پیش آیا تھا اور محمد بن قاسم ثقفی نے ریگستان سندھ کو طے کر کے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

ہندوستان میں اسلامی تعلقات کی ابتداء

ملک سندھ کو اس کے بعد مرزبوم کی خصائص کی بنا پر سرزمین عرب کے ساتھ بہت سی باتوں میں مشابہت بھی رکھتا تھا۔ سندھ کی یہ اسلامی سلطنت کم و بیش بارہ سو سال تک مسلمانوں کے اقتدار اور حکومت کے تحت رہتے گزاری جس کی حدیں ایک طرف راجپوتانہ سے دوسری تک وادیٔ کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سے بہت پہلے ان کی نظریں گجرات کی سرسبز پہاڑیوں پر برابر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس وقت تک نہ ہٹیں جب تک وہ اس پر قابض نہیں ہوئے۔

مسلمانوں کا پہلا حملہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرمانے کے پانچ سال بعد سنہ ۱۵ھ فاروق اعظم نے اپنے عہد خلافت میں بحرین و عمان کی امارت پر عثمان ابن ابی العاص ثقفی کو مامور فرمایا جن کا اصحاب کرام میں شمار تھا انھوں نے عنان سنبھالنے کے بعد اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کا سفیر مقرر کیا۔ اور ساتھ ہی ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا۔ حکم نے کشتیاں تیار کیں اور ان کے ذریعہ سے سمندر کی کٹھن اور دشوار گزار راستہ طے کر کے اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ سب سے پہلے جس ساحل پر لنگر انداز ہوئے وہ گجرات ہی کا ایک ساحل تھا۔ اس لحاظ سے سرزمین گجرات کو یہ شرف و فخر حاصل ہوا کہ اس کو ایک اللہ پر ایمان لانے والوں اور معبود برحق کے اپنے والوں، اسلام کے داعیوں اور دین کے مبلغوں کے مبارک قدم سب سے پہلے اس دھرتی کو شرف بخشا تھا اور اسی سرزمین کے دشت و جبل سے اس دیار ہند میں سب سے پہلے اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھے۔

اس حملے میں جنھیں شہادت حاصل ہوئی ان میں غالباً وہ بھی تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھنا نصیب ہوا تھا اور جن کو آپ کی پاکیزہ صحبتیں میسر ہوئی تھیں۔

ان جانبازان اسلام کی قدسی لاشیں اس سرزمین کی آغوش میں گنج گراں مایہ کی طرح آسودۂ خاک ہیں۔ اگرچہ کہ آج ہم کو ان کی کنز مخفی کا نشان و پتہ نہیں ملتا۔ یاد ایام کے مصنف کی صراحت کے مطابق ۱۔ مگر یہ یقینی ہے کہ بمبئی اور بھروچ کے گرد و نواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا لیکن اس زمانے میں بمبئی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ آج آپ جس کو ایک آباد پر رونق و ودق، شاندار اور پر رونق اور عروس البلاد کی صورت میں دیکھ رہے ہیں وہ جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ایک غیر آباد ٹاپو تھا۔ مگر اسی کے قریب تھانہ تھا۔ جس کو عربی کتابوں میں تانہ لکھا گیا ہے اور جو اب ضلع تھانہ کا صدر مقام ہے وہ بہت بارونق اور آباد اور تجارتی مرکز تھا اور اسی پر سب سے پہلے مسلمانوں کا حملہ ہوا تھا۔ ۲؎

دوسرا حملہ اس کے بعد دوسرا حملہ حکم بن ابی العاص نے بھروچ پر کیا۔ جس کو عرب اپنی کتابوں میں بروص یا بروجن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو اس زمانہ میں تیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا ایک آباد بندر تھا ۳؎ مگر چونکہ یہ حملہ فاروق اعظمؓ کے اذن کے بغیر کیا گیا تھا۔ اور جب انھیں اس کی اطلاع ملی تو ان کی رائے بحری سفر کے خلاف ہونے کی بنا پر مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹ گئی ۴؎

تیسرا حملہ ۹۳ھ میں جب سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو ہشام ابن عبدالملک خلیفہ دمشق نے ۱۰۷ھ میں جنید بن عبدالرحمان کو مری کو سندھ پر حکومت کا امیر مقرر کیا وہ ایک باہمت اور سرگرم امیر تھا اس نے اپنی حکومت کا مناسب انتظام کے بعد گجرات پر حملہ کی تیاری شروع کی۔ اور اپنی طرف سے عربی فوج کی ایک جماعت کچھ جس کو عرب نقہ کہتے تھے روانہ کیا اور یہ فوجیں بھروچ کو روندتی کچلتی ہوئی مالوہ میں داخل ہو گئیں۔ دشمنوں کو ہر جگہ پسپا کیا اور ہر جگہ فتوحات حاصل کیں اور بے شمار غنیمتیں ہاتھ آئیں ۵؎

چوتھا حملہ ۱۵۹ھ میں المہدی باللہ عباسی خلیفہ بغداد نے عبدالملک بن الشہاب المسمعی کافی ساز و سامان سے لیس ایک بڑی فوج جس کے ساتھ فوج مطوعہ (والنٹیر) بھی تھی روانہ کیا۔ یہ فوج ۱۶۰ھ میں باربد پہونچی اس فوج نے ابتداً بعض مقامات پر فتوحات حاصل کیں۔ عبدالملک آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بیچ میں دریا حائل تھا اور وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا۔ اسکے اترنے کے انتظار میں عساکر اسلامیہ کو کچھ دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ اس اثنا میں وہاں ایک گندی اور زہریلی ہوا نمودار ہوئی جس کے نتیجہ میں وبا کے مہلک اثرات ہر طرف پھیل گئے۔ اور اسلامی فوج کے

۱؎ یاد ایام مولانا عبدالحئی صفحہ ۳۱ (۲) فتوح البلدان بلاذری۔ ۳؎ معجم البلدان حموی۔ ۴؎ فتوح البلدان بلاذری۔ ۵؎ فتوح البلدان بلاذری ۶؎ مولانا عبدالحئی یاد ایام میں لکھتے ہیں کہ مجھکو اب تک یقینی طور پر معلوم نہیں کہ بابد کس نام کا معرب ہے اور یہ کہاں پر تھا۔ عرب تاریخوں میں بتایا ہے کہ یہ شہر سندھ کا کوئی شہر ہے مگر مجھکو یقین نہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کم و بیش ایک ہزار اشخاص لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان میں ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے۔ جو ایک تابعی اور بڑے پایہ کے محدث تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے حدیث کی کتاب تصنیف کی ان کے بارے میں صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ :-

"ھو اول من صنف الاسلام" یہ مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب تصنیف کی یہ ربیع بن صبیح اس بیماری میں رحلت پا گئے۔ اور اسی سر زمین پر پیوند خاک ہو گئے۔ اس طرح یہ دوسرا شرف سر زمین ہند کو حاصل ہوا کہ ایک جلیل القدر تابعی حدیث شریف سے سب سے اول کتاب کے لکھنے والے مصنف اس کی آغوش لحد میں آرام فرما ہیں۔

محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ

اس کے بعد محمود غزنوی کا دور آیا۔ اور وہ ۴۱۶ھ میں تیس ہزار فوج کثیر کے ساتھ اول ملتان آیا۔ اور پھر وہاں سے گجرات کی طرف روانہ ہوا۔ یہ راستہ ناہموار اور نہایت دشوار گزار پانی کی کمیابی۔ غرض ہر طرح سے مشکلات سے گھرا ہوا تھا۔ اس کے باوجود عزم ملوکانہ اور ہمت مردانہ کے آگے یہ رکاوٹیں پیش قدمی سے انھیں روک نہ سکیں۔ غزنوی لشکر ریگستانوں کو طے کرتا ہوا انھلواڑہ پہونچا۔ اس کو عربی تاریخوں میں نہروالہ لکھا گیا ہے۔ اس زمانہ میں یہاں کا راجہ بھیم تھا اور انہلواڑہ اس کا پایہ تخت تھا لیکن بعد میں اس کا نام پٹن (دفن) پڑ گیا تھا۔ محمود غزنوی اس کو زیر وزبر کرتا ہوا آگے بڑھا اور دیول واڑہ کو فتح کیا۔ یہ اس زمانے میں دوسرے راجہ کا شہر تھا۔ یہاں سے سلطان محمود سومناتھ کی طرف یورش کا ارادہ کیا۔ سومناتھ ساحل گجرات پر ہندوؤں کا متبرک مقام اور سب سے بڑا تیرتھ گاہ ہے۔ سومناتھ میں محمود کا نہایت ہی سنگین مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود وہ غالب اور کامیاب ہوا[۱] اور بے حساب مال و دولت سمیٹ کر واپس غزنی چلا گیا۔

شہاب الدین غوری کے حملے

۵۷۴ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان ہی کے راستہ گجرات پر دھاوا کیا۔ راجہ بھیم دیو اس وقت وہاں حکمراں تھا۔ اسنے ڈٹ کر مقابلہ کیا اس جنگ میں شہاب الدین غوری

بقیہ حاشیہ[۱] عرب مورخوں کا دستور ہے کہ وہ ہندوستان کے ہر شہر کو سندھ بنا دیتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ یہ مقام خلیج کمبایہ (کھمبایت) میں کہیں واقع ہے۔ ایام ص۷۱ صفحہ ہذا

[۱] ابن الاثیر کامل

کو شکست اٹھانی پڑی۔ اس شکست سے غوری حملہ آوروں کے حوصلے پست اور ہمتیں ٹوٹ گئیں لیکن اس کے چند ہی دنوں بعد لاہور اور دہلی کے عظیم فتوحات ان کے حق میں نعم البدل ثابت ہوئیں اور اس فتح وکامرانی نے ان کے گزشتہ جنگ کے دوران شکست کی خفت سے جھکے ہوئے سروں کو اونچا کر دیا[1] پھر سنہ ۵۹۱ھ میں اجمیر فتح ہونے کے بعد قطب الدین ایبک اپنے آقا شہاب الدین غوری کی اجازت سے گجرات پر دوبارہ حملہ کیا۔ سخت لڑائی کے بعد راجہ بھیم دیو کو میدان جنگ میں شکست فاش اٹھانی پڑی۔ قطب الدین ایبک اس سے تاوان جنگ وصول کر کے دہلی واپس چلا گیا۔ لیکن اس سے شہاب الدین غوری کے دل کو تسکین نہیں ہوئی وہ گجرات پر مکمل قبضہ کے لیے برابر بے چین رہا۔ سنہ ۵۹۷ھ میں دوبارہ قطب الدین کو گجرات کی مہم پر بھیج دیا۔ اس مرتبہ بھی قطب الدین نے راجہ بھیم کو ایسی شکست دی کہ اس نے راہ فرار اختیار کی اور کسی محفوظ مقام پر پناہ گزین ہونے پر مجبور ہوا۔ قطب الدین نے نہروالہ پر قبضہ کر لیا۔ سلطان شہاب الدین کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ جب تک وہ خود یا قطب الدین گجرات میں مستقل سکونت نہیں کر لیں گے اس کا موثر اور خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اس نے قطب الدین کو حکم دیا کہ وہ بھیم دیو سے سالانہ خراج پر مصالحت کر کے واپس آ جائے۔ چنانچہ قطب الدین حکم سلطانی کی تعمیل کے ساتھ دہلی واپس آ گیا[2]

علاء الدین خلجی کا گجرات پر حملہ اور مسلمانوں کا تسلط

علاء الدین خلجی نے سنہ ۶۹۷ھ میں کافی ساز و سامان جنگ کے ساتھ الغ خاں کی سالاری میں گجرات کی تسخیر کے لیے بھیجا اس وقت گجرات کی فرماں روائی راجہ کرن جیسے فاتح کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے علائی خروج کا نہایت دلیری سے مردانہ وار مقابلہ کیا اور اپنا پورا زور اور ساری قوت کو کام میں لانے کے باوجود شکست سے بچ نہ سکا۔ شکست کے بعد راجہ کرن دیو گڈھ وانڈہ میں پناہ گزین ہو گیا اور اس کا تمام سامان خزانہ، مال و متاع، ہاتھی گھوڑے الغ خاں کے قبضہ میں آئے قیدیوں میں رانیاں اور راجہ کی بیٹی دیول دیوی راجکماری بھی تھی۔ ان سب کو الغ خاں نے دہلی روانہ کر دیا۔ اور نہروالہ کو دار الحکومت بنایا۔ اور وہاں سب سے پہلے ایک جامع مسجد کی تعمیر شروع کر دی[3] غالباً گجرات بھر میں اپنی نوعیت کی ایک سب سے پہلی جامع مسجد تھی۔ الغ خاں کو اہل گجرات الپ خاں یا الف خاں کہتے تھے۔

---

[1] ابن الاثیر کامل [2] ابن الاثیر کامل [3] تاریخ فرشتہ بحوالہ بادایام

دیول دیوی کا ذکر ضمناً آیا ہے۔ اس کی مزید کچھ تفصیل سن لیجیے۔ دیول دیوی جب دہلی پہونچی تو اس کے ساتھ نہایت پیار و شفقت کا برتاؤ کیا گیا اور اس کی تعلیم و تربیت شہزادیوں کی طرح کی گئی۔ جب وہ شادی کے قابل ہوئی تو سلطان علاءالدین نے اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی میں ان دونوں کے معاشقہ کا ذکر نہایت پر لطف اور دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ جس کے دو تین اشعار ہم یہاں برائے نمونہ "یادِ ایام"[1] سے نقل کرتے ہیں

کہ دول رانی کہ ہست از دو زمانہ   زشاہزادگان ہندوستان یگانہ
برسم ہندواں از نام تابش   دراول بود دیول دیوی خطابش
بنام آں پری چوں دیدہ داشت   فسون ہندواں دیوی نگہ داشت

الغ خاں نے بیس برس تک نہایت تدبر اور حسن انتظام کے ساتھ حکومت کی۔ اس کے زمانہ میں ہر طرف امن و امان رہا۔ اور ہر طرح کے فتنہ و فساد سے محفوظ اور پاک رہا اس کے بعد دیگرے مختلف صوبے دار دہلی سے منتخب ہو کر آتے رہے اور ہر ایک نے اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق گجرات میں امن و سلامتی قائم رکھنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

گجرات میں خود مختار اسلامی سلطنت کا قیام

محمد شاہ تغلق کی بعض تشدد آمیز کارروائیوں سے تنگ آکر علاءالدین حسن بہمنی نے تغلق شاہی حملوں کو پسپا کر کے زمین دکن سے اس کو بے دخل کر دیا تھا۔ اور تغلق شاہی بالادستی سے آزاد ہو کر اپنی ایک خود مختار سلطنت گلبرگہ میں قائم کر لی تھی۔ یہ واقعہ اس کی زندگی کے آخری دور میں پیش آیا تھا۔ اس کے چند ہی دنوں بعد محمد شاہ تغلق کا انتقال ہو گیا اور فیروز شاہ اس کا جانشین ہوا اس کو اپنی حکومت کے بقا و استحکام اور مواقفتی انتظام کی طرف توجہ دینے کے لیے ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر علاءالدین حسن بہمنی نے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مضبوط بنا لیا۔

بنگال اور کشمیر کے خود سر فرماں روا مرکز سے اپنا ناطہ توڑ کر پہلے ہی آزاد ہو چکے تھے اور اب دکن کی علیحدگی اور خود مختاری نے ایک طرف مرکز کو کمزور کر دیا اور دوسری طرف دوسرے صوبے داروں کے لیے مرکز سے بغاوت کا حوصلہ فراہم کر دیا۔ فیروز شاہ کے انتقال کے بعد اس

---

[1] "یادِ ایام"

کے بیٹے محمد شاہ کے کمزور ہاتھوں میں سلطنت کی باگ ڈور آگئی تھی اس کی ناقابلیت کی وجہ سے جابجا خانہ جنگیاں اور مختلف علاقوں میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ادھر گجرات کے گورنر نے بغاوت اختیار کی۔ حالات جب قابو سے باہر آتے نظر آئے تو محمد شاہ نے اپنے ایک امیر ظفر خان کو بھی سنہ ۷۹۳ھ میں گجرات کا گورنر مقرر کر کے روانہ کیا۔

ظفر خاں گجرات میں

ظفر خاں گجرات میں پہونچ کر اپنی تمام تر توجہ اس وقت وہاں پھیلی ہوئی بغاوت کی آگ فرو کرنے میں صرف کی۔ اس کے بعد اس نے انتظامی معاملات میں سدھارنے اور ملکی اور عوامی حالات بہتر بنانے میں لگ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے حالات پرسکون ہو گئے۔ اور امن واطمینان کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے قرب وجوار کے راجاؤں پر اپنی دھاک ایسی بٹھادی کہ وہ اس کے سامنے اپنی اطاعت کا سر جھکانے لگے۔ غرض اس نے اپنے حسن تدبر اور انتظامی صلاحیت عمدہ کارکردگی، مسلسل محنت اور انتہائی جفاکشی سے کام لے کر چند روز میں اس نے گجرات کے ایک نئے ترقی کے مقام تک پہونچایا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کی سلطنت کے حدود میں پہلے کے بہ نسبت بہت زیادہ وسعت حاصل ہو گئی

ظفر خاں کی خود مختاری

یہاں کا یہ حال تھا ادھر دہلی کی سلطنت کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ تباہی کے سائے اس کی طرف برابر بڑھتے آرہے تھے۔ زوال کے آثار اور اسباب ان کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ بادشاہ برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ حکمرانی کے تمام اختیارات اس کے وزیر اقبال خاں کے قبضۂ اقتدار میں آچکے تھے۔ تیمور گورگان کی للچائی ہوئی نظریں عرصہ سے ہندوستان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ موقعہ کی تاک میں تھا۔ اس کے لیے اب میدان ہموار تھا۔ وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ آندھی کی طرح دہلی پہونچا اور اس کی رہی سہی عظمت اور شان و شوکت کو خاک میں ملا دی۔ اور ایسی تباہی مچائی کہ الامان والحفیظ کی صداؤں سے سارا دہلی گونجنے لگا۔ فیروز شاہ کا خاندان برباد ہو گیا۔ اس طرح سنہ ۸۰۱ھ میں فیروز شاہ تغلق کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جو صوبہ دار اور والیان کے حکام خود مختاری کا علم بلند کر چکے تھے۔ ظفر خاں کے لیے بھی خود مختاری کے اعلان کے لیے حالات

بہت ساز گار تھے اور ہموار تھے۔ مگر جلد بازی کے بجائے اس نے خاموشی اختیار کی۔ آخر ۸۱۰ھ میں علماء ومشائخ کی اتفاق رائے اور فرزند اکبر تاتارخاں کے پیہم اصرار پر مظفر شاہ لقب کے ساتھ خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اجڑتے ہوئے دہلی سے جو تباہ حال خاندان کو اپنی جانیں بچائے افتاں وخیزاں گجرات پہونچ گئے تھے انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی اور علماء ومشائخ کو بہ اطمینان زندگی گزارنے اور دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض علمی ودینی بجالانے کے ضروری اسباب مہیا کردیے اور ۸۱۳ھ میں بانیک نام اور ہردل عزیز بادشاہ سفر آخرت اختیار کیا۔

صوبیداروں کی خود مختاری

اس کی تفصیل میں مولانا حکیم عبدالحئی صاحب مرحوم اپنی کتاب یاد ایام کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:۔

"حسن اتفاق دیکھو محمد شاہ اور اس کے بیٹے محمود شاہ نے چار شخصوں کو ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں کی حکومتیں دیں اور آخر کار ان چاروں نے خود مختار سلطنتیں قائم کرلیں، ظفر خاں کو گجرات بھیجا گیا۔ خضر خاں کو ملتان، دلاور خان کو مالوہ، ملک سرور کو جونپور، ان میں سے خضر خاں کو تیمور نے دہلی کا بادشاہ بنادیا۔ اور دلاور خان اور ملک سرور خود ہی آزاد ہوگئے ظفر خاں کچھ دنوں رکا رہا۔ آخر کار اس کو بھی وہی کرنا پڑا۔ جو اس کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ دہلی کی سلطنت پنجاب میں محدود ہو کر رہ گئی"[1]

احمد شاہ اوّل

مظفر شاہ کے وفات کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ تاتارخاں کا بیٹا تھا چونکہ تاتارخاں اپنے والد مظفر شاہ کی زندگی میں ہی انتقال کرگیا تھا اس لیے تاج وتخت کا وہی وارث بنا۔ احمد شاہ ایک بیدار مغز، بلند حوصلہ، ذی ہمت اور بہمہ گیری ذہن رکھنے والا اور بہت اچھا انتظامی صلاحیتوں کا حامل بادشاہ تھا سب سے پہلے اس نے اپنے نام پر احمد آباد کا سنگ بنیاد رکھا اور نہایت خوبی حسن وخوش اسلوبی سے اس کو آباد کیا جو عرصہ دراز تک ہندوستان کا خوبصورت اور بے نظیر شہر کہا جاتا تھا اور اس کے ساتھ احمد شاہ ہندو راجاؤں اور دوسرے دشمنوں سے

---

[1] یاد ایام ص۱۵

اپنی مملکت کو محفوظ رکھنے کے لیے سرحدوں کو مضبوط کیا۔ اس دوران میں اس کو بارہا سخت خونریز جنگوں اور نہایت ہنگاموں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہمیشہ وہ فتحیاب رہا اور گرد و پیش کے تمام راجہ اس کو خراج دینے اور اس کی بالادستی تسلیم کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کی زندگی کا سب سے اہم اور نمایاں کارنامہ وہ دستور ہے جس کو اس نے اپنے وزراء اور عمائدین کے مشورہ سے مرتب کیا تھا۔ اور جس میں ہر شہری کے لیے بنیادی حقوق، فرائض و اختیارات، قواعد و ضوابط کی تشریح کے ساتھ پورے ملک کے لیے ایک مستقل آئین کی صورت دی گئی تھی۔ اس کو انھوں نے اپنے عہد میں نافذ کر دیا اور جو مظفر شاہ حلیم کے زمانے تک جاری رہا۔ اس بادشاہ نے کم و بیش تیئیس سال تک بحسن و خوبی حکمرانی کے بعد ۸۴۳ھ میں وفات پائی۔

محمد شاہ

اس کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ جانشین ہوا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طبعاً فیاض اور عافیت پسند تھا۔ عام طور پر وہ زر بخش و لک بخش کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے زمانہ میں محمود شاہ خلجی اور شاہ مالوہ نے گجرات پر چڑھائی کی۔ وزراء اور سربرآوردہ حضرات نے اس کو ہر چند مدافعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر بھی وہ خاموش رہا۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مجبوراً زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ نو برس اس نے بادشاہی کی۔ اس کی وفات ۸۵۵ھ میں ہوئی۔

قطب الدین احمد شاہ

محمود شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا احمد شاہ قطب الدین احمد شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا یہ بادشاہ چابک دست دلیری اور بہادری میں اپنے باپ کا ایک بہتر نمونہ تھا اس کا مقابلہ سب سے پہلے محمود شاہ کے بیٹے خلجی سے ہوا اور اس کو پے در پے شکستیں دے کر واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران اس کو معلوم ہوا کہ رانا کو نبھا کے راجہ نے ناگور پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ برق و باد کی طرح اس کی طرف جھپٹا اور رانا کو ایسی شکست دی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا اور چتوڑ کے قلعہ میں پناہ لی۔ احمد شاہ نے اس کا تعاقب کیا اور آبو کا قلعہ بھی فتح کر لیا اب رانا کو اس کے آگے سر جھکانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ اس سے یہ اقرار لے لیا گیا کہ وہ آئندہ پھر کبھی ناگور کا رخ نہیں کرے گا۔ تاوان جنگ وصول کر کے یہ واپس ہوا۔ اس نے کم و بیش آٹھ برس حکومت کی۔ ۸۶۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

محمد شاہ اوّل

قطب الدین کے بعد اس کا چھوٹا بھائی فتح خان محمود شاہ اول کے نام سے تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ ایک حکمراں کے لیے جو صفات حسنہ ضروری ہیں وہ سب اس میں موجود تھیں۔ بعض راجاؤں کے بارے میں اس کو کھٹکا لگا رہتا تھا اس لیے اس نے جوناگڑھ اور چانپانیر پر فوج کشی کی۔ اور ان دونوں ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ جب خلجی نے دکن پر حملہ کیا تو اس نے اہل دکن کی حمایت کے لیے ایک زبردست اور طاقت ور فوج بھیجی جس کی وجہ سے محمود شاہ خلجی کو ناکام واپس جانا پڑا۔ برہان پور کے حکمرانوں کو جب ضرورت پیش آئی ان کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ خود اپنے ملک میں عوام کے لیے جو نمایاں طور پر خدمات انجام دیں۔ اس کا ذکر یاد ایام کے مصنف اس طرح کرتے ہیں وہ اپنے ملک کے لوگوں کی ایسی حوصلہ افزائی کی کہ سارا ملک سرسبز تھا اور شادابی میں باغ و بہار نظر آنے لگا۔ دیہات اور قصبات آباد و معمور ہوگئے۔ احمد آباد صنعت و حرفت کا مرکز بن گیا۔ سورت، بھڑوچ، کھمبایت (کھمبایت) دیو اور دمن وغیرہ بنادر گجرات تجارت کی گرم بازاری سے آباد اور پررونق ہوگئے۔ نہروالہ، بڑودہ، سلطان پورہ، اور احمد نگر کی شہرت میں اضافہ کیے گئے چانپانیر کے قریب محمد آباد، جوناگڑھ میں مصطفےٰ آباد اور احمد آباد سے بارہ کوس پر محمود آباد کے نام سے متعدد شہر آباد کیے گئے۔ ہر جگہ مدرسہ اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔ سکندر شاہ لودھی نے تحائف بھیج کر دوستی کا اظہار کیا۔ سکندر لودھی کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ مدار بادشاہ دہلی برگندم و جوار است و بنیاد بادشاہ گجرات بر مرجان و مروارید کہ شہنشاہ در چہار بندر در تحت شاہ گجرات است۔

مظفر شاہ حلیم

محمود شاہ نے چون سال حکومت کی اس کی حکومت نسبتاً بہت کامیاب رہی ۹۱۷ھ میں وہ رحلت کر گیا اس کے بعد اس کا فرزند مظفر شاہ حلیم تاج و تخت کا مالک بنا یہ بادشاہ عالم و فاضل متقی و صالح تھا اس کے متعلق مولانا عبد الحیٰ لکھتے ہیں۔

"علوم و فنون میں یہ علامہ محمد بن محمد الایجی کا شاگرد تھا اور حدیث علامہ جمال الدین محمد بن عمر بحرق سے پڑھی تھی۔ قرآن مجید کے حفظ کر لینے کا شرف ایسی عمر میں اس کو نصیب ہوا تھا

لہ یاد ایام ص ۱۲ ۔ ۔ ۔ لہ مراۃ سکندری مصنفہ مرزا سکندر بن محمد اکبر بن گجراتی

جس کی نسبت شیخ سعدی فرماتے ہیں۔ "در ایام جوانی چناں کہ افتد و دانی" اس فضل و کمال کے ساتھ تقویٰ اور عزیمت کی دولت بھی اس نے پائی تھی۔ تمام عمر نصوص حدیث پر عمل رہا۔ ہمیشہ باوضو رہتا۔ نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا۔ روزے عمر بھر نہیں چھوٹے۔ شراب ناب کو بھی منہ سے نہیں لگایا۔ کبھی کسی پر بیجا سختی نہیں کی۔ بدزبانی سے کبھی اپنے منہ کو گندہ نہیں کیا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ اس پیکر تقدس میں سپہ گری اور ملک گیری اور دنیا داری کی صفتیں بھی علی وجہ الکمال مجتمع تھیں۔ مالوہ کی فتوحات عظیمہ تاریخوں میں پڑھیے اور ان باتوں سے اس کے اخلاق فاضلہ کا اندازہ کیجیے[1] اس نے چودہ برس داد حکومت دی اور سنہ ۹۳۲ھ میں راہ گیر عالم جاودانی ہوا۔

بہادر شاہ

مظفر شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ ابھی اس کو تخت نشین ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ اس کو اپنے بھائی بہادر شاہ کے لیے تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔

بہادر شاہ محض نام ہی کا نہیں بلکہ حقیقت میں بہادر تھا۔ اس کے بہادرانہ اوصاف اور شجاعانہ حالات کی دور دور تک دھوم مچی تھی۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی سارے ہندوستان میں ہلچل سی مچ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطنت دکن کے تمام بڑے سرنگوں ہو گئے۔ احمد نگر کے نظام شاہ، برار میں عماد شاہ، برہان پور میں محمد شاہ نے اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ بہادر شاہ ہی نے حسب ذیل مالوہ کی عظیم الشان سلطنت کو اپنی مملکت گجرات میں شامل کر دیا۔ چتوڑ اور رنتھنبور کے عالی شان قلعے فتح کر لیے۔ بیانہ کا قلعہ پھوڑ توڑ کر سطح زمین کے برابر کر دیا۔ اس سے فراغت کے بعد اب نظر دہلی اور آگرہ کی طرف جا رہی تھی۔ بہادر شاہ کا ہمایوں شاہ سے مقابلہ ہوا لیکن عین وقت پر تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور تدبیر کام نہیں آئی اور رومی خاں جیسے بے وفا نمک حرام کی سازش سے بہادر شاہ کو شکست اٹھانی پڑی۔ اس کے بعد پرتگیزوں نے اس کے خلاف ایک بڑی گہری سازش کی۔ جس کے نتیجہ میں سنہ ۹۴۳ھ میں وہ اس دنیا سے چل بسا۔ بندر گوا پر شاہان بیجاپور کے طفیل سے پہلے ہی سے پرتگیزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اب بندر دیو پر بھی ان کا تسلط ہو گیا اور یہ پھر کبھی مسلمانوں کے ہاتھ نہ آیا۔

محمود شاہ دوم بہادر شاہ کے بعد اس کا بھتیجا محمود شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کا کوئی سیاسی اور ملکی کارنامہ تاریخ گجرات میں ہماری نظر سے نہیں گزرا سوا اس کے کہ

[1] یاد ایام ص ۱۵ مولانا سید عبد الحئی۔

وہ نہایت مخیر اور فیاض تھا۔ علماء کا قدر داں تھا۔ اور حرمین شریفین سے والہانہ عقیدت اور اس کی خدمت کا دیوانہ رہتا تھا اس کے زمانے میں ایک عظیم الشان مدرسہ مکہ معظمہ میں باب العمرہ سے متصل قائم کیا گیا تھا۔ جس میں علامہ شہاب الدین ابن حجر مکی اور عز الدین عبدالعزیز زہری وغیرہ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی رباط اور مکتب مکہ معظمہ میں اس نے تعمیر کئے۔ اس کے بارے میں یادایام کے مصنف لکھتے ہیں:" اس کا دستور تھا کہ دعوتوں میں اپنے ہاتھ میں آفتابہ لے کر علماء کے ہاتھ دھلاتا تھا۔ اس نے خلیج کھمبایت کے ایک بندر کی آمدنی محض حرمین محترمین کے رہنے والوں کے لیے وقف کردی تھی۔ جہاں سے ایک لاکھ اشرفیوں کا مال جدہ بھیجا جاتا تھا اور اس کے بھیجنے میں جو کچھ صرف ہوتا تھا وہ خزانۂ شاہی سے دیا جاتا تھا۔ اس مال کے فروخت سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ سب اہل حرمین محترمین پر تقسیم کردی جاتی تھی [1]

اہل حرمین کا یہ مخلص خادم اور علوم دینیہ کے نشر و اشاعت میں بدل و جان حصہ لینے والا اسلام کا شیدائی ۹۶۱ھ میں بعض نمک حراموں کی غداری سے قتل کیا گیا۔ محمود شاہ کی شہادت کے بعد حکومت گجرات کا رہا سہا دم خم ختم ہوگیا۔ اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اکبر شاہ تیموری تو ایسے موقعہ کی تاک ہی میں تھا۔ وہ طوفان کی طرح اٹھا اور ۹۸۰ھ میں گجرات پر قبضہ کرلیا۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ۔

فرمان روایان گجرات کا ایک سرسری جائزہ

ظفر خان کے اولوالعزم خاندان نے ایک سو چوراسی سال تک گجرات میں فرماں روائی کی اور انھوں نے اپنی فرماں روائی کا جو بہتر نمونہ پیش کیا۔ اس کی نظیر ہندوستان میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ایک طرف ان کے جلال و جبروت اور قوت سطوت کی وہ دھاک کہ رانا سانگا کی راتیں بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزرتی تھیں۔ چتوڑ اور رنتھنبور کے سر بفلک عظیم الشان قلعے جس پر دہلی کے شدید القوی بادشاہوں نے برسوں زور آزمائیاں کرنے کے بعد کامیاب نہ ہوسکے تھے انھیں شاہان گجرات نے مہینوں میں سر کرلیا۔ مانڈو کا قلعہ جو مالوہ کی حکومت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا تھا ایک ہی حملہ میں فتحیاب ہوا۔ ان کی انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت کا یہ عالم تھا کہ مالوہ کے حکمرانوں نے تقریباً ایک صدی تک وقتاً فوقتاً گجرات پر حملہ آور ہوتے رہے اور فوج کشی کے ذریعہ ان سے چھیڑ چھاڑ کا لاحاصل سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے باوجود جب مالوہ پر ہر ایک کٹھن اور ابتلا انگیز

---

[1] یادایام ص۱۵

دور آیا تو بھی گجرات اس کو بچانے کے لیے دلیرانہ قدم اٹھایا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مالوہ کے محمود شاہ دوم کی غفلت اور سوء تدبیر سے اس کے وزیر منڈلی رائے نے بادشاہ کے تمام اختیارات غصب کر کے اس کو بے دخل کر دیا اور خود سیاہ سفید کا مالک بن گیا۔ اور اسلامی آثار و شعائر کو مٹا کر رسوم کفر و شرک کی تدریج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ اس کو سن کر گجرات کا اس وقت کا بادشاہ مظفر شاہ حلیم کی رگ حمیت کو جنبش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ برق رفتاری سے مالوہ پہونچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ منڈلی رائے تاب مقاومت کہاں سے لاتا؟ بدحواسی کے عالم میں اس نے رانا سانگا کو گراں قدر تحائف کے ساتھ اپنی امداد کے لیے بلایا۔ اور وہ ابھی سارنگ پور تک پہونچا تھا کہ ادھر مظفر شاہ حلیم نے اس کی مدافعت کے لیے اپنی فوج کا ایک حصہ روانہ کر دیا۔ جس نے رانا کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور اس سے پہلے کہ منڈلی رائے کو اطراف و جوانب سے کسی قسم کی کمک پہنچے قلعہ کو مسخر کر لیا۔ قلعہ میں مظفر شاہ اور اس کے امرا نے شاہ مالوہ کے خزائن و دفائن، اس کے گراں مایہ مال و اسباب کی ریل پیل اس کے بے اندازہ سامان دولت و تجمل کے ذخائر اس کے ملک کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر امرائے سلطنت نے مظفر شاہ کی خدمت میں جسارت کے ساتھ عرض کیا کہ اس جنگ میں تقریباً ہمارے دو ہزار سوار جام شہادت نوش کر چکے ہیں یہ مناسب نہیں کہ اس قدر نقصان اٹھانے کے بعد پھر ملک اسی بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ جس کی سوء تدبیری سے منڈلی رائے اس پر غالب آ گیا تھا۔

بادشاہ یہ سنتے ہی باہر چلا آیا اور محمود شاہ کو ہدایت کی کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی کو قلعہ کے اندر جانے نہ دیا جائے۔ محمود نے بادشاہ سے بہ اصرار تمام اس بات کی التجا کی کہ بادشاہ چند روز قلعہ میں آرام فرمائیں۔ لیکن مظفر شاہ نے اس قلعہ کو منزل نہیں کیا۔ لیکن اس کی وجہ خود انھوں نے بعد میں خود ظاہر کی: "میں نے یہ جہاد محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کیا تھا۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔ مجھے امرا کی تقریر سے یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا کوئی خطرہ فاسد میرے دل میں پیدا ہو اور میرا اخلاص نیت برباد ہو جائے۔ میں نے محمود پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ محمود کا خود مجھ پر احسان ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی ہے"[1]۔

ان کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کا یہی ایک نمونہ نہیں بلکہ گجرات کی تاریخ اس قسم کے مختلف واقعات سے لبریز ہے۔ تاریخ بیں حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت گجرات کے ارد گرد کتنی مسلم حکومتیں قائم تھیں۔ ایک جانب مالوہ اور خاندیس اور دوسری جانب دکن کی وسیع اور

---

[1] مرآۃ سکندری

طاقت ور بہمنی سلطنت اور اس کے مٹنے پر اس ایک کے پانچ حصے ہو گئے۔ بیجاپور، اور احمد نگر، برار، بیدر اور گولکنڈہ، ہر جگہ ایک نیا خاندان ایک نئے رنگ و روپ میں برسر حکومت آگیا۔ ان میں کوئی کمزور تھا اور کوئی شہ زور۔ ایسے موقع پر عین ممکن تھا کہ اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر شاہان گجرات اپنی حدود سلطنت کو اور وسیع کر لیتے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان حوصلہ مند بادشاہوں نے اس طرح کی ملک گیری اور توسیع پسندی سے اپنے دامن کو آلودہ ہونے نہیں دیا اسکے مقابلہ میں محمود شاہ مالوی نے اپنی توسیع پسندانہ ہوس کے ماتحت جب کبھی دکن پر حملہ آور ہوا تو شاہان گجرات اسکے مقابلہ کیلئے سینہ سپر ہوگئے اور اس کو واپس لوٹنے پر مجبور کیا اس کے باوجود انھوں نے شاہان دکن سے نہ کبھی مصارف جنگ کے طلبگار ہوئے اور نہ اس امداد کے حیلہ سے اپنی حدود کو وسعت دینے کی کوشش کی اور ان پر اپنا کسی طرح کا احسان جتایا۔ بلکہ انھوں نے اسکو اپنا ایک فرض سمجھا اور اسی جذبہ کے ماتحت اس کو انجام دیا۔ چنانچہ محمود شاہ مالوی کے دکن پر بار بار حملوں سے تنگ آکر شاہ گجرات محمود شاہ اول نے محمود شاہ مالوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔

" اہل اسلام کو ستانا اور ان کے ملک کو تخت و تاراج کرنا شیوۂ مردانگی کے خلاف ہے اس کا خیال آپ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ جب کبھی آپ دکن کا رخ کریں گے تو مجھ کو مانند بہو بجا ہوا پائیں گے[1]

شاہان گجرات کو ایک طرف جہاد و غزوہ میں مصروف پاتے ہیں تو دوسری طرف اپنے ملک کی تعمیر و ترقی میں سرگرم دیکھتے ہیں تیسری طرف انھیں اپنے رعایا کی خبر گیری، معدلت پروری، انصاف پسندی میں بھی وہ بہت بلند و ممتاز نظر آتے ہیں۔ انکے معدلت اور انصاف کے سامنے غیر مسلم اپنے اور بیگانے، دوست و دشمن سب برابر ایک صف میں دکھائی دیتے ہیں۔ احمد شاہ کے داماد نے عنفوان جوانی میں خون ناحق کر دیا۔ اس کی خبر بادشاہ کو پہونچی اس نے اس کو گرفتار کر کے قاضی کی عدالت میں بھیج دیا۔ قاضی نے بادشاہ کے داماد کو قصاص سے بچانے کے لیے مقتول کے وارثوں سے گفت و شنید کی اور انھیں ایک کے بجائے دو دیت لے کر قاتل کو معاف دینے پر راضی کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ وارثان مقتول پر سلطانی لحاظ غالب آگیا ہو اور وہ بادل ناخواستہ رضامند ہو گئے ہوں۔ بہرحال بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ فرمایا " وارثان مقتول دیت لینے پر راضی ہیں تاہم اس کو قبول نہیں ہونا چاہیے ورنہ دولتمندوں کو قتل ناحق پر دلیری ہو گی۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ مجمع عام میں قاتل کا سر اڑا دیا جائے[2]"

اس طرح عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی، رعایا کی خبر گیری، یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری

---

[1] یاد ایام ص۱۸ [2] مرآۃ سکندری

علماء و مشائخ کی حوصلہ افزائی اور ملک کی سرسبزی و شادابی زراعت و فلاحت ،صنعت و حرفت اور اس کی حیرت انگیز و بے نظیر تعمیر و ترقی میں شاہان گجرات کا دور نہایت شاندار اور نمایاں نظر آتا ہے ۔

اکبر شاہ کی توسیع پسندی اور ملک گیری اور دست درازیوں نے دسویں صدی ہجری میں گجرات کو تاخت و تاراج کیا ۔ اس کے سلاطین کی بساط الٹ دی اس کی خوبصورتی میں خاک میں ملا دی اور اس کی صنعت و حرفت کو برباد کر ڈالا ۔ تاہم عرصۂ دراز تک دہلی اور آگرہ کے درباروں کی سجاوٹ گجرات ہی کی نفیس و نادر اشیاء سے کی جاتی تھی ۔

مہائم کا بھیم راج

بھیم دیو یا بمب دیو ایک راجکمار تھا اور اس کا تعلق دیوگیری کیا دو خاندان سے تھا ۔ تخت و تاراج اس کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے ۔ راج پاٹ کو گنوا کر وہ نقریبًا بے دست و پا ہو چکا تھا لیکن اس کا حوصلہ بلند تھا ۔ اس کی قسمت سوئی نہیں جاگ رہی تھی ۔ اس کی ہمت اس کو ایک نئے عزم و ارادے کی طرف ابھار رہی تھی ۔ وہ کس طرح خلجی فوجیوں کے آہنی پنجوں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے راج گرو اور گیارہ سرمایہ داروں کے ساتھ براہ سمندر کوکن آیا ۔ اس کا ذکر تاریخ کوکن کا مصنف اس طرح کرتا ہے :۔

"کوکن کے اتہاس میں اس نے ایسی ناموری حاصل کی کہ وہ یمن کے گمنام جزیروں کا افسانوی شہزادہ بن گیا ۔ جس کے اردگرد خوبصورت کہانیوں کے ایسے رنگین تانے بانے بنے ہوئے ہیں کہ اصل کہانی الجھ گئی ہے اور یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کہانی کا سرا سوریہ وبلشی گشنریوں کے بیان کے مطابق انہلواڑہ کے سولنکی راج سے ملا ہوا ہے یا دیوگیری کے یادو گھرانے سے وابستہ ہے ۔" آگے لکھتے ہیں :۔

"یہاں کوکن میں اس کی بندگی کا بھرم رکھنے والے نائک راجہ رائے اور نہامند لیشور ، ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے راج کر رہے تھے ۔ بمب راجہ نے سنجان سے لے کر جزائر مین تک ایک نئے راج کی بنیاد ۱۲۹۹ء میں ڈالی جس میں پندرہ محال تھے ۔ اور جو چار سو چوالیس پکھاڑیوں یا دیہاتوں پر مشتمل تھے ۔ یا منجلہ بارہ پرگنے اور دو قصبے تھے ۔ ساشٹی جزیرے میں سے مرزہ را داونا جزیرہ کا علاقہ کا ملا ڈ اور جوہو جزیرے کا سرول اس نئی راجدھی کے اہم حصے تھے ۔ ساشٹی ہی میں شامل ٹرامبے کا جزیرہ بھی بھیم راج میں شامل تھا ۔ اس سے پرے نائگام کا علاقہ تھا ۔ ننگا ، پریلی ، وڈالا

جو بردبیت کے جزیرے میں تھا۔ بردبیت کے کنارے جہاں بڑا بیر، ساشٹی اور دھاراوی کے دریائی سمندری خلیج سے نکلی ہوئی کھاڑیاں سنگم بناتی تھیں۔ وہیں بھیم راجہ کی راجدھانی تھی جسے مہی کا وتی کہتے تھے۔ جو زبانوں پر چڑھ کر مہی سے مہائم بن گیا اس کے سامنے واندرا (باندرا) کا جزیرہ بندر تھا بدصورت اور کالے کولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

دڈالا کی پہاڑی کے دامن میں راجہ بھیم نے بھیم ملڑی قائم کی تھی۔ یہاں راج سبھا کی بیٹھک ہوتی تھی۔ جس میں راجہ اپنی پرجا کی فریادیں سنتا تھا اس کے عدل و انصاف، داد و دہش، اس کی خیرات اور دان پن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہوتی، بھونگلے اور بھنڈارکی پہلے ہی سے ان جزیروں میں آباد ہو چکے تھے۔ بھوئی واڑی اور ٹھاکر واڑی اسی دور کی یادگاریں ہیں کاٹھیاواڑ کے ٹھاکر اور بنئے اور ان کے کئی خاندان غزنوی کے سومناتھ پر حملے کے بعد یہاں بس گئے تھے۔ بھیم دیو اور جو پربھوؤں کا راجہ تھا۔ جس نے غزنوی بادشاہ کے سومناتھ پر حملہ کے وقت مقابلہ کیا تھا۔ پربھوؤں اور ان کے پروہت پاشیکریا، یجر ویدی برہمنوں کی بہت بڑی تعداد انھیں جزیروں میں آکر پناہ پذیر ہوگئی تھی۔ راجہ بھیم دیو اپنے راج پروہت پرشوتم کا دے کو ملاڈ کا علاقہ دان میں دے دیا تھا۔

آخر میں ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"اس سے پتہ چلتا ہے کہ ساشٹی دیئہ کے کچھ حصے پر بھیم راج کا قبضہ تھا۔ فارسی کے چند اسنادسے (گو جن کی تاریخی قدامت مشکوک ہے) یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ بمبئی کا پانی پر اسرار کہانیوں کا یہی راجہ تھا۔ جس کے اصلی خد و خال افسانوی دھند میں اجاگر نہیں ہونے پائے۔ مگر جو برسوں تک اوتار کے روپ میں نچلی جاتیوں کا معبود بنا رہا"[1]

"ملک گیری اور توسیع پسندی، استعماری طاقتوں کے سیاسی اور اقتصادی حربے تھے۔ دکن کی دولت کے ڈھیر پر قدم رکھ کر علاء الدین تخت شاہی تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے جانشین مبارک خلجی نے ۱۳۱۸ء میں دیوگیری کے راجہ ہرپال کو رام کر کے کوکن کی راجواڑیوں اور بندرگاہوں کو ہتھیانے کا بیڑا اٹھایا اور سمندر کی لہروں نے خلجی سلطنت کی سرحدی چوکیوں کے قدم چومنے شروع کر دیئے، مہی کا وتی کے نئے بندر کی رونق، جزائر بمبئی کی جغرافیائی وسعت اور نو آبادیوں کی بڑھتی ہوئی عظمت اور دور رسائی کی تجارت شہرت، یہ سب پہلے خلجی سامراج کی آنکھوں کا کانٹا بنی ہوئی تھیں۔ اب اسی کاٹا اندازہ نگی۔ پہلے دلی بادشاہت کا تصور اور چرچا تھا۔

---

[1] گزیٹیر شہر بمبئی بحوالہ تاریخ کوکن صہ ۱۳۱

اب خود بادشاہت کوکن کے قدم چوم رہی تھی مسلمانوں کی پرانی بستیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ملگمنڈ کے کنارے مہادیوی اور مہالکشمی کے پراچین مندروں کی بنیادیں ہل گئیں۔ داکھول اور جیمبول کے نگر دیوراجہ اور مہی کادیتی کے پرتاپ دیوراجہ نے خود اپنے کانوں سے نرگوں اور آفتابوں کے ہلگیر، تکبیر کی للکاریں سنی ہوں گی جو کلیان سے لے کر شستی تک کے ساتھ دیہاتوں اور مہی کادیتی تک گونج رہی تھیں۔ دور کھاڑیوں سے پرے دھند میں اٹھتے ہوئے دھویں کے بادلوں کو دیکھتے، ہوئے جو سٹری استھانک کا پونز استھان مسلمانوں کا فوجی محاذ بن گیا تھا۔ جہاں ملک حاکم شہر اور قاضی شہری اور شرعی حقوق و امور کا نگہدار تھا۔ ساشستی اور کلیانا خلجی مملکت کے برائے نام پرگنے بنا دیے گئے تھے۔ کلیان اور اس کا ماتحت قصبہ بھیم واڑی اب اسلام آباد کہلانے لگے تھے۔ بھیمڑی میں گودی واڑہ تک جوہار کولی راجہ جینیہ کا راج تھا۔“ [1]

تھانہ فرانسیسی سیاحوں کی نظر میں

فرائرس جورڈونس اور اس کے ساتھی راہب ۱۳۲۱ء میں تھانہ پہونچے اور تین برس تک یہاں قیام کیا۔ انھوں نے اپنے سیاحت نامہ میں تھانہ کا ذکر جس انداز میں کیا ہے اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ فرائرس جورڈونس لکھتا ہے۔

”مسلمانوں نے سارا ملک غصب کر لیا ہے، بے شمار مندر ان کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہو چکے ہیں کلیساؤں کے اوقاف ضبط کر لیے گئے ہیں۔ اور اب یہ عبادت گاہ ان کا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔“ سارا شہر جو کبھی راجہ پورس کے سامراجیہ کا حصہ تھا۔ گہرے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ برسوں پرانے بوڑھے برگد اپنی جٹائیں زمین پر گرائے اونگھتے کھڑے تھے۔ جن کے سروں پر چیل کے برابر چمگادڑیں بسیرا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے تنوں والے بورات کے درخت افریقہ کے جنگلوں کی جھلکیاں پیش کرتے تھے۔ کٹھل کے پیڑوں کے کھوڈوں میں کینے کے ڈیل ڈول جیسے گھوس گھسے پڑے تھے۔ بن بلاؤ اپنے سیاہ کان اوپر اٹھائے ان کے ارد گرد گھوما کرتے تھے۔ تاڑ کے اونچے پیڑوں پر تاڑی نکالنے والے چڑھتے اترتے دور سے نظر آجاتے تھے۔ یہ جنگلی کھجوروں کے درختوں سے کچی شراب (سیندھی) کشید کرتے تھے۔ جو یہاں کے باشندے اپنی خوراک چاول کے دلیہ کے ساتھ پیتے تھے۔ ناریل کے گہرے جھنڈ دلدلوں سے جب ساحل کی طرف سے آتی ہوئی نمناک ہوائیں گزرتی تھیں تو اونگھتے

[1] مجلہ التاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۱۳۱

گدھ بھی بلکھاپیوں پر ڈولنے لگتے تھے۔ آموں کے کسلمند سایوں میں سانپ لہراتے رہتے تھے۔ ان کی پوجا ہوتی تھی۔ ساگوان کی گھنیری چھاؤں میں گینڈے اور پرندے لوٹتے پوٹتے نظر آتے تھے۔ ڈڈالا کے ہرے بانسوں کی ٹھنڈی کچھاروں میں چیتا اپنی مکار آنکھوں بند کئے لیٹا بندروں کی اچھل کود دیکھتا رہتا تھا۔ ادیباسی لنگوٹی کسے ہوئے کلہاڑی اور ڈھال لیے ہوئے دیکھ کر اکا دکا بن مانس پرشکوہ پہاڑیوں پر بھاگ جاتا ہوگا۔ دور بھیمڑی میں آبخورے کے کنارے تک پھیلی ہوئی سمندر کی ٹھنڈی ریت پر اور کچی مہندی کے باڑھوں میں مگرمچھ، کیچڑ اور دلدل میں بیٹھا ہوا نظر آجاتا تھا! بار برداری کے اونٹ تھے نہ جھوتے ہاتھی۔ ناکارہ گدھے کھاڑی کے کنارے برہمنوں کی اکھاڑیوں میں ساگینے کے پودوں پر منہ مارتے رہتے تھے۔ (گنا تباشیر کے لیے اگایا جاتا تھا) سواری کے لیے گھوڑے نہ رہتے تھے (بحری قزاقوں کی وجہ سے اس بندر سے عراق و عجم کے گھوڑوں کی تجارت ختم ہو چکی تھی) صرف بیل گاڑیاں تھیں اور یہی بیل ہل چلانے کے لیے بھی جوتے جاتے تھے۔ بیلوں کی پوجا ہوتی تھی۔ تلسی کا پیڑ بھی پوتر مانا جاتا تھا۔ اشیاء خورد و نوش میں چاول اور گیہوں کی کھلیاں بھرے رہتے تھے۔ تل، ادرک اور گھی کی افراط تھی۔ مقامی باشندوں میں چنڈال بھی تھے جو سب سے نچلی جات کے لوگ تھے۔ یہ مردار کھاتے تھے۔ سر پھٹول اور مار پیٹ بچوں کا کھیل بن گیا تھا۔ لیکن یہ سارے کافر اپنے معاملات میں ایماندار اور راست باز تھے۔ اور ان کی عدل پسندی نے رواداری کی پرانی روایتوں کو اب تک زندہ رکھا تھا۔ اس لیے یہ عیسائیت کے تبلیغی وعظوں کو خاموشی کے ساتھ سنتے تھے۔ اس کے برخلاف مسلمان کچھ سننے کے روادار نہ تھے (مسلمان سو برس پہلے کی صلیبی جنگوں کی تلخیاں بھولے نہ تھے) کافروں (ادیباسیوں) کے بیاہ کے وقت دولہا گھوڑی کی دمچی پر دلہن کے پیچھے بیٹھا اس کے آگے چھرا تانے رہتا تھا۔ (آگے چل کر ازدواجی زندگی کی تلخیوں میں یہ چھرا بیوی کی گردن پر چل جاتا) دولہا کے سر پر لمبی نوکدار ٹوپی ہوتی تھی اور مکھ پر چنبیلی کا مکٹ گرا ہوا ہوتا تھا۔ ان کے جسموں پر اور کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا۔ شب عروس بسر کرنے کے بعد صبح دولہا دلہن برہنہ باہر نکلتے تھے۔ باراتی عورتیں گاتی بجاتی بانس، کیلے کے پتوں اور ناڑ کی بنی ہوئی چٹائیوں سے بنے ہوئے لگن منڈپ تک ساتھ جاتی تھیں۔ ادیباسیوں میں ستی کا رواج تھا۔ بعض جاتیوں میں مردے کی ارتھی دھوم دھام سے اٹھاتے تھے۔ اور کسی بنجر کھیت میں اسے درندوں اور چیل گدھوں کے کھانے کے لیے چھوڑ آتے تھے۔ تھانہ کی سخت دھوپ میں مردار جلدی سڑ گل جاتا تھا۔ تھانہ کی بندرگاہ سے بھڑوچ اور ملیبار تک تجارت ہوتی تھی۔ خلیج فارس اور حبش سے[1]

---

[1] تجارتی رابطہ۔ تھانہ گزیٹیر جلد ۱۳ حصہ دوم صفحہ ۴۲

تجارتی رابطہ ابھی تک برقرار تھا۔ ابن بطوطہ کے سفر کے دوران ۱۳۵۰ء تھانہ سے جہاز عدن تک جایا کرتے تھے۔ پارسیوں کے علاوہ تھانہ میں ۱۵ نسطوری عیسائیوں کے گھرانے آباد تھے۔ راہبوں کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تعلقات آپس میں بہتر تھے مگر لاعلمی اور جہالت کی بنا پر فرقہ بندی میں مبتلا تھے۔ پارچہ بافی کی صنعت بہت ترقی پر تھی۔ کرگھوں کی تعداد پانچ ہزار پہونچ گئی تھی۔ ان میں زیادہ مخمل بنے جاتے تھے۔ عرب سیاحوں نے بھی یہاں کی پارچہ بافی کی صنعت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

دور تغلق

خلجی حکومت کا چراغ گل ہوا اور اب تغلقی دور شروع ہوا۔ انھوں نے دکن پر جنیر تک اپنا تسلط مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا۔ زراعت اور پیداوار کا سارا نظام ان کے قبضہ میں آگئے تھے چنانچہ تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں :

۱۳۳۳ء کے ایک فارسی محضر نامے سے جو سردیشمکھ عہدے کے بارے میں ہے توثیق ہوتی ہے۔ اگلے پندرہ برسوں تک کوکن پر ان کی سیاست کا سایہ بڑھتا رہا۔ مقامی راجہ اور رائے اپنے سوراجیہ کو دلی کے سامراجیہ کے سیاسی بندھنوں سے جکڑتا دیکھ کر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کا سیاسی ردعمل غیر جذباتی نہ تھا کیونکہ ان کی زوال آمادہ سنسکرتی اپنی فرسودہ قدروں کے ساتھ نئی مسلم تہذیب اور مدنیت کی قدروں سے الجھ رہی تھی اور وہ اپنے تہذیبی اثاثہ کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالا دینے کی ناکام جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ اپنا سماج اور مفاد خطروں میں گھرا دیکھ رہے تھے مگر مسلم اقتدار کا گھیرا پھیلتا اور بڑھتا جارہا تھا۔ خلجی عہد کے جو سکے دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالسلطنت دلی کا سکہ کوکن میں بھی رائج تھا۔ ۱۳۴۲ء ملک ہوشنگ کی بغاوت کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ :-

جب وہ کوکن کے بربرہ (مرہٹہ دیس) راجہ کی پناہ میں چلا گیا تو الغ خان نے (جو بعد میں محمد تغلق کے نام سے بادشاہ بنا) ہوشنگ کے باغی ساتھیوں کی سرکوبی کے لیے کلیان کے زمینداروں اور پالیگاروں کو حکم دیا تو انھوں نے اس حکم سے سرتابی نہیں کی۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ دلی کے تسلط کے آگے سارے سرنگوں ہو چکے تھے۔ اسی طرح جوہار کے کولی راجہ کو جب ۱۳۴۱ء میں تغلق بادشاہ نے شاہ کا خطاب دیا۔ بائیس قلعوں کا دھنی اور نو لاکھ روپے لگان کی ریاست کا دھنی بنا دیا تو

وکرم شاہ ہمیشہ کے لیے تغلق آقا کا بندہ بے دام بن گیا۔ یہ دن جوہار ریاست کی تاریخ میں اتنا اہم ثابت ہوا کہ ایک نئی تقویم کی بنا ڈالی گئی اور دفتری کارروائیوں میں جس کا مدتوں رواج رہا۔" لہ

جوہار دالی اور کوکی ادیباسیوں کا ملک ہے اور یہ سرحک سوریہ کوہستانوں کے فصیل اور گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان جنگلوں میں قسم قسم کے درندے بکثرت آباد ہیں۔" پھر ایک دن اس وارلی راجواڑی کا ایک کولی نوجوان یا ہیرہ یا جتیہ جو تھل گھاٹ کی وادی میں کھنے گاؤں کی مٹی سے بنی ہوئی ممی کا مالک تھا۔ بھیری شاہ صدرالدین چشتی کی زیارت کے لیے آنکلا جو اس وقت وہاں تبلیغ کی خاطر سکونت پذیر تھے۔" ۲ہ

مبنئی

"یہاں نگر دیو کے سر چڑھے سرداروں جیسے جواری اور نتھور ائے بندھا کھونگلے کے سروں میں سرکشی کا سودا سمایا تھا۔ لگان بڑھا دینے سے کسانوں کی پریشانیاں بڑھ گئیں اور جب بنگلے کے کلہاڑیوں کی برہمی بغاوت بن گئی تو یہ دونوں سردار جان بچا کر ڈونگر (گجرات) بھاگ گئے۔ یہاں تغلق ایرانی اسیران صدا دھار کھلے بیٹھے تھے۔ خوابوں کے جزیروں کی دولت بھی آنکھوں میں سما گئی۔ نیکو جو غالباً نوساری کا مالک تھا فوج لے کر چڑھ آیا۔ ایک دستہ پرتاب دیو کے بسائے ہوئے قصبے پرتاپ پور (پردل اندھیری) کو گھیر لیا اور دوسرے نے تھانہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک تیسرے دستے نے ماہی کا دیتی پر ہلابول دیا جو اس وقت نگر دیو کی رانی کی راجدھانی تھی۔ بمب دیو کے گھرانے کی لاج اب اسی کے ہاتھوں میں تھی۔ سب لوگ ساکت تھے۔ مقابلہ میں ڈٹ گئی مگر اس کی گردن کٹ گئی اور راجدھانی لٹ گئی۔ ماہی کا دیتی کے بعد مرگاؤں جزیرے میں لڑائی چھڑ گئی۔ بھائی کلہ (بھایا کلہ) کے میدان میں دو بدو آخری جھڑپ میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا دشمن کی فوج کھیت رہی اور بھیم دیو کی مجالس ساز حکومت کی قسمت پر موت کی مہر لگ گئی ۱۳۲۷ء پرتاپ پور اور دستی اور ایک دوسرے امیر صدہ کے محاذ بن گئے۔ اور نوساری سے ماہی کا دیتی تک کا علاقہ زوال پذیر تغلق سلطنت کا آخری ستون بن گیا۔ جس پر عرصہ تک خلجی ملک اپنی ملکیت جتاتے رہے۔ مگر جب محمد بن تغلق کے بھتیجے ظفر خان نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ۱۳۹۱ء میں گجرات میں مظفر شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی تو اس نے اپنے حاکموں کو مقرر کرنا شروع کر دیا۔" ۳ہ

تاہم کے نئے حاکم ملک الشرقانے زمینوں کی پیمائش کر کے مالیہ کی نئی شرحیں مقرر کیں تو بمبئی کے گاؤں نشیط۔ دو میں گجراتی حکومت کے لیے وفاداری کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ تھانہ کا مقامی رئیس

لہ تاریخ کوکن صفحہ ۱۳۱ ۲ہ تاریخ کوکن ص ۱۳۵ ۳ہ تاریخ کوکن ڈاکٹر محی الدین ص ۱۴۲

سنہ ۱۴۱۱ء تک شاہ گجرات کا باجگزار رہا اور یہی اطاعت دکن کی بہمنی حکومت کی رقابت بن گئی۔[1] ادھر تغلق سلطنت میں ضعف و زوال پیدا ہو گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن میں بہمنی کے نام سے ایک نئی سلطنت ۱۳۴۷ء میں وجود میں آ گئی۔ جس نے امیرانِ صدہ کو بغاوت کا حوصلہ دیا۔ اس کے علاوہ دوسری حکومتوں نے بھی بغاوت کا پرچم لہرا لیا۔ ان میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا علم اپنی شہرت، قوت اور بغاوت میں اولیت کے اعتبار سے سب سے نمایاں اور بلند تر تھا۔ مسلم تمدن و تہذیب اور ان کا اقتدار ہندو رسم و روایات سے متصادم ہوا۔ تو ہندو مصلحین نے دانستہ سیاست کو دھرم کے ساتھ خلط ملط کر کے جنوب سے مسلم سلطنت کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لیے ہندو دھرم کی حفاظت کا نام دے کر مختلف تحریکوں کا جال اطراف میں پھیلایا۔ اس کا بانی اور سرگرم رہنما ہندو سدھارک سری شنکراچاریہ مادھو ودرائن تھا۔ بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ گو کوکن سے کافی دور تھا تاہم اس کے اطراف میں بہمنی اقتدار ہی غالب تھا۔ اس لیے کوکن کے حکمراں راجے اپنے حدود میں کافی مطمئن تھے۔ لیکن بیڑوں اور قزاقوں کی کشتیاں بہمنی سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کرتی اور چھاپے مارنے لگی تھیں۔ چنانچہ تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں:۔

”قزاق کشتیاں گھاٹ اتر کر بہمنی مملکت کی سرحدوں پر چھاپے مارنے لگیں اور انھوں نے خود قزاقی کا بیڑہ اٹھایا۔ دابھول جو بہمنی ریاست کی بیرونی تجارت اور مواصلات کے لیے اہم بندرگاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ۱۳۵۷ء میں اس مملکت کا بحری دروازہ بن گیا۔ گو یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا کیونکہ وجیانگر کی حریف حکومت اس پر دوبارہ قابض ہو گئی۔ بہمنی سلطنت کی سرحد ایک طرف سمندر کی لہروں سے پابہ زنجیر ہو گئی۔ اور مغرب و شمال میں کولھاپور (کراڈ) تک سہیادری کا دامن چھونے لگی۔ گلبرگہ سے لے کر دابھول تک بہمنی آدھم کا ملک سیف الدین غوری کی مقرر ہوا۔“[2]

پڑوسی راجاؤں کی شر انگیزیوں کے سبب دابھول کا سیاسی و تجارتی مستقبل ڈانواں ڈول ہی رہا گو چیلوں اور راجاؤں کی تجارت کسی حد تک چمک گئی تھی۔ ادھر چھی کا دیتی اور شاسٹی جزیروں میں جہاں بھنڈاری بڑی تعداد میں آباد تھے۔ گجرات کا مظفر شاہی دستار بھونگلے سرداروں کی سرکشیوں کے سبب خاک میں مل چکا تھا۔ آٹھ سال تک وہ مہاراشٹر قائم کرنے کے ہاتھ پیر مار رہے تھے ناگروں، راجاؤں اور پالیگاروں کو وجیانگر کی بڑھتی ہوئی طاقت سے شہ ملی تو وہ بھی بساط سیاست کے اہم مہرے بن گئے اور مسلم شاہی کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے جو دہاد کا راجہ نولی شاہ اور بھیمڑی کا راجہ ماہولی کے کوہستانوں میں رائے گڑھ کا رائے ناگو کھنے سے قریب دیو استقلی

---

[1] تاریخ کوکن از ڈاکٹر محی الدین صفحہ ۱۳۱ [2] تاریخ فرشتہ کا انگریزی ترجمہ بحوالہ تاریخ کوکن صفحہ ۱۳۳

کے درے تک اور رتناگیری کے نائک وشال گڑھ میں قلعے بنا کر سیاسی داؤ پیچ میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ شہ کو مات دینے کی ترکیبیں سوچنے لگ گئے۔ جنوبی دکن میں بلوارا، ماچال، اورنگ، ریگنا اور کھیلنا کے راجہ کھل کر قزاقی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ بہمنیوں کو بھی کوکن کی اس طوائف الملکی سے کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ تال کوکن کی سیاست میں ان کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔ کلیان، اسلام آباد (بھیونڈی) میں ان کے قدم جم چکے تھے۔ فیروز شاہ بہمنی سنہ ۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء کے ایک اصل فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ "قصبہائے کلیان اور اسلام آباد دار الاسلام بن چکے تھے جہاں قدیم نائطی گھرانے عرصہ سے سلامتی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں مولانا قاضی محمد کا قبیلہ بھی تھا جن کی اولاد و احفاد کو بہمنی بادشاہ نے بطور صرف مایحتاج انھیں قصبوں میں جاگیریں انعام دی تھیں۔ اس عہد میں یہاں مہائم کے مخدوم شیخ علی کا گھرانہ بھی آباد تھا[1]

مورخین لکھتے ہیں :۔

"چودہویں صدی کے آخر میں بہمنیوں نے تھانہ، کلیان، اسلام آباد کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ادھر مہائم کی بندرگاہ میں دو مخالف حکومتوں کی طاقتوں کی زور آزمائی کا اڈہ بن گئیں۔ مہائم دوبارہ گجرات کی حکومت کے ماتحت بن گیا تھا۔ ان آپس کی دست درازیوں کا مقصد بظاہر ہمسایہ ریاستوں کی آئے دن کی چھیڑ چھاڑ اور چیرہ دستیوں کا انسداد تھا۔ مگر درحقیقت ان حکومتوں کا مقصد سیاسی استحکام اور اقتصادی منافع کا حصول تھا تاکہ تمام بیرونی تجارت پر ان کا تسلط ہو اور ان کا اقتصادی نظام بہتر اور مضبوط ہو۔ اس زمانہ میں سرمایہ کی فراہمی سرکاری آمدنی اور باج ستانی پر موقوف تھا۔ باجگذار ریاستیں جہاں ایک طرف اندرونی تجارت کے لیے نہایت مفید تھیں وہاں ضرورت پڑنے پر فوجی نقل و حمل کے لیے گزرگاہوں کی سہولتیں مہیا کرتی تھیں۔ چیول کی قدیم سے قدیم بندرگاہوں سے بحری تجارت کا راستہ قائم تھا۔ اور بہمنی سلطنت نے بھی مدت دراز تک اس کو اپنی ایک اہم بندرگاہ کا مقام بخشا تھا۔ فیروز شاہ بہمنی اپنے شاہی جہاز اس کے اطراف و اکناف میں بھیجتا تھا کہ غیر ملکی نوادرات، مصنوعات اور مختلف قسم کے ملبوسات میں کام آنے والے کپڑوں کے علاوہ باصلاحیت افراد کو دار السلطنت منتقل کیا جا سکے۔ اکثر ہندو تاجر اس بندرگاہ کے ذریعہ ہرمز سے گھوڑے، سراندیپ سے ہاتھی اور شیک اور چین سے سمور اور دیگر تجارتی اسباب لا کر وجیا نگر کی مالدار حکومت کو بہت زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کر دیتے تھے۔ انہی دنوں گلبرگہ اور وجیا نگر کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر بغور ان لڑائیوں کے اسباب کا مطالعہ کیا جائے

---

[1] تاریخ کوکن ص ۱۲۵

تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑائیاں مذہبی یا سیاسی نہ تھیں بلکہ ان کی نوعیت محض اقتصادی تھی[1] اس لیے بہمنی سلطنت گوا پر اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ جب تھانہ پر بہمنی تسلط قائم ہو گیا تھا تو مظفر شاہی حکومت کو حملوں کا ایک نیا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ دابھول قزاق راجاؤں کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے بہمنی رعب و داب کو دھکا لگ چکا تھا۔ تمام حریف طاقتوں کی بیرونی تجارت ہتھیا لینے کے لیے بہانے تلاش کر رہی تھیں۔ تاجروں کو لوٹنا، سوداگروں کے مال پر ڈاکہ ڈالنا۔ عازمین حج بیت اللہ کو ستانا۔ امن و امان کو غارت کرنا۔ قتل و خونریزی کرنا کوئی گناہ کی بات نہ تھی بلکہ عین حق و صواب تھا۔ وجیانگر اور اس کی متحدہ ریاستوں کے لیٹرے جہاز اسلامی بحریہ کے بیڑوں کو غارت کرنے کے لیے دابھول کے اطراف چیلوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے[2] لیکن بہمنی اس سے غافل نہ تھے۔ ان کے بھی بحری بیڑے تھانہ تک مدافعت کے لیے برابر تیار رہتے تھے۔ بحری قزاقوں کی وجہ سے تھانہ کی تجارت کا سلسلہ برسوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ اور اس کے کاروباری رونق کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ اب غیر ملکی جہاز کھمبایت اور مہائم کی بندرگاہ کی طرف پہونچ رہے تھے۔ کھمبایت کا تعلق محمد بن تغلق کے زمانہ میں دولت آباد سے قائم تھا۔ پھر بہمنی حکومت سے اس کا رشتہ جڑ گیا۔ اس کے بعد بیدر (محمد آباد) اس کی تمت کا مالک بن گیا۔ دکن اور خاندیس سے تجارتی اسباب، گھریلو مصنوعات اور خام پیداوار ناسک کی سرحدوں سے گزر کر براہ نندر بار اور سوم گڑھ اور دوسری طرف جنیر سے تھل گھاٹ ہوتے ہوئے جوہار کے کولی راج سے کھمبایت یا مہائم بھیجی جا سکتی تھیں۔ جنیر چاکن کوٹھاڈ داری اور مال کی ریاستیں بہمنی حکومت کے ماتحت تھیں مگر جوہار کا کولی راجہ گجرات کی طرف جھک گیا تھا۔ ویسے بھی مظفر شاہی کو سرزمین کوکن پر اقتدار حاصل کرنے اور اپنی فوج کو آگے بڑھانے کے لیے کولی کے راجہ کو ایک اہم مہرہ کے طور پر استعمال کرنا پیش نظر تھا۔ کیونکہ اس کی سرحد سے تھل گھاٹ کی بہمنی علمداری شروع ہوتی تھی۔ اسلام آباد میں گوری پارہ تک اگرچہ جوہار کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن یہ حصے بہمنی سلطنت کے ہی زیر اقتدار ہو گئے تھے۔ سہادری گھاٹ کی تمام ریاستیں وجیانگر کی بالادستی کے سامنے جھک گئے تھے اس لیے احمد شاہ بہمنی کے نزدیک یہ باغی اور سرکش تھے۔ اس لئے ان کی سرکوبی کے لیے خلف حسن ملک التجار کو ۱۴۲۹ء کوکن روانہ کیا یہ فوجی مہم نہایت سودمند اور بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اور بے انتہا مال و دولت اس کے ہاتھ آیا۔ اور انھیں ہاتھیوں اور اونٹوں پر لاد کر احمد شاہ کے بارگاہ خسروی میں بھیج دیا۔ اس پر ابھی پانچ سال گزرے تھے رائے گڑھ اور دشال گڈھ کے راجاؤں نے خراج دینا بند کر دیا اور مقابلہ پر اتر آئے۔ بہمنی حکومت کی طرف

---

[1] دکن کی بہمنی سلطنت ہارون خاں شیروانی ص ۸۶–۱۴۷ [2] مطلع السعدین بحوالہ ریاض الانشاء ص ۲۵–۲۰۷

سے ۱۴۳۶ء میں دلاور خاں نے مقابلہ کیا۔ یہ مہم بھی توقع سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ چنانچہ تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں۔ "دلاور خاں کی مہم اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ سنگیشور کا راجہ ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہو گیا اور اپنی لڑکی کا ہاتھ علاء الدین بہمنی کے ہاتھ میں دے کر اپنا ہاتھ مضبوط کر بیٹھا اس راجکماری کا مسلم نام پری چہرہ رکھا گیا اور یہی ملکۂ جہاں جو نصیر خاں والی خاندیس کی بیٹی تھی۔ حسد و رقابت کا باعث بن گئی۔"[1]

"سوتیا ڈاہ نے اپنے باپ کو اکسایا تاکہ بہمنی حکومت پر قابض ہو جائے۔"

کوکن میں خلف حسن بصری کو جو عظیم فتوحات حاصل ہوئیں اس سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور پیش قدمی کا ایک نیا حوصلہ ابھر آیا۔ اپنی سرحد دول سے آگے مہائم اور ساشٹی کی سرحدوں تک پہنچ گیا۔ اس وقت مہائم کا پرجو حکمراں رائے قطب جو گجرات کے بادشاہ احمد شاہ کا سمدھی تھا۔ دیلے سے چل بسا تھا۔ شاہ گجرات اپنے مقبوضہ ملکوں کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے اپنے ظفر خاں کو افتخار خاں کی سپہ سالاری میں ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ کوکن بھیجا ظفر خاں نے پہلے ہی حملہ میں تھانہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ادھر مخلص الملک دیو کا کتوال اپنے سترہ جنگی جہازوں کے ساتھ تھانہ کی خلیج میں شور مچاتے بیٹھا تھا۔ یہ گجراتی بحری طاقت خلیج سے نکلی ہوئی کھاڑیوں کے ذریعہ ساشٹی اور جزائر بمبئی سے گزر کر دھاراوی تک پہونچ سکتا تھا۔ جہاں سے مہائم کا حملہ کا راستہ صاف تھا۔ خلف حسن بصری نے مہائم کے پاس واقع کھاڑیوں کے دہانے کو پاٹ دیا۔ اور جزیرے کے اطراف کانٹوں کی باڑھ لگا دیا۔ لیکن اس ترکیب سے محفوظ ہونے کے بجائے محصور ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ گجراتی بحریہ کے دیو پیکر جہاز دھاراوی کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ ادھر ظفر خاں کی بری فوج تھانہ سے ساشٹی کے کنارے محاذ سنبھال لیا تھا۔ اب دونوں طرف سے بہمنی راستہ فوجوں کے لیے بند تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہمنی فوج اپنے حریف کے نرغہ میں آگئی اور اس کا صفایا ہو گیا۔ بہمنی لشکر کیلئے فرار یا موت کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ بچے کچے دکھنی سپاہی چھپتے چھپاتے نرغوں کی نظروں سے خود کو بچاتے ناریل اور کیلوں کے [illegible] سے ہو کر جیل پہونچ گئے۔ بہمنی سلطان کو یہ شکست فاش بھی کوئی درس عبرت نہ دے سکی نہ اس کی ہمت پست ہوئی۔ اس نے اپنے شہزادے علاء الدین کو ساٹھ ہزار گھوڑ سوار فوج ساتھ ہاتھیوں کی زبردست طاقت کے ساتھ آخر خلف حسن بصری کی مدد کے لیے بھیجا۔ ساشٹی کے کنارے بمبئی کی تسخیر کے لیے گجرات اور دکن کے شہزادے سینہ سپر ہو گئے۔ ہنگامہ کارزار گرم ہوا لیکن اس مرتبہ بھی ہزیمت علاء الدین ہی کو اٹھانی پڑی اور ظفر خاں ظفریاب ہوا۔ اس پر تاریخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں۔ "دکھنیوں کی شکست گجراتیوں کے بہتر اسلحہ اور بحریہ کے بدولت نہ تھی۔ بلکہ وہ خود بھی باہمی نزاع سے کمزور ہو چکے تھے۔ بارگاہ بہمنی

[1] تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب ص ۱۴۷

میں دکھنی اور آفاقی ذہنیتوں کے تصادم نے بغض و نفاق کا جو محاذ بنا لیا تھا اس نے عسکری محاذوں کو کھوکھلا ثابت کر دکھایا۔ گجراتی حکومت کا سیاسی تدبر نئی قدروں کا حامل تھا۔ وہاں سیاسی گھروندے نہ تھے۔ سماجی گھرانے ابھر رہے تھے۔ جس میں رائے قطب کی حسین نومسلم لڑکی شہزادہ فتح خاں کی اگر ملکہ تھی تو اس کے پرکھو جانک کے دنوں پر مظفر شاہی حکمراں تھے کوکن کی سرزمین پر قومی ایک جہتی کی غالباً یہ پہلی کوشش تھی اور دکن میں ابھی ایک مشترکہ ثقافت کی نیو پڑنے والی تھی۔ جس نے کوکن میں گجراتی اقتدار کے طویل سفر کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔[1]

تال کوکن میں بہمنوں کی شکست نے ان کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ ادھر جنوبی کوکن

سیاسی فریب

کے مرہٹہ پالیگاروں زمینداروں اور نائکوں کی سرکشی نے امن وامان تہہ و بالا کر رکھا تھا ۸۵۳ھ میں ان کی سرکوبی کے لیے ایک طاقت ور دستہ بھیجا گیا جس نے سہادری کے متعدد قلعے فتح کر لیے اور شیر کے جیسا مغرور اور سرکش راجہ بھی ہتھیار ڈالنے اور سر اطاعت خم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور ملک التجار محمود گاواں نے اپنی تین ہزار عرب گھوڑسواروں اور سات ہزار پیدل فوج کے ساتھ اہم مرہٹہ سرداروں کو زیر کر لیا۔ اور انھیں اپنا دوست سمجھ بیٹھا۔ بعض مورخین کے بیان کے مطابق ملک التجار نے شرکے کے سامنے یہ شرطیں پیش کیں کہ اسلام یا جنگ مگر شرکے نے ایک ایسا موقف اختیار کیا جو بظاہر معقول لیکن درحقیقت ایک سیاسی خدع اور فریب تھا۔ اس نے کہا۔

اس نے یہ بہانہ بنایا کہ جب تک سنگمیشور اور کھیلنا کا راجہ شنکر رائے جو اس کا حریف تھا زندہ ہے وہ شرکے کے راجہ کے مسلمان ہو جانے کو بزدلانہ فعل تصور کرے گا۔ اس طرح وہ ہمیشہ اس کے طعن و تشنیع اور سازش کا شکار رہے گا۔ اور شرکے رشتہ داروں کو شہ دے کر اس سے اس کا پرکھوں کا دیس چھین لے گا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ شنکر رائے کو مغلوب کیا جائے اور اس کا راج پاٹ شرکے یا اس کے کسی سردار کو بخش دیا جائے۔ تاوقتیکہ ایسا نہیں ہوتا نہ تو وہ نئے دین سے اپنا ناطہ جوڑ سکتا ہے اور نہ تو بارگاہ بہمنی کی بندگی کو قبول کر سکتا ہے۔ ملک التجار معین الدولہ کا اس مہم کا مقصد ہی کھیلنا کو سر کرنا تھا۔ اب جب کہ شرکے جیسا وفادار اور لائق رہبر میسر تھا تو نہ راہ کی دشواریاں آڑے آئیں اور نہ چوری کا ڈر اور نہ رہزنی کا کھٹکا تھا۔[2]

چنانچہ بہمنی لشکر شرکے کی رہبری میں سنگمیشور کی طرف روانہ ہوا۔ سنگمیشور کا پایہ تخت کا راشٹر تھا جو سندرداں کا پوتر اور متبرک مقام تھا۔ اس کا راستہ نہایت پر خطر اور دشوار گذار تھا۔ دکھنی اور حبشی فوج کے جوان ابتدا ہی میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ غرض یہ لشکر ہیبناک جنگلوں تنگ و تاریک

---

[1] تاریخ کوکن ص ۱۵
[2] مہاراشٹر یہ دیش گزیٹر ص ۱۲۲ بحوالہ تاریخ کوکن ص ۱۵۱

دروں اور بھیانک گھاٹوں سے گزر کر جون کا نوں گزر گئی لیکن بہت ہی خستہ حال اور نڈھال ہو گئی۔ تھکن سے چور اور آگے قدم اٹھانے سے بالکل معذور ہو گئی۔ سنگمیشور کی سرحدوں تک پہنچنے کے لیے ایک سب سے ناقابل عبور پار گھاٹ کو طے کرنا تھا۔ اس گھاٹی کے تین طرف بڑی بڑی خوفناک چٹانیں راستہ روکے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں اور سامنے سمندر تھا جس کی موجیں چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، امیر عساکر، ملک التجار اسہال اور پیچش کی بیماری سے اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ فوجی نظم اور انتظار کے قابل نہیں رہا تھا۔ مصیبت کی ماری، تھکی ہوئی فوج ایک جگہ ٹھہر گئی۔ نیند نے غلبہ کیا اور وہ سو گئی۔ کس کو خبر تھی کہ یہ نیند ان کے لیے پیام موت ثابت ہو گی جس کے بعد وہ پھر کبھی بیدار نہ ہو سکیں گے وہ تو خواب غفلت میں پڑے سو گئے تھے مگر موت ان کے سروں پر جاگ رہی تھی۔ آگے کا حال تاریخ کوکن کے زبان قلم سے سنیے وہ لکھتے ہیں کہ ”رہبر نے رہزنی کا اصلی روپ نکالا۔ سرکے نے پہلے ہی سے شنکر رائے کو اپنی سازش میں شریک کر لیا تھا۔ اب جبکہ صیاد کے جال میں پھنس چکا تھا تو کاہے کی دیر تھی بڑی بھاری فوج کے ساتھ شبخون مار دیا۔ نیند اور موت کے درمیان حائل دیواروں کو ننگی تلواروں نے ڈھا دیا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انسان ذبح کر دیا گیا۔ جن کی دلدوز چیخیں اور دل ہلا دینے والی فریادیں طوفانی ہواؤں کے تیز جھکڑوں میں ڈوب گئیں، درختوں کے پتوں نے تالیاں بجا بجا کر غافل انسانوں کو بچانا چاہا مگر وہ گہری اور ابدی نیند سو چکے تھے بیمار ملک التجار شہید ہو گیا اور اس کے ساتھ مدینہ، نجف اور کربلا کے پانچ سو سید، کچھ حبشی اور دکھنی ملحدار اور ان کے دو ہزار باربردار سپاہی صبح تک موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔[1]

اس بہیمانہ اور وحشیانہ قتل و غارت گری اور اس سنگین سازش جفاکاری اور اس ایسی فریب اور دھوکہ بازی کا سولہ سال تک بہمنی حکمراں انتقام نہ لے سکے۔ کیونکہ بہمنی سلطنت اپنے اندرونی خلفشار اور باہمی آویزشوں میں گرفتار ہو گئی تھی۔ دکھنی اور غیر دکھنی امراء میں اقتدار کی جنگ اپنے شباب پر پہونچ چکی تھی۔ انھیں اپنے ذاتی کشمکشوں میں اتنی فرصت کہاں تھی کہ شنکر رائے کے جانشین جاکھو رائے سے مقابلہ کریں۔ جاکھو رائے اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اور وہ کھیلنا اور رنگنا کے محفوظ قلعے میں ہر مقابلہ کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس کے پاس تین سو قزاقوں کا جہازوں کا بیڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وجیانگر کی حکومت ایک بہت بڑی طاقت کے روپ میں ابھر چکی تھی۔ اور راجہ ہر کا ہر دوم کے دور ۱۳۷۷ء تا ۱۴۰۴ء میں اس کی سرحدیں گوا سے لے کر کرشنا تک پھیلی ہوئی تھیں اور کوکن کی طرف بڑھنے کے لیے اس کے جہاز دابھول، اچیول اور کھارسے

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ نیر کوکن بحوالہ تاریخ کوکن صہ ۱۵۳

یمن کی بندرگاہوں میں گھوڑے گھات میں رہنے لگے تھے

محمود گاواں

گزشتہ صفحات میں محمود گاواں کے بارے میں ہم لکھ آئے ہیں لیکن کوکن کے تعلق سے اس کا تذکرہ چھڑ گیا تھا۔ اسے یہاں اپنے موقع کے لحاظ سے دھرانا مناسب سمجھتے ہیں۔ محمود نام کا ایک تاجر ۱۴۴۷ء میں مال و اسباب تجارت کے ساتھ دابھول کی بندر گاہ پر اترا تھا یہ ایک تاجر تھا اور عالم و فاضل بھی۔ اس کے (چودہ) چند سال بعد اسی بندر گاہ سے ترکی خلیفہ عثمانی کا ایک شہزادہ غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھاتا ہوا اسی بندر گاہ دابھول میں اترا تھا اور یہیں سے دکن پہونچا تھا۔ اس کا نام یوسف تھا اور یہی یوسف بعد میں عادل شاہی حکومت کا سربراہ اور بانی بن گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود گاواں کا دور وزارت بہمنی حکومت کے لیے نہایت ترقی اور عروج اور بہت نمایاں کامیابی کا دور رہا۔ لیکن کوکن میں بہمنی اقتدار کے مقابلہ میں گجراتی حکومت کا غلبہ متصادم ہو رہا تھا۔ اور ان دونوں کے حفاظتی دستوں میں اکثر چھیڑ چھاڑ اور جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر صورت حال بگڑ جاتی تو باہمی عہد و پیمان پر مصالحت ہو جاتی اور چند ہی دنوں میں یہ دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ محمود گاواں کی پالیسی یہ تھی کہ دوسرے حریفوں کے مقابلہ کے لیے مسلم سلاطین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں۔ اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو اس نے اپنے بادشاہ محمد شاہ بہمنی کی طرف سے محمود شاہ کے نام بھیجے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہرمز کے ملک امیر جہاں شاہ لارکی سے فوجی امداد کی درخواست کی تھی۔ تاکہ سنگیشور، کھیلنا اور رینگنا کے قلعوں کے راجہ جگھا رائے اور اس کے حمایتی وجیا نگر کی سرکوبی کی جاسکے اور ان کے ان تین سو جہازوں کے بیڑے کو جو سمندر میں مسلم مسافروں اور زائرین کا مال و اسباب لوٹتے اور انھیں ستاتے تھے۔ اور یہ راہزن جیول اور دابھول کی بندرگاہوں پر قبضہ جما لینے کی تاک میں رہتے تھے۔ محمود گاواں نے اپنے مدبرانہ حکمت عمل سے جہاں ہمسایہ مسلم حکومتوں سے باہمی تعلقات قائم کیا وہاں کھیلنا، رینگنا، اور وشال گڑھ، ماچال، بلواڑہ اور اورنگ قلعوں پر اپنے پنجے مضبوط کر لیے اور وجیا نگر کی عظیم بندر گاہ گوا کو ۱۴۷۲ء میں فتح کر لیا۔ گوا سیاسی اعتبار سے ایک نہایت اہم مقام اور پوری بہمنی سلطنت میں سب سے زرخیز علاقہ تھا۔ کوکن کی مکمل تسخیر سے جو محمود گاواں کا سب سے نمایاں کارنامہ تھا۔ بہمنی سلطنت کی وسعت میں گوا سے بسین تک پھیل گئی تھی۔ ساشٹی ساحلی علاقہ کو چھوڑ کر باقی تمام علاقوں پر بہمنی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ دابھول اور جیول کی بندرگاہوں میں اب پھر پہلے کی سی شان

اور رونق دکھائی دینے لگی تھی دابھول جسے بہمنی حکومت کے دور میں مصطفیٰ آباد کہا جاتا تھا۔ اپنے وقت کی تجارت کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ چنانچہ "تاریخ کوکن" کے مصنف لکھتے ہیں :-

"یہی وہ باب الدکن تھا جہاں سے ایران کے علمی و تجارتی مراکز سے آئے ہوئے ہزاروں مہاجرون، سیاحوں اور سوداگروں کے قافلے بجرے تھے اس بندرگاہ پر شاہ نعمت اللہ حسینی کے روحانی جانشین خلیل اللہ اور نور اللہ کے بجرے آکر ٹھہرتے تھے اور یہیں سے محمد شاہی جہاز قیمتی تحائف لے کر ہرمز پہنچا تھا تاکہ حافظ شیراز کی دعوت بیدر پر بارگاہ بہمنی کھینچ لایا جائے۔"

اس نے سب سے پہلے ملک قمی اور آذری جیسے نامور شعراء کے قدم چومے اور محمود گاواں جیسے مدبر اور علم دوست کی قدم بوسی کی اور اس کے بازار میں عثمانیہ ترکی کا گمنام شہزادہ یوسف عادل بکنے کے لیے لایا گیا۔ یوسف عادل خاں اسے جنت ارضی کا ٹکڑا کہا کرتا تھا۔ جہاں ساری نعمتیں میسر تھیں اور جس کی تجارتی گرم بازاری بازار مصر کی یاد دلاتی تھی۔[1]

سنہ ۱۴۷۰ء میں روسی سیاح سی آس نکی تن جیول کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تو دابھول کی شہرت نے اس کی امنگوں کے بادبان کھول دیے تھے۔ اور جب وہ آگے بڑھا تو دیکھا کہ یہاں عرب و عجم اور افریقہ کے تجارتی جہاز ان کے بیڑے آکر ٹھہرتے تھے جن میں تجارتی اسباب کے علاوہ مصر و عرب، خراسان اور ترکستان سے گھوڑے لائے جاتے تھے۔ یہاں کی مخلوط آبادی میں ساحلی علاقوں کی ساری قوموں کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ان میں حبشہ کے سیاہ فام سدھی بھی تھے اور گورے چٹے ترک بھی یہاں سے بیدر اور گلبرگہ ایک ماہ کے فاصلے پر تھے۔"[2]

محمود گاواں کے دو قدیم نمک خوار ملک وجیہی اور ملک اشرف کے حسن انتظام اور بہتر نظم و نسق کی وجہ سے بہمنی سلطنت کے سرحدی مقامات سلطان پور سے ملکاپور تک پر امن اور پر سکون رہے نہ ڈاکہ اور لوٹ مار کا ڈر تھا، نہ امن شکنوں اور رہزنوں کا خطرہ، عازمین بیت اللہ اور زائرین دیار حبیب جہازوں کے ذریعے بلا خوف و خطر اس بندرگاہ سے روانہ ہوتے تھے۔ مصطفیٰ آباد کے متصل حمزہ آباد تھا۔ جس کو شاہ نصیر الدین نے اپنے بیٹے کے نام پر آباد کیا تھا۔ بہمنی بادشاہ کبھی کبھی کشتی رانی اور سیر و سیاحت کے لیے آتے تھے۔ بہمنی سلطان محمود ثانی نے یہاں کئی مدرسے اور یتیم خانے بھی تعمیر کیے تھے۔[3]

سلطنت بہمنی کا زوال

گزشتہ صفحات میں بہمنی سلطنت کے زوال کے متعلق کچھ باتیں لکھی آئے ہیں چونکہ اس سلطنت کے زوال کے اثرات کاکوکن کے

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۳ ... [2] ایضاً

اقتدار پر گہرے مرتب ہوئے تھے۔ اس لیے اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کے زوال اور اسباب سے متعلق حالات پر مزید روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے (۱) دکنی اور غیر دکنی فرقہ بندیاں (۲) محمود شاہ بہمنی کی کمسنی ناتجربہ کاری (۳) علاحدگی پسندی، خود غرضی، اقربا پروری (۴) صوبیداروں کی بے وفائی، بد عہدی، مرکز سے بے تعلقی اور خود مختاری (۵) باہمی رقابتیں اور حریفانہ سازشیں۔

کم و بیش ان ہی اسباب کی بنا پر بہمنی حکومت کی جڑیں ڈھیلی ہو گئیں اور یہی بالآخر اس کے زوال کا سبب بن گئیں"

بہمنی حکومت اپنے زوال پذیر دور سے گزر رہی تھی۔ اس کی اجتماعی قوت بکھر چکی تھی۔ اس کے صوبیدار اس سے کٹ رہے تھے۔ دولت آباد، جنیر کا سارا علاقہ مرہٹی قاعدوں اور پالیگاروں کا بیچ تھے۔ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ان کی سرکشی زور پکڑ گئی تھی۔ وہ سرکاری لگان جنیر کے شاہی خزانہ میں جمع نہیں کرتے تھے۔ اس طرح کی ان کی باغیانہ سرگرمیاں پانچ سال تک قائم رہی۔ آخر [illegible]ھ میں ملک احمد اپنے باپ کی ہدایت اور محمود شاہ بہمنی کے زمان شاہی کے تحت دولت آباد اور جنیر میں امن و انتظام کی بحالی کے لیے پہونچا۔ ملک احمد اپنی بلند حوصلگی اور اعلیٰ صلاحیت کا ایسا بہتر نمونہ پیش کیا کہ سرکشوں کے سر جھک گئے۔ تمام قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ سارے کوکن پر تسلط کے ساتھ امن اور انتظام بحال ہو گیا اور خوش حالی اور آسودگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ کوکنی، دکنی، خراسانی زبانوں میں اس کی تعریف و تحسین ہونے لگی اور ہندو تو اس کے نام کا کلمہ پڑھنے لگے۔ ان پھولوں کے ساتھ کانٹا بھی نکل پڑا۔ اس کی شہرت اور تعریف سن کر جاگن کا مہر زین العابدین آتش حسد میں جل اٹھا اور ملک احمد کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے اور اس کے مخالف حالات پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس پر الزام یہ عاید کیا کہ وہ اپنی کامیابیوں کے نتیجہ میں وہاں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے گو یہ الزام تمام تر غلط نہ تھا، ملک احمد اور اس کے والد کے دماغوں میں ایک نئی سلطنت کے قیام کا تصور ابھر رہا تھا۔ لیکن اس کا اقبال روشن اور بخت بیدار تھا۔ علی باش کا پروپگنڈہ اس کی عزت و جاہ کے بڑھتے ہوئے سورج کے سامنے چھپ کر دب گیا۔ محمود شاہ بہمنی کی تاج پوشی کی تقریب میں اس کو نظام الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔ اور جنیر کی صوبیداری کے ساتھ بارگاہ خسروی کے اس انعام سے بھی سرفراز ہوا کہ جو آئندہ قلعے فتح ہوں گے وہ اس کی جاگیر قرار پائیں گے۔

شاہی الطاف و عنایات نے اس کے حوصلے بڑھا دیے اب اس کی عملی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ مرہٹہ سرداروں کے سروں کے ڈھیر لگ گئے۔ بے شمار قلعے اس کے قبضہ میں آگئے۔ ستونیر سے رتناگیری تک مغربی گھاٹ کا سارا علاقہ اور اس کے درمیان دھرم تر گھاڑی سے ناگو کھنہ تک تمام قلعوں کا مالک و مختار بن گیا لیکن اس کے باوجود اسی گھاڑی کی دوسری جانب میگر دامیں محمود شاہ گجرات کے جنگی بیڑے

برابر گشت میں لگے ہوئے تھے۔

ملک احمد کی توجہ اب زیادہ تر دانڈا راجپوری کی طرف لگا ہوا تھا کیونکہ وہ دو کھاڑیوں کے سنگم پر آباد ایک جزیرہ نما تھا اور سیاسی و جنگی لحاظ سے اس کو کوکن کا نہایت اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔ ملک احمد نے اس کا محاصرہ کیا اور کامیاب رہا۔ مگر پایہ تخت بیدر میں حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے چنانچہ تاریخ کوکن کا مصنف لکھتا ہے۔ "پایہ تخت بیدر میں فتنے پیدا ہو چکے تھے اور یوسف عادل خاں طرفدار بیجاپور اور دیگر آفاقی امرا کی آنکھیں بحریوں کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر کھل گئی تھیں۔ یوسف عادل خاں کی شہ پاکر ایک طرف گوا کے کوتوال بہادر گیلانی کے سر میں شہریاری کا سودا سمایا تھا۔ جس نے دابھول کو دبا کر چیول کے بندرگاہ کے جیو سنبھال یے تھے۔ دوسری طرف محمود گاواں کا بہادر گیلانی ہی کی طرح ایک اور ماتحت زین العابدین ملک احمد کو جنیر کا طرفدار تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ ملک حسن بحری نے خواجہ جہاں دکھنی اور ملک آدم جی کو بھیجا تاکہ وہ ملک احمد کے ساتھ مل کر زین العابدین کی سرکوبی کریں۔ زین العابدین حاکم چاکن نے یہ پیش قدمی دیکھ کر اپنے مددگار یوسف عادل خاں کو پکارا جس نے فوراً اپنی فوج کمک کے لیے بھیج دی۔ اندا پور میں پڑاؤ پڑا۔ ملک احمد باپ کا حکم پاکر تعمیل کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اس کے باپ کو ملک عدم سے حکم آگیا۔ اور وہ کوچ کر گیا تو ملک احمد دانڈا راجپوری سے محاصرہ اٹھا کر آگے ستو گاؤں، راہفر اور زبیر کو روندتا گوداوری تک کوچ کرتا چلا گیا۔ اب وہ احمد نظام الملک بحری تھا اور اس کی تلوار اپنے باپ کا خون کا بدلہ لینے کے لیے ننگی ہو چکی تھی [1]

اب احمد نظام الملک بحری کا سے مقابلہ کوہ کن سے کبھی زیادہ سخت اور دشوار تھا۔ یوسف عادل خاں کی کمک کے شاہی حکم کے باوجود آگے بڑھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زین العابدین مقابلہ کے لیے تنہا رہ گیا۔ جو احمد نظام الملک کے ایک ہی حملہ شبخون میں وہ اور اس کے ساتھ سو ساتھیوں کا بڑی بے دردی کے ساتھ صفایا ہو گیا۔ نظام الملک کی فتوحات میں ایک اور قلعہ کا اضافہ ہو گیا۔ اب نظام الملک ایک نئی طاقت بن کر ابھر آیا۔ اس کی خود مختار نئی سلطنت کا آغاز ۱۴۹۰ء میں ہوا سہیادری کے دونوں طرف کے علاقہ بلا شرکت غیرے اس کے قبضہ میں تھے۔ تال کوکن کے تمام قلعوں کا اب وہ مالک و مختار تھا۔ ایک مشہور روسی سیاح نکوتن لکھتا ہے کہ دلیر دل کا بنایا ہوا جنیر کا قلعہ اور اس کا نواحی علاقہ (پونہ تک)، چاکن، چارگڑھ اور کوکن میں دانڈا راجپوری تک سارا علاقہ شامل تھا۔ بہادر گیلانی کو کھاپور، کلہر، سرد الا۔ لکوان، میرج اور بہالہ تک قابض ہو

---

[1] تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین ص ۱۶۲

ہو چکا تھا۔ یاقوت حبشی اس کا دست راست تھا۔ غارت گری اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دو سو جنگی جہازوں کا امیر البحر یاقوت طاقت کے گھمنڈ میں طاغوت بن گیا تھا۔ جس کی تباہیوں کا طاعون گجراتی بادشاہ بیگڑا کے مقبوضہ بندر مہائم تک پھیل چکا تھا۔ جہاں اس نے مسجدوں کا ملبہ بنا دیا اور زائرین کعبہ کے چوبیس جہازوں کے بیڑے کو جو بیگڑا کی ملکیت تھا لوٹ کر غرق کر دیا۔ بیگڑا نے بگڑ کر ملک سارنگ اور قوام الملک کی سرکردگیوں میں بحری اور بری دستے بھیجے مگر یہ راستے کی رکاوٹوں کے سبب اور سمادی آفات کے باعث جزائر بمبئی تک ہی پہنچ گئے۔ محمود شاہ بیگڑا نے ۱۴۷۹ء میں اپنے ایک امیر ہاشم تبریزی کو ایلچی بنا کر اپنے پیغام بہمنی بادشاہ کی خدمت میں بھیجا تاکہ مقربان بارگاہ کی سرزنش کی جائے۔ شاہی مہم ناکام ثابت ہوئی تو احمد نظام الملک بحری نے بہادر گیلانی کی" دریا بار سلطنت" کو دریا برد کرنے کا بیڑا اٹھایا اور کامیاب ہوا۔ اس کامیابی نے دکن کی نئی حکومتوں میں اس کا وقار بڑھا دیا اور بادشاہ بہمنی کے وعدہ کے مطابق بہادر گیلانی کی مقبوضات کا کچھ حصہ جس میں چیول شامل تھا نظام الملک کو مل گیا گو چیول پر محمود شاہ بیگڑا کی نظر لگی ہوئی تھی۔ ۱۵۰۸ء میں جب ناگوٹھنے گجراتی سلطنت کا فوجی محاذ بنا تو اس نے چیول پر قبضہ جمانے کے لیے ایک مہم بھیجی"۔ [1]

بہمنی حکومت میں اب کچھ دم خم نہیں رہ گیا تھا۔ اس کی سلطنت کے اعضا اس سے کٹ رہے تھے۔ اس کی کوکھ سے جنی ہوئی اولاد اس سے اپنا رشتہ توڑ رہی تھیں۔ صوبیدار نئے رنگ در وپ کے ساتھ ابھر رہے تھے۔ بیجاپور میں یوسف عادل خاں، احمد نگر میں نظام الملک، بیدر میں برید شاہ، برار میں عماد الملک اور گولکنڈہ میں قطب شاہ آزادی و خود مختاری کی نئی آن شان نئے تخت و تاج اور اپنے الگ نام اور پرچم کے ساتھ سرفراز ہو گئے۔ اور کوکن کے علاقے ماد نزی سے لے کر دیوگڑھ [2] تک اب عادل خانی اقتدار میں تھا۔ سنگیشور، ہر بھادتی، اور پالون کی مقامی ریاستیں گو عادل شاہ سلطنت کے ماتحت تھیں مگر در پردہ ان کی فتنہ پردازیاں بھی جاری تھیں۔ اور یہی وہ زمانہ تھا کہ جب پرتگیزی سات سمندر پار ہندی ساحلوں کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔

کوکن میں دور مسلم میں بندرگاہوں کا اقتدار

گجرات میں مظفر شاہی حکومت کا احاطۂ اقتدار کوکن تک پھیل گیا تھا لیکن یہ اقتدار وقتاً فوقتاً

---

[1] تاریخ کوکن ص ۱۶۲   [2] دیوگڑھ رتناگیری ضلع میں واقع تھا۔

عروج و زوال کے چکر میں گردش کرتا رہا تھا۔ کیونکہ سمندر پار سے آئے ہوئے ناخواندہ سیاحوں کی گرفت مغربی ساحل کی طرف زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جزائر بمبئی پر گجراتی بادشاہ کی حکومت تھی ۱۵۰۹ء میں محمود شاہ گجراتی نے جزیرہ سالسٹ تک باندرہ اپنی سلطنت میں داخل کر لیا تھا۔ گجراتی حکومت کا آخری سرحدی صدر مقام تھانہ تھا۔ جہاں اہل نوائط کی بہت بڑی تعداد آباد ہو گئی تھی۔ جہاں ایک طرف عالی شان مسجدیں تھیں تو دوسری طرف مندروں کے گوپرم اور کلیساؤں کی برجیاں بھی سربلند اور چمکتی نظر آتی تھیں گجراتی حکومت کی سرحدیں عادل شاہی اور نظام شاہی سرحدوں سے ٹکرانے لگی تھیں۔ سترہویں صدی تک کوکن کے شمالی حصہ پر نظام شاہی قبضہ رہا۔ مورخین کے بیان کے مطابق اس کی سرحد اشٹی سے لے کر بانکوٹ تک تھی۔ اگرچہ سیاسی عروج و زوال کے ساتھ اس کی وسعت میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ اس حصہ کو نظام شاہی شمالی کوکن کہا جاتا تھا۔ اس کا صدر مقام بندرگاہ چیول تھا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے زمانہ میں اسلام آباد (کھیرڈی) اس کی حکومت میں شامل نظر آتا ہے۔ ساوتری کے جنوب میں بانکوٹ کھاڑی کے ادھر کا علاقہ گوا تک عادل شاہی تسلط تھا اور عادل شاہی سلطنت کا سب سے بڑا بندرگاہ اور تال کوکن کا صدر مقام دابھول تھا۔

بہمنی حکومت کا قیام

سلطان محمد تغلق سے بعض مسلم امیروں اور ماتحتوں کا بغاوت کر کے اپنی اپنی جگہ میں آزاد و خود مختار ہو جانا مسلمانوں کے لیے تاریخی اور سیاسی اعتبار سے ایک نہایت افسوسناک واقعہ تھا۔ اس بغاوت سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت پارہ پارہ ہو گئی اور ان کی سیاسی طاقت کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس طرح جو نئی حکومتیں بنیں انھیں ترقی و استحکام حاصل کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ ادھر جنوبی ہند کے ہندوؤں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی منتشر قوتوں کو یکجا کیا اور ایک زبردست حکومت کو جنم دیا اور یہ حکومت دریائے کرشنا کے نیچے اس طرح ابھری کہ جنوب کی مسلم حکومتیں اپنے اندرونی مسائل سے فراغت پا کر اس نئی حکومت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کے مدمقابل ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس ایک مضبوط اور طاقتور سلطنت وجود میں آ چکی تھی اور یہ تھی وجیانگر کی سلطنت۔ اس ہندو حکومت نے اپنی سوچی سمجھی پالیسی کے ماتحت ابتدا میں مسلم حکومتوں اور ان کے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی۔ اور نہایت ہوشمندی سے کام لے کر ان کے خلاف صف آرائیوں اور جنگ بازیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ اور نہایت خاموشی کے ساتھ وہ اپنی طاقت کو بڑھانے میں لگے رہے۔ اس طرح جب انھیں کچھ طاقت حاصل ہو گئی تو ان کی للچائی ہوئی نظریں دکن کی طرف اٹھنے لگیں لیکن وہ نظریں اٹھ کر ہی رہ گئیں لیکن اس سے آگے قدم بڑھانے کی

ہمت اکفیر اب بھی نہ ہوسکی کیونکہ بہمنی نام سے ایک نئی اور عظیم الشان سلطنت سرزمین دکن کے نقشہ پر نمودار ہو چکی تھی۔ اس نئی سلطنت کا پایہ تخت گلبرگہ اور بانی ظفر خان تھا جس نے علاء الدین گانگو بہمنی کا لقب اختیار کیا۔ ظفر خان کے متعلق بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس کا اصل نام حسن تھا۔

حسن ۶۸۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوا اس بارے میں کہا گیا کہ جب وہ جوان ہوا تو اس کو ایک برہمن نے نوکر رکھ لیا اس کا نام گنگو تھا اس نے حسن کو دو بیل اور دو نوکر دیے تھے کہ کھیتی باڑی کر کے اپنی زندگی بسر کرے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن ایک روز حسب معمول ہل جوت رہا تھا کہ اس کا ہل زمین میں کسی چیز سے اٹک گیا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے زمین کھودنا شروع کیا تو اشرفیوں سے بھرا ہوا ایک گھڑا نکلا اس کو حسن برہمن کے پاس لے گیا اور کہا کہ یہ دفینہ آپ کی زمین سے نکلا ہے اور آپ ہی اس کے مالک ہیں برہمن اس کی ایمان داری دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کو شہزادے کے پاس لے گیا اور اس کی ایمانداری کا حال اس پر ظاہر کیا۔ شہزادے نے حسن کی ایمانداری کی تعریف کی اور اس کے لیے سلطان محمد تغلق سے سفارش کی جس نے اس کو اپنے ملازمان خاص میں داخل کر لیا پھر اس کے خدمات کے صلہ میں اس کو دکن میں جاگیر عطا کی گانگو برہمن کے متعلق یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ علم نجوم کا ماہر تھا۔ حسن کا زائچہ دیکھ کر اس نے بتایا کہ وہ آئندہ جا کر تخت و تاج کا مالک بنے گا"۔

حسن جب تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا تو اس کو برہمن کی یہ پیشین گوئی یاد آگئی اور وہ بطور اظہار تشکر اپنا نام بہمنی سے منسوب کیا گیا اور علاء الدین گنگو بہمنی کا لقب اختیار کیا اور اس نام سے اس کا خاندان شہرت پایا۔

یہ باتیں تاریخی اعتبار سے کچھ زیادہ وقیع اور قابل اعتماد نہیں کیونکہ اس کا ثبوت کوئی نہیں ہے کہ حسن کسی برہمن کا ملازم تھا اور گانگو نام کا کوئی برہمن تھا اور اگر کوئی تھا بھی تو یہ بات فہم و قیاس سے بالاتر ہے کہ حسن نے اس کی محض پیشین گوئی پر یا ملازمانہ تعلق کی بنا پر اپنے پورے خاندان کا انتساب اس کے نام سے کیا ہو حسن دراصل ایرانی النسل تھا اس کا خاندانی تعلق اسفندیار بہمن سے تھا اور اسی نسبت سے وہ بہمنی کہلایا۔ چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے ":۔

"ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل ۱۹۰۴ء میں ایک مضمون چھپ چکا ہے اور اس میں بھی یہی لکھا ہے کہ حسن ایران کے سپہ سالار بہمن اسفندیار کی اولاد سے تھا"۔

"اور یوں بھی دیکھا جائے تو صحیح لفظ برہمن ہے بہمن نہیں اگر حسن اپنے خاندان کو برہمن کے لحاظ سے نام دینا چاہتا تو وہ نام برہمنی ہوتا نہ کہ بہمنی"۔

حبب دکن کے امرا سلطان محمد تغلق سے باغی ہو گئے تو اس میں نمایاں حصہ لینے والوں میں حسن

بھی تھا۔ اور سلطان محمد تغلق کی فوج کو شکست اسی نے دی تھی۔ اسی بنا پر دکن کے امیر دں نے تخت شاہی کے لیے اسی کا انتخاب کیا اور بادشاہ دکن ہو گیا۔ اس نے گیارہ برس تک حکومت کی اور ۱۳۵۸ء میں رحلت کر گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس خاندان کے ۱۸ بادشاہ ہوئے اور یہ بہمنی حکومت ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۹ء تک کم و بیش ایک سو بچھتر سال قائم رہی پھر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ احمد شاہ ثانی کے بعد آخر میں جو تین بادشاہ ہوئے وہ برائے نام تھے۔ اور ضعف و زوال کے آثار نمایاں محمود شاہ ثالث نے متوفی ۱۴۸۲ء نے محمود گاواں جیسے صاحب علم و فہم، صاحب سیف و قلم وزیر باتدبیر کے قتل ناحق سے بہمنی سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ اس کا صوبیداری نظام بکھرنے لگا زوال و انحطاط تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ محمود گاواں کا خون ناحق نہایت گہرا رنگ لایا۔ صوبیدار سب بگڑ گئے۔ اور اپنی اپنی طاقتیں بڑھانے لگا اور انھیں مستحکم کرنے لگ گئے۔ پھر مختلف صوبے آپس میں ٹکراتے اور لڑتے رہے۔ آخر تمام صوبے اپنے اپنے علاقوں میں آزاد خود مختار اور اپنی جداگانہ حکومتیں قائم کر لیں۔ اس طرح سلطنت بہمنی تو اجڑ گئی۔ اس کے بجائے پانچ نئی ریاستیں وجود میں آگئیں (۱) عادل شاہی بیجا پور (۲) نظام شاہی احمد نگر (۳) بریدشاہی بیدر (۴) عماد شاہی برار (۵) قطب شاہی گول کنڈہ۔

عادل شاہی

عادل شاہی حکومت کا بانی یوسف عادل خاں تھا وہ پہلے بیجا پور میں بہمنی سلطنت کا ایک صوبے دار تھا یہ سلطنت ۸۹۵ھ میں قائم ہوئی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس کے نو بادشاہ ہوئے اور یہ حکومت تقریباً دو سو برس تک قائم رہی پھر ۱۶۸۶ء میں بیجاپور میں عالمگیر اورنگ زیب کے حملے کے بعد اس کا قبضہ ہو گیا۔ اور عادل شاہی حکومت کا ستارہ اس طرح چھپ گیا کہ پھر کبھی نہ ابھرا۔

نظام شاہی

احمد نظام الملک احمد نگر کا صوبیدار تھا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد اس نے ۹۸۶ء میں نظام شاہی نام سے احمد نگر میں ایک نئی سلطنت قائم کی۔ نظام شاہی خاندان میں

لہ تاریخ جنوبی ہند ص۱۰

یکے بعد دیگرے ۱۲ بادشاہ ہوئے۔ ۱۶۳۳ء میں مغلوں نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

قطب شاہی

قطب الملک بہمنی حکومت کی طرف سے گول کنڈہ کا صوبیدار تھا۔ اس نے اپنی قطب شاہی حکومت الگ قائم کرلی۔ اس کا نام قلی قطب علی شاہ تھا۔ اس کا پایہ تخت گول کنڈہ تھا۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ حکومت ۱۵۱۲ء سے ۱۶۸۷ء تک قائم رہا۔ تاریخ سے اس کے آٹھ بادشاہوں کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے گول کنڈہ پر قبضہ کر کے اس حکومت اور خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

وجیانگر

چونکہ اس حکومت کا تعلق جنوبی ہند اور خاص کر کرناٹک اور خطۂ کنارا سے تاریخی اور سیاسی اعتبار سے نہایت گہرا اور اس کے دور میں سارا جنوبی ہند مختلف قسم کے انقلابی حالات و واقعات سے گزرا تھا۔ اس لیے اس کی اہمیت کے مدنظر اس عظیم سلطنت کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔

وجیانگر کی بنیاد کے لیے ایک ایسی جگہ چن لی گئی تھی۔ جہاں اس سے ڈھائی ہزار سال پہلے کشکندہ نامی ایک شہر آباد تھا اور اسی نام کی ایک حکومت بھی وہاں قائم تھی جو بمبئی کے علاقہ کی طرف واقع تھی۔ کشکندہ ایک تاریخی جگہ تھی۔ کیونکہ سری رام چندر جی، سیتا جی، اور لچھمن جی اپنی یاترا کے دوران یہاں سے جنوبی ہند کی ایک مشہور تیرتھ گاہ سری نگر میں آکر ٹھہرے تھے۔ وہاں کا راجہ سگریو تھا یہ وہی راجہ تھا جس نے راون کے مقابلہ کے لیے رام چندر جی کی مدد کی تھی۔ مورخین نے کشکندہ کے مختلف نام لکھے ہیں لیکن اگر نقشہ میں بغور دیکھا جائے تو کسی قدر فرق کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مقام کے مختلف نام ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ شہر مختلف انقلابوں سے گزرتا رہا تھا۔ اور ہر بار اجڑنے پر کبھی شمال اور کبھی جنوب میں ایک نئے نام سے ابھرتا رہا اور ہر عہد حکومت ایک نئے نام سے موسوم ہوتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تاریخی کتابوں اور سیاحوں کے بیانوں میں اناگنڈی، کمپلا، بھانگر، بسناگ جیسے مختلف نام پاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس کا قدیم نام کشکندہ تھا لیکن بعد میں اس کے نام بدلتے رہے۔ اور تاریخ نویسوں اور سیاحوں نے اس کا جو نام اپنے زمانہ میں پایا وہی لکھ دیا اسی طرح وجیانگر کے شاہی خاندان اور اس کی اصلیت کے بارے میں مورخین کی رائے

یکساں نہیں ہیں لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کا پہلا راجہ ہری ہر تھا۔ لیکن یہ دراصل کون تھا؟ کس خاندان سے تھا؟ ہری ہر راجہ کیسے بنا؟ اس میں مورخین کی تحقیقات الگ الگ، بانسری الگ الگ راگ کا نمونہ ہیں۔ نارگائن اچاریہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔ "کردیا ذات کے دو بھائی ہری ہر اور بکا ورنگل کے راجہ کی ملازمت میں تھے۔ ورنگل پر مسلمانوں کے حملے کے بعد انھوں نے ۱۳۳۶ء انا گنڈی میں آکر یہاں کے راجہ کی ملازمت اختیار کرلی اور یہاں وہ ترقی کر کے وزیر اور خازن بن گئے۔ اور رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی حکومت قائم کرلی۔"

اب تاریخ فرشتہ سے بھی کچھ سن لیجیے۔ وہ لکھتا ہے کہ۔

راجہ جنگ میں مارا گیا اس کے بارہ بیٹے تھے۔ جنھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ محمد بن تغلق نے انھیں حکومت سپرد کی لیکن تبدیلی مذہب کی وجہ سے انھیں ہندوؤں نے قبول نہیں کیا اور بوڑھے وزیر کو راجہ بنالیا۔ ہری ہر اور بکا اسی خاندان سے ہیں۔

پرتگالی سیاح اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:۔

"سلطان محمد بن تغلق نے انا گنڈی کے راجہ پر چڑھائی کی۔ محاصرہ کی تاب نہ لاکر راجہ نے سری نانا میں پناہ لی۔ لیکن مسلمانوں نے یہاں بھی اس کا تعاقب کیا۔ تنگ آکر راجہ نے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کردیا۔ اور قلعہ سے نکل کر جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ شہر میں صرف دو بوڑھے آدمی باقی رہ گئے تھے۔ ان میں ایک راجہ کا وزیر تھا اور دوسرا خزانچی۔ محمد بن تغلق نے دو سال تک انا گنڈی میں رہا۔ جب شمالی ہند میں بغاوت ہوئی تو وہ یہاں اپنے ایک نائب ملک نبی کو چھوڑ کر دہلی چلا گیا اور سلطان کے جانے کے بعد ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ ملک نبی اس بغاوت کو فرو نہ کرسکا اور مجبوراً دولت آباد چلا گیا۔ اس وقت سلطان تغلق نے اپنے امراء سے مشورہ کر کے انا گنڈی کی حکومت راجہ کے وزیر کو بخش دی۔ ہری ہر اور بکا اسی وزیر کے خاندان سے تھے۔"

محمڈن انو بڈریس کا مصنف لکھتا ہے:۔

"ہری ہر اور اس کا بھائی ہوئے سالا حکومت کے ملازم اور گورنر تھے۔ دوار سمندرم کو مسلمانوں نے جس وقت فتح کرلیا تو راجہ نے وجیا نگر کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس سلطنت کے زوال پر وجیا نگر ان بھائیوں کے قبضے میں آگیا۔"

تاریخ جنوبی ہند کا مصنف محمود خاں لکھتا ہے:۔

قدیم تاریخوں اور کتبوں سے جو انا گنڈی کے قریب ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنگما نامی ایک شخص انا گنڈی کے راجہ کا وزیر تھا۔ راجہ کے مارے جانے کے بعد یہ یہاں کا راجہ بن گیا اور ہری ہر اور بکا اس کے لڑکے تھے۔"

قطع نظر اس بات کے کہ ان روایات میں کہاں تک صداقت ہے لیکن ان پر گہری نظر ڈالنے سے جو باتیں سامنے آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اناگندی کے راجہ کے قتل ہو جانے کے بعد سلطان محمد بن تغلق نے یہاں کی حکومت اس کے ایک وزیر کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے پانچ بیٹے تھے ان میں سے دو راجہ ورنگل کی ملازمت سے منسلک تھے۔ ورنگل پر جب مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا تو یہ وہاں سے جان بچا کر بھاگ نکلے اور اناگندی آ کر پناہ لی۔ اور ہوئے سالا کی حکومت میں ملازمت اختیار کر لی اور آگے چل کر مختلف صوبوں کے گورنر ہو گئے۔ مسلمانوں کے حملہ سے بلار اسوم کی حکومت کا کس بل گھٹ گیا تھا اور تباہی کا اور زوال کے آزمائشی دور سے گزر رہی تھی۔

جگت گرو شنکراچاریہ ودیارنیہ جو دھرم کے ایک بہت بڑے پیشوا اور رہنماؤں میں سب کے مانے ہوئے گرو تھے انھوں نے بلار اسوم کی حمایت اور تائید سے مسلمانوں کے مقابلہ میں جنوبی ہند کے ہندوؤں کو متحد و منظم کرنے اور انھیں ایک بڑی طاقت ور قوم کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع فراہم کرنے اور ایک نئی حکومت کو جنم دینے کا منصوبہ بنایا۔ کیونکہ گرو جی نے محسوس کر لیا کہ بلار اسوم کی حکومت میں اب اتنا دم نہیں ہے کہ وہ مسلم حملوں کی تاب لا سکے۔ اس لیے انھوں نے ہندوؤں کی عام حمایت و تعاون سے ان کے بے اندازہ مال و دولت کے بل بوتہ پر وجیانگر کو راجدھانی کا کیندر تجویز کیا اور ہری ہر کو راج گدی پر بٹھا کر اس کو وجیانگر کا پہلا فرمانروا منتخب کیا۔ مورخین کے بیان کے مطابق راجہ ہری ہر کی حکومت ۱۳۳۶ء میں قائم ہوئی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سلطنت دہلی کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں برپا ہو گئیں تھیں، سرکشی اور بدامنی زور و شور کے ساتھ سر اٹھا چکی تھیں۔ محمد بن تغلق مدورا کی بغاوت کچلنے کے لیے دکن آیا یہ سلسلہ ادھر جاری تھا ادھر شمالی ہند میں بغاوتیں پھوٹ پڑنے کی خبریں آنے لگیں تو وہ بیدر ہی سے دہلی واپس چلا گیا اور وہاں کے حوادث و حالات میں الجھ کر رہ گیا اور اس کو جنوب کی طرف رخ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

سلطان محمد تغلق کے دکن سے چلے جانے کے بعد یہاں میدان صاف تھا۔ بغاوتیں سر اٹھانے لگیں۔ دبی دبائی فتنوں کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ دکن کے امراء علانیہ سرکشی پر آئے۔ ادھر مسلمان باہمی جنگ و جدال میں مبتلا ہو گئے اور ادھر ہندوؤں کو اپنی خفیہ تیاریوں کو بروئے کار لانے کا سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ ہوئے سالا کی حکومت ہندو اتحاد اور سنگٹھن کی زبردست حامی تھی اور اس کے لیے پوری سرگرمی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ اس سے اس کا مقصد خود اپنی حکومت کی تقویت و استحکام تھا۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہی کیونکہ جگت گرو ودیارنیہ نے اس گرتی ہوئی دیوار کو تھامنے اور اس خزاں رسیدہ کمزور حکومت کو سنبھالنے کے لیے ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھنے

کو ترجیح دی اس طرح وہ ایک نئے نقشہ اور نئے ڈھانچہ کے ساتھ ایک بالکل نئی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اس حکومت کی سربراہی کے لیے ہری ہر کا انتخاب ہوا۔ یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ گرو جی نے ہری ہر کے انتخاب اسی لیے کیا کہ ہری ہر اور اس کے چار بھائی ملک کے بہت بڑے حصہ اس کے بارے میں تاریخ جنوبی ہند کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"یہ گمان بے جا نہیں کہ گرو نے ہری ہر کا انتخاب اس لیے کیا کہ ہری ہر اور اس کے چار بھائی ملک کے بہت بڑے حصہ پر حکمراں تھے۔ شاید ان پانچ بھائیوں کی متفقہ طاقت جنوبی ہند میں اس وقت سب سے زبردست تھی لیکن کسی تاریخ سے یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ ہری ہر کے انتخاب پر بلال سوم نے کس طرح گوارا کیا ہو۔" ۱؎

بلال سوم کے اس انتخاب کو گوارا کرنے یا اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھانے کے اسباب دو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کو اپنے سیاسی زوال اور غیر یقینی حالات نے کچھ کہنے اور سننے نہ دیا ہو یا اس کی خاموشی اس مصلحت پر مبنی ہو کہ ہری ہر ایک نئی طاقت و سلطنت کے روپ میں ابھر آنے سے اس کی حکومت کو مسلم حملوں سے بچانے کا ایک قوی اور مضبوط سہارا بن جائے گا۔

ہری ہر اول سنگما وزیر کا بڑا بیٹا تھا اور اس کے چار چھوٹے بھائی تھے۔ چنانچہ نیور ٹوپی اسپائر لکھتا ہے:۔

"ہری ہر نہایت خوش قسمت تھا اس کے چار بھائی اس کے نہایت وفادار اور فرمانبردار تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی بکا رایا کو اس نے یوراج یا ولی عہد بنایا اور اپنی افواج کا سپہ سالار اس کو مقرر کیا۔ تیسرے بھائی کو کلیا کو کڈپہ اور نلور کے اضلاع کا گورنر بنایا۔ چوتھے بھائی ماریا کو میسور کے مغربی علاقہ کا حاکم مقرر کیا۔ پانچویں بھائی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔"

اس میں اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ اس نئی سلطنت کا وزیر اعلیٰ خود جگت گرو و مہادیو یا بنے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور وزارت میں اس نئی سلطنت کا انتظام اس حسن و خوبی کے ساتھ مقرر کیا کہ چند ہی دنوں میں وہ جنوب کی ایک طاقت ور حکومت بن گئی ان کا زمانہ ہر طرح پر امن رہا۔ راجہ ہری ہر اپنے دور حکومت میں جنگ اور لڑائی سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو اس کے ابتدائی دور میں لڑائی چڑھائی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ اس کو معلوم تھا کہ مسلم حکومتیں اس وقت آپس میں خانہ جنگی میں مبتلا اور اپنے اندرونی مسائل میں بری طرح الجھی ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا تو رہے کہ

۱؎ تاریخ جنوبی ہند ص ۱۲

ان میں سے کسی ایک سے معمولی چھیڑ چھاڑ ہماری اس نئی حکومت کو کچل کر خاک میں ملا دے گی۔ درحقیقت یہ راجہ ہری ہر کی مدبرانہ حکمت عملی تھی کہ اس نے دوسرے ملکوں کی طرف نظر اٹھانے اور انھیں چھیڑنے سے گریز کیا اور اپنی ساری توجہ اور تمام تر صلاحیتیں اپنی حکومت کو دیا وہ مستحکم مضبوط اور قوی تر بنانے میں صرف کیا لیکن جب وہ کافی طاقت ور ہو گیا تو اس کے ساتھ اس کی فوجی نقل و حرکت بھی شروع ہو گئی اس طرح اب وہ بعض جنگوں میں بھی حصہ لینے لگا لیکن اس کی فوجی کارروائی یا زور آزمائی کڈپہ اور نلور کے اضلاع تک محدود رہی وہ بھی اس لیے کہ وہاں کے ہندو سردار اس میں حکومت کی بالادستی اور سرداری کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ حالانکہ جنوب کے تمام راجاؤں سرداروں اور مندروں کے سب سربراہوں نے اس نئی سلطنت کے قیام میں ہر طرح ساتھ دیا تھا۔ اور اس کی سرگرم حمایت کی تھی اور بے انتہا مال و دولت فراہم کر کے اس کو استحکام بخشا تھا اور جب وہی سلطنت ایک بڑی طاقت بن کر اپنی سرداری و بالادستی کو منوانا چاہا تو انھوں نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور لڑنے پر اتر آئے۔ ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے ان کا مقابلہ کیا اور انھیں اپنا تابعدار اور باجگذار بنا کر چھوڑا۔ ہری ہر ۱۳۴۶ء میں چل بسا۔ ہری ہر کے دور میں وجیانگر کی سلطنت کافی وسعت اور ترقی پر پہنچ گئی تھی دریائے تنگبھدرا سے لے کر جنوب میں بحرۂ عرب تک پھیل گئی تھی۔ اور ان علاقوں کے راجاؤں نے اس کو بطور اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کر لیا تھا۔

سیاسی اعتبار سے ہری ہر کا دور حکومت ایک پر امن اور کامیاب کہا جاتا ہے کہ اس نے نہایت تدبر اور دانشمندی سے اپنے پڑوسی مسلم حکومتوں سے اسرار حکومت کو پوشیدہ رکھ کر درپردہ حکومت کو مستحکم اور حکومت کو طاقتور بنایا تھا۔ چنانچہ سیول اپنی تاریخ میں میوز بیاح کے حوالہ سے لکھتا ہے:۔

"ہری ہر کا دور سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ نہایت رازداری سے کام لے کر سلطنت کی تنظیم میں مصروف رہا۔"

ہری ہر کے عہد میں مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی جنوبی ہند کے دورے پر آیا تھا۔ اس نے حنور میں سلطان جمال الدین کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہ سلطان راجہ ہریب (ہری ہر) کا باج گزار تھا۔"

اکثر ہندو دیگر تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہری ہر کے بعد اس کا بھائی بکا دیا راجگدی پر بیٹھا تھا۔ وجیانگر کے شاہی شجرے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے لیکن سیول لکھتا ہے کہ:۔ ہری ہر کے بعد اس کا بھائی سنگا تخت نشین ہوا۔ خدا جانے وہ کس بنیاد پر ایسا لکھتا ہے۔ کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے ہری ہر کا سنگما نامی کوئی بھائی بھی تھا۔ اس لیے سیول کا یہ لکھنا کچھ بے جوڑ اور بے ثبوت

معلوم ہوتا ہے درحقیقت ہریہر کے بعد اس کا بھائی بکاریا ہی تخت نشین ہوا تھا اس کا زمانہ حکومت ۱۳۴۶ء سے ۱۳۴۹ء تک تھا۔ جنوب میں وجیانگر کے مقابلہ میں اس زمانے میں بہمنی حکومت وجود میں آگئی تھی چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :-

جس طرح وجیانگر کا حکمراں نے اپنے ابتدائی سال نہایت خاموشی سے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے میں گزارے ہیں اسی طرح علاءالدین کانگو بہمنی نے بھی اپنی سلطنت طاقتور بنانے میں مصروف رہا۔ اسی لیے دونوں سلطنتوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہمنی سلطنت کا قائم ہو جانا ان کی ہستی کے لیے نیک فال ثابت ہوا ورنہ اگر مسلمان امراء منتشر رہتے تو ممکن تھا کہ بکاریا سا اولوالعزم انھیں دکن سے ضرور نکال دیتا۔[1]

بہمنی سلطنت کی زبردست طاقت کو دیکھتے ہوئے بکاریا نے خود تو اس کے مقابلہ میں آنے کی ہمت نہ کر سکا۔ لیکن در پردہ اس نے خلاف مختلف چالیں چلتا رہا۔ ان میں اس کی ایک گہری چال یہ تھی کہ مسلم حکومتوں کو آپس میں لڑا کر دکن پر قابض ہو جائے۔ چنانچہ مینور لوڈی نرگائن ایائر لکھتا ہے :-

بکاریا نے شہنشاہ دہلی کو پیغام بھیجا اگر شہنشاہ حکم دے تو وہ دکن کے باغی امراء سے جنگ کرنے کو تیار ہے۔ لیکن دہلی سے اس کو کوئی جواب نہیں ملا۔ اسی لیے دہلی میں بھی تغلق کے بعد انقلابات آرہے تھے۔ " دہلی سے جب وہ مایوس ہو گیا تو وہ ایک دوسرا حلیف تلاش کرنے لگا۔ آخر ورنگل کے راجہ وناگیک دیو اسے ساز باز کر کے اس کو اپنا حلیف اور ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

علاءالدین حسن کانگو بہمنی کا ۱۳۵۸ء میں انتقال ہو گیا تو اس کی جگہ محمد شاہ اول حکومت بہمنی کا دوسرا تاجدار بنایا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بکاریا اور وناگیک دیو اور راجہ کے مشترکہ طور پر محمد شاہ لکھا کہ بعض سرحدی اضلاع مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے ہیں انھیں پھر ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔ محمد شاہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ ورنگل پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ سے ورنگل کے راجہ کو شکست اٹھانا پڑا۔ پھر چند دن بعد اس نے محمد شاہ سے بدعہدی کی اور توہین آمیز رویہ اختیار کیا تو محمد شاہ نے اس پر دوبارہ حملہ کیا۔ راجہ ناگیک دیو کو گرفتار کیا اور اس کو قتل کر ڈالا۔ جب بہمنی فوج کامیاب واپس ہو رہی تھی تو اچانک بکاریا کی فوج پہونچ گئی اور اس نے گھیر کر اس کا تعاقب کیا لیکن وہ گلبرگہ پر حملہ کی ہمت نہ کر سکا اور وجیانگر واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بکاریا نے شہنشاہ دہلی فیروز تغلق کے نام ایک اور خط لکھا جس میں لکھا تھا اگر وہ ہماری حمایت کرے

---

۱ تاریخ جنوبی ہند ص ۱۲۶

تو گلبرگہ پر چڑھائی ہو سکتی ہے لیکن فیروز نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بکاریا کی فوج کا گلبرگہ تک اس کا تعاقب کیا اور اس سلسلہ میں فرشتہ لکھتا ہے :۔

ورنگل کی فتح کے بعد موسم کی خرابی کی وجہ سے اسلامی فوج زیادہ دنوں تک اس ملک میں ٹھہر نہ سکی سپاہی روزانہ مر رہے تھے۔ اسی لیے محمد شاہ نے ہندوؤں کی تعاقب کرنے والی فوج پر کوئی توجہ نہیں۔ وہ خود بھی اس جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔" [1]

پھر کچھ دنوں کے بعد محمد شاہ نے ورنگل پر تیسری بار حملہ کر دیا ورنگل اور گول کنڈہ کا مشہور قلعہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح ورنگل کی ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اب بہمنی اور وجیانگر کی سرحدیں آپس میں مل گئیں۔ اب محمد شاہ وجیانگر سے انتقامی کارروائی کے لیے سوچ رہا تھا کہ اس نے بغیر کسی وجہ کے ورنگل کے راجہ کو ہمارے خلاف اکسایا اور اس کی مدد کے لیے ہماری فوج کا تعاقب کیا محمد شاہ نے ورنگل کی فتح وکامیابی کی خوشی میں ایک شاندار جشن منانے کا انتظام کیا۔ اس میں رقص وسرود میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک طائفہ بیجانگر سے بھی پہنچا تھا۔ اس کے رقص اور موسیقی کے کمالات دیکھ کر محمد شاہ بہت خوش ہوا۔ اور اپنے وزیر سیف الدین کو حکم دیا کہ راجہ بکاریا تک ہماری خواہش پہنچا دی جائے کہ اس طائفہ کو اپنی طرف سے بطور انعام کچھ عطا کر دے۔ وزیر نے اس تعمیل میں کچھ تردد کیا۔ صبح کو محمد شاہ نے شاہی فرمان کو دستخط طلب کیے۔ تو وزیر نے معذرت چاہی۔ اس پر محمد شاہ نے کہا۔ خدا کی قسم میں اپنی زبان سے بے کار الفاظ نہیں نکالتا۔ میرا حکم شراب کی مستی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔ وزیر نے حسب شاہی حکم کی تعمیل کی اور بکاریا نے اس کو اپنی ہتک اور توہین سمجھا اور اس قدر برہم ہوا کہ قاصد کو گدھے پر بٹھا سارے شہر میں پھرایا اور ذلت کے ساتھ اس کو نکال باہر کر دیا اور اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ اس موقع پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

۱۳۶۵ء میں تین ہزار ہاتھی اور تین ہزار سوار اور نو لاکھ فوج لے کر بکاریا بہمنی سلطنت کے جنوبی اضلاع پر حملہ کیا محمد شاہ کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو وہ اپنی فوج کو تیاری کا حکم دیا لیکن اس کی فوج کو تیار ہونے میں دو وقت لگ گیا۔ اتنے میں ان کے ملک کے بعض اضلاع پر بکاریا کی فوج کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ودنگل کا شہر محاصرہ میں آگیا تھا اس وقت ورنگل میں کم وبیش آٹھ سو مسلمان آباد تھے اور وہ اس ناگہانی افتاد سے بے خبر تھے قلعہ فتح ہو گیا۔ بکاریا نے حکم دیا کہ تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ مرد اور

---

[1] تاریخ فرشتہ منقول از تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۲۰

بچے تو اسی وقت قتل کر دیے گئے لیکن عورتوں کو ان کی عصمت دری کے بعد قتل کر دیا گیا۔ ہندو فوج کی اس چیرہ دستی کی خبر جب محمد شاہ کو پہنچی تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک اس کے بدلے میں ایک لاکھ ہندو تہ تیغ نہ کئے جائیں تلوار نیام میں نہیں ڈالی جائے گی۔ یہ کہہ کر اس نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک نو ہزار منتخب جانباز سواروں کو لے کر دریائے کرشنا پار کیا۔ باقی اسلامی فوج پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ محمد شاہ کی آمد کی خبر سنتے ہی بکاریا اور اس کی سوار فوج فرار ہو گئی۔ محمد شاہ کی فوج نے ہندوؤں کے کیمپ میں اس قدر تباہی لائی کہ ستر ہزار ہندو مارے گئے۔ ان مقتولوں میں دس ہزار سے زیادہ برہمن تھے۔"[1]

محمد شاہ نے آگے بڑھ کر وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ راستہ میں بے حساب مرد، عورت اور بچے قتل ہوئے۔ محمد شاہ اسی طرح اپنی قسم پوری کی۔ بکاریا نے محصور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ صلح اس شرط پر ہوئی کہ بکاریا اپنا خزانہ سے طائفہ کو انعام دے۔ طوائفوں کا انعام اسی وقت دیا گیا اور دونوں حکمرانوں نے عہد کیا کہ آئندہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔[2]

سلطان محمد تغلق کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ محمد شاہ نے دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا عبور کر کے جنوب میں داخل ہوئے۔ چنانچہ میسور گزیٹر اس واقعہ کو اس طرح لکھتا ہے:۔

"وجیانگر کی بنیاد کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ وجیانگر پہنچا۔ محاصرہ ایک ماہ جاری رہا۔ سلطان کی واپسی پر ہندوؤں نے پھر مسلمانوں کا تعاقب کیا۔ محمد شاہ نے طرح دینی شروع کی لیکن جب ہندو باز نہ آئے تو اس نے ایک جگہ ہندوؤں کو گھیر کر ایسا شبخون مارا کہ بے حساب ہندو مارے گئے[3]" اس کے بعد یہ مصنف آگے لکھتا ہے "اور یہی اس کا مقصد ہے کہ باوجود صلح کے بکاریا عاجز نہیں ہوا بلکہ اس نے واپس ہونے والی فوج سے برابر چھیڑ چھاڑ جاری رکھی[4]"

اس جنگ کے بعد نو سال تک کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بکاریا نے کسی لڑائی بھڑائی میں حصہ لیا ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ وہ گذشتہ جنگ میں بہمنی حکومت کے ہاتھوں اس کو زبردست نقصان پہونچا تھا۔ دوسری وجہ اپنی فوج کو از سر نو تنظیم اور اس کو پہلے سے زیادہ طاقتور بنانے میں لگ گیا ہو۔ مورخین وجہ ثانی کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ لیکن بعض واقعات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وجیانگر اس زمانے میں کسی بڑی جنگ سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ لیکن جزیرہ نما کے جنوب میں چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور پالیگاروں کو اپنا ماتحت بنانے میں

---

[1] سٹورک لینڈ مارکس آف دکن ص۱۰۸ ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند۔ [2] ایضاً ص۱۲۹ [3] تاریخ جنوبی ہند ص۱۲۹
[4] میسور گزیٹیر جلد دوم ص۱۴۳۱

میں اس کی پوری فوج سرگرمی دکھاتی اور لڑتی رہی۔ اس کی اس طرح کی صف آرائی اور مقابلہ بازی زیادہ تر جنوب کی ان مسلم ریاستوں سے تھی جو ملیبار اور مدورا میں واقع تھیں۔ فریقین کبھی فتح سے دوچار اور کبھی شکست سے ہمکنار ہوتے رہے۔ اور یہ لڑائی اور مقابلہ بازی جب کئی مہینوں تک مسلسل رہی تو آخرکار ملیبار اور مدورا کی حکومتیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئیں اور فتح و کامرانی بیجانگر کے حصہ میں آئی۔ ملیبار اور مدورا کی مسلم حکومتوں کا زوال درحقیقت جنوب کے مسلمانوں کا زوال تھا۔ وہاں کے مسلمان سخت اور کڑی آزمائشوں اور سخت مشکلات میں گھر کر رہ گئے۔ وہ ناقابلِ برداشت ظلم و ستم کے نشانہ بنے زندگی کی راہیں ان پر تنگ نہیں بلکہ بند کر دی گئیں۔ ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں، ان کا مال و اسباب چھین لیا گیا۔ انھیں اپنے گھربار سے محروم ہونا پڑا اور اپنے دین کو چھپانا پڑا۔ انھیں اپنی عزیز جانوں کو بچانے کے لیے شہروں سے نکل کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ ملیبار اور مدورا کی اسلامی سلطنتوں کے خاتمہ کے ساتھ وجیانگر کی سلطنت کو راس کماری تک وسعت حاصل ہو گئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس وسعت کے بعد اب پورا جنوبی ہند وجیانگر کے قبضہ میں ہو گیا۔ اس طرح ہیگن گرو مہا دیوا کا وہ خواب جو اس سلطنت کی بنیاد رکھتے ہوئے انھوں نے دیکھا تھا بکا رایا کے ہاتھوں بڑی مدت تک تعبیری شکل میں ظاہر ہو گئی۔ ان ہی دنوں بہمنی حکومت کے لیے ایک حادثہ پیش آیا۔ محمد شاہ بہمن گلبرگہ میں انتقال کر گئے اور ۱۳۷۵ء میں ان کا نوجوان بیٹا مجاہد حسن کی عمر صرف ۱۹ برس کی تھی سربراہ سلطنت ہوا بکا رایا جو موقع کی تاک میں تھا اس سے فائدہ اٹھا کر تنگ بھدرا سے آگے بڑھا اور رس کے قریب وجوار کے جنوبی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ مجاہد ابن نوجوان اور ناتجربہ کار ہیں اس لیے وہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کر سکتا۔ لیکن خلاف امید مجاہد نے بکا رایا کے نام اسی وقت یہ خط بھیجا:

"ہندو قوم چیرہ دست ہو کر اسلامی مقبوضات پر قبضہ کر رہی ہے بہتر یہ ہے کہ اس فوج کو تنگ بھدرا کے پار واپس بلا لیا جائے اگر دریائے تنگ بھدرا کو سرحد قرار دیا جائے تو آئندہ بہمنی سلطنت وجیانگر والوں سے کوئی تعرض نہیں کرے گی۔ تنگ بھدرا سے نیچے تمام جنوبی ہند پر اس کی قیادت کو تسلیم کر لیا جائے گا۔"

اس کا جواب بکا رایا نے یہ دیا:۔

"سلطنت وجیانگر کی شمالی سرحد عرصہ قدیم سے دریائے کرشنا تک رہی ہے اس لیے دوآبہ پر وجیانگر کا حق ہے۔ بہتر ہے کہ اسلامی فوجوں کو یہاں سے واپس بلا کر رائے چور اور مدگل کے قلع ہندوؤں کے قلع ہندوؤں کے حوالے کیے جائیں اور ساتھ ہی وہ تمام ہاتھی جو نوراں بیشتر محمد شاہ نے بجبر حاصل کیے تھے۔ واپس کیے جائیں۔" [1]

---

[1] ہشارک لیانڈ مارگس آف دکن ص ۱۰۹

بلاکر رائے چور اور مدگل کے قلعے ہندؤں کے حوالے کئے جائیں اور ساتھ ہی وہ تمام ہاتھی جو نو سال پیشتر محمد شاہ نے بجبر حاصل کئے تھے واپس کیے جائیں۔

اس خط و کتابت کا نتیجہ باہمی جنگ کی صورت میں نمودار ہوا۔ مجاہد دریائے کرشنا کو عبور کر کے نہایت برق رفتاری کے ساتھ ادھونی پہونچا اور اس کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اسے پر اپنے ایک امیر صفدر خان سیستانی کے سپرد دیگر مجاہد وجیانگر کے طرف روانہ ہوا اور ادھر بکارپا تنگ بھدرا کے دوسرے کنارے پر اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے وجیانگر کے افواج کے حوصلے پست ہوگئے اور ان میں سراسیمگی اور ابتری پھیل گئی۔ اس واقعہ کو انگریز مورخین ہیگ گریبل نے فرشتہ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور وہ واقعہ یہ ہے :۔

" مجاہد کو آتے ہوئے راستے میں ایک خونخوار اور خوفناک شیر نظر آیا۔ مجاہد نے اس شیر کو ایک ہی تیر سے مار ڈالا یہ خبر بکارپا کی فوج تک پھیل گئی تو ان پر مجاہد کا رعب چھا گیا۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے اور بکارپا جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا۔"

ہسٹارک لینڈ مارکس آف دکن لکھتا ہے :۔

" مجاہد نے آتے ہوئے راستے میں خونخوار شیر کو ایک ہی تیر سے مار دیا۔ ہندو فوج میں یہ خبر پھیل گئی تو ان پر مجاہد کا رعب چھا گیا۔ بکارپا نے یہ دیکھ کر جنگلوں میں پناہ لی۔"

ہو سکتا ہے کہ ہندو جو عام طور پر شگون کے وہم میں مبتلا رہتے تھے اس واقعہ کو اپنے حق میں ایک برے شگون سے تعبیر کیا ہو اور بڑے بھڑے بنا جنگلوں میں پناہ لے ہو۔ بہر حال مجاہد آٹھ مہینے تک برابر بکارپا کے تعاقب میں لگا رہا۔ اس عرصہ میں اس کو ایک طرف فتوحات ہوتی گئیں تو دوسرے طرف بکارپا کی فوج پر اتنا سخت دباؤ پڑا کہ ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔

چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے :۔

" جنوب میں مجاہد رامیسورم تک پہونچ گیا اور اس نے ملک کا فور کی بنائی ہوئی مسجد جو شکستہ ہو رہی تھی از سر نو تعمیر کی۔"

مسلسل آٹھ مہینوں تک جنگلوں میں بن باسی کی زندگی گزارنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بکارپا کی فوج میں وبا پھیل گئی اور وہ واپس اپنی راجدھانی چلا گیا۔ جب یہ خبر مجاہد کو پہونچی تو اس نے آگے بڑھ کر وجیانگر کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے دو راستے ہوتے تھے۔ ایک راستہ کسی قدر کشادہ تھا جس پر بہ آسانی فوج گزر سکتی تھی۔ لیکن یہاں قدم قدم پر مدافعت کی سنگین رکاوٹیں تھیں دوسرا راستہ نہایت دشوار گزار اور خار زار تھا۔ لیکن مجاہد نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اور اچانک شہر پر حملہ کر دیا اس طرح کے ناگہانی حملے سے سارے وجیانگر میں خوف وہراس گھبراہٹ اور اضطراب کی ایک عجیب حالت طاری ہوگئی جلا اور

شہر کی فصیل پر قابض ہو گئے۔ چونکہ شاہی محل تک پہونچنے میں راستہ میں نہایت شدید مزاحمتیں اور رکاوٹیں حائل تھیں اس لیے اس پر قبضہ نہ ہو سکا لیکن مجاہد نے ہنومان مندر پر قبضہ کر لیا اس کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ اس کا ایک نیوٹول فرگائٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے :-

"میں نے اس مندر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کو مجاہد نے تباہ کر دیا تھا شاہی محل یہاں سے بالکل قریب ہے"[1]

اس وقت بکا رایا اپنی فوج لے کر مقابلہ کے لیے نکلا۔ اور عین اس وقت بیبو رسے ایک بہت بڑی فوج اس کی کمک کے لیے آگئی لیکن مجاہد کے چچا داؤد خاں کی جلد بازی سے جنگی پلان کی خلاف ورزی میں حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ مجاہد نے تدبیر اور مصلحت بینی سے کام لے کر اپنی فوج کو واپسی کا حکم دیا۔ اور وجیانگر سے محاصرہ اٹھا کر ادھونی کی طرف بڑھا۔ ادھونی کا محاصرہ نو مہینے تک قائم رہنے کے بعد اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ادھر ملک میں قحط کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس سے عوام میں پریشانی اور بے چینی پیدا ہو گئی۔ ادھر فوج میں بیماری پھیل گئی۔ آخر ملک نائب سیف الدین کے سمجھانے سے مجاہد محاصرہ اٹھا کر واپس ہوا۔

مجاہد کا قتل ناحق

مجاہد نے اپنے مختصر عہد حکومت میں جو کارنامے انجام دیے اور جو کارگزاریاں دکھائیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ صرف نام کا مجاہد نہیں تھا بلکہ عمل اعتبار سے بھی وہ ایک سرگرم مجاہد اور ایک زبردست کارگزار تھا وہ ابھی جوان تھا۔ تخت شاہی پر آئے اس کو ابھی چار سال ہی گذرے تھے وہ ابھی پورے طور پر ابھرنے نہ پایا تھا کہ جان لیوا سازش کا شکار ہو گیا۔ ہوا یہ کہ وہ اپنی جنگی مہمات سے واپس ہو رہا تھا تو راستے میں اس کے خلاف اس کے چچا داؤد خاں نے سازش کی اور اس کے نتیجہ میں اس کو قتل کر دیا گیا اس کے قتل پر چند روز تک ملک بھر میں کافی شور و شر برپا ہوا۔ اس بارے میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :-

"مجاہد کی شہادت کے بعد جب داؤد خاں گلبرگہ پہنچ کر تخت نشین ہوا تو مجاہد کی بہن نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے داؤد خاں کو قتل کر دیا"

مورخین کے بیان کے مطابق اس جنگ میں بکا رایا کی چالیس ہزار سپاہیوں کی جانیں کام آئیں مجاہد کی فوج کا ایک رعب اور ہیبت ہندو فوجیوں پر اس قدر طاری تھی کہ انھوں نے مجاہد کی واپس جانے والی فوج کا تعاقب نہ کیا اور نہ کچھ تعرض۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد تقریباً چالیس سال تک دریائے کرشنا سے آگے بڑھ کر دوآبہ رائچور کی طرف آنکھ اٹھانے تک کی ہمت نہ کر سکے مجاہد کے اس

---

[1] ہسٹارک لینڈ مارکس آف دکن ص ۱۰۹

ہنگامہ خیز اور زبردست حملے نے بکاریا کو اس کی آخری عمر میں اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ اس کے چند ہی مہینوں بعد یعنی ۱۳۷۹ء میں وہ اس دنیا سے چل بسا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وجیانگر کو وسعت دینے اور اس کو ایک طاقتور مملکت بنانے میں بکاریا نے نہایت اہم رول انجام دیا تھا۔ اس کی جنگی قابلیت و انتظامی صلاحیت بھی اپنی جگہ ناقابل انکار ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کو اپنے زمانے میں صف آرائی اور مقابلہ بازی سے بالا اکثر جنوب کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں سے رہا تھا۔ اور اسے فتوحات انھیں کمزور طاقتوں اور علاقوں میں حاصل ہوئی تھیں۔ اس کو کسی بڑی طاقتور فنون جنگ کی ماہر اور آلات حرب سے مسلح فوج سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ملیبار اور مدورا کی مسلم حکومتیں اول تو ان نوآباد علاقوں میں ان کی تعداد بالکل معمولی تھی۔ دوسرے جب تک دہلی سے ان کا تعلق قائم رہا وہ اس کے سہارے محفوظ رہے۔ لیکن ۱۳۳۶ء میں جب مرکز سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا تو یہ مسلم حکومتیں ہنادؤں کے غلبہ کے سامنے دم توڑنے لگیں کیونکہ دکن اور دہلی تک ان کی رسائی میں بیجانگر سد راہ تھا لیکن اس کے باوجود ان دونوں علاقوں کے مٹھی بھر مسلمان لگاتار تیس سال تک وجیانگر جیسی طاقتور حکومت سے بڑی ہمت اور جانبازی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اور اپنی اپنی حکومتوں کو بیجانگر کی جارحانہ سرگرمیوں سے بچاتے رہے اس طرح ان کے تیس سال بے امنی، بے اطمینانی سے معمور، ابتلا و آزمائشوں سے بھرپور حالات میں گزر گئے ۱۳۳۳ء تک وہ دوار سمندرم اور ہزادنکورد دو دشمن طاقتوں سے ان کا مقابلہ رہا۔ اس کے بعد تئیس سال تک وجیانگر کی جیسی عظیم وطاقتور سلطنت سے لڑتے بھڑتے رہے آخر کار انھیں وجیانگر کے ہاتھوں پسپا ہونا پڑا اور ان دونوں مسلم حکومتوں کا خاتمہ ہوگیا ان دو مسلم حکومتوں سے فتحیاب ہونے سے بکاریا کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس نے سوچا کہ جب ہم اتنے طاقتور ہیں تو دکن ہمارے مقابلہ کی تاب کہاں سے لائے گا۔! اس کی یہی غلطی تھی کہ اس نے ملیبار اور مدورا کی کمزور حکومتوں کو دکن جیسی طاقتور حکومت پر قیاس کیا۔ حالاں کہ ملیبار اور مدورا کی کمزور حکومتیں اپنی کمزوریوں کے باوجود تیس سال تک ہمت کے ساتھ اس کے جارحیت کے خلاف برابر لڑتے رہے اور جنگ کرتے رہے تو دکن کی ایک بڑی طاقت کے خلاف ان کی صف آرائی کا انجام کیا ہوگا؟"

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ محمد شاہ بہمنی کے حملہ آوری کی خبر سن کر بکاریا کی فوج مارے خوف کے کھانے لگی تھی کیونکہ ملک کا نور اور تغلق کی یورش رہا جنگی کارگزاریاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے جس سے مسلمانوں کی ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ چکی تھی وہ دیکھ چکے تھے کہ تغلق نے گزشتہ ہولناک جنگ کے دوران ان کی تین ہندو حکومتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا تھا ان حالات میں بکاریا کی فوج کا رعب زدہ ہو جانا، لڑنے سے جی چرانا اور فرار کی راہ اختیار کرنا جبرت اور

تعجب کا مقام نہ تھا۔

بکاریا کی فوج پر محمد شاہ اور مجاہد کی فوج کا رعب اس قدر چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کا سامنا کرنا تو درکنار ان کے نام سے گھبرا اٹھتی تھی حالانکہ ان کے پاس عسکری قوت کی بہت کثرت تھی۔ اسباب و آلات جنگ کی فراوانی تھی۔ مال و زر کے وسائل بھی فراہم تھے۔ اس کے باوجود بکاریا کی فوج محاذ جنگ سے یکسر غائب تھی اور محض پست ہمتی اور دہشت خوردگی کی بنا پر وہ اپنے ہاتھ آئے ہوئے موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکی اور یہ واقعہ ہے کہ اس ہزیمت سے بکاریا کے دل کو سخت دھچکا لگا اور یہی جانگسل صدمہ بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ بکاریا کے عہد کے بارے میں فرشتہ لکھتا ہے:۔

"بہمنی سلاطین کو اگر وجیانگر پر کوئی فوقیت حاصل تھی تو یہ ان کی جنگی طاقت تھی ورنہ والیان وجیانگر مال و دولت میں ان سے بڑھ کر تھے گوا اور ملیبار کی زرخیز بندرگاہیں ان کے قبضہ میں تھیں رعایا وفادار تھی اور ملک خوب آباد تھا۔ سیلون اور پرٹاونکورے کے راجہ ان کے درباروں میں سفیر رکھے اور ہر سال ان کے ذریعہ قیمتی نذرانے گذارتے تھے۔"

بکاریا کا عہد حکومت بلحاظ وسعت و ترقی وجیانگر کا ایک کامیاب دور تھا۔ ہندو دھرم کے اعتبار سے بھی بکاریا کا دور کافی اہمیت کا حامل ہے ایک عرصہ سے وشنو اور جین آپس میں ٹکرا رہے تھے ان میں ہر جگہ قتل و خوں ریزی کا بازار گرم رہتا تھا۔ ہزاروں جانیں ان کے باہمی جھگڑوں سے ضائع ہو رہی تھیں۔ یہ بکاریا ہی تھا کہ اس نے ان کے باہمی اختلافات و تنازعات کو دور کیا۔ ان دھرموں کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے ان کے لیے پر امن طور پر رہنے کا موقع فراہم کر دیا۔

ہری ہر دوم

ہری ہر کے بعد اس کا بیٹا ہری ہر تخت راجگی پر جلوہ افروز ہوا۔ وجیانگر کے راجگان میں مہاراج اور راج ادھی راج کا خطاب اسی راجہ کو ملا تھا وہ شروع ہی سے اپنی حکومت کو منظم، مستحکم اور ہر لحاظ سے طاقتور بنانے سے کام رکھا اور یہ کام کسی دوسرے کی طرف نظر اٹھائے بغیر نہایت خاموشی سے انجام دیتا رہا اس کا ابتدائی دور پر امن رہا اس نے ۱۳۹۱ء میں گوا سے مسلمانوں کو نکال باہر کیا تھا جو وہاں تجارت اور کاروبار میں مدت سے رہتے آئے تھے ان کے اخراج کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہری ہر کو ان سے ڈر تھا کہ اس کی خفیہ جنگی تیاریوں کا راز ان کی ہمسایہ مسلم سلطنتوں پر ان تاجروں کے ذریعہ افشا ہو جائے۔ اس طرح اس نے مسلسل آٹھ سال اپنی جنگی تنظیم اور تیاریوں میں گزارا۔ جب اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اس کی فوج کسی بھی بڑی طاقت کے نبرد آزمائی کے قابل ہو گئی ہے تو اس نے بہمنی سلطنت سے اس کی گزشتہ ہنگامہ بازی کا انتقام لینے کے لیے کمربستہ ہو گیا اور بجھر ۱۳۹۸ء میں فوج کو کوچ کا حکم دیا اور تنگ بھدرا کو عبور کر کے دوآبہ دکن کے علاقوں پر قابض ہو کر رائچور کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا حال ہٹلر رک لیا نڈ ار کسی آف دکن

کی کتاب ہے جو کہ جنوبی ہند میں مکتوب ہے اپنی کتاب صفحہ ۱۱۱ میں مؤرخ ہیگ لکھتا ہے :-

"اس وقت دکن میں فیروز شاہ بہمنی حکمراں تھا جس وقت اس کو ہری ہر کی اس چیرہ دستی کی خبر پہونچی تو اس نے گلبرگہ جاکر نظام آباد میں فوج جمع کرنی شروع کر دی اور وہاں کے ہندو زمیندار کو جو ہری ہر سے سازش کر کے باغی ہو گیا تھا میدان جنگ میں شکست دے کر قتل کر ڈالا لیکن اس سلسلہ میں اس کو معلوم ہوا کہ اس میں صرف یہی ایک زمیندار نہیں بلکہ یہ سازش مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع پیمانے پر ہوئی ہے جس میں دکن کے بہت سے ہندو سردار شامل ہیں۔ کراڈ کا نرسنگھ دیو بھی اس میں شامل ہے اور ملک کے شمالی سرحد پر حملہ کر رہا ہے۔ فیروز نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے بیدر اور دولت آباد کی مقیم فوجوں کو کہیرلا پر بڑھنے کا حکم دیا۔ اور خود بھی جس قدر فوج جمع ہو سکی تھی لے کر آگے بڑھا۔ اس وقت اس کے زیر کمان بارہ ہزار فوج تھی۔ فیروز جس وقت دریائے کرشنا پر پہونچا تو دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا اور دوسرے ساحل پر ہری ہر دوم تیس ہزار سوار اور نوے ہزار فوج کے ساتھ اس کے انتظار میں تھا۔ فیروز دریا کی یہ حالت دیکھ کر پیچ و تاب کھانے لگا۔ امراء اور وزراء سے مشورہ کیا لیکن دریا پار ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں ملتا تھا اور دوسری مشکل یہ تھی کہ اس حالت میں دریا کو عبور کیا جاتا تھا تو دوسرے طرف ساحل پر تمام اہم مقامات پر ہندو فوج قابض تھی یہ حالت دیکھ کر قاضی سراج نے جو فوج میں ایک سو سواروں کا حاکم تھا اپنی تجویز اس کے آگے پیش کر دی فیروز نے اس کو منظور کر لیا۔ قاضی سراج اور اس کے سات دوست ہندو فقیروں کا بھیس بدل کر ہندوؤں کے لشکر میں پہنچ اور یہاں یہ لوگ شراب خانوں میں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے طوائفوں سے دوستی بڑھائی اور ان کے ناچ گانوں میں شامل ہونے لگے۔ قاضی سراج نے ایک طوائف سے محبت بڑھائی حالت یہاں تک پہونچی کہ بغیر اس کو دیکھے اس کو چین نہ آتا تھا یہ طوائف شاہی دربار میں رسائی رکھتی تھی اور قاضی کو معلوم تھا کہ اس کے ذریعہ وہاں تک پہونچ سکتا ہے۔ چند دن بعد اس طوائف کی شاہی دربار میں طلبی ہوئی اور جس وقت وہ جانے لگی تو قاضی نے اس کا دامن تھام لیا۔ کہنے لگا یا تو میرا خاتمہ کرتی جاؤ یا ساتھ لے چلو طوائف نے کہا کہ دربار میں سوائے ناچنے اور گانے والوں کے دوسروں کو لے جانا منع ہے اس پر قاضی نے کہا وہ بانسری بجا سکتا ہے اور اس نے بانسری اٹھا کر اس خوبی سے بجائی اور ایسا ناچا کہ طوائف دنگ رہ گئی اس نے قاضی کو اور اس کے ساتھیوں کو زنانہ لباس پہنایا اور ساتھ لے کر دربار میں گئی یہاں قاضی اور اس کے ایک ساتھی کو راجکمار کے سامنے پیش کیا گیا۔ ناچ شروع ہوا قاضی اور اس کے ساتھی نے تلوار کا ناچ جو دکن میں مشہور ہے دکھایا۔ تمام دربار حیرت سے دیکھ رہا تھا ناچتے ہوئے کبھی اس قدر آگے بڑھ جاتے تھے کہ راجکمار کے قریب ہو جاتے تھے اور کبھی بالکل دور۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر جب وہ راجکمار کے قریب تھے یکایک دونوں نے اپنی تلواریں راجکمار کے سینے میں گھونپ دیں۔ اس موقعہ پر قاضی کے دوسر

چھ ساتھی جو باہر کھڑے تھے۔ قناتیں کاٹ کر خیمہ میں گھس آئے اور ہندو امرا کو جو شراب کے نشہ میں مخمور تھے قتل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے ہندوؤں کے سنبھلنے تک کئی امیر مارے گئے۔ اسی وقت قاضی اور اس کے ساتھیوں نے چراغ گل کر دیا اور اندھیرے میں بچ کر نکل گئے۔ یہاں سے وہ اس جگہ پہونچے جو پہلے سے مقرر شدہ تھی یہاں پہونچ کر انھوں نے اسلامی فوج کو دریا عبور کرنے کے لیے مقررہ اشارے دیئے۔ راجکمار اور امرا کے قتل سے ہندو فوج میں ایک اضطراب پھیل گیا۔ تھوڑے سے وقت میں قسم قسم کی افواہیں اڑنے لگیں یہ بھی مشہور ہو گیا کہ راجہ ہری ہر بھی مارا گیا۔ ہندو فوج کے سپاہی جہاں ان کا خیال آیا قاتلوں کے تعاقب میں نکلے اس اثنا میں کسی نے یہ افواہ بھی اڑا دی کہ مسلمان دریا پار ہو کر آگئے ہیں۔ ہندو فوج اس طرح منتشر ہو رہی تھی تو دوسری طرف فیروز کے چار ہزار سپاہی ٹوکروں میں بیٹھ کر رات کی اندھیری میں گھوڑوں کو ساتھ ساتھ تیراتے ہوئے دریا کو عبور کر کے ساحل پر آئے ادھر جو چند ہندو محافظ تھے مارے گئے۔ صبح ہونے لگی اس وقت فیروز اپنی بقیہ فوج لے کر دریا کو عبور کیا۔ شب میں جو مسلمان سپاہی آگئے تھے وہ ساحل کی حفاظت کر رہے تھے۔ ہندوؤں میں اس قدر پریشانی پھیل گئی تھی کسی جگہ بھی جم کر وہ فیروز کا مقابلہ نہ کر سکے راجہ ہری ہر بمشکل اپنے بیٹے کی لاش لے کر فرار ہوا لشکر کا تمام مال و اسباب مسلمانوں کے ہاتھ آیا فیروز نے اب ہندوؤں کا تعاقب شروع کر دیا اس کی فوج وجیانگر تک پہونچی اور اس کا محاصرہ کر لیا فیروز نے اپنے بھائی خان خاناں اور سردار فضل اللہ کو حکم دیا کہ اطراف کے شہر اور دیہات کو تباہ کر ڈالیں قاضی سراج کو امیر کا خطاب دیا گیا۔ چند دنوں میں میر فضل اللہ اور خان خاناں کی فوج نے دس ہزار برہمن مرد و عورت کو گرفتار کر لیے فیروز نے حکم دیا کہ انھیں مسلمان بنا لیا جائے یہ دیکھ کر وجیانگر کے برہمنوں نے راجہ ہری ہر کو صلح کر لینے کا مشورہ دیا فیروز کے لیے دس لاکھ طلائی ہن اور میر فضل اللہ کے لیے ایک لاکھ طلائی ہن۔ یہ سب برہمن میر فضل اللہ کے پاس بھیجے گئے کہ کسی طرح وہ فیروز کو صلح کے لیے رضامند کرے میر فضل اللہ نے پورے گیارہ لاکھ ہن سلطان کے آگے پیش کر دیے اور صلح ہو گئی۔ دوآبہ رائچور مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ فیروز محاصرہ اٹھا کر واپس روانہ ہوا اور جاتے ہوئے فولاد خاں کو رائچور کا حاکم مقرر کیا۔[1]

ہری ہر اس جنگ کے بعد چار سال تک زندہ رہا۔ اس کی حکومت کا زمانہ سنہ ۱۳۷۹ء سے لے کر سنہ ۱۴۰۴ء تک رہا۔

دیوراے اول

ہری ہر دوم کے بعد اس کا بھائی دیوراے وجیانگر کی راج گدی پر بیٹھا۔ مورخین نے اس کے مختلف نام لکھے ہیں۔ فرشتہ نے اس کا نام ترنگ لکھا

---

[1] ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۴

ہے۔ اس کے تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں بہمنی سلطان فیروز کے ساتھ ایک اور جنگ کا آغاز ہوگیا۔ اس لڑائی کی وجہ پرتھال نامی لڑکی بتائی جاتی ہے۔ مورخ رئیس لکھتا ہے :۔

پرتھال ایک سنار کی لڑکی تھی جو مدگل کے قریب ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ اگر شاعرانہ تعلیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کو بے مثل حسین بنایا تھا وہ صانع فطرت کی صناعی کی ایک زندہ مثال تھی۔ اتفاق سے اس کے گاؤں میں ایک برہمن تاجر کا آنا ہوا جو شمالی ہند کی تیرتھوں سے واپس آرہا تھا۔ وہ پرتھال کے گھر میں مہمان ٹھہرا۔ اس برہمن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس لڑکی پر فریفتہ ہوگیا تھا اور اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اپنی عشق ومحبت کا حال اس پر ظاہر بھی کر دیا لیکن لڑکی نے اس کو ٹھکرا دیا جس سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور آخر ناکام وجیانگر چلا گیا وہاں پہونچ کر اس نے سوچا کہ پرتھال اگر میری نہیں ہوسکتی تو اس کا حسن وجمال میرے لیے مال زر اور دولت کثیر کا بہت بڑا ذریعہ بن سکتا ہے وہ دیو رائے کے بارگاہ میں پہونچا اور اس کے سامنے پرتھال کے حسن وجمال کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا کہ دیو رائے نے برہمن کو قیمتی تحائف اور زیورات کے ساتھ سنار کے پاس بھیجا اور پیام دیا کہ وہ اپنی لڑکی پرتھال کو بیجانگر کے محل میں داخل کرے لیکن لڑکی نے اس خیال سے کہ راجہ کے مرنے کے بعد اس کی بیویوں کو ستی ہونا پڑے گا اس نے یہ پیام قبول نہیں کیا اس پر راجہ سخت برہم ہوا اور مشتعل ہوگیا اور غالباً اس نے زبردستی حاصل کرنے کے لیے اپنی فوج لے کر مدگل پر حملہ کر دیا۔ مدگل چونکہ بہمنی سلطنت کا علاقہ تھا اس لیے اس کی کھلی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے فیروز شاہ بھی اپنی فوج کے ساتھ وجیانگر پہونچا راجہ قلعہ میں بند ہوگیا آپس میں جھڑپیں ہوئیں اور اس میں طرفین کا کافی جانی نقصان ہوا اور اسی میں فیروزشاہ مجروح ہوا اس کے باوجود فیروز شاہ اپنی فوج کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا اور اپنے ایک سردار میر فضل اللہ کو کرناٹک فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اس کے کچھ دن بعد فیروزشاہ نے قلعہ ادھونی کی فتح کا ارادہ کیا بیجانگر کا راجہ اس نئے حملہ کی بات سن کر پریشان ہوا اور فیروز کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اس نے صلح کے لیے کچھ کڑی شرطیں پیش کیں اگر دیورائے اپنی بیٹی سے میری شادی کرے اور اس کے جہیز میں بنکاپور کا علاقہ مجھے دے دے، دس لاکھ ہن ہوں، کئی من موتی، پچاس ہاتھی، دو ہزار کنیزیں اور مصارف جنگ ادا کرے تو صلح ورنہ جنگ ضرور ہو کر رہے گی۔ دیورائے نے ان تمام شرطوں کو قبول کر لیا۔ دیورائے کی بیٹی کی شادی نہایت کر وفر اور دھوم دھام کے ساتھ وجیانگر میں قرار پائی۔ میر فضل اللہ وجیانگر گئے اور دلہن کو دولہا کے پاس جہیز کے ساتھ لائے پھر فیروز شاہ دلہن کے ساتھ وجیانگر گیا اور وہاں کئی روز مہمان رہ کر رخصت ہوا اس کے راستے میں مخمل اور اطلس کا فرش بچھایا گیا تھا فیروز اور دیو رائے پہلے دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلے۔ پھر تھوڑی دور تک دونوں گھوڑے پر سوار ہو کر چلے۔ پھر

پالکی پر بیٹھ گئے۔ دلہن کو راجہ نے تیسرے روز رخصت کر دیا دیو رائے بھی کچھ دور تک ساتھ آیا لیکن خدا معلوم کیا بات ہوئی راستے سے واپس چلا گیا فیروز کو یہ بات ناگوار گزری اس نے کہا کہ راجہ کا دل مجھ سے صاف نہیں ہے اس لیے وہ میرے ساتھ خیمہ تک نہیں آیا۔ اس طرح فیروز شاہ دیو رائے سے ناراض ہو گیا جہاں تک اس صلح کا تعلق ہے وہ مسلم نقطۂ نگاہ سے نقصان دہ اور سیاسی لحاظ سے ایک ایسی فاش غلطی تھی جس کی تلافی آئندہ دو سو سال تک نہ ہو سکی کیونکہ وجیانگر کی ہندو حکومت اس وقت احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی ان کی ہمتیں پست اور ان کا عسکری نظام بگڑ چکا تھا۔ اگر فیروز اس وقت اپنی جنگ جاری رکھتا تو پورے جنوبی ہند پر اس کا تسلط ہو سکتا تھا لیکن "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کے مصداق فیروز کے سامنے شاید یہ صلح سے یہ مصلحت کارفرما رہی ہو کہ اس شادی سے بہمنی اور وجیانگر کے درمیان باہمی جنگ بازیوں اور آئے دن کے خون ریزیوں کا سلسلہ مدتوں سے چلتا آرہا ہے۔ اس کا خاتمہ ہو جائے جس سے یہ دونوں حکومتیں آپس میں ٹکرا کر اپنی تمام ترقتیں ضائع کر رہی ہیں اس کا سدباب ہو جائے اور ان میں صلح و آشتی، امن و دوستی کی ایک نئی بنیاد اس رشتہ کے ذریعہ قائم ہو جائے۔

جس لڑکی کی خاطر یہ ہنگامہ آفریں لڑائی برپا ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے بے دریغ خونریزی ہوئی اس کا انجام بھی ذرا سن لیجئے!

مؤرخ اسکاٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:۔

"وہ لڑکی جس کے لیے اس قدر خونریزی ہوئی تھی اس کو فیروز نے اپنے دربار میں طلب کیا پرتھال کے حسن خداداد کو دیکھ کر اس پر حیرت چھا گئی۔ اس نے اس کی شادی اپنے بڑے لڑکے حسن سے کر دی"

اس جنگ کے بعد گیارہ سال امن اور خاموشی کے ساتھ گزر گئے لیکن گیارہویں سال کے ختم ہوتے ہوتے پھر ایک بار میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اس کی تفصیل میور گزیٹر اس طرح لکھتا ہے:۔

"۱۴۱۷ء میں فیروز نے پنگل پر چڑھائی کی یہ راجدھانی سے ستر میل شمال میں تھی اور یہاں کے راجہ دیو رائے کے عزیزوں میں تھا پنگل کا محاصرہ دو سال تک رہا اس عرصہ میں ملک میں وبا پھیل گئی جس کی وجہ سے اسلامی فوج کے سپاہی مرنے لگے لیکن فیروز نے محاصرہ نہیں اٹھایا یہ دیکھ کر اکثر امراء علیحدہ ہونا شروع ہو گئے۔ دیو رایا موقع کی تاک میں تھا اس وقت اس نے فیروز پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد فیروز کو شکست ہوئی۔ میر فضل اللہ جو اس کا بہترین جنرل تھا اس جنگ میں مارا گیا یہ دیکھ کر مسلمانوں کا دل ٹوٹ گیا اور راہ فرار اختیار کی"[1]

---

[1] میور گزیٹر ص۱۲۵ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۱۲۷/۱۲۸

بالکل

اس جنگ میں مسلمانوں کے قتل و خونریزی کا ذکر فرشتہ اس طرح کرتا ہے :۔

"اس موقع پر ہندو فوج نے نمازیوں کے سر تن نازنیں سے اس قدر جدا کئے کہ میدان جنگ میں ان کے سروں کا چبوترہ بن گیا"

اس کے بعد ہندو فوج نے نہ صرف مسلمانوں کا تعاقب کیا بلکہ بہمنی حکومت کے جنوبی علاقہ دوآبہ رائچور اور دریائے کرشنا تک سارے علاقے وجیانگر کے قبضہ میں چلے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر فیروز نے گجرات سے کمک طلب کی تھی لیکن وہ بروقت نہ پہونچ سکی ہندو فوج دریائے کرشنا تک رک گئی ہندو فوج نے دریائے کرشنا عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ مصلحت نہیں سمجھا یہ ایک بہت بڑی شکست تھی جو ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کو پہونچی تھی۔ فیروز کو اس شکست کا اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ وہ اس کے چند ہی مہینوں بعد اس دنیا سے رحلت کر گیا لیکن اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ اس فتح و کامرانی کے باوجود دست اجل نے دیورایا کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ دیورایا نے اپنی تمام تر توجہ عسکری تنظیم اور اس کو قوی و مضبوط تر بنانے میں صرف کیا تھا اس کے زمانے میں اس کے سوا کوئی اور کام نمایاں نظر نہیں آتا مورخین لکھتے ہیں کہ :۔

"دیورایا در پردہ ایک زبردست لڑائی کی تیاری میں مصروف تھا تاکہ فیروز سے اس کی سنگین توہین کا بھرپور انتقام لیا جاسکے جو اس نے پرتگال کے حصول میں آڑے آنے اور اس کی بیٹی کی شادی اپنے ساتھ رچانے کی صورت میں کیا ہے۔ میری بیٹی ہندو اور وہ مسلمان ہمارا ان کا رشتہ کیا؟ میری بیٹی کے ساتھ شادی رچا کر اس نے خود میری اور میرے ہندو دھرم کی توہین کی ہے۔ اس لیے ہم کو دوسری تمام باتوں سے قطع نظر کر کے اس سے انتقام لینے کی کوششوں اور تیاریوں کو مقدم رکھنا چاہیئے۔ غالباً یہی جذبہ انتقام تھا جس نے وجیانگر کے راجاؤں کو مسلمانوں کی تذلیل اور توہین پر اکثر اکسا تا رہا چنانچہ اس کے بعد کی جنگیں بے شمار کشت و خون اور بے دریغ قتل و غارت گری سب اسی سلسلہ کی کڑیاں نظر آتی ہیں۔

بکا ریا سوم

دیورایا کے بعد اس کا بھائی نیچے رایا وجیانگر کا راجہ ہو گیا۔ گذشتہ سطور میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ فیروز کے رحلت پانے کے بعد اس کا حریف جو اس کا خسر بھی تھا چل بسا تھا۔ بیگل میں فیروز کی شکست و ناکامی، طاعون کی مہلک بیماری اور اس سے فوجی جوانوں کی جانیں تلف ہونے اور فوجوں میں ہراس و ابتری پھیلنے، امرائے سلطنت کا ساتھ چھوڑنے اور راہ فرار اختیار کرنے کی بنا پر ہوئی تھی۔ فیروز کو اس کی امید نہ تھی کہ ایسے آفت زدہ اور نازک موقع سے فائدہ اٹھا کر دیورایا اس پر اچانک حملہ کرے گا لیکن خلاف توقع یہ حملہ ہوا اور پوری شدت کے ساتھ ہوا اور اس کے نتیجہ میں فیروز کو عبرتناک شکست اٹھانا پڑا تھا اگر موت نے فیروز کو کچھ مہلت دی ہوتی تو عجب نہ تھا کہ اس شکست کا بدلہ وجیانگر پر حملہ کی صورت میں لیا جاتا فیروز شاہ کے انتقال کے بعد

اس کا بھائی احمد شاہ تختِ بہمنی پر جلوہ افروز ہوا اور ادھر وجیانگر راجگدی پر دیو رایا نے زینت بخشی اب دونوں حریفوں کی جگہیں ان کے بھائیوں نے سنبھالی۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کے بارے میں سٹورک مارکس لیانڈ آف دی دکن لکھتا ہے :-

"احمد شاہ تخت نشینی کے بعد فوراً چالیس ہزار سوار لے کر دوابہ دکن پر حملہ کر دیا۔ جس نے اگلی جنگ میں جس میں فیروز کو شکست ہوئی تھی حصہ لیا تھا سمجھا کہ اس وقت بھی مسلمانوں کو آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے جس طرح پہلی بار دی گئی تھی۔ وہ دس لاکھ پیادہ فوج لے کر دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پر ٹھہر گیا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل چالیس روز تک پڑی رہیں۔ چالیسویں دن احمد شاہ نے اپنے امیروں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے رائے دی کہ دریا کو عبور کیا جائے۔ جب یہ خبر ہندو لشکر میں پہنچی تو ازلبیہ کا راجہ جو گج بنی جو دیو رایا کی مدد کے لیے آیا تھا اس سے علیحدہ ہو گیا۔ لیکن دیو رایا نے ہمت نہیں ہاری۔ اس عرصہ میں دو پٹھان سردار عالم خاں اور لودھی خاں نے دس ہزار سواروں کی ایک جمعیت لے کر رات کے وقت ایک جگہ سے عبور کیا جس کی ہندوؤں کو خبر تک نہ ہو سکی دریا کو عبور کر کے انھوں نے ایک چکر دار راستہ سے ہندو فوج کے عقب میں پہونچ کر اچانک حملہ کیا جہاں پر دیو رایا کا کیمپ تھا۔ دیو رایا اس غیر متوقع حملہ کا گمان تک نہ تھا۔ کیمپ کے قریب وہ ایک نیشکر کے کھیت کے پاس اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آرام کر رہا تھا۔ مسلمانوں کے اس حملے کے ساتھ ہی محافظین تو بھاگ گئے اور دیو رایا سمجھا کہ مسلمان خاص اس کی ذات پر حملہ کرنے آئے ہیں اس لیے وہ نیشکر کے کھیت میں چھپ گیا۔ مسلمانوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا اس سے ہندو فوج میں پریشانی پھیل گئی اور ان کے سنبھلنے تک احمد شاہ دریا کو عبور کر کے مقابل بن گیا۔ جس سے ان کی رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی اور وہ فرار ہونا شروع ہو گئے۔ نیشکر کے کھیت کے پاس جو چند مسلمان تھے وہ محافظین کے فرار ہونے پر اپنی پیاس بجھانے کے لیے گھوڑوں سے اترے اور نیشکر کاٹنے لگے۔ یہاں دیو رایا چھپا ہوا بیٹھا تھا انھیں مل گیا مسلمانوں نے سمجھا کہ کھیت کا مالک ہے اس لیے کہ وہ اس وقت نہایت سادہ لباس میں تھا انھوں نے نیشکر کا گٹھا اس کے سر پر لاد کر لے جانے کے لیے کہا۔ دوسری طرف ہندو فوج کے فرار ہو جانے سے مسلمانوں کے لشکر میں فتح کا غلغلہ بلند تھا اس فتح کی نوید سن کر مسلمان نیشکر چھوڑ کر مال غنیمت کو لوٹنے کے لیے چلے گئے۔ دیو رایا کو بھاگنے کا موقع مل گیا اور جس وقت یہ اپنے امراء سے ملا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ منتشر فوج کو جمع کر کے مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔"

یہی مورخ پھر آگے لکھتا ہے :-

نازوں کے پلے ہوئے راجہ کو کبھی اس قدر وزن اٹھانے کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ نیشکر کے بھاری بوجھ نے اس کے دماغی توازن کو خراب کر دیا تھا اس نے بجائے مقابلہ کرنے کے یہی مناسب سمجھا کہ وجیانگر چلے

کر وہ قلعہ بند ہو جائے۔ احمد شاہ نے وجیا نگر کا محاصرہ کرنے کے بجائے ملک کے اندر حصوں میں قتل و غارت گری شروع کی اور گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے۔ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا بچہ جو کوئی ہاتھ آیا قتل کر دیا گیا۔ مندروں کو اجاڑ اگیا۔ احمد شاہ نے یہ معمول سمجھا جب مقتولوں کی تعداد تیس چالیس ہزار تک پہونچی تو تین دن تک جشن منایا۔ ایسے ہی موقعہ پر جس طرح دیو رایا کی جان بچی یہ بھی بال بال بچ گیا ایک دن احمد شاہ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر شکار کھیلنے جنگل میں گیا اس وقت پانچ سو سپاہی تھے جب یہ شکار کھیل رہا تھا تو اچانک ہندوؤں کی فوج آگئی۔ انھیں جب معلوم ہو گیا کہ ان کا دشمن احمد شکار کھیل رہا ہے تو انھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ محافظین نہایت سختی کے ساتھ اس کی حفاظت کی۔ انھوں نے لڑتے ہوئے قریب کی چار دیواری میں پناہ لی اور اس کے محافظین اس کو گھیرے رہے جو عام طور پر مویشیوں کو بوقت ضرورت پناہ دینے کے لیے جنگلوں میں بنی رہتی ہے۔ احمد شاہ نے اس چہار دیواری میں پناہ لی۔ اور اس کے محافظین اس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہندوؤں کے حملے سے بچاتے رہے مسلمان کٹ کٹ کر مر رہے تھے لیکن ہندوؤں کو چہار دیواری تک پہونچنے نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ احمد شاہ کے پانچ سو سپاہی قریب قریب مارے گئے۔ ہندوں نے چہار دیواری کے قریب پہونچ کر دیواریں توڑنا شروع کر دیں "

آگے لکھتا ہے :-

"احمد شاہ کی واپسی کا وقت گزر گیا تو اسلامی لشکر کے ایک سردار عبد القادر نے منتخب سواروں کا ایک دستہ لے کر بادشاہ کی تلاش میں نکلا اور عین وہاں پہونچا جب ہندو چار دیواری کو منہدم کر رہے تھے۔ عبد القادر نے آتے ہی ہندوؤں پر حملہ کر دیا۔ ہندو فوج اس حملہ کی تاب نہ لاکر فرار ہو گئی اس طرح احمد شاہ کی جان بچ گئی"۔ [1]

اس کے بعد احمد شاہ وجیا نگر پہونچا اور اس کو محاصرہ میں لے لیا دیو رایا کے لیے اس وقت صلح کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا اس نے دوآبہ رائچور کو مسلمانوں کے قبضہ میں دینے کے لیے شرط پر صلح کی درخواست کی اور دونوں حریفوں میں مصالحت ہو گئی احمد شاہ نے وہ تمام خراج دیو رایا سے وصول کر لیا جو تغلق کے زمانہ کے بعد سے ان کے ذمہ واجب الادا تھے۔ اس کے ساتھ آئندہ بھی خراج برابر ادا کرنے کا وعدہ لیا گیا۔

دیو رایا دوم اس کا عہد حکومت ۱۴۲۲ء سے ۱۴۲۵ء تک تھا۔ احمد شاہ سے صلح اور اس کی واپسی کے بعد دیو رایا نہایت افسردہ خاطر اور شکستہ دل ہو گیا اور اس کے چند ہی دنوں

---

[1] ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن ص ۱۶۱ ایضاً تاریخ جنوبی ہند ص ۲۲۴

بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا ایک اور بھائی دیو رایا راج گدی پر بیٹھا۔ اس راجہ کے ابتدائی گیارہ سال امن و سکون کے ساتھ گزرے اس نے اپنا زیادہ وقت تعمیرات پر صرف کیا۔ اپنی دارالسلطنت کو بہت مضبوط اور مستحکم بنایا۔ نئی عمارتوں اور مندروں کو وجود میں لایا فوج کو پہلے سے زیادہ کہیں منظم اور طاقتور رکھا۔

اس کے زمانے میں بیدار ذات کے ہندوؤں کی طرف سے کچھ بغاوتیں سر اٹھائی تھیں جس کو کچل کر رکھ دیا گیا تھا۔ اسی طرح جنوب ہند کے بعض ساحلی مقامات پر جس پر بیلوں کی حکومت قابض ہو گئی تھی بغاوت کا طوفان اٹھا جس کو فوج کے کامیاب حملے سے دبا دیا گیا۔ ۱۴۲۵ء کے لگ بھگ اس کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنے پیشروؤں کی طرح مسلمانوں سے صلح و جنگ میں سرگرم نظر آتا ہے۔

میسور گزیٹر اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"احمد شاہ کی وفات پر علاء الدین احمد اس کا جانشین ہوا اور اسی سال دوآبہ رائچور میں اس کے خلاف بغاوت ہوئی ایک تو وجیانگر نے پانچ سال سے خراج دینا بند کر دیا تھا دوسرے اس بغاوت نے یہ گمان پیدا کر دیا کہ اس کی تہہ میں وجیانگر کا ہاتھ ہے۔ علاء الدین نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد کو اس بغاوت کے فرو کرنے کے لیے بھیجا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وجیانگر سے خراج وصول کیا جائے محمد نے بغاوت فرو کر کے وجیانگر کے علاقوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر دیو رایا نے خراج ادا کر دیا اور مسلمان واپس ہو گئے"۔

وہی میسور گزیٹر آگے لکھتا ہے :-

"مسلمانوں کے واپس ہونے کے بعد دیو رایا نے اپنے امیروں مشیروں اور پنڈتوں کو بلا کر مشورت کی کہ مسلمان کس لیے ہمیشہ ہندوؤں پر جنگ میں غالب آتے ہیں۔؟ برہمنوں نے اپنے معلوم کے مطابق کہا کہ قدرت نے تیس ہزار سال تک مسلمانوں کی قسمت میں حکومت لکھی ہے لیکن سرداران فوج نے کہا کہ مسلمانوں کی فتح کا سارا راز ان کی سوار فوج اور ان کے تیر اندازوں کی قابلیت میں ہے اور جب تک ہندو بھی تیر اندازی میں ہی کمال حاصل نہ کریں گے اور ان کے گھوڑے بھی اسی قدر تیز رو نہ ہوں گے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دیو رایا کو یہ تجویز پسند آگئی اور اس نے اس وقت حکم دیا کہ مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے اور ان کی عبادت کے لیے پایہ تخت میں ایک مسجد تعمیر کی جائے"۔

آگے لکھتا ہے :-

"مسلمان تو فوج میں بھرتی ہو گئے لیکن اس کے آگے وہ سر نہیں جھکاتے تھے یہ دیکھ کر راجہ نے حکم دیا کہ آئندہ تخت پر قرآن مجید کا ایک نسخہ رکھا جائے کہ کم از کم مسلمانوں کا سر اسی کی تعظیم کے لیے جھک

جائے مسلمانوں کو ہندو فوج کی اتالیقی پر مقرر کیا گیا۔ سوار فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی کہ وہ ہمیشہ عمدہ گھوڑے رکھا کریں۔"

سات سال کی مسلسل تیاریوں اور کوششوں نے دیورایا میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ اب اس کی فوج مسلمانوں سے صف آرائی میں شکست نہیں اٹھا سکتی چنانچہ وہ بہمنی سلطنت سے زور آزمائی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ دکن کے مسلمان دو سال سے اپنے شمالی علاقوں میں جنگ میں لگے ہوئے ہیں ان سے جنگ کے لیے یہ بہت ہی مناسب موقع ہے۔ اور اس کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔

"اس نے ۱۴۴۳ء میں دوآبہ رائچور پر حملہ کر کے مدگل پر قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ رائچور اور بنکاپور کے قلعے سر کرنے کے لیے اپنے دو بیٹوں کو روانہ کیا اور خود دریائے کرشنا کی طرف پیش قدمی کی۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی تفصیل مورخ ہیگ اس طرح لکھتا ہے:"

"علاءالدین احمد کو جب اس حملے کی خبر پہونچی تو وہ خود فوج لے کر مقابلہ میں آیا۔ دریائے کرشنا پر ایک معمولی جنگ کے بعد ہندو فوج پیچھے ہٹ کر مدگل میں مدافعت کے لیے ٹھہری۔ علاءالدین نے اپنے جنرل خلف حسن بصری کو رائچور اور بنکاپور پر روانہ کیا اور آپ مدگل کی طرف بڑھا۔ خلف حسن بصری کی آمد سن کر دیورایا کے دونوں بیٹوں نے رائچور اور بنکاپور سے محاصرہ اٹھا کر باپ سے آگے مل کر خلف حسن بصری بھی علاءالدین احمد سے آکر ملا۔ مدگل میں تین جنگیں ہوئیں پہلی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی دوسری جنگ میں ہندو پسپا ہوئے لیکن تیسری جنگ میں جو پہلی دو جنگوں سے زیادہ خوں ریز تھی مسلمان کامل طور پر فتحیاب ہوئے۔ دیورایا کا بیٹا رائچور کے محاصرہ پر گیا تھا میدان جنگ میں مارا گیا اس کے مرتے ہی ہندو فرار ہوئے۔ مسلمانوں نے تعاقب شروع کیا اور یہ تعاقب اس تیزی سے ہوا مسلمانوں کے دو سپہ سالار فخرالملک دہلوی اور اس کا بڑا بھائی یہاں تک بڑھتے چلے گئے کہ ملک کے قلعہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہی داخل ہو گئے۔ اور ہندوؤں نے انھیں دیکھ کر دروازہ بند کر دیا دونوں مسلمان سردار جب دیورایا کے سامنے پیش کئے گئے تو اس نے حکم دیا کہ انھیں زنجیریں پہنا دیں۔"[1]

علاءالدین اس خبر کو پاتے ہی دیورایا کو خبردار کیا کہ ہر سردار کی قیمت ایک ہزار سوار کے برابر ہے اور ہر ایک کے عوض دس ہزار ہندوؤں کو قتل کیا جائے گا اور اس کے ساتھ علاءالدین نے مدگل کا پوری شدت کے ساتھ محاصرہ قائم کر دیا۔ دیورایا کے لیے محاصرہ کی شدت ناقابل برداشت ہو گئی اور اس نے صلح کی پیش کش کر دی جو ان شرطوں پر منظور کر لی گئی۔ آئندہ خراج برابر ادا کر دیا جائے گا اور دوآبہ رائچور اسکے حوالے کیا جائے گا۔ دیورایا نے اس شرائط کو اسی وقت پورا کر دیا اور یہ جنگ اس طرح ختم ہو گئی۔

---

[1] مورخ ہیگ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۳ صفحہ ۴۵۵، ۴۵۶

دیورایا اپنے ہندو دھرم کا ایک نہایت پختہ راجہ تھا۔ وہ مبینک دھرم سے زیادہ متاثر اور اس کا معتقد تھا اس کے باوجود وہ ہندوؤں کے دوسرے فرقوں سے بھی رواداری کا برتاؤ رکھتا تھا۔ جین فرقہ کا کوئی مندر اس کے ملک میں نہ تھا وہ سب سے رواداری کا برتاؤ رکھتا تھا اس نے اپنی دارالحکومت میں ان کے لیے ایک مندر تعمیر کردیا۔ مشہور ایرانی سیاح عبدالرزاق اس کے زمانہ میں وجیانگر پہونچا تھا اس نے اپنے سفرنامہ میں وجیانگر کی سلطنت کے تفصیلی حالات کے ذیل میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"راجہ کی سلطنت سرحد سراندیپ سے گلبرگہ تک تھی یعنی راس کماری سے رودکرشنا تک ہزار ہا ہاتھی بلند قامت مثل پہاڑ کے دجوں کی سی ہیبت ناک شکل کے دکھائی دیتے تھے۔ گیارہ لاکھ فوج تھی تمام ملک اس ہندوستان میں اس سے بڑھ کر کوئی سلطنت نہ تھی۔ یہاں کا حکمراں "رایا" کہلاتا تھا شہر بیجانگر ایسا ہے کہ لاعین رأت ولااذن سمعت (نہ آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا)۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں ست و ہمیں ست ہمین است

روئے زمین کا کوئی شہر اس کے برابر نہ ہوگا۔ اس کی بنیاد ایسی ہے کہ سات گڑھیاں اور سات فصیلیں ایک کے اندر ایک ہیں راجہ کے محل کے پاس چار بازار ہیں جو مثل چوراہے کے چاروں طرف واقع ہیں۔ بجانب شمال راجہ کے محل ستون دار دیوڑھی واقع ہے۔ ہر بازار میں بلند محراب دار مکان مع برآمدے کے ہیں۔ لیکن راجہ کا دربار ہال سب مکانوں سے بلند ہے بازار بے انتہا لمبے اور چوڑے ہیں۔ بازار میں ہر قسم کے بیوپاریوں کی دوکانیں سلسلہ وار ایک دوسرے کے برابر ہیں جوہری، جواہرات سر بازار فروخت کرتے ہیں۔ اس شہر میں عموماً اور محلات میں خصوصاً بہت سی نہریں واقع ہیں راجہ کے ایوان کے برابر ایک بہت بڑا وسیع اور عالیشان دیوان خانہ ہے جو فی نفسہ ایک عظیم الشان محل ہے اس دیوان خانے کے سامنے ایک ہال ہے جس کی بلند قدآدم سے زیادہ طول تیس گز اور دس گز ہے اس میں دفتر رکھا جاتا ہے اور اہل عملہ بیٹھتے ہیں، رانیاں اور راجہ کی بیبیوں کی تعداد سات سو ہے۔

پھر آگے یہی سیاح مہانومی تیوہار کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

"راۓ بیجانگر نے اپنی ریاست کے تمام امراء اور رؤسا کے نام دعوت کے رقعے بھیجے سب لوگ دارالسلطنت حاضر ہوگئے۔ امراء کے ہاتھیوں کی تعداد ایک ہزار ہوگی۔ ہر امیر نے اپنے اپنے ہاتھی کو عمدہ امباری اور ہودجوں اور جگمگاتے زیورات اور ہتھیاروں سے سجا کر لایا تھا۔ میدان جہاں جشن ہونا تھا بہت عمدگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اور تین دن تک برابر بڑی چہل پہل رہی اس میدان میں بڑے بڑے ہاتھی ایسے معلوم دیتے تھے کہ گویا سمندر کی بڑی بڑی اور کالی موجیں لہرا رہی ہیں۔ آدمیوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ سوائے سب۔ ان حشر کے دوڑنا ناممکن ہے۔ اس وسیع میدان میں سینکڑوں

منڈوے اور منڈپ سہ منزلہ چہار منزلہ اور پانچ منزلہ تک ڈالے گئے تھے ان منڈوؤں کو اوپر سے نیچے تک مجسم بتوں سے آراستہ کیا تھا اور بعض منڈوے اس میں اس ترکیب سے بنائے گئے تھے کہ ان کا رخ بدلتا رہتا تھا ہر وقت ایک نیا کمرہ یا برآمدہ چکر کھا کر سامنے آجاتے تھے۔ اس میدان کے سامنے ایک محل نو عظیم الشان اور آراستہ منڈوؤں کا بنایا گیا تھا اس منڈوے میں راجہ کا تخت تھا راجہ کے منڈوے مقابل ایک خوبصورت پردے کے پیچھے طائفے متفرق لباس پہنے ناچ رہی تھی۔ گاڈوری اور بے شمار تماشے اور کرتب والے اپنا اپنا کمال دکھلا رہی تھی۔ ان لوگوں نے ہاتھیوں کو خوب سدھایا تھا۔ جو طرح طرح کے تماشے کرتے تھے۔ طلوع آفتاب سے غروب تک تینا دن اسی طرح بڑی شان وشوکت کے تماشے ہوتے رہے۔ آتش بازی، کھیل تماشے ہر قسم کا سامان دلچسپی موجود تھا۔ راجہ ایک بہت بڑے تخت پر براجتا جو سونے کا بنا ہوا تھا اور اس پر بیش بہا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ تخت کے سامنے ایک مربع گدی رکھی ہوئی تھی جس کے اطراف میں تین قطاریں موتیوں کی ٹکی ہوئی تھیں۔ تین روز تک راجہ اسی گدی پر بیٹھا ہوا تھا[1]"

اطالوی سیاح نکولو نے تقریباً اسی قسم کے خیالات اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔ دیو رایا کے زمانہ میں کنڑی زبان و ادب کو بہت نمایاں ترقی ہوئی دیو رایا دوم ۱۴۴۶ء میں اس دنیا سے گزر گیا۔

ملیکارجنا وجے رایا

دیو رایا کے بعد اس کا بیٹا ملیکارجنا وجے نگر کی راج گدی پر بیٹھا اس کا عہد حکومت ۱۴۴۶ء سے ۱۴۶۵ء تک رہا مورخین اس کو دوجے رایا دوم کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کی تخت نشینی کے بعد اڑیسہ کا راجہ گجپتی کپل سیوریہ نے مشرقی سمت میں واقع اس کے بعض علاقوں پر حملہ کیا لیکن اس جنگ میں اس کو کسی قسم کی کامیابی نہ ہوسکی۔ اس کے ابتدائی زمانے میں مختلف مقامات پر معمولی جھڑپیں تو ہوتی رہیں لیکن کسی بڑی جنگ میں الجھنے کا سابقہ اس کو پیش نہ آیا اس لیے اس کے عہد حکومت کو نسبتاً امن و شانتی کا دور کہا جاتا ہے اس نے اپنے زمانے میں کچھ اصلاحی کام انجام دیے ان میں سے ایک نذرانے لینے کی رسم تھی، یہ ظالمانہ رسم زمانہ قدیم سے چلی آتی تھی وزراء سے لے کر حکومت کے تمام عہدے دار رعایا سے عام طور پر نذرانے وصول کرتے تھے اور اس کے نہ ادا کرنے پر بعض اوقات رعایا پر ظلم اور زبردستی تک کی نوبت پہونچ جاتی تھی۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس نذرانے کے ظلم و تشدد سے تنگ آکر اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں بھاگ جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہاں تک کہ مندروں میں پوجا پاٹ کے مراسم اور تہوار تک بند ہو گئے۔ ملیکارجنا نے اپنے

---

[1] سفرنامہ ایرانی سیاح عبدالرزاق ماخوذ از تاریخ جنوب ہند ص ۱۵۶

ملک کی اس تباہ کن حالت کو محسوس کیا اور لوٹ کھسوٹ کو پوری سختی کے ساتھ ختم کر کے رکھ دیا اور راجہ بلیکار جنا اپنی عمر کے آخری سالوں میں عیش و عشرت میں مبتلا اور شراب کا متوالا ہو گیا تھا اور عیش و شراب خوری نے اس کو بڑی حد تک امور سلطنت سے غافل کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ملک میں ابتری اور بدنظمی پیدا ہو گئی اور اسی حالت میں وہ ۱۳۶۷ء میں اس دنیا سے چل بسا۔

ویرایکنا

ویر ایکشا کا دور حکومت ۱۲۹۳ء سے ۱۳۷۹ء تک ہے یہ بلیکار جنا کا بیٹا تھا جو اس کے بعد راج گدی پر بیٹھا اس کا دور وجیا نگر کی تاریخ کا بدترین اور تاریک ترین دور تھا۔ اس کو نہ اپنی سلطنت کے حسن انتظام سے کوئی سروکار تھا اور نہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود سے تعلق وہ اکثر شراب میں مست و سرشار عیش و عشرت میں گرفتار رہتا تھا اس کے اوقات کا زیادہ تر حصہ اپنے محل کے عشرت گاہ میں دلربا ؤں کے ساتھ گزرتا تھا۔ راجہ کی اس غفلت اور امور سلطنت سے مسلسل بے پروائی کی وجہ سے سارے ملک میں بدنظمی اور طوائف الملوکی پھیل گئی تھی بعض راجہ اور ماتحت حکام اپنی اپنی جگہ پر آزادی اور مختاری کے علم بلند کئے۔ مدورا کے نائک حکمراں نے خراج کی ادائیگی روک دی۔ ملیبار کے اہل کلیسا نے اپنی آزادی کے الگ دعویدار بن گئے۔ کنجی کا افسر بھیادبرل نائک اپنی جگہ راجہ بن بیٹھا۔ اس طرح سلطنت کا سارا نظام اور اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ ہندوؤں کے اتحاد و یکجہتی کے رشتے ٹوٹنے لگے اور ان میں پھوٹ اور ناچاقیاں پیدا ہونے لگیں ادھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا ادھر راجہ ویر ایکشا کو اپنی عیاشی اور بادہ خواری رنگ رلیوں میں اس قدر مست و مگن رہا کہ اسے اپنی سلطنت کے بگڑتے ہوئے حالات کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت تھی اور نہ اس کی سنگینی کا احساس اس کی غفلت اور بے توجہی کی بنا پر اس کے دور حکومت ظلم و تشدد کی انتہا نہیں رہی تھی۔ انسانی خون اس کے زمانے میں بے دریغ بہایا گیا۔ بے شمار جانیں اس کے جابرانہ مظالم کے ہاتھوں اپنی زندگیوں سے محروم ہو گئیں وہ ایک وہمی اور شکی مزاج تھا اور ذرا سی بدگمانی پر امیروں اور بڑے بڑے سرداروں کو قتل کر ڈالتا تھا۔ کسی ایک معاملہ میں کسی فرد یا افراد سے دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس کی سزا صرف انھیں تک محدود نہیں رہتی تھی بلکہ اس گناہ کا انتقام ان کی پوری قوم سے لیا جاتا۔ اور ہزاروں جانیں اس طرح فرد یا افراد کا گناہ قتل عام کی صورت میں ان کی پوری قوم کو بھگتنا پڑتا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

"۱۳۷۹ء میں ویرایکشا کو معلوم ہوا کہ بھٹکل مسلمان تاجروں نے جس قدر گھوڑے برآمد کئے تھے وہ سب بہمنی سلطان کے ہاتھ فروخت کر دیے ہیں اور اس سال وجیانگر کے لیے کوئی گھوڑا نہیں رہا ان کی اس کارروائی نے ویرایکشا کو اس قدر برافروختہ کیا کہ اس نے یہاں کے تمام مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ اور ان تمام مسلمانوں کو جنھیں دیودارایانے فوج میں ملازم رکھا تھا۔ ملک سے نکال

دیا گیا[1]

روسی سیاح بنادوسی جو اس زمانے میں وجیانگر میں موجود تھا اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :-

"راجہ ویرا ایکشا کے حکم سے دس ہزار عرب تاجر قتل کر دیے گئے جن عربوں نے بھاگ کر گوا اور عرب میں پناہ لی وہ بچ گئے لیکن ہندؤں نے گوا کا بھی محاصرہ کر لیا"

میسور گزیٹیر کا ہندو مصنف لکھتا ہے :-

"عربوں کا یہ قتل ویرا ایکشا کی عادت سے بعید نہ تھا"

سیویل اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ :-

"مسلمانوں نے اس قتل کی خبر جب گلبرگہ میں پہونچی تو بہمنی سلطان کے وزیر ملک التجار محمود گاواں نے گوا پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو راتوں رات ان کے مظالم سے نجات دلائی"

اس کے تین سال بعد ویرا ایکشا نے مسلمانوں کے خلاف پھر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن فوج کو پتہ چل گیا کہ مسلمانوں کی فوج مقابلہ کے لیے پہونچنے والی ہے اس کے ساتھ ہی فوج پلٹ گئی اور حملہ ٹل گیا ۱۴۷۷ء میں وجیانگر کے تلنگانہ میں واقع بعض اہم علاقوں پر گوداوری، کرشنا، اسحاق پٹن گنجام وغیرہ پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔

جب ہندو گوا پر پلان حملہ کا تیار کر رہے تھے۔ وجیانگر کے راجہ نرسمہا ہندو زمینداروں کو مسلمانوں کے خلاف بغاوت پر اکسانے میں لگے ہوئے تھے راجہ نرسمہا کی شخصیت اور اس کی اس وقت کی جنگی کارروائی کے متعلق "تاریخ فرشتہ" لکھتا ہے :-

"یہ نرسنگھ ایک راجہ قوی ہیکل اور عظیم الجثہ تھا اور کثرت مال اور وفور افواج میں موصوف اور ولایت کرناٹک اور تلنگ کے درمیان مقام رکھتا تھا اور سواحل سمندر کے مچھلی پٹن تک اس کے تحت حکومت تھے اکثر اوقات زمینداروں کو جنگ پر مستعد اور آمادہ کر کے اور خود ان کا مددگار ہو کر شاہان بہمنیہ کی سرحد میں شور و غوغا برپا کرتا تھا"[2]

جب سرحد پر اس قسم کے شور و غوغا اور زمینداروں کی باغیانہ سرگرمیاں کی خبریں محمد شاہ کو پہونچ گئیں تو وہ ان کی گوشمالی کے ارادہ سے نکلا انھوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور اطاعت گذار بن گئے۔ اس کے بعد مچھلی پٹن کے قریب کرشنا نگر کو عبور کر کے نلور کے ضلع میں واقع کندا پور میں پہونچا یہاں اس پر یہ راز کھل گیا کہ اس سازش میں نرسنگھ تنہا نہیں بلکہ کنچی ورم کا راجہ بھی اس میں برابر کا شریک اور حصہ دار ہے اور بغاوت اور سرکشی کی یہ آگ اسی کی بھڑکائی ہوئی ہے اس کے ساتھ

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۱۶۱ [2] تاریخ فرشتہ مطبوعہ نول کشور ص ۴۳

اس کو کنجی ورم کے متعلق بعض خاص باتیں اس کے علم میں لائی گئیں چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے :-

سلطان جب کونداپور پہونچا ایک جماعت وہاں کی متوطن نے معروض کیا کہ یہاں سے دس منزل پر ایک بت خانہ ہے کہ کنجی نام رکھتا ہے اور در و دیوار اور سقف اس کے زیور و جواہر سے آراستہ اور لعل گوہر سے پیراستہ اور آج تک شاہان اسلام نے اس کو نہیں دیکھا بلکہ نام بھی اس کا نہیں سنا سلطان محمد شاہ چھ ہزار سوار خنجر گذار لشکر سے جدا کر کے بطور ریلغار اس طرف متوجہ ہوا[1]

اس کے بعد کیا ہوا میانوں کا مصنف اس کے متعلق لکھتا ہے :-

بہمنی سلطان اس شہر پر قبضہ کر کے اس کو تلوار اور آگ کے حوالہ کر دیا[2]"

فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جنگ میں کنجی کا راجہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور بہمنی سلطان کا شہر اور مندر پر یہاں قبضہ ہو گیا اس موقعہ پر فرشتہ نے جو نظم لکھی ہے اس سے کنجی اور اس کے مندر سے جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

ہمہ خانہ از گوہر و گنج بر — زر این بتان ہم بر آمودہ در
بہر ایک صنم خانہ دل پذیر — نہ چنداں گہر کاندر اندر ضمیر
صنم خانہا جملہ گشتہ خراب — غنیمت خیال کس ندیدہ خواب
بجز زیور و گوہر و گنج زر — نمی برد کس ہیچ چیزے دگر

اس کے بعد محمد شاہ نے اپنے امرا کو جنگل پریٹ، جینتر، گنگورہ، گڑپہ اور کرنول وغیرہ مختلف مقامات کی طرف روانہ کیا۔ انھوں نے ان مقامات کو فتح و کامرانی سے سر کرتے ہوئے بلگنڈہ کا محاصرہ کیا اور آخر کار اس پر قابض ہو گئے۔

خدا معلوم بہمنی سلطان کی کیا مصلحت تھی کہ اس نے اس مقامات پر اپنا مستقل قبضہ نہیں رکھا بلکہ انھیں مقامی راجاؤں اور پالیگاروں کو خراج کی ادائیگی کے عہد پر ان کے حوالہ کر دیا۔ ورنہ جنوب مدراس سے کرشنا تک اور مغرب بلگنڈہ تک ایک مستقل صوبہ بن جاتا اور سلطان اس پر قابض رہتے بہر حال ویر ابکشا کے زمانہ میں وجیانگر کی سلطنت کے بہت سے علاقے اس کے قبضہ سے نکلتے رہے اور دوسرے اس کے وزیروں اور افسروں کو اپنی جانیں خطرے میں نظر آنے لگیں اس کے متعلق نیونز سیاح لکھتا ہے :-

"راجہ ویر ابکشا ایک عجیب و غریب واہمہ میں مبتلا تھا وہ اکثر اپنے سرداروں کو اس لئے قتل کر دیتا تھا کہ اس نے انھیں خواب میں اپنے حرم میں آتے ہوئے دیکھا تھا"

۱؎ تاریخ فرشتہ ص ۵۱۲ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۱۶۳ ۲؎ میانوں ڈسٹرکٹ جنگل پٹ ص ۱۲

اس کے علاوہ اس نے اپنی رعایا پر نئے نئے ٹیکس عائد کر دیئے جس کی وجہ سے عوام پر بھاری بوجھ آپڑا اس کی وجہ سے وہ اپنے راجہ سے ناراض اور بدظن ہو گئی ان تمام ناقابل برداشت ستم رانیوں، ظلم آرائیوں کے ساتھ امرا کی بے اطمینانی، رعایا کی بے اعتمادی جنگ میں ہزیمت اور ناکامی اور اس کے نتیجہ میں بعض اہم علاقوں سے محرومی وغیرہ حالات کا انجام یہ ہوا کہ راجہ ویرا پکشا کے خلاف سازش کے جوڑتوڑ اور درپردہ مشورہ ہونے لگے اور اس سازش کا روح رواں نرسمہا تھا۔ اس نے مختلف امرا اور سرداروں کے نام پیغامات بھیجے اس کا خلاصہ یہ تھا:-

ایک عادل اور شفیق حکمراں کے نہ ہونے سے تمام ملک تباہ ہو رہا ہے۔ اگر حالت یہی رہی تو عجب نہیں کہ اس سلطنت پر ہمیشہ کے لیے مسلمان قبضہ کر لیں۔ بہتر یہ ہے کہ ویرا پکشا کو تخت سے اتار کر کسی دوسرے کو تخت نشیں کیا جائے۔" تمام امرا نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

راجہ ویروپکشا کا چل چلاؤ

نرسمہا ضلع کنارہ کا گورنر تھا وہ اپنے ساتھ ایک کثیر فوج لے کر خاموشی کے ساتھ دارالسلطنت وجیانگر پہونچا اور شاہی محل کا محاصرہ کیا ویروپکشا نے دیکھا کہ اب اس کی جان کی خیر نہیں ہے تو وہ خاموشی کے ساتھ چور دروازے سے فرار ہو گیا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کبھی نظر نہ آیا اس طرح وجیانگر کی تاریخ میں بلا کسی مزاحمت و مقابلہ کے ایک انقلاب آیا اور امن و خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ ویروپکشا کا جانشین کون ہوا؟ اس میں مورخین کی مختلف رائیں نظر آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ویروپکشا کے بعد امرا سلطنت نے اتفاق کر کے نرسمہا کو راجہ بنایا اس کے مقابلہ میں دوسرے کہتے ہیں کہ ویروپکشا کے دو بیٹوں میں سے بڑے کے سامنے تخت پیش کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنے باپ کا قاتل ہے اس کو اس کی وجہ تخت نشینی کا حق نہیں پہونچتا اس کے انکار پر دوسرے بیٹے کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن یہ بھی اپنے باپ کے نمونہ پر عیاش نکلا اس نے اپنے باپ کا انتقام اپنے بھائی سے لے لیا۔ آخر امرا سلطنت نے باہمی صلاح و مشورہ سے اس کو تخت سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ نرسمہا کو جس نے ویروپکشا کے ظلم و استبداد سے سلطنت کو نجات دلائی تھی راج گدی پر بٹھا دیا اس طرح ۱۴۸۶ء میں وجیانگر کی سلطنت سنگما خاندان سے نکل گئی اور تلنگا اور سلووا خاندان کے اقتدار میں چلی گئی۔ سنگما کا خاندان کا دور حکومت ۱۳۳۶ء ہری ہراول سے شروع ہو کر ۱۴۸۶ء میں ویروپکشا پر ختم ہو گیا۔

نرسمہا اول یہ دراصل کنارا کا باشندہ تھا اس کے تعلق کناڑے کے ایک حکمراں خاندان

ے تھا۔ نرسمہا صرف کنارا ہی کا حکمراں نہیں تھا بلکہ وہ وجیانگر کے راجگان کے ماتحت مختلف صوبوں میں گورنری کے فرائض بھی انجام دے چکا تھا۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا اس کی زندگی کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک باہمت، پرحوصلہ، بیدار مغز اور جنگی داؤ پیچ کا ماہر اور تجربہ کار تھا۔ اس کے تخت نشینی کے متعلق جو واقعات بعض مورخین نے لکھے ہیں وہ نہ صرف مبالغہ آمیز ہیں بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی غیر معتبر اور ناقابل فہم ہیں لیکن اس کے باوجود دیون راؤ میسور گزیٹر کا مصنف سلووا بھادیم کے حوالہ سے اس طرح لکھتا ہے :۔

"اس نے رامیشورم تک تمام علاقہ فتح کر کے شمال میں وسرنا کے ملک پر چڑھائی کی اور فتوحات حاصل کرتا ہوا ہمالیہ تک پہونچ گیا اور یہاں سے پلٹ کر بنارس میں تخت نشین ہوا۔ اس موقع پر خداؤں نے (بتوں) نے خوش ہوکر اس پر پھول برسائے اور ملک کے تمام راجہ جو اس موقع پر حاضر تھے انھوں نے اس کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرلیا"

لیکن وہی گزیٹر کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اس روایت میں جس قدر واقعات ہیں سب جھوٹ ہیں ا وسرنا کے ملک پر چڑھائی کا قصہ مبالغہ سے خالی نہیں لیکن ایک واقعہ ہے کہ اس کی تاج پوشی بنارس میں ہوئی ممکن ہے کہ نرسمہا خود بنارس نہ گیا ہو لیکن اپنی غاصبانہ حکومت کو مذہبی نقطہ نظر سے جائز ثابت کرنے کے لیے اپنے نائب کو وہاں بھیج دیا ہو"

جس شاعر نے اپنے اشعار میں جو کچھ کہا ہے اور جسکو میسور گزیٹر نے سلووا بھادیم سے نقل کیا ہے نری شاعری کے سوا کچھ نہیں، ہے ہوسکتا ہے کہ وہ راجہ نرسمہا کا کوئی درباری شاعر رہا ہو اور اس نے اپنے راجہ کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کے لیے اس طرح کی قصیدہ خوانی کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے تمام مورخین خواہ وہ مغربی ہوں یا مسلم اپنی کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ اگر وجیانگر کے اس وقت کے نقشہ کو بغور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دریائے تنگبھدرا کے پاس ایک طرف وجیانگر کی سلطنت واقع تھی تو دوسری طرف کے سارے علاقے پر بہمنی سلطنت کا قبضہ تھا اور مغربی جانب اڑیسہ کی حکومت تھی اس کا راجہ گنج پتی تھا اور وہ وجیانگر کا کھلا ہوا دشمن اور حریف تھا اور بہمنی سلطنت کے شمالی جانب پورے ہندوستان میں لودھی خاندان کی ایک زبردست حکومت قائم تھی۔ بنگال میں پٹھان حکومت کر رہے تھے اور بنارس تو مسلمانوں ہی کے ماتحت تھا۔ ان حالات نرسمہا کے بارے میں یہ لکھنا ہے کہ :۔

"اس نے رامیشورم تک تمام علاقہ فتح کر کے شمال میں وسرنا کے ملک پر چڑھائی کی اور فتوحات حاصل کرتا ہوا ہمالیہ تک پہونچ گیا اور یہاں سے پلٹ کر بنارس میں تخت نشین ہوا اور اس موقع پر خداؤں نے (بتوں) خوش ہوکر اس پر پھول برسائے اور ملک کے تمام راجہ جو اس موقعہ

پر حاضر تھے انھوں نے اس کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا!

اس کا ہمالیہ تک پہونچ جانا اور بنارس جا کر تخت نشین ہونا تو در کنار وہ اپنے زمانے میں پڑوسی بہمنی حکومت سے نبرد آزمائی کی ہمت نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ ویر ویکیتا کے تخت چھوڑنے اور نرسمہا کے تخت پر آنے کے وقت مچھلی بندر سے کر جنگل پیٹ تک کا تمام علاقہ بہمنی حکومت کے زیر اقتدار تھا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے مقامی راجہ اور پالیگار محمد شاہ کو خراج ادا کر رہے تھے ان حالات کی بنا پر اس کی فتوحات اور بنارس میں تاج پوشی صرف شاعر کے دماغ کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اسکے باوجود واقعہ یہ ہے کہ نرسمہا ایک ایسا راجہ تھا جو حکومت رانی کی صلاحیت سے کافی حد تک بہرہ ور تھا۔

تخت نشین ہونے کے بعد

اس نے سب سے پہلے فوج کی طرف توجہ مبذول کی اس زمانہ میں جنگ کے لیے گھوڑوں کی بڑی اہمیت تھی اس نے اس کے حصول کے لیے خاص طور پر عربوں سے رابطہ پیدا کیا چنانچہ اس کے بارے میں سیاح نونہر لکھتا ہے

” اس نے عرب سوداگروں سے گھوڑوں کی فرمائش کی۔ انھیں معقول معاوضہ دیا جاتا تھا۔ گھوڑے بندرگاہ عدن وہرمز سے لائے جاتے تھے جو گھوڑے راستے میں تلف ہو جاتے تھے ان کی قیمت دم اور کھال دکھانے پر مل جاتی تھی اس نے گھوڑوں کی قیمت مقرر کر دی تھی تین گھوڑوں کی قیمت ایک ہزار طلائی پگوڈا دی جاتی تھی۔ ایک طلائی سکہ کی قیمت ۳½ روپئے ہوتی تھی اس پر میسور گزیٹیر لکھتا ہے :۔

” نرسمہا کی یہ کارروائی بہمنی سلطان کے خلاف تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے حریف گھوڑے خرید سکیں “

اس اثنا میں اس کی توجہ کا مرکز فوجی استحکام اور تیاریوں کی طرف رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان حالات میں تیاریوں کے بعد وہ مقصد برآری کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھا اور اس کو اس کا موقعہ محمد شاہ کے انتقال کے بعد حاصل ہو گیا۔ ۱۴۸۲ء میں محمد شاہ بہمنی اس دنیا سے چل بسا اور محمود شاہ اس کی جگہ تخت نشین ہو گیا۔ لیکن اس کے زمانے میں سلطنت بہمنی اپنے اندرونی مسائل میں مبتلا تھی اور اس میں بد نظمی اور انتشار کے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نرسمہا خاموشی کے ساتھ اٹھا اور ان علاقوں پر قبضہ کیا جو اس کی گورنری کے زمانے میں اس کی حکومت کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پھر آگے بڑھ کر مقامی راجاؤں اور جاگیرداروں کو جو سلطنت بہمنی کے ماتحت تھے انھیں زبردستی اپنا زیر دست اور مطیع بنایا اس طرح کرشنا کے جنوب میں جنگل پیٹ تک پورا علاقہ اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

نرسمہا دوم

نرسمہا اول ۱۴۸۹ء میں گزر گیا اس کی جگہ اس کے ایک نہایت کم سن بیٹے

کو نرسمہا دوم کے نام پر تخت پر بٹھایا گیا۔ راج پاٹ کے تمام اختیارات ایک نائب کے سپرد ہوئے اس کا نام نرسا نائک تھا اور وہ نمراج کہلاتا تھا۔ نمراج پر خود راجہ بن جانے کی دھن بری طرح سوار تھی اور اس نے اس کے حصول کے لیے اس کی طرف سے بعض ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جس کو تاریخ ہمیشہ ایک غاصب سلطنت کے نام سے یاد کرے گی وہ چار سال تک راجہ کی طرح راج کرتا رہا لیکن نرسمہا دوم کا وجود اس کو برابر کھٹکتا رہا۔ آخر اس نے اپنے راستہ کے اس روڑے کو ہٹانے اس کو زہر دے کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا اور اس کے شیر خوار بھائی کو تخت نشین کر دیا اس کے متعلق اسکاٹ لکھتا ہے:۔

"ہیمراج (نرسا نائک) ایک غاصب سلطنت تھا اس نے وجیا نگر کے کم سن راجہ کو زہر دیکر اس کے شیر خوار بھائی کو تخت نشین کیا۔ رفتہ رفتہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر سلطنت کا خود مختار کل بن گیا۔"[1]

جب اس پر چھ سال گذر گئے تو اس کو بھی زہر دے کر اس کا خاتمہ کر دیا اور اب اس کو اپنی دیرینہ تمنا بر لانے کے لیے کوئی روک حائل نہیں رہا تھا چنانچہ اس نے ۱۴۹۹ء میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اس سلسلہ میں نیو مورخ لکھتا ہے:۔

"نرسا نائک نے سازش کر کے بادشاہ کو بالکل خاموشی سے مروا ڈالا اور لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ بادشاہ کہاں ہے اور اس کا کیا ہوا۔ جب بادشاہ لاپتہ ہو گیا تو اس نے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔"[2]

یہ وجیا نگر کی راجگی کا تاریخ کا دوسرا انقلاب تھا اور اب حکومت سلو خاندان سے تلووا خاندان میں منتقل ہو گئی۔

گزشتہ صفحات میں بہمنی سلطنت کا ایک مختصر سا جائزہ آپ کے ملاحظہ سے گزر چکا ہے لیکن چونکہ نرسا نائک کے دور کے حالات کا ربط مسلسل قائم رکھنے کے لیے بہمنی حکومت میں جو نئے واقعات رونما ہوئے اور جس کے نتیجہ میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو کر چار مستقل خود مختار حکومتیں اسی نرسا نائک کے زمانہ میں اکھر آئی تھیں ان میں سے ایک امیر برید کی حکومت جو ۱۴۸۶ء میں برید شاہی کے نام سے بیدر میں، دوسری یوسف عادل کی حکومت جو ۱۴۹۰ء میں عادل شاہی کے نام سے بیجاپور میں، تیسری احمد نظام شاہ کی حکومت جو اسی سال ۱۴۹۰ء میں نظام شاہی نام سے احمد نگر میں، چوتھی فتح اللہ عماد کی حکومت جو عماد شاہی نام سے برار میں ان ہی دنوں میں قائم ہوئی۔ یہ نئی سلطنتیں کم و بیش محمد شاہ کی رحلت کے آٹھ سال بعد وجود میں آگئیں ان نئی سلطنتوں کے جنم

---

[1] اسکاٹ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۷۱ [2] نیو مرد بحوالہ تاریخ جنوبی ہند

لینے کے بعد بھی بہمنی حکومت چند ایک برس زندہ رہی لیکن وہ اپنا دم خم کھو چکی تھی اسطرح کی کمزوریوں میں گھر گئی تھی اور وہ چند امراء کے ہاتھوں میں اس بری طرح کھیل رہی تھی کہ صاف نظر آرہا ہے کہ وہ اپنے چل چلاؤ کے آخری دن گن رہی ہے۔ بہمنی حکومت کے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر امیر قطب الملک نے بھی اپنا رنگ بدل دیا اور ۱۵۱۲ء میں گول کنڈہ میں قطب شاہی حکومت کا علم نصب کر دیا اس کے بعد گلبرگہ کا بہمنی سلطنت کا جھلملاتا ہوا چراغ رات کی تاریکی میں گل ہو گیا۔ اس کا ستارہ اقبال اس طرح ڈوبا پھر کبھی نہ ابھرا۔ اس طرح ۱۵۲۶ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا اور اس پر عادل شاہی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ کز ہتیش بروئے زمیں برنشاں نہ ماند۔

یہ واضح رہے کہ ہمارا موضوع بحث سلطنت جنوبی ہند اور خاص کر وجیانگر کے تاریخی حالات و واقعات ہیں چونکہ اسلامی حکومتوں اور وجیانگر کے مدمقابل کی حیثیت سے اس کا تعلق رہ گیا تھا اس لیے بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد جن نئی اسلامی حکومتوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق یا تصادم رہا تھا ہم آئندہ صفحات میں ضمنی طور پر انھیں کا ذکر کریں گے۔

آگے بڑھنے سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی اور وجیانگر کی سلطنتوں میں جو انقلابات آئے اور ان سے جو نتائج پیدا ہوئے ان پر ایک ایک سرسری نظر ڈالی جائے اس بارے میں تاریخ جنوبی ہند کے مصنف نے جو موازنہ کیا ہے اس کا خلاصہ انھیں کے زبانی پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر وجیانگر کے پہلے اور دوسرے انقلاب اور اسی کے ساتھ اس سلطنت کی حریف بہمنی سلطنت کے حالات کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں حریف ہندو اور مسلمان اس تمام عرصہ میں اپنے اندرونی خلفشار میں اس قدر گھرے ہوئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ کارروائی نہ کر سکے۔ محمد شاہ بہمنی کی وفات کے بعد اگر بہمنی سلطنت میں انتشار پیدا نہ ہوا ہوتا تو یہ یقینی تھا کہ وجیانگر کے انقلابوں سے فائدہ اٹھا کر وہ جنوبی ہند پر مستقل طور پر قابض ہو جاتی یا وجیانگر میں انقلاب نہ ہوتا تو مسلمانوں کو اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندو دریائے کرشنا کو عبور کر کے دکن پر قبضہ کر لیتے۔ قدرت نے دونوں حریفوں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو ایک ساتھ کمزور کر دیا کہ اس مدت میں ایک دوسرے کے مقابل نہ ہو سکیں[1]"

تلوو خاندان کا اقتدار

نرسا نائک بیجانگر کے شاہی محل میں عرصہ سے ایک بڑی عزت و اقتدار کی جگہ پر فائز تھا۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۰۳

یہ تلو دا خاندان کا پہلا راجہ تھا اس نے وجیانگر کی سلطنت پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا۔ جس کی کچھ تفصیل گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ آئے ہیں۔ اب تاریخ فرشتہ سے مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ فرشتہ لکھتا ہے :-

"وجیانگر کی سلطنت سات سو سال سے ایک ہی خاندان میں چلی آئی تھی۔ اس کے بعد سالو: اخاندان میں منتقل ہو گئی۔ اس کے راجہ نرسمہا اول کی وفات پر اس کا کم عمر لڑکا تخت نشین ہوا لیکن یہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی راجہ بنا لیکن ہیمراج جو عرصہ سے شاہی محل میں خاصا اقتدار رکھتا تھا اس راجہ کی زندگی کا خاتمہ کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔"[1]

جس طرح بھی وہ کسی اختلاف کے بغیر وہ راجہ بن گیا۔ اس کی تخت نشینی کے سلسلہ میں میسور گزیٹر لکھتا ہے :-

"نرسانائک ۱۴۹۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اگرچہ تخت پر اس کا اقتدار ۱۴۹۷ء سے ہی مسلم تھا"

اس انقلاب کے بعد وجیانگر میں کافی ترقی اور سدھار پیدا ہو گیا اور ادھر مسلمان بھی اپنے دم خم کے ساتھ ابھرنے لگے تھے۔ پہلے تو وجیانگر کے مدمقابل صرف ایک بہمنی سلطنت تھی اور اب اس کی سرحد پر پانچ مسلم حکومتیں گھیرے ہوئے تھیں (۱) بیجاپور (۲) احمد نگر (۳) گولکنڈہ (۴) بیدر (۵) برار لیکن ان میں وجیانگر سے بہت ہی قریب بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کی حکومتیں تھیں۔ لیکن یہ حکومتیں آپس میں حریفانہ جنگ اور رقیبانہ کشمکش میں بری طرح گرفتار تھیں۔ ان کے باہمی اختلاف سے وجیانگر کی ہندو حکومت کو فائدہ اٹھانے کی نہایت زریں مواقع حاصل ہو گئے۔ مسلمانوں کی باہمی رقابتوں کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اڑیسہ کے راجہ نے مسلمانوں کے بعض اہم مقبوضات گنجام، اسحاق بجن، گوداوری اور کرشنا پر حملہ کر کے انھیں دوبارہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ لیکن اس وقت مسلمانوں نے ان علاقوں کے ہاتھ سے نکل جانے اور اس کے نتیجہ میں آئندہ پیدا ہونے والے سنگین اثرات کو محسوس نہیں کیا لیکن اس غفلت اور بے پروائی کی بنا پر بعد میں مسلمانوں کو نہایت سنگین حالات سے گزرنا پڑا۔ اس کے علاوہ نرسانائک کے زمانہ میں نہ کسی طرف بغاوت نے سر اٹھائی۔ نہ کوئی جنگی صف آرائی ہوئی اور نہ کسی حریف نے اس پر فوج کشی کی اس کے باوجود ایک بہت اہم اور نازک واقعہ یہ پیش آیا کہ سب سے پہلے پرتگیزوں کی ایک

---

[1] منقول از تاریخ فرشتہ

بڑی جماعت نے اس کے زمانہ میں ہی ہند میں آئی۔ نرسمہا نائک ۱۴۹۹ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۵۰۳ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ویر نرسمہا اس کے بعد اس کا بیٹا ویر نرسمہا جو بڑی رانی سے تھا سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۱۵۰۹ء میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے چھ سالہ دور حکومت میں اس کی کوئی نمایاں کارگزاری کا کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا لیکن ینوشا اپنی تاریخ میں اس کے بارے میں لکھتا ہے :۔

"یہ ہمیشہ جنگوں میں مصروف رہا۔ اس کے باپ کی وفات کے بعد ملک میں ہر جگہ چھوٹے چھوٹے راجہ اور سردار خود مختار ہو گئے تھے۔ ویر نرسمہا نے ان پر فوج کشی کر کے انھیں پھر مطیع کر لیا۔"

" اس کے خلاف بیسور گزیٹیر لکھتا ہے :۔

"کوئی علمی ثبوت یا کوئی کتبہ اب تک ایسا نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا کہ اس کا عہد کامیاب تھا بلکہ اس عہد میں کسانوں کا حال اس قدر تباہ تھا کہ انھیں محصولات ادا کرنے کے لیے اپنی زمینیں کو فروخت کرنا پڑتا تھا۔"

کرشنا دیو رایا کرشنا دیو رایا ۱۵۰۹ء میں اپنے بھائی ویرا کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر تئیس سال کی تھی۔ وہ اپنی تخت نشینی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تین حقیقی بھائیوں اور بھتیجے کو چندرگیری کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد سال ڈیڑھ سال تک وجیانگر کے پیش رو راجگان کی زندگیوں اور ان کی کارگزاریوں کے گہرا اور تفصیلی مطالعہ میں گزارا۔ اس کا خلاصہ ینوبڑ کی زبانی ملاحظہ ہو وہ لکھتا ہے :۔

" ان کا غذات میں اس کو نرسمہا اول کا ایک وصیت نامہ ملا جس میں تحریر تھا کہ اس کے جانشین کو چاہیے کہ قلعہ رودگیری کو اڑیسہ والوں کے قبضے اور قلعہ رائچور اور مدگل کو مسلمانوں کے تصرف سے نکال کر اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔"

اس نے اپنی تخت نشینی کے تین سال گزرنے پر میسور پر حملہ کر دیا اور سیوا اسمندرم اور سرنگاپٹم پر فاتحانہ قبضہ کیا۔ پھر اسی سال اس نے رودگیری پر بھی تسلط حاصل کر لیا۔ وہ برابر چار سال تک اڑیسہ کے راجہ سے لڑتا رہا۔ آخر فتح و کامیابی اسی کے حصہ میں آئی۔ اس طرح خلیج بنگالہ تک تمام مشرقی علاقہ اس کے قبضہ میں آگیا اس سے اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس کے قدم کرشنا کی طرف بڑھنے لگے۔ دریائے کرشنا کو پار کر کے بیاحی علاقہ کو کچلتا مسلتا ہوا اسحاق چمن تک پہونچ گیا۔ تلنگانہ والے بڑی بے جگری سے لڑتے رہے لیکن کرشنا دیو رایا کی فوج نظر فوج کے سامنے انھیں پسپا ہونا پڑا اگرچہ گولکنڈہ کی قطب شاہی برابران کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ تاہم انھیں شکست فاش سے

خود کو بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آخر پرتاپ دیو رایا نے اس جنگ سے تنگ آکر صلح کی درخواست پیش کر دی۔ جس کو دیو رایا نے ان شرائط پر منظور کر لی۔

۱۔ پرتاپ دیو رایا اپنی دختر دیو رایا کے ساتھ بیاہ دے۔ اور ان تمام مقبوضات سے دست بردار ہو جائے۔ جن پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ میں کامیاب مصالحت کے بعد کرشنا دیو رایا ایک تیز و تند آندھی کی طرح جنوب کی حکومتوں کی طرف بڑھا اور ان سے لڑتے بھڑتے، کچلتے، روندتے، مالابار تک پہونچا اور ان تمام ملکوں کو دوبارہ اپنے اقتدار میں لے آیا جو گزشتہ دور میں اس کی حکومت کے ماتحتی اور باجگزاری سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس طرح اس نے جدیرم، دیور، مدورا، ٹراونکور اور ملیبار میں اپنی فتوحات کے جھنڈے نصب کیے۔ اور اب وجیا نگر کی حکومت کرشنا دیو رایا کے دور حکومت میں اپنی وسعت کے لحاظ سے جنوب میں دریائے کرشنا سے راس کماری تک اور ادھر مشرق میں خلیج بنگال سے بحیرۂ عرب تک پھیل کر ایک زبردست طاقت بن گئی جس کی اس کی گزشتہ تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے اس کا دور وجیا نگر کی تاریخ کا ایک کامیاب روشن اور فتحمندانہ دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

کرشنا دیو رایا جب اپنی حکومت قوت و استحکام سے ہر طرح مطمئن ہو گیا تو اس کی نظر دکن کی سلطنتوں کی طرف اٹھنے لگی اس نے دیکھا کہ دکن کی سلطنتیں باہم برسرپیکار ہیں۔ آپس میں حریفانہ کشمکش میں مبتلا ہیں۔ کہیں سرحدی جھگڑے ہیں تو کہیں ایک دوسرے کے مقبوضات کی بازیابی کے لیے زور آزمائی۔ کرشنا دیو رایا چاہتا تھا کہ مسلم سلاطین برابر لڑتے بھڑتے رہیں اور ان کی ساری قوت اسی میں صرف ہو۔ اس طرح جب وہ کمزور ہو جائیں گے تو ہمارے لیے ان ممالک کی طرف پیش قدمی کرنے اور انہیں اپنی حکومت میں شامل کر لینے کا موقع بہت آسانی کے ساتھ آجائے گا۔ اس نے سوچا دکن کی مسلم سلطنتوں میں زیادہ طاقتور بیجاپور کی حکومت ہے۔ اور دریائے کرشنا و تنگبھدرا کا دوآبہ رائچور اور مدگل کا قلعہ بھی اسی کے قبضہ میں ہیں اس لیے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے بیجاپور کی حریف احمدنگر اور گولکنڈہ، بیدر اور برار کی مسلم حکومتوں سے رابطہ پیدا کر لیا اور انھیں بیجاپور سے ہونے والی جنگ میں کسی قسم کا حصہ نہ لینے کے سلسلہ میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سیاح نیوسٹ لکھتا ہے:۔

"کرشنا دیو رایا نے اس قدر فریب سیاست سے کام لیا کہ برار، بیدر، گولکنڈہ اور احمدنگر کے مسلمان سلاطین نے نہ صرف اس سے آنے والی جنگ سے علیحدہ رہنے کا وعدہ

کی بلکہ انھوں نے بیجاپور کے خلاف کرشنا دیو کی مدد بھی کرنا چاہی، ان پانچوں اسلامی حکومتوں میں بیجاپور کی حکومت سب سے زیادہ طاقتور تھی اور دوسری چار اسلامی حکومتیں یہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔"

۱۵۲۰ء کا ذکر ہے کہ کرشنا دیو رایا نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ اپنی راجدھانی سے روانہ ہوا۔ پھر نیوز آگے لکھتا ہے :۔

"اس لشکر میں پانچ سو ہاتھی کے علاوہ صرف جنگی سپاہیوں کی تعداد سات لاکھ چھبیس ہزار تھی۔ ان کے ساتھ پرتگالی سپاہی بھی تھے جنھیں کرشنا دیو رایا نے گوآ سے طلب کیا تھا۔ پرتگالی فوج کی کمان، نگر بدر کے ہاتھ میں تھی۔"

اس میں سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک مسلم حکومت کے خلاف پرتگالیوں کے جنگ میں حصہ لینے کی ابتدا کرشنا دیورایا کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ اس فوج ظفر موج کی کچھ مزید تفصیل اسی سیاح کی زبانی سن لیجیے، وہ لکھتا ہے :۔

"میں یہاں دشمنوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جو اس کیمپ میں بے شمار تھے اور نہ میں ان ناچنے والیوں کا ذکر کروں گا جو بیس ہزار کی تعداد میں سپاہیوں کا دل لبھانے کے لیے موجود تھیں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کیمپ میں بار برداری کا کس قدر سامان ہوگا کیمپ کے آگے آگے دس سے بارہ ہزار بہشتی گزرنے والی فوج کو پانی پلانے کے لیے راستہ میں کھڑے رہتے تھے اور اسی قدر بہشتی کیمپ میں موجود تھے۔ اس تمام مجمع سے آگے آگے کوئی لمبی چار فرسنگ کے فاصلہ پر بطور ہراول دستہ کے دشمن کی جستجو پر مامور تھے۔ ان کے دونوں بازوؤں پر دو ہزار سوار تھے جو تیر و کمان لیے ہوئے ان کی حفاظت کرتے تھے۔ کیمپ میں ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا تھا یہاں تک کہ ہیرے جواہر بھی ملتے تھے۔"

کبھا چار یہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"یہ جنگی کیمپ نہیں تھا بلکہ ایک نہایت عالیشان شہر معلوم ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی ضروریات زندگی ملتی تھیں۔ یہاں تک کہ تفریح کے لیے بیس ہزار رنڈی عورتیں بھی تھیں۔"

اس فوج کی پہلی کارروائی کا حال مورخ ہیگ اس طرح لکھتا ہے۔

"یہ فوج وجیانگر سے نکل کر تین ماہ کے سفر کے بعد رائچور کے قریب علی آباد میں ٹھہری جب یہاں جنگی انتظامات مکمل ہو گئے تو رائچور کا محاصرہ کر لیا گیا۔"

جنگی تفصیلات ہمارا موضوع نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ رائچور مسلم فوج نے تین مہینے تک نہایت پامردی کے ساتھ مدافعت کرتے رہے پھر بیجاپور سے اسماعیل عادل شاہ ان کی امداد

کے لیے اپنی بھرپور طاقت کے ساتھ آپہونچا۔ اس کی بھرپور طاقت اس کی حریف کی چوتھائی سے کمتر تھی اس نے حریف کی زبردست طاقت، اور اس کے لشکر کی کثرت و برتری دیکھ کر اپنے امرا و مصاحبین سے مشورہ کیا۔ اس وقت ہمیں جنگ کرنا چاہیئے۔ یا واپس ہو کر کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھنا چاہیئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے یہ بات بہت ہی نامناسب ہوگی کہ ہم بلا مقابلہ کیے واپس جائیں۔ چنانچہ ہیڈ سٹر اس موقع کی تفصیل یوں لکھتا ہے :۔

" دیورایا کی اس قدر کثیر فوج دیکھ کر اسماعیل عادل نے پہلے پہل دریا کو عبور کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ لیکن بعد میں جنگجو سرداروں کی تجویز پر دریا کو عبور کر کے ساحل پر خیمہ زن ہوا اسمٰعیل کی آمد کی خبر سن کر دیورایا نے اپنی فوج کو سات حصوں میں تقسیم کر کے ہفتہ کے دن مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں دیورایا نے اپنی جنگی قابلیت کا اظہار حیرت ناک طور پر کیا۔ یہاں تک کہ مسلمان قریب قریب سب ہی مارے گئے۔ یہ حالت دیکھ کر اسد خاں نے بادشاہ سے کہا کہ اگر جان عزیز ہے تو میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ چنانچہ بادشاہ کو لے کر نہایت مشکل سے دریا پار پہونچا۔"

اس کے بعد کیا ہوا اس کو بھی اسی کی زبانی سن لیجئے :۔

" اسلامی کیمپ کو لوٹ لیا گیا۔ دیورایا کو علاوہ باربرداری اور دوسرے جنگی سامان کے چار ہزار عربی گھوڑے اور سو ہاتھی اور چار سو بھاری توپیں اور نو سو گاڑیاں ملیں میدان جنگ میں جب مقتولوں کی دیکھا گیا تو ان میں کئی ایک نامی سرداروں کی لاشیں تھیں اسیران جنگ میں پانچ سردار بھی تھے جن میں ایک صلابت خاں نامی سردار بھی تھا جو زخموں سے بالکل چور چور تھا ؛ [1]

صلابت خاں آخر میں زخموں سے چور ہو کر ہاتھ دشمن کے ہاتھ اسیر ہو گیا لیکن اس جنگ میں جس بہادری اور دلیری سے مقابلہ کیا اور جس بے جگری کے ساتھ صلابت خاں آخر میں زخموں سے چور ہو کر فوج میں گھس کر داد شجاعت دی وہ اس میدان جنگ کا ایک روشن کارنامہ ہے جس کو مورخین نے سراہتے ہوئے خاص طور پر ذکر کیا ہے اس جنگ کے بعد ہندو فوج نے رائچور کا نہایت سخت محاصرہ کیا۔ مسلمانوں نے مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن جب ان کے سپہ سالار کا قتل ہو گیا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور قلعہ دشمن کے حوالہ کر دیا۔ اس کے بعد مدگل پر بھی مخالف قبضہ ہو گیا۔ مورخین کے بیان کے مطابق رائچور اور مدگل کے قلعوں کو سر کرنے میں پرتگالی فوج اور ان کے کمانڈر فگریڈو کا نہایت نمایاں حصہ تھا اس کامیابی سے فاتح فوج کے حوصلے

---

[1] ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند ص ۱۸۱۔

اتنے بڑھ گئے تھے کہ انھوں نے دیو رایا سے درخواست کی کہ وہ انھیں بیجاپور پر چڑھائی کی اجازت دے مگر دیو رایا بعض مصالح کے مد نظر اس وقت اس کی اجازت نہ دی۔

رائچور اور مدگل کی شاندار فتح و کامیابی کے بعد کرشنا دیو رایا ناگلا پہونچا۔ ناگلا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا شہر تھا جس کو کرشنا دیو نے کچھ سال پہلے اپنی ایک معشوقہ کے نام سے آباد کیا تھا یہاں اسماعیل عادل کی طرف سے اس کا ایک سفیر آیا اور باریابی کی اجازت طلب کی۔ دیو رایا نے اس کو ایک مہینے کے بعد اجازت دی۔ سفیر نے عرض کیا کہ ایک مدت سے دونوں حکومتوں میں اتحاد اور باہمی تعلقات تھے۔ راجہ نے انھیں بالائے طاق رکھ کر بیجاپور کے علاقہ پر حملہ کر کے اسے اجاڑ دیا گیا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہمارے تعلقات بحال ہو سکتے ہیں کہ آپ ہمارے مفتوحہ علاقے واگذار کر دیں اور مال غنیمت ہمیں لوٹا دیں۔ دیو رایا نے جواب دیا۔ اسماعیل جو چاہتے ہیں ہم انھیں منظور کر لیا گے بشرطیکہ وہ خود یہاں آئے اور ہمارے قدم چومے۔ سفیر اس کو سن کر واپس چلا گیا اور اس کو اسماعیل عادل شاہ تک پہونچایا اور اس نے اس کے جواب میں جو کچھ کہلا بھیجا وہ گو سخت تھا مگر اسلامی شان اور اس کی عزت کے منافی نہ تھا۔ اس نے کہلا بھیجا تھا کہ ”تلوار اس کا فیصلہ کرے گی“۔ اسماعیل عادل شاہ سے یہ جواب سنکر دیو رایا اپنی تمام طاقت اور لشکر کے ساتھ بیجاپور چل پڑا۔ اور اس کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا۔ ہر چند دیو رایا کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ اسماعیل عادل شاہ اس کے ہاتھ آجائے تو اس سے پورا انتقام لیعنی اس کا خاتمہ کرنے یا اس کو قیدی بنالے مگر دیو رایا اس میں ناکام رہا۔ کیونکہ اسماعیل عادل شاہ وقت سے پہلے ہی بیجاپور خالی کر کے باہر چل دیا تھا۔ ہندو فوج نے بیجاپور میں وہ اودھم اور تباہی مچائی کہ خدا کی پناہ اس کی خوبصورت اور عالیشان عمارتیں ڈھادی گئیں مساجد کی علانیہ بے حرمتی کی گئی ان میں خنزیر کاٹے گئے اسکے محراب و منبر کو توڑ پھوڑ کر تہس نہس کر دیا گیا۔ قرآن مجید کے نسخے نذر آتش کر دیے گئے۔ اور پردہ نشین عورتوں کی عصمتیں وحشیانہ طور پر لوٹی گئیں اس کی عمارتوں سے لکڑیوں کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا گیا۔ اور اس طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر بیجاپور کو برباد کر دینے کے بعد جب وہاں پانی کی قلت پیدا ہو گئی تو ہندو فوج مدگل کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس سلسلہ میں میسور گزیٹر لکھتا ہے :-

”ہندو فوج عملی طور پر کل شہر (بیجاپور) کو تباہ کر دیا اور بیتر زمین کے سپے جس کا ملنا مشکل تھا تمام گھروں کو ڈھا دیا گیا۔ صرف ایک ہی عمارت محفوظ رہ گئی جو اسماعیل عادل شاہ کا محل تھا جس میں کرشنا دیو رایا خود اقامت گزیں تھا۔“ [۱]

---

[۱] میسور گزیٹر ص۱۷۵ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند

جب وجیانگر کی فوج چلی گئی تو علی عادل شاہ بیجاپور اپنی جگہ واپس آگیا۔ صلابت خاں سپہ سالار اب تک کرشنا دیورایا کی قید میں تھا اس لیے اس کی رہائی کے لیے اسماعیل نے اسد خاں کو سفیر بنا کر دیورایا کے پاس بھیجا۔ چونکہ اسد خاں کو صلابت خاں سے رقابت تھی اس لیے وہ اس کا زندہ رہنا اپنی کامیابی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے دیورایا کے سامنے اپنی گفتگو کے دوران یہ گل کھلایا کہ اسماعیل عادل شاہ آپ کے تمام شرائط قبول کرنے پر آمادہ ہے۔ لیکن صلابت خاں نے ایک خفیہ خط کے ذریعہ اس بات سے اس کو باز رکھا ہے۔ اس کو سنتے ہی دیورایا نے صلابت خاں کے قتل کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اسد خاں نے یہ بھی کہا کہ اسماعیل عادل اور اس کی والدہ ملکہ جہاں سرحد پر آپ سے ملاقات کے لیے آرہے ہیں۔" اس کے بعد اسد خاں بیجاپور واپس نہیں گیا بلکہ وہ بلگام کی طرف چلا گیا۔ اسے خوف تھا کہ اگر صلابت خاں کے قتل کا راز اسے معلوم ہو جائے گا تو اس کی جان کی خیر نہیں۔ ساتھ ہی جاتے جاتے اسماعیل عادل کے نام یہ پیغام بھیجا کہ وہ دیورایا پر بھروسہ نہ کرے۔"

جب وقت مقررہ پر اسماعیل اور ملکہ جہاں سرحد پر نہ پہنچے تو دیورایا نہایت مشتعل اور برہم ہوا اور اس نے دوبارہ بیجاپور پر حملے کے لیے اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کی پیش قدمی اور فتوحات کا دائرہ گلبرگہ تک پھیل گیا۔ گلبرگہ میں ایک بہمنی شہزادے کو جو قید خانہ میں تھا اس کو آزاد کر کے تخت بہمنی پر بٹھایا لیکن دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ گلبرگہ کے انتظام کے لیے اپنا ایک خاص گورنر گجری کلیان راؤ کو مقرر کیا تھا۔"

"تاریخ جنوبی ہند کی صراحت کے مطابق اور کرشنا ملیا ڈاما کی تاریخی کتاب میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوؤں نے راستہ بھر تمام مقامات کو اجاڑ دیا، مساجد اور دوسرے مذہبی مقامات کی بے حرمتی کی۔" گلبرگہ وغیرہ مقامات کی فتوحات اور کامیابیوں کے بعد کرشنا دیورایا نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اپنی راجدھانی وجیانگر پلٹ آیا پھر چند ہی دنوں بعد وہ ملیبار کی طرف روانہ ہو گیا اور اس کے راجہ ساوری کو جو اس سے بغاوت کر کے بیٹھا تھا اس کو پھر سے اپنے حلقہ اطاعت میں لے آیا۔ اس کے بعد اس کی فوج سیلون کی جانب بڑھی۔ سیلون کے راجہ نے اس کی فوج اور طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور خراج دینے پر مصالحت ہو گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کرشنا دیورایا کے عہد حکومت میں وجیانگر ترقی اور عروج کے نصف النہار تک پہنچ گیا تھا اور بالآخر یہی عروج اس کے زوال کا پیش خیمہ بھی ہو گیا۔ چنانچہ سیویل نے اپنی تاریخ میں اس کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"یہ صحیح ہے کہ ان فتوحات کا اثر اسماعیل عادل شاہ والی بیجاپور پر نہایت برا پڑا

اس کی طاقت اور اس کے گھمنڈ کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ وہ اب اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے دوستی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری طرف ان فتوحات کا یہ اثر ہوا کہ وجیانگر کے راجاؤں میں ایک نیا گھمنڈ اور فخر پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ہمسایہ طاقتوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے غرور نے ان کے ہمسایوں کو ان کا دشمن بنا دیا۔"[1]

کرشنا دیو رایا نے اپنے زمانہ میں بکثرت مندر تعمیر کیے۔ اور انھیں کافی جاگیریں دے کر مالا مال کیا ان میں سب سے مشہور رنگ گھر جو اپنے فن تعمیر اور بہترین صنعت کے اعتبار سے بے نظیر تھا۔ ہوسپیٹ، جس کا اصلی نام ناگا پور تھا آباد کیا۔ دیو رایا اپنی ایک خواتین میں محبوبہ کے نام پر بسایا تھا۔ اس شہر کی تعریف میں ایبوڑہ لکھتا ہے :-

"راجہ نے شہر اس عورت کے نام پر آباد کیا تھا جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اس شہر کے اطراف ایک نہایت خوشنما دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ شہر کے اندر دونوں طرف خوشنما سنگین عمارتیں تھیں اس کی وسعت چالیس قدم کی تھی۔ کرشنا دیو رایا نے اپنے امیروں کو یہاں مکانات بنانے کا حکم دیا جس کی انھوں نے تعمیل کی۔ اس شہر کی تجارت سے سرکار کو بیالیس ہزار پرڈاؤ کی آمدنی ہوتی رہتی ہے اس شہر کے علاوہ ضلع تناولی میں اس نے اپنے نام پر ایک شہر تعمیر کیا جس کا نام کرشنا رایا سمندرم ہے۔"[2]

مورخ فرگاٹن کے بیان کے مطابق ۱۵۲۵ء میں یہ اطلاع پہونچی کہ اسماعیل عادل شاہ دوبارہ رائچور حاصل کرنے کی تجویز میں لگا ہوا ہے۔ اس پر اس نے ایک بڑی فوج لے کر رائچور کی جانب چل پڑا اور اس کے ساتھ اسماعیل کو لکھ بھیجا کہ :-

"اسماعیل دربار میں خود حاضر ہو کر اطاعت کا وعدہ کیا تھا اس کا ایفا اب تک نہ ہوا۔"

اس خط کے آخر میں اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ عنقریب بیجاپور پر ایک اور حملہ کرے گا۔ کسی ذریعہ سے یہ نہ ثابت ہو سکا کہ اس خط کا کوئی جواب دیا تھا۔ لیکن برسات کا موسم شروع ہو جانے کی وجہ سے وہ بلا کسی اقدام کے اپنی راجدھانی پلٹ آیا اور آئندہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ جنگ کی تیاریاں جاری تھیں کہ کرشنا دیو رایا بیمار ہو گیا اور اسی بیماری میں ۱۵۳۰ء میں وفات کر گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے آئندہ کے تمام جنگی منصوبوں کا خاتمہ ہو گیا۔

دیو رایا کے دور حکومت میں بیرونی ممالک کے مختلف سیاح وجیانگر پہونچے تھے انھوں نے اپنے مشاہدات کو مختلف انداز میں لکھا ہے۔ ان میں ایک سیاح نیس بھی تھا وہ لکھتا ہے: تمام

---

[1] فرگاٹن امپائر مصنفہ سیول ص ۱۵۵

ملک میں بالکل امن و امان تھا۔ زمین نہایت سر سبز و شاداب تھی اور ہر جگہ تالاب بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ محصولات سے جملہ آمدنی ۲۲۰ لاکھ پگوڈا ہوتی تھی جس میں سے نصف راجہ کو دیا جاتا تھا اور باقی نصف فوج پر خرچ ہوتا تھا۔ اس کے مقابل نیوبرٹ لکھتا ہے :-

"کاشتکاروں کی حالت بالکل تباہ تھی کیونکہ ان پر مال گزاری کا نرخ بہت زیادہ لگا ہوا تھا"

راجہ کرشنا دیو رایا کے عہد میں سلطنت کا نظم و انتظام

وجیانگر کی پوری مملکت کئی حصوں میں منقسم تھی۔ ہر صوبہ کا ایک گورنر تھا۔ ان کے علاوہ اس کے ماتحت چند باجگذار راجہ بھی ہوتے تھے۔ ان میں مشہور یہ تھے (۱) نبکا پور (۲) گرسپا (۳) برکلور، (۴) کالیکٹ (۵) بھٹکل۔

گورنری کے عہدے پر صرف برہمن ہی مامور ہوتے تھے۔ وفاقی حکومت کے طرح راجہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ایک خاص فوج رکھتا تھا۔ ہر گورنر کا ایک نمائندہ پایہ تخت میں رہ کر اپنی اپنی ریاستوں کی طرف سے روزانہ رپورٹ دیتا تھا۔ دسہرہ کا تیوہار نہایت شاندار پیمانہ پر منایا جاتا تھا جس کی مثال ہندوستان بھر میں کسی اور جگہ نہیں ملتی تھی۔

ملک کے مغربی حصے میں سات بڑی بندرگاہیں تھیں جن سے مالی تجارت کی برآمد ہوتی تھی ان میں "بھٹکل" سب سے اہمیت رکھتا ہے۔ مشرقی ساحل پر کائل اور دیولی پٹنم تھا لہ اسی دیو رایا کے زمانہ میں مجرموں کو سزائیں دینے کی تفصیل نیوبرٹ کی زبانی سن لیجئے۔ وہ لکھتا ہے :-

چوری کا ثبوت ملتے ہی چور کے ہاتھ اور پاؤں اسی وقت کاٹ دیے جاتے تھے اگر چوری بڑی ہوتی تو چور کو سولی دے دی جاتی تھی۔ امراء باغی ہو جاتے تھے تو ان کے پیٹ میں لکڑی گھسیڑ کر مار دیا جاتا تھا۔ عام لوگوں کو معمولی خطاؤں پر بھی سزا دی جاتی تھی۔ ان کے سر کاٹ کر بازار میں لٹکائے جاتے تھے۔ بادشاہ کا حکم ہر شخص کو بے چوں و چرا ماننا پڑتا تھا۔ اکثر ڈیول اسازات لڑے جاتے تھے۔ جن میں جیتنے والا ہارنے والے کی تمام املاک پر قابض ہو جاتا تھا بعض وقت بادشاہ لوگوں کو ہاتھیوں کے آگے بھی ڈال دیتا تھا کہ انھیں

۱۔ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۸۹

پھاڑدیں۔ البتہ برہمن بھاری سزاؤں سے مستثنیٰ تھے اور انھیں جرم کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ اندھا کر دیا جاتا تھا"۔

کرشنا دیو رایا کے دور کا ایک اجمالی جائزہ

کرشنا دیو رایا کی کامیابی کے اسباب پر بیبو رگز بیڑا اپنی کتاب میں لکھتا ہے :۔

۱۔ بہترین فوجی تنظیم (۲) اس کی سیاسی چالیں (۳) اس کی ذاتی وجاہت (۴) اس کی ہمسایہ سلطنتوں میں باہمی رقابت۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کرشنا دیو رایا اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں اپنے تدبر اور زیرکی کے اعتبار سے ایک ممتاز مقام پر فائز تھا اس کی انتظامی صلاحیت اور جنگی قابلیت میں کچھ کلام نہیں۔ لیکن ایک فاتح کا مفتوح اور غالب کا مغلوب کے ساتھ جس حکمت عملی اور اعلیٰ کرداری کی ضرورت تھی وہ اس میں بڑی حد تک خالی نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی فتح سے زیادہ کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکا بلکہ اس کے خلاف اس نے اپنے حریفوں کے جذبات کو مشتعل اور برانگیختہ کرنے میں سرگرمی دکھایا۔ جیسے اسماعیل عادل شاہ کو اپنی قدم بوسی کے لیے اصرار کرنا۔ اس نے تنہا اسماعیل شاہ کا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے دلوں کو عام طور پر ٹھیس پہونچایا۔ جس سے ان کے دبے ہوئے جذبات ابھر آئیں جو ان کے لیے بیداری کا ایک تازیانہ ثابت ہوا۔ کیونکہ مسلمان یہ گوارہ کر سکتا ہے کہ سر کٹ جائے لیکن کسی حالت میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے جھک جائے۔

دیو رایا اگر بیجاپور پر قبضہ کر لیتا تو دکن کے مسلم سلاطین باہمی رقابت کی بنا پر خوش ہو جاتے اور ان کے جذبۂ رقابت کو ایک گونہ تسکین حاصل ہو سکتی تھی لیکن اس کے خلاف دیو رایا کے اس توہین آمیز برتاؤ نے انھیں سخت برہم اور بدظن کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیے۔ کرشنا دیو رایا جہاں اپنی سلطنت کو عروج و سربلندی کے کمال تک پہونچا وہاں اس کے غرور و نخوت، مذہبی تنگ نظری نے اس کے زوال کے اسباب بھی فراہم کر گئے۔ رہا یہ بات کہ کرشنا دیو رایا اپنے فتوحات کے لحاظ سے ہندوستان کا نپولین تھا جیسا کہ بعض مورخین نے لکھا ہے یہ محض ان کی خوش فہمی ہے۔ کرشنا دیو رایا اور نپولین میں مماثلت کسی وجہ سے بھی درست نہیں۔ نپولین نے تمام یورپ کو زیر و زبر کیا تھا اور کرشنا دیو رایا بیجاپور کی ایک چھوٹی سی حکومت پر فتحیاب نہ ہو سکا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور انھیں ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی حکمت عملی میں وہ ایک حد تک کامیاب رہا اور اس بنا پر اس کو دیو انگار

کا پہلا فاتح راجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کرشنا دیو رایا کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ کافی نزاع و اختلاف کا باعث بنا۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"کرشنا دیو رایا کی وفات پر اس کی چھوٹی بیٹی تخت کی وارث تھی"

مقامی زبان کی کتابوں اور کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشنا دیو رایا کا ایک چھوٹا بیٹا بھی تھا۔ کرشنا دیو رایا کی رانیوں میں چار رانیاں بہت ممتاز تھیں اور اپنے اثر و رسوخ کے اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل تھیں۔ ان میں بڑی رانی کا داماد رام راج تھا۔ اور دوسری رانی کا ترمل راج تھا۔ رانیاں اس بات پر متفق تھیں کہ رام راج کو بڑے داماد کی حیثیت سے تخت نشین بنایا جائے۔ برخلاف تیسری رانی چاہتی تھی کہ اس کا شیر خوار بچہ کرشنا دیو رایا کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے تخت و تاج کا حقدار ہے۔ ایک جماعت ایسی تھی جو صرف اچھوتا رایا کی حمایت میں تھی بہرحال جانشینی کے بارے میں اختلاف ناگوار اور سنگین صورت اختیار کر گیا۔ وجیا نگر اسی دوران میں سازشوں، ریشہ دوانیوں اور باہمی کش مکشوں کا ایک اچھا خاصا اڈہ بن گیا۔

اسماعیل شاہ تک جب یہ خبر پہونچ گئی تو وہ خاموشی کے ساتھ اٹھا۔ دریائے کرشنا عبور کیا اور رائچور اور مدگل پر دس سال بعد ۱۵۳۰ء میں دوبارہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس دفعہ بیں اسلامی ریاستیں، بیدر اور برید اسماعیل کی حمایت میں تھے۔ امیر برید تو اس زمانہ میں اس کا باجگزار ہو گیا تھا وجیا نگر اپنے اندرونی مسائل میں الجھے رہنے کی وجہ سے رائچور اور مدگل میں موجود فوج کی کچھ مدد نہ کر سکا اس لیے رائچور اور مدگل کی فوج تین مہینے کے مسلسل محاصرہ سے تنگ آکر اسماعیل کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اسماعیل عادل شاہ دو آبہ رائچور کی مہم کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد بیجا پور چلا آیا اور اس کے چند ہی دنوں بعد وہ رحلت کر گیا۔ اس کی جگہ ابراہیم عادل تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

وجیا نگر کی تخت نشینی کا جھگڑا اب تک حل نہ ہو سکا تھا کہ دیو رایا کی تیسری رانی جو اپنے دودھ پیتے بچے کو اس کے باپ دیو رایا کی جگہ راجہ بنانا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے دبے ترملا کی حمایت اس کو حاصل تھی۔ اس رانی نے ابراہیم عادل کے نام ایک پیغام بھیجا اور اس سے امداد کی خواستگار ہوئی اس مدد کے بدلے آئندہ اس کی باجگزار ہونا منظور کیا۔ ابراہیم عادل نے اس کو منظور کر لیا۔ ابراہیم عادل کی آمد کی خبر سن کر فریقین   لگا اپنے اختلافات میں ڈھیلے پڑ گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ تیسری رانی کے مطالبہ کو تسلیم کیا جائے اور اس کے شیر خوار بچے کو تخت نشین بنایا جائے۔ اس مصالحت کی اطلاع ابراہیم عادل کو جو وجیا نگر کے لیے روانہ ہو گیا

تھا۔ اس کے نام دوسرا پیغام بھیجا گیا کہ ہمارے آپس میں مصالحت ہوگئی ہے اس لیے وہ وجیانگر آنے کی زحمت نہ اٹھائے، اور جو رقم اس کی مدد کے عوض میں مقرر کی گئی تھی وہ رقم بلا کم وکاست اس کو پہونچا دی گئی اور وہ اس کو لے کر مستقر کی طرف مراجعت کی۔

درحقیقت یہ اتحاد حقیقی اتحاد نہ تھا بلکہ ایک وقتی فتنے کو دبانے کا ایک سوچا سمجھا پلان تھا اور ایک گہری سیاسی چال تھی۔ عادل شاہی فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کا ایک بہانہ تھا۔ ان کا خیال تھا اگر وجیانگر کی حکومت ایک بار باجگذار بن گئی تو پھر ہندو سلطنت کا وجود ہی ختم ہوجائے گا اور اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا چنانچہ جب ادھر ابراہیم عادل کی واپسی ہوئی اور ادھر مخالف گروپوں نے اپنے سازشی پلان کے مطابق فوج کو اپنے ساتھ ملالیا اور وجیانگر پر قبضہ کے ساتھ شاہی محل کا محاصرہ کرلیا اور وجے نرملا جو تیر عوار راجہ کے پردے میں راج کر رہا تھا نہایت بے بسی کے عالم میں خودکشی کرکے اپنا قصہ تمام کر دیا۔ اس کے بعد سب نے اتفاق کرکے اچیوت رایا کو راج کے بدیر بٹھایا اور ملک کے انتظامی امور میں بطور مشیران راجہ بدا سلوکا، ترملا، درجا سلوکا ترملا، رام راج اور اس کے بھائی کو شریک کرلیا گیا اول الذکر دونوں اچیوت رایا کے نسبتی بھائی اور ثانی الذکر پہلی اور دوسری رانیوں کے داماد تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے متعلق نیوٹر لکھتا ہے :-

"ابراہیم عادل شاہ والئی بیجاپور کو وجیانگر آنے کی دعوت کسی نے بھی نہیں دی۔ وجیانگر کی خانہ جنگی کی حالت سن کر وہ خود حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ وہ پایہ تخت سے ایک منزل پر پہونچ گیا۔ اچیوت رایا اگر چاہتا تو اس کا مقابلہ کرسکتا تھا لیکن اس نے ہمت ہار دی۔ ابراہیم عادل کے ماتحت اس وقت صرف بارہ ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ تھی اس نے شہر باگلاپور پر حملہ کرکے اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ اچیوت رایا نے دس لاکھ طلائی پگوڈا اور ایک لاکھ جواہرات دے کر صلح کرلی۔ رائچور پر اس کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا۔ جس کے بعد ابراہیم عادل واپس آگیا اس کے واپس ہوتے ہی وجیانگر کے امرا اور رعایا نے رانیوں کو عزت دلائی کہ ان کی ضد کی وجہ سے وجیانگر کو یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ آخران تمام ہنگاموں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اچیوت رایا کو راجہ تسلیم کرلیا۔ اور سلطنت کے انتظام میں اس کے سالوں کے ساتھ رام راج اور اس کے بھائی ترملا کو بھی حصہ دیا گیا۔"

اقتدار حاصل کرنے کے بعد بدا سلوکا ترملا اور جنا سلوکا ترملا جو اچیوت رایا کا سالا تھے ایسے ظلم وستم ڈھائے کہ رعایا چیخ اٹھی اور پورے ملک میں بدامنی اور بے چینی کی فضا پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ میں اکثر ماتحت امرا بغاوت کر بیٹھے۔ ابھی دونوں اڑیسہ کے راجہ دیو رایا کے زمانے

میں اپنے کھوئے ہوئے مقامات پر حملہ کر دیئے کرشنا تک تمام ملک واپس لے لیا اور اپنی آزادی اور وسعت کے ساتھ پہلے مقام پر واپس ہو گیا اس طرح وجیانگر کے اچھوت رایا کا بیدا دنگری دور کا ۱۵۴۲ء میں خاتمہ ہو گیا۔

اچھوت رایا کے مرنے پر امرا سلطنت نے اس کے سالوں کو ملکی اقتدار و اختیارات سے کلی طور پر محروم کر دیا۔ اور رام راج اور اس کے بھائی ترملا کی جماعت برسر اقتدار آگئی۔ سدا سیو راجہ اچھوت رایا کا سوتیلا بھائی تھا تخت شاہی پر بٹھایا۔

سیاح گیاسرے کورے جو اس زمانے میں وجیانگر میں موجود تھا وہ لکھتا ہے :-

"اچھوت رایا کے گزر جانے کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے ذنکٹارائے کو تخت پر بٹھایا گیا اس کو چھ ماہ بعد قتل کر دیا گیا اور سدا سیو رایا کو تخت نشین کیا گیا لیکن تمام انتظام سلطنت رام راج اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں رہا دونوں کرشنا رایا کے داماد تھے" ملک راجہ تو برائے نام تھا ملک کا سارا انتظام سلطنت رام راج اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں رہا اور وہی سیاہ و سفید کے مختار کل تھے۔ ہند و مورخین لکھتے ہیں :-

"سدا سیو رایا اس وقت نہایت کمسن تھا اس لیے اس کو کمسن برائے نام راجہ بنا کر رام راج نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی"

آگے لکھتے ہیں :-

"سدا سیو رایا کو رام راج نے تمام عمر اپنی قید میں رکھا۔ سدا سیو رایا کو سلطنت کے کاموں میں بالکل دخل نہ تھا۔ سدا سیو رایا کا نام صرف اس لیے لکھا گیا کہ رام راج نہایت ہوشیاری سے کام لے کر تمام احکام و فرمان سدا شیو رایا کے نام سے جاری کرتا تھا ورنہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک صرف رام راج ہی تھا"[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رام راج وجیانگر میں ایک زبردست شخصیت بن کر ابھرا تھا سیاسی صلاحیت اور انتظامی قابلیت تدبر اور دانشمندی جیسے اوصاف کا حامل تھا اس نے سلطنت میں پھیلی ہوئی تمام اندرونی اور بیرونی خامیوں و کمزوریوں کو دور کر دیا اور پورے ملک کو امن و سلامتی، ترقی و خوشحالی کے بلند سطح پر پہونچا دیا یہی وجہ تھی کہ اس کی دھاک لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی اس دھاک کے باوجود عوام میں اس کی عزت تھی، احترام تھا اور اس سے محبت بھی تھی"

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۰۴

رام راج نے سب سے پہلے فوجی تنظیم پر خاص طور سے توجہ دی۔ پھر اس نے رعایا کے حالات کو سدھارنے اور ان کی مشکلات اور کٹھنائیوں کو دور کرنے میں پوری تن دہی کے ساتھ حصہ لیا۔ اور ایسے احکام جاری کیے جن سے ان کی ساری شکایتیں اور سورشیں بالکل دب کر رہ گئیں۔ اور جو ریاستیں باغی ہو کر بیجا نگر سے اپنا رشتہ توڑ چکی تھیں وہ تمام بجز ایک ٹراونکور کے اس کے تابعدار اور باجگذار ہو گئے۔ ٹراونکور کے راجہ نے بغاوت ہی نہیں کی بلکہ آگے بڑھ کر ضلع تناولی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر رام راج نے ٹراونکور پر حملہ آور ہوا۔ تاریخ خاندان اراویدو کا مصنف ریونڈ ہراس اپنی کتاب میں اس حملے کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ٹراونکور والوں نے حملہ آوروں کو سخت شکست دی۔ لیکن بعد میں وجیانگر والے ان پر غالب آگئے۔ ٹراونکور نے ضلع تناولی کو خالی کرتے ہوئے خراج دینا منظور کر لیا۔"

اس سے فراغت پانے کے بعد رام راج کی نظریں اب شمالی سرحدوں میں واقع مسلم سلطنتوں کی طرف اٹھنے لگیں چنانچہ اس کے متعلق تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"رام راج نے اپنی شمالی سرحدوں کی طرف نظر ڈالی۔ اس زمانے میں دکن کی اسلامی سلطنتوں میں تین سلطنتوں کی سرحدیں وجیانگر کی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں، احمد نگر، بیجاپور، گول کنڈہ کی۔ ان تینوں کی آپس میں نااتفاقی تھی اور ہمیشہ ان میں جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان تینوں میں بیجاپور کی سلطنت سب سے زبردست تھی اور یہی سلطنت ہمیشہ وجیانگر کے مقابلہ میں صف آرا ہوتی تھی۔ رام راج نے سب سے پہلے اس کا خاتمہ کرنا چاہا لیکن اس کو جرأت نہیں ہوئی کہ اکیلا اس کا مقابلہ کرے اس لیے اس نے اپنے خسر کرشنا دیو دایا کی تقلید میں ایک ایسی سیاسی روش اختیار کی جن کی وجہ سے تینوں سلطنتیں ایک دوسرے کی پہلے سے زیادہ دشمن بن گئیں اور بیک وقت نہ صرف بیجاپور بلکہ احمد نگر اور گول کنڈہ بھی کمزور ہو گئے۔"[۱]

یہی وہ زمانہ تھا کہ پرتگیزی ہند میں اپنا تسلط جمانے جا رہے تھے۔ ان کی بحری طاقت کافی مضبوط تھی اور اسی بحری طاقت کی وجہ سے عربوں کے ہاتھوں سے ان کی تجارت چھین رہے تھے۔ اور انھیں ان کے کاروبار سے بے دخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور اسی مقصد کے لیے بندرگاہ گوا وغیرہ کو اپنے قبضہ میں لے رکھا تھا۔ اسی زمانہ میں احمد نگر سے پرتگیزوں نے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس لیے رام راج نے پرتگیزوں سے معاہدہ کرنے میں احمد نگر کو شریک کر لیا۔ اس سے رام راج کا مطلب بیک کرشمہ دو دار تھا ایک یہ کہ جنگ کی صورت میں

---

[۱] تاریخ جنوبی ہند۔ ص ۲۰۳

پرتگیزوں کی طرف سے مکمل حمایت۔ دوسرے جنگ میں احمدنگر کو اپنا حلیف بنانے میں کامیابی۔
بہرحال پرتگال اور وجیانگر کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی تفصیل میسور گزیٹیر سے نقل کی جاتی ہے :-

" یہ معاہدہ گوا کے گورنر ڈی کاسٹرو اور راجہ سداسیو رایا نے ۱۷ر دسمبر ۱۵۴۷ء مطابق ۱۵۴ کیا ہے (۲) فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ایک فریق کا دوست دوسرے فریق کا بھی دوست اور ایک فریق کا دشمن دوسرے فریق کا بھی دشمن مانا جائے گا اور جب کبھی ہندوستان بھر میں کسی بادشاہ یا حاکم سے جنگ کی ضرورت پڑ جائے تو ایک فریق دوسرے فریق کو مدد کرے گا۔ نظام شاہ والی احمدنگر کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے (۳) بندرگاہ گوا میں جتنے گھوڑے عرب یا فارس سے اتریں گورنر گوا کا فرض ہوگا کہ وہ وجیانگر کے راجہ کو مناسب وقفوں کے ساتھ اطلاع دے کر تمام گھوڑے اس کے لیے بہ ادائے قیمت خرید کر بھجوا دے۔ ہرگز کوئی گھوڑا بھی سلطنت بیجاپور کو نہ بھیجا جائے۔
۴۔ وجیانگر کا راجہ اپنے ملک کے تمام سوداگروں کو اس امر پر مجبور کرے گا کہ وہ اپنے تمام سوداگری کا مال انھیں بندرگاہوں سے روانہ کریں جو پرتگال والوں کے قبضہ میں ہیں۔ کوئی تاجر کو مجاز نہ ہوگا کہ سامان تجارت بیجاپور کے مقبوضہ بندرگاہوں سے چڑھائے۔
۵۔ وجیانگر کا راجہ اپنے تمام تاجروں کو حکم دے گا کہ آئندہ شورہ اور لوہا بیجاپور کی بندرگاہوں سے نہ خریدیں بلکہ اپنی تمام ضروریات پرتگالی کوٹھیوں سے خریدیں۔
۶۔ کپڑے، تانبہ، ٹین اور جستہ کے بھی لیے یہی مذکورہ بالا حکم ہے۔
۷۔ وجیانگر کا راجہ اپنی بندرگاہوں میں مسلمانوں کا کوئی جہاز یا بیڑہ آنے نہ دے گا اور اگر اجانا کوئی آجائے تو اس کو گرفتار کر کے گوا بھیجدیا جائے گا۔
۸۔ دونوں فریق اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ عادل شاہ والی بیجاپور سے جنگ کریں گے اور وہ علاقہ جو فتح ہوگا وہ وجیانگر کی ملکیت سمجھا جائے گا۔ اس کے عوض ان تمام مقامات جو مغربی گھاٹوں کے مغرب میں اور شمال میں باندے سے لے کر جنوب میں سنٹا کورٹے تک ہیں۔ بادشاہ پرتگال کا علاقہ تسلیم کیا جائے گا"۔[1]

اس معاہدے اور گزشتہ واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ (ا) بیجاپور کے خلاف رام راج جارحانہ عزائم رکھتا تھا (ب) مسلمانوں کا زور توڑنے کے لیے جنوب کی اس وقت

---

[1] میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۳۹ ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند۔

کی سب سے بڑی زور دار حکومت کا خاتمہ (ج) مسلمانوں کے خلاف اس وقت کے ہندوؤں کے جذبات کس قدر مخاصمانہ اور معاندانہ تھے۔ (د) مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور ان کی قوت و توانائی کو خانہ جنگیوں میں الجھانے اور اس کے ذریعہ انھیں کمزور کرنے اور آئندہ کسی بھی جنگ کے قابل نہ رکھنے کے لیے کس کس قسم کے حربے اور جوڑ توڑ اور اوچھے ہتھیار استعمال کئے گئے (ہ) اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پرتگیزی جو غیر ملکی اور نو وارد تھے ان کے ساتھ باہمی تعلقات استوار کئے گئے۔ اور انھیں مسلمانوں پر ترجیح دی گئی۔ انھیں ملکی معاملات میں دخیل ہونے کی سہولتیں بخشی گئیں اور ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کی ایک نئی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس طرح مغربی استعمار پسند ملکوں کو یہاں پھلنے پھولنے قوت و استحکام حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا گیا۔

احمد نگر اور بیجا پور کی حکومتوں میں کلیان کا عرصہ سے ایک مابہ النزاع مسئلہ بنا ہوا تھا گزشتہ جنگ میں کلیان احمد نگر کے ہاتھوں سے نکل کر بیجا پور کے قبضہ میں آگیا تھا اس کو واپس لینے کے لیے رام راج نے احمد نگر سے پوری حمایت کا وعدہ کیا۔ اس پر فرشتہ لکھتا ہے:۔

"اس اتحاد کو مضبوط کر کے رام راج نے برہان نظام شاہ والی احمد نگر اور جمشید قطب شاہ والی گولکنڈہ سے سازش کر کے بیجا پور پر حملہ کر دیا۔"

ہندو تاریخ واسو چتریہ کا مصنف لکھتا ہے:۔

"احمد نگر کا سلطان اس سے مدد کا خواہاں ہوا تو اس نے مدد کی"[۱]

رام راج کی سازشوں اور در پردہ مسلسل کارروائیوں کا انجام ۱۵۵۰ء میں دریائے بھیما کے کنارے ایک خونریز مقابلہ کی صورت میں نکلا۔ اس معرکہ میں بیجا پور کو شکست ہوئی اور ابراہیم عادل نے اپنے گردو پیش کے حالات کے مدنظر اپنے جنرل اسد خاں کے ذریعہ رام راج سے علیحدہ صلح کر لی۔ رام راج نے اس مصالحت میں برہان نظام شاہ اور جمشید قطب شاہ کو علیحدہ رکھا۔ بیجا پور والوں سے رام راج نے یہ شرط منوالی کہ وہ آئندہ کبھی احمد نگر اور گولکنڈہ سے اتحاد نہ کریں گے اور شہر کلیان احمد نگر کو سپرد کر دیا گیا۔ اس جنگ کے تیسرے سال احمد نگر اور گولکنڈہ ایک ساتھ اپنی متحدہ طاقت سے بیجا پور کے خلاف گلبرگہ کی طرف پیش قدمی کی لیکن رام راج اس جنگ میں بیجا پور کے حمایت میں کھڑا ہو گیا اور اپنے بھائی کو گولکنڈہ پر فوج کشی کے لیے بھیجدیا رام راج کی اس فوج کشی سے گولکنڈہ والے حیران و پریشان اپنے پایہ تخت کو بچانے پلٹ آئے۔ اور ادھر احمد نگر والوں نے بھی میدان جنگ چھوڑ کر اپنے دار الحکومت

---

[۱] بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۰۵

کی طرف روانہ ہو گئے۔ گولکنڈہ والوں نے رام راج کی طرف دست صلح بڑھایا جو اس بات کی یقین دہانی پر منظور کی گئی کہ وہ آئندہ کسی وقت بھی احمد نگر سے اتحاد و تعاون نہیں کرے گا۔ رام راج جو کل تک احمد نگر کا حلیف تھا اور جس نے گزشتہ جنگ میں کلیان کو احمد نگر کے حوالہ کیا تھا اب وہی رام راج کلیان کو احمد نگر کے ہاتھوں سے چھین کر بیجاپور کے سپرد کر دیا۔

مسلم سلاطین کی ان باہمی رقابتوں یا انھیں آپس میں لڑانے کی حسین ترکیبوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے عہد و اقرار کی بنا پر آپس میں ایک عرصہ تک متحد نہ ہو سکے۔ اب رام راج نے اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ان کے داخلی معاملات میں دست اندازی شروع کی۔ گول کنڈہ کے جمشید قطب شاہ کے انتقال پر امرائے سلطنت نے اس کے فرزند کو تخت نشین کر دیا۔ اس کے خلاف رام راج نے جمشید کے بھائی ابراہیم قطب شاہ کی حمایت میں گول کنڈہ پر فوج کشی کی۔ اور ابراہیم قطب شاہ کو تخت پر مسلط کر دیا۔ اس پر سرے بریا ہیو سہد و تاریخ کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس نے قطب شاہ کو مدد دے کر اس کی سلطنت اسے بحال کر دی اس تائید کے عوض رام راج نے ملک کا ایک حصہ حاصل کر لیا"

۱۵۵۷ء میں بیجاپور ایک نئے انقلاب سے دوچار ہوا۔ وہ یہ کہ فرماں روائے بیجاپور ابراہیم عادل انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا علی عادل سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ابراہیم عادل کے ایک بھائی عبد اللہ نے تخت کا دعویٰ کیا۔ اور اس کے لیے اس نے پرتگیزوں سے حمایت حاصل کر لی اور اس حمایت کے عوض سالسٹ اور پرڈیڑ کا علاقہ پرتگیزوں کو بخش دیا۔ پرتگیزی فوج بیجاپور پر چڑھائی کی۔ ادھر علی عادل نے رام راج سے مدد طلب کی۔ رام راج نے ایک بڑی طاقت بھیج کر عبد اللہ کو شکست دے دی۔ عبد اللہ فرار ہو کر احمد نگر میں پناہ لیا جہاں اس کو گرفتار کر کے گوا بھیج دیا گیا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ احمد نگر والوں نے سوچا علی عادل نوخیز اور کمسن ہے نہ جنگ آزما ہے اور نہ تجربہ کار۔ اس لیے اس وقت کسی سے مقابلہ کی ہمت نہیں کر سکتا کلیان کے حصول کے لیے یہی مناسب موقع ہے۔ چنانچہ ۱۵۵۸ء میں احمد نگر نے اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ کلیان کی طرف پیش قدمی کی۔ اور اس طرف علی عادل بیجاپور سے سیدھے اپنے منھ بولے باپ رام راج کی خدمت میں پہنچا اور اس کی حمایت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ رام راج نے ایک زبردست فوج احمد نگر پر حملہ کے لیے بھیج دی۔ احمد نگر کو شکست فاش اٹھانی پڑی اس حمایت کا بیجاپور کی طرف سے رام راج کو یہ صلا ملا کہ رائچور اور مدگل پر وجیا نگر کا مستقل قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد چند سال تک ہر طرف خاموشی رہی اس اثنا میں احمد نگر اور گول کنڈہ میں ایک نیا رشتہ قائم ہو گیا۔ حسین نظام شاہ کی بیٹی ابراہیم قطب شاہ کی زوجیت

میں آگئی۔ اس شادی کی وجہ سے دونوں حکومتیں قریب ہوگئیں اور یہ دونوں آپس میں مل کر کلیان کے لیے بیجاپور پر حملہ آور ہوئے۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ والی بیدر اور برار بھی شامل تھے۔ بیجاپور کے علی عادل نے رام راج سے فوجی امداد لے کر مقابلہ کیا۔ اس جنگ کا نتیجہ پھر احمد نگر کی شکست کی صورت میں نکلا، اور رام راج کی ہندو فوج نے دوبارہ احمد نگر پر قبضہ کر لیا اور انتقامی جذبات سے سرشار ہندو فوج نے اس شہر کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھی۔ مسلمانوں کی تذلیل بحقیر کے ساتھ اسلام کی جو توہین کی گئی وہ نہایت تکلیف دہ اور دل خراش ہے برگس Barigas تاریخ فرشتہ کا مترجم اپنی کتاب جلد سوم ص۲۰۳ میں جس طرح لکھتا ہے اس کو تاریخ جنوبی ہند کے حوالہ سے یہاں نقل کیا جاتا ہے برگس لکھتا ہے:۔

"ظلم و ستم کی انتہا نہیں رہی۔ مسجدوں میں سور کاٹے گئے۔ گھوڑے باندھے گئے اور گھروں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قرآن مجید کے نسخے لا کر ان کی بے حرمتی کی گئی اور انھیں سر بازار جلایا گیا مسلمان پردہ نشین عورتوں کی دن دھاڑے راستوں میں عصمت دری کی گئی۔ مسجدوں اور دوسرے مذہبی عمارتوں کو ڈھا دیا گیا۔"

مورخ بیگ اپنی کتاب کے ص۱۲۷ میں لکھتا ہے:۔

"ہندوؤں نے اس موقعہ پر بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی توہین کی اور ان کی مسجدوں میں گھوڑے باندھے گئے۔ اور جب جلانے کے لیے لکڑی نہ رہی تو مسجدوں کو ڈھا کر لکڑی ملائی گئی۔"[1]

حسین نظام نہایت پریشانی اور عجز و درماندگی کی حالت میں صلح کی درخواست کے ساتھ وجیانگر پہونچا اور رام راج کے دربار میں حاضر ہو کر اس کے ہاتھ سے پان بیڑا لے لیا اس زمانہ میں کسی کے ہاتھ سے پان لینے کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ دینے والا بلند و برتر اور لینے والا پست و فروتر۔

اس صلح کے نتیجہ میں احمد نگر کا کافی علاقہ وجیانگر کے قبضہ میں دیا گیا۔ اور ادھر بیجاپور سے بھی اس کی حفظ و حمایت کے بدلہ میں کونڈاپلی کا پورا علاقہ ہتھیا لیا گیا۔"

اس طرح رام راج نے اپنا نام خوب روشن کیا اور ہندو دنیا میں وہ بہت ہی مقبول اور مشہور ہو گیا کیونکہ سرزمین دکن اور پورے جنوبی ہند میں رام راج سے زیادہ طاقتور اور سب سے زبردست حکمراں اور کوئی نہیں تھا اس کے زمانہ میں وجیانگر من حیث الکل

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص۲۱۰

عروج وارتقا کی انتہائی حد تک پہونچ گیا تھا۔ مال و دولت کی ریل پیل، زراعت اور پیداوار کی بھی افزائش، عوام کی خوشحالی اور کشائش ہر طرف امن و امان کی بحالی، دشمنوں کی بے بسی اور درماندگی نے اس کو بلند ترین درجہ پر پہونچا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس کا غرور و نخوت سے سرشار دماغ آسمان پر پرواز کر رہا تھا۔ سفراء اس کے دربار میں بیٹھ کر نہیں سکتے تھے بلکہ انھیں کھڑے رہنے کا حکم تھا اور ان سے تخاطب نفرت وحقارت اور متکبرانہ شان کے ساتھ کیا جاتا تھا اور اگر اس کے ساتھ کبھی سفر پیش آتا تو انھیں پیدل ہی چلنا پڑتا تھا۔ اس کا یہ برتاؤ سفیروں تک محدود نہیں تھا بلکہ مسلم سلاطین سے بھی اس کا یہی رویہ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی توہین و تذلیل کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

چنانچہ میسور گزیٹر کا مصنف لکھتا ہے :۔

" رام راج کا ۲۳ سالہ عہد اور اس کی جنگی پالیسی اور شاطرانہ چالوں نے اس کے نام کو جنوب میں اس قدر چمکا دیا کہ یقیناً اس وقت دریائے نربدا سے نیچے راس کماری تک سب سے زیادہ طاقتور حکمراں تھا۔ جس کے نام سے جنوبی ہند کانپتا تھا حقیقت یہ رام راج اس وقت جنوبی ہند کا ڈکٹیٹر تھا جس کے اشاروں پر اس کے ہمسایہ رقصاں رہتے تھے۔ اور یہ ان کی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس میں اس قدر نخوت پیدا ہوگئی تھی۔ ہر شخص جو اس کی امداد کا طالب ہوا وہ اس کو دیکھ کر اندرونی طور پر دشمنی کرتا تھا گو ذاتی طور پر ہر ایک اس سے مدد کا خواہاں تھا۔ لیکن اندرونی طور پر اس کی چیرہ دستیوں کو دیکھتے ہوئے وہ اس سے حسد کرتے تھے۔ اس رام راج نے بیجاپور، احمدنگر گولکنڈہ والوں کو ایک دوسرے کے خلاف مدد دی۔ بیدر اور برار والوں نے اس کے ہاتھوں سے شکست کھائی۔ اس لیے انھوں نے اتحاد کر لیا ان میں کوئی اس کا دوست باقی نہیں رہا۔ رام راج کی پالیسی وقت کی مناسبت سے تھی نہ کسی اصول پر، ضرورت کے مطابق اس نے ایک کے خلاف دوسرے کی مدد کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دوستی ان کے نزدیک قابل اعتماد نہ رہی اس لیے تفریق ڈال کر وہ ہمیشہ اپنا فائدہ ملحوظ رکھتا تھا[1]

رام راج کا سلوک مسلم سلاطین اور مسلمانوں کے ساتھ ناقابل برداشت حد تک پہونچ گیا۔ راعی کا اس کی رعایا تک سرایت کر گیا اور وہ بھی مسلم آزاری اور اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ روز نت نئے واقعات پیدا ہونے رہے۔ حالات بد سے بدتر ہونے لگے ظلم و ستم کوئی کب تک سہتا اور اس کی تاب کہاں سے لاتا مسلم سلاطین کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا ان کی آنکھوں سے غفلت

---

[1] کتاب میسور گزیٹر ص ۲۰۵۹/۲۰۶۰

وخود پسندی کے پردے ہٹنے لگے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ناگفتہ بہ حالات ان کی خانہ جنگیوں، باہمی رقابتوں سے خود ان کے ہاتھوں سے لائے ہوئے ہیں اور اگر یہی حالات قائم رہے تو وہ دن دور نہیں کہ آئندہ نہ وہ رہیں گے نہ ان کی سلطنتیں۔ جن حالات میں مسلمان اس وقت گھرے ہوئے تھے ان سے بجا طور پر انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب ان کی سلامتی باہمی اتحاد و یکجہتی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب بہ تقاضا وقت اپنے اعمال نامہ کا سیاہ ورق الٹ کر اتحاد و اخوت کا ایک نیا ورق کھول کر ایک نئے دور کا آغاز کرنے کے لیے متفق و مستعد ہو گئے۔ ان کے اختلافات محض سیاسی نہ تھے کچھ مذہبی بھی تھے کیوں کہ ان میں سنّی شیعہ کی مذہبی تفریق ایک وجہ نزاع بنی ہوئی تھی۔ لیکن وقت نے ان تمام اختلافات کو دور کرنے، پچھلی تمام تلخیوں اور ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائیوں اور رقابتوں کو بھول جانے اور اسلام کے نام پر ایک مرکز پر جمع ہونے اور ایک متحدہ محاذ قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ابتدا میں علی عادل شاہ اس اتحاد میں کسی قدر پس و پیش تھے کام لیتے رہے۔ کیونکہ اکثر کٹھن وقتوں میں رام راج کی امداد اس کو حاصل رہی تھی۔ اب اس اتحاد میں شریک ہونے سے نہ صرف ہمارے تعلقات پر اس کا گہرا اثر پڑے گا اور اس سے جو نتیجہ نکلے گا اس کو بھگتنے کے لیے ہم کو پوری طرح تیار رہنا پڑے گا۔ علی عادل ابھی تذبذب اور پس و پیش کی حالت میں تھا کہ اس دوران ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے اس کو اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کو کنڑی مخطوطات کے مصنف ولسن نے مستند حوالہ جات سے اپنی کتاب میں لکھا ہے:۔

"ایک دن بیجاپور کے سفیر نے رام راج کے دربار میں شکایت کی کہ محل کے ادنیٰ ملازموں کی خوراک کے لیے جو سور لائے جاتے ہیں وہ ہمیشہ اسی راستہ سے اور اسی وقت لائے جاتے ہیں جب سفیر دربار میں آتا ہے۔ اس شکایت کے جواب میں رام راج نے طنزاً کہا "تم تو مرغ کھاتے ہو جو سور کے نالے کے پاخانہ سے اناج چن کر کھاتا ہے"[1]

سفیر نے اس شکایت اور اس کے جواب سے علی عادل کو آگاہ کیا۔ اور اس کے لیے یہ مذہبی توہین ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس کے بعد کا حال فرشتہ کی زبانی سنیے"

"آخر کار علی عادل نے طے کر لیا کہ اس رام راج کی مغروری کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی طاقت ہمیشہ کے لیے کچل دیا جائے اس کی خاطر اس نے اپنے ہمسایہ مسلمان سلطنتوں سے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اپنے جنرل کشور خان کو نواب شاہ والی گولکنڈہ کے پاس بھیجا جو فوراً اتحاد پر راضی ہو گیا احمد نگر کا حسین نظام سولاپور کے مقابلہ کی وجہ سے علی عادل سے اتفاق نہ کر سکتا

---

[1] کنڑی مخطوطات مصنفہ ولسن ص $\frac{268}{289}$ بحوالہ جنوبی ہند۔

تھا۔ اس لیے ابراہیم قطب شاہ نے درمیان میں پڑ کر دونوں میں اتحاد کی تجویز پیش کی۔ اس کے لیے اس نے اپنے وزیر مصطفےٰ خاں کو نظام شاہ کے پاس بھیجا۔ مصطفےٰ خاں نے نہ صرف اتحاد کر لیا بلکہ دونوں خاندانوں احمد نگر اور بیجاپور میں شادی بھی کرا دیا۔ مصطفےٰ خاں نے نظام شاہ سے کہا جب مسلمانوں کی کل طاقت صرف ایک بہمنی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی تو اس وقت تک مسلمانوں اور ہندوؤں میں توازن قائم رہا۔ اور جب مسلمان تقسیم ہو گئے تو انھیں شکستیں اٹھانا پڑیں اس وقت مصلحت کا تقاضا ہے کہ تمام دیندار بادشاہ پھر متحد ہو کر آپس میں ایک دوسرے کے حد درجہ دوست بنے رہیں اور اسی صورت میں ایک عام دشمن کے مقابلہ میں ان کی حفاظت ہو سکتی ہے وجیانگر کے راجہ نے تمام کرناٹک کے راجاؤں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کیا ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ انھیں اسلامی ملکوں سے دور کریں اور اس طرح ان لوگوں کو جن کو خدا نے ہماری ضمانت میں دیا ہے بے دینوں کے ظلم و ستم سے بچائیں تاکہ ہماری مساجد و مقدس مقامات ان بے دینوں کی جائے رہائش نہ بنیں۔" (تاریخ فرشتہ)

رام راج کے گذشتہ جابرانہ سلوک و برتاؤ سے وہ ستم رسیدہ اور دل شکستہ تو پہلے ہی سے تھا اور اس وجہ سے اس سے ادر نفرت اور بیزاری اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اس کے ہاتھوں احمد نگر اور اس کے مقبوضات پر جس طرح ہولناک تباہی و بربادی آئی تھی وہ اس کو کبھی بھول نہ سکتا تھا چنانچہ حسین نظام شاہ نے نہ صرف اتحاد بین السلاطین سے اتفاق کیا بلکہ مصطفےٰ خاں کے مشورے کے مطابق باہمی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے طرفین کی شادیوں کے لیے بھی رضامند ہو گئے اور حسین نظام کی دختر چاند بی بی کا علی عادل شاہ سے اور دوسری طرف علی عادل کی ہمشیرہ فلاح بی بی کا حسین نظام شاہ کے بڑے فرزند کے ساتھ شادیوں کا رشتہ بحسن و خوبی قائم ہو گیا۔ اس شادی کی وجہ سے ان کے آپس کا ایک دیرینہ مابہ النزاع قضیہ اس طرح رفع ہو گیا کہ شولا پور کا قلعہ چاند بی بی کے جہیز میں علی عادل کو اور فلاح بی بی کے جہیز میں کلیان شہر نظام شاہ کو دے دیا گیا۔ مرہٹی تاریخی کتاب جس کا نام ہے " وجیانگر کی تباہی " اس کو ہم یہاں تاریخ جنوبی ہند سے نقل کرتے ہیں وہ لکھتا ہے:۔

" اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی۔ علی عادل اس اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کرتا رہا اس لیے کہ رام راج نے بہت سے موقعوں پر اس کی مدد کی تھی۔ آخر حسین نظام نے اس سے درخواست کی کہ " کم از کم اس کی فوجوں کو وہ اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے۔" علی عادل نے اس سے بھی انکار کیا لیکن دوسری طرف اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رام راج سے مدگل اور رائچور کی واپسی کا مطالبہ کیا جو رام راج نے علی عادل کے سفیر کو سر دربار ذلیل کر کے باہر

نکال دیا۔ یہ خبر جب علی عادل کو پہونچی تو اس نے اس اتحاد میں شرکت کرلی اور جنگ کی تیاری شروع کردی گئی "

جنوب کے مسلم سلاطین کے متحدہ محاذ کی طرف سے جنگ کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے بیجاپور ڈسٹرکٹ گزیٹر کا مصنف لکھتا ہے :۔

۱۔ احمد نگر میں رام راج کی ہندو فوج کا ظلم وستم اور اسلام کی توہین خاص کر ان مقامات میں جہاں جہاں ہندو فوج کا گزر ہوا۔

۲۔ مسلمانوں کی مذہبی اور دوسری عمارات اور ملک کی تباہی۔

۳۔ رام راج کا برتاؤ اسلامی سلاطین اور ان کے سفیروں کے ساتھ ان سے اس طرح برتاؤ کیا جاتا تھا کہ ان کو دربار میں بیٹھنے تک کی اجازت نہ تھی۔ ان سے نہایت حقارت، نفرت اور غرور سے خطاب کیا جاتا تھا جب کبھی یہ سفر میں ساتھ ہوتے تھے تو ان کو پیدل چلنے کا حکم تھا۔

۴۔ رام راج کے فوجی افسر اور سپاہیوں کا مسلمانوں کے ساتھ پر غرور اور ذلیل برتاؤ خصوصاً احمد نگر میں۔

۵۔ جب کبھی موقع ملتا تو مسلمان سلطنتوں کا ایک ایک حصہ غصب کر لیا جاتا تھا خصوصاً بیجاپور اور گولکنڈہ کے علاقے لیے[1]"

جنگ کے اسباب پر یہ نہایت مختصر اور محتاط تجزیہ ہے ان اسباب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم سلاطین متحد ہوگئے۔ اور جنگ کے لیے پورے طور پر مستعد۔ اب کچھ باتیں مورخ ہیگ کی زبانی سن لیجئے وہ لکھتا ہے :۔

"اس اتفاق کے بعد علی عادل والی بیجاپور نے رام راج سے دوآبہ رائچور اور ضلع سیپ گرمی کا مطالبہ کیا جس پر رام راج نے قبضہ کر لیا تھا۔ رام راج نے بیجاپور کے سفیر کو سر دربار ذلیل کر کے شہر سے باہر کر دیا۔ یہ خبر جب اسلامی پایہ تختوں کو پہونچی تو حسین نظام شاہ والی احمد نگر، ابراہیم قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید شاہ والی بیدر اپنی اپنی فوج کو لے کر علی عادل شاہ سے آکر مل گئے۔ اور مسلمانوں کی یہ متحدہ فوج ۲۵ دسمبر ۱۵۶۴ء میں عین کرسمس کے دن بیجاپور سے نکلی اور تالیکوٹہ پر جو دریائے کرشنا سے ۲۵ میل شمال میں ہے مقام کیا۔ اس کی اطلاع ملنے پر رام راج نے اپنے بھائی ترملا کو مدافعت کے لیے روانہ کیا"

---

[1] میسور ڈسٹرکٹ گزیٹر ص ۲۰۷ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند۔

ترملا کتنی طاقت کے ساتھ گیا تھا اس کی تفصیل میں فرشتہ لکھتا ہے :۔
"ترملا کے ماتحت بیس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیدل سپاہی اور پانچ سو ہاتھی تھے"
اس کے بعد رام راج نے اپنے بھائی ونکٹا کو ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ بھیجا اس پر وہ بیٹھا نہیں رہا۔ بلکہ بچی کھچی ساری طاقت اور پوری فوج کے ساتھ وہ خود بھی میدان جنگ کی طرف کوچ کیا۔ اس سلسلہ میں فرشتہ لکھتا ہے :۔
"ہندؤں کی کل فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار، تین لاکھ پیادے، دو ہزار ہاتھی اور پانچ سو توپیں تھیں اور مسلمانوں کے پاس ان سے نصف فوج بھی نہیں تھی۔"
اس کے مقابلہ میں پرتگالی مورخ لکھتا ہے :۔
"ہندؤں کے پاس اس وقت نو ہزار پیدل سپاہی اور ستر ہزار سوار فوج تھی مسلمانوں کے پاس پچاس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے۔"
جنگی طاقت کے بارے میں ہند مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد ہندؤں سے نصف بھی نہیں تھی۔"
ہندؤں کے جنگی کیمپ کا نقشہ "وجیا نگر کی تباہی" کا مصنف اس طرح کھینچتا ہے :۔
"ہندؤں کی فوج کا کیمپ اتنا بڑا تھا کہ وجیانگر میں جب ہندو نے پاس گھوڑا تھا وہ فوج میں داخل کر دیا گیا معلوم ہوتا تھا کہ یہ فوجی کیمپ نہیں ہے بلکہ ایک نہایت آباد اور وسیع شہر ہے جس میں ہر جگہ ناچ ورنگ ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی دلچسپی کے لیے زبان یا بازاری کے طائفے بھی ہمراہ تھے۔ شراب کی دوکانیں ہر جگہ کھلی ہوئی تھیں، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خزانہ اناج سب کچھ کیمپ میں موجود تھے۔ رام راج پایہ تخت سے نکلنے سے پہلے اپنی رانیوں اور ماں کے پاس گیا ماں نے نصیحت کی مسلمانوں سے صلح کر لی جائے لیکن رام راج نہیں مانا۔"
ہندؤں نے اپنی کتنی بڑی طاقت میدان جنگ میں جھونک دی تھی اس کی تفصیل مورخ ہیگ سے بھی سن لیجے، وہ لکھتا ہے :۔
"رام راج نے پہلے اپنے چھوٹے بھائی تماکے ماتحت بیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی اور دس ہزار پیادہ فوج بھیجی کہ مسلمانوں کو دریائے کرشنا عبور کرنے سے باز رکھے۔ تماکے بعد وینکٹ درائے کو ایک اور زبردست فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کے بعد آپ خود میدان جنگ کو روانہ ہوا۔ کل فوج کی تعداد جو ہندؤں نے میدان جنگ میں لائی ایک لاکھ سوار تین لاکھ پیادے اور ایک ہزار توپیں تھیں"۔ [1]

---

[1] سیٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن ص ۱۲۹

تالی کوٹہ کا ہنگامۂ کارزار

مسلمان جب تالی کوٹہ سے نکل کر دریائے کرشنا کے شمالی ساحل پر پہونچے تو انھیں پتہ چلا کہ ہندو فوج جنوبی کنارے کے اہم جگہوں پر مضبوط دیوار بنا کر اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ مسلمان کسی طرح دریا عبور نہ کر سکیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل ہیگ کی زبانی سنئے وہ اپنی کتاب لینڈمارکس آف دی دکن میں لکھتا ہے:[1]

"مسلمانوں نے سراغ رسانوں کو بھیجا کہ دریا سے پار اترنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کریں لیکن انھوں نے تمام راستے دیکھنے کے بعد یہی رائے دی کہ دریا کو عبور کرنے کے لیے یہی راستہ موزوں ہے جو ہمارے آگے ہے۔ اور یہیں سے توپیں وغیرہ لے جا سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے ایک جنگی چال چلی۔ انھوں نے یہ مشہور کر دیا کہ شمال میں ایک اور راستہ دریافت ہوا ہے جہاں سے فوج دریا کے پار اتر سکتی ہے اور سچ مچ ان کی فوج یہاں سے شمال کی جانب بڑھی لیکن انھوں نے یہ ہوشیاری کی کہ بیس ہزار سوار فوج کو ایک کمین گاہ میں چھپا دیا۔ مسلمانوں کو شمال کی طرف بڑھتے دیکھ کر ہندو فوج بھی جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی اور انھوں نے یہ غلطی کی کہ اس جگہ پر جہاں پہلے کیمپ تھا کوئی فوج نہیں چھوڑی۔ ہندو کو اس طرح مغالطہ میں ڈال کر اسلامی فوج تین دن تک آگے بڑھتی رہی اور یکایک ایک شب میں کامل اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس جگہ واپس آ گئی جہاں سے چلی تھی۔ اسلامی فوج نے تین دن کا راستہ ایک ہی دن میں طے کر لیا۔ وہ اس جگہ پر شام کو پہنچی اور سر مغرب ان کے ہراول دستہ نے جو کمین گاہ میں چھپا ہوا تھا دریا کو عبور کر کے جنوبی ساحل پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے روز یعنی ۲۴ جنوری ۱۵۶۵ء کو مسلمانوں کی تمام فوج دریا کے پار اتر گئی۔ سب سے پہلے نظام شاہ نے دریا کو عبور کیا تھا۔"

جنگ کے مقام کے بارے میں مورخین کی رائیں مختلف ہیں۔ مرہٹی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنگ اکساس نامی ایک موضع کے میدان میں ہوئی تھی اس کے برخلاف دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ یہ جنگ موضع بیاپور یا بجاگاپور کے متصل اس کے ایک میدان میں ہوئی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو تالی کوٹہ کی جنگ کے نام سے شہرت عام کیوں دی گئی۔ جو موضع جنگ سے ۲۵ میل دور فاصلہ پر واقع تھا؟ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلمانوں کی فوج شروع میں یہاں آ کر ٹھہر گئی تھی۔ اس نسبت سے اس کا نام تالیکوٹہ کی جنگ سے مشہور ہو گیا ہو۔ اس کے علاوہ

---

[1] ہسٹورک لینڈ مارکس آف دی دکن ص ۱۳۰ ترجمہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۱۹

بھی ہو سکتا ہے جس سے بعض مورخین نے بھی اتفاق کیا ہے اور اس کو اس طرح تطبیق دینے کی کوشش کی ہے چونکہ جنگ کا موضع تالیکوٹہ کے مواضعات میں داخل تھا اس لیے اس کا نام تالی کوٹہ کی جنگ پڑ گیا۔

جب مسلم فوج دریائے کرشنا پار ہو کر ایک کھلے میدان میں خیمہ زن ہو گئی تو ہندو فوج کو محسوس ہوا کہ وہ ایک جنگی چال کے مغالطہ میں آ گئے تھے اور وہ فوراً اپنی پہلی جگہ پر واپس آ گئے اور مقابلہ کے لیے صف بستہ ہو گئے۔

"تاریخ جنوبی ہند کے بیان کے مطابق مسلمانوں نے جنگ سے بیشتر اتمام حجت کے لیے رام راج سے کہلا بھیجا کہ صلح کر لی جائے۔ لیکن رام راج نے اس درخواست کو مسلمانوں کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے نہایت نخوت سے سفیروں کو واپس بھیج دیا"

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے میسور گزیٹیر کا مصنف اس جنگ کا تجزیہ جس انداز میں کیا ہے اس کو اسی کے قلم سے آپ کے سامنے پیش کیا جائے وہ لکھتا ہے:۔

"رام راج ایک نہایت دوربین سیاستداں تھا اس کو اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز تھی۔ وہ کبھی کئی بار دوست اور دشمن بنا۔ وہ جانتا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ اپنی تمام شمالی سرحدوں کو ہمیشہ مستحکم کرتا رہا لیکن یہی شخص جو ہمیشہ دشمنوں کی کمزوری پر نظر رکھ کر فائدہ اٹھاتا رہا اور ہمیشہ ان کو ایک دوسرے سے لڑاتا رہا اور ایک دوسرے میں حسد و رقابت بڑھایا کرتا تھا ایک لمحہ کے لیے اپنی قدیم پالیسی بھول گیا اور ایک ایسی جنگ میں مبتلا ہوا جس سے وہ واپس نہ پھرا"[1]

نماز صبح کے بعد مسلمان مقابلہ کے لیے اپنی فوجی ترتیب شروع کی۔ میمنہ پر علی عادل، میسرہ پر ابراہیم قطب شاہ اور علی برید شاہ اور قلب میں حسین نظام شاہ تھا۔ اس کے بالمقابل ہندو فوج میں میمنہ پر تِرّاج، میسرہ پر وینکٹ اور قلب میں خود رام تھا۔ جنگ سے پہلے رام راج سے اس کے خاص امیروں اور فوجی افسروں نے کہا آپ اپنی پالکی چھوڑ دیجیا اور گھوڑے پر سوار ہو جائیں اس کے جواب میں اس نے کہا یہ تو جنگ نہیں بچوں کا کھیل ہے مسلمان ہمارے پہلے ہی حملہ کی تاب نہ لا کر بھاگ جائیں گے"

مسلمان فوج خراماں خراماں آگے بڑھنے لگی۔ مسلم فوج کو ان کے افسروں کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ سب سے پہلے ہاتھیوں کو نشانہ بنائیں چنانچہ اسلامی فوج کے تیر اندازوں

---

[1] کتاب میسور گزیٹیر ص ۲۰۶۸ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۲۱

اور شمشیر زنوں نے تاک تاک کر ہاتھیوں کو ہدف بنایا جس کی بوچھار سے ہاتھی زخمی ہو ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے جس سے ہندو فوج کی صفوں کا نظم ٹوٹ گیا اور وہ منتشر ہونے لگی یہ رنگ دیکھ کر رام راج اپنی پالکی سے اتر کر شامیانے میں بچھے ہوئے ایک زریں آراستہ تخت پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے دائیں بائیں اور سامنے سونے، چاندی اور جواہرات کے انبار لگا دیئے اور اعلان کر دیا کہ جو کوئی اس جنگ میں اپنی نمایاں کارگزاری پیش کرے گا اس کو بھاری انعام سے مالا مال کیا جائے گا۔ رام راج کے اس اعلان نے جہاں ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا وہاں ان کے اکھڑے ہوئے قدم کو پھر سے جما دیا لیکن ادھر اس انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم سواروں نے آگے بڑھ کر مقابل فوج پر ایک زوردار حملہ کیا مسلم فوج اب بہت قریب پہونچ گئی تھی۔ توقع کی نزاکت دیکھ کر رام راج تخت چھوڑ کر پالکی میں بیٹھ گیا۔ مسلمانوں کے ایک ہاتھی نے پالکی پر حملہ کر دیا۔ اور پالکی بردار مارے خوف کے فرار ہو گئے۔ ہاتھی سوار اس گراں قدر پالکی کے طمع میں اس کو اٹھانے کے لیے جھکا تو رام راج کا ایک محافظ برہمن چلایا اور کہا "یہ پالکی میں رام راج مہاراج ہیں" اگر ان کو بچا لیا جائے تو اس مسلمان کو دولت وجاگیر کا ایک بڑا افسر بنایا جائے گا۔" فیل بان کو جب معلوم ہوا کہ اس کے قبضہ میں اس وقت کتنی بڑی بھاری شخصیت آرہی ہے تو اس نے ہاتھی کو اشارہ دیا اور ہاتھی رام راج کو سونڈ میں اٹھا کر مہاوت کے حوالے کر دیا اور اس نے اس کو معًا احمد نگر کے سردار رومی خاں کے پاس پہونچا دیا اور اس نے حسین نظام شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حسین نظام شاہ نے اس کو قتل کر کے اس کے سر کو نیزہ پر چڑھا کر فوج میں گشت کرایا۔ ہندو فوج کے دلوں پر اپنے راجہ کے سر کو دیکھ کر ایک ہیبت سی بیٹھ گئی۔ ان میں انتشار کی پیدا ہو گئی۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور اس شدت کے ساتھ کیا کہ بہتوں کو بچ کر نکلنے نہیں دیا۔"

مورخین کے بیان کے مطابق میدان جنگ میں مارے جانے والوں کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ تک پہونچ گئی تھی۔"

اب ہم مسٹر رکز بیٹر سے اس جنگ کا کچھ تفصیلی تذکرہ پیش کرتے ہیں جس کا ہندو مصنف اپنی قومی حمایت اور شان ہندویت کو برقرار رکھتے ہوئے لکھا ہے:-

" ۱۵ر جنوری ۱۵۶۵ء کے دن دوپہر کو ہندوؤں نے جنگ شروع کی وینکٹ راے نے بحیثیت کماندار اعلیٰ اپنی فوج سے علی عادل کی فوج پر حملہ کیا۔ وینکٹ راے کے ماتحت ۲۰ لاکھ پیادے ۲۵ ہزار سوار ... ۵ ہاتھی تھے۔ گولہ باری سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا اور وہ بظاہر پیچھے ہٹ گئے۔ جلد ہی عام لڑائی شروع ہو گئی۔ ترلانے جس کی کمان میں دایاں بازو تھا گولکنڈہ اور بیدر کے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ وہ اور اس کے بیٹے رگھوناتھ نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا۔ گولکنڈہ

اور بیدر والے سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ لیکن جنگ میں رگھوناتھ مارا گیا اور رتن ملا کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی۔ رام راج کو جب یہ خبر پہنچی تو اس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی اس نے پالکی چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو کر گروڑا، گروڑا کا نعرہ لگایا اور اتحادی فوج پر حملہ کیا۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کی فوج اس حملہ کی تاب نہ لا سکی۔ اس کے بعد اس نے احمد نگر کی فوج پر جو قلب میں متعین تھی دس ہزار سواروں سے حملہ کیا۔ یہ حملہ اس بے جگری سے ہوا کہ احمد نگر کی فوج تقریباً آدھے کوس تک پیچھے ہٹ گئی۔ رام راج کا باڈی گارڈ رام راج کے اس حملہ کو دیکھ کر گھوڑے سے اتر کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا اور کئی مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس عرصہ میں علی عادل نے جو پیچھے ہٹ گیا تھا عقب سے حملہ کیا اور نظام شاہ نے اپنی فوج کے ساتھ لڑائی اس وقت میدان جنگ کے قلب میں ہو رہی تھی۔ اس وقت رومی خاں نے توپوں سے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس کا اثر ایسا مہلک پڑا کہ ہندوں کی فوج کا سیلاب جو آگے بڑھ رہا تھا سخت نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا شروع ہوا عین اس موقع پر حسین نظام نے اپنی فوجوں کو لے کر حملہ کیا اور آپ خود فوج کے آگے اپنا شامیانہ نصب کیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ سلطان فتح یا موت چاہتا ہے۔ رام راج یہ دیکھ کر گھوڑے سے اتر کر تخت پر بیٹھا اور اپنے سامنے تخت پر ہیرے، جواہر اور سونے کے ڈھیر لگائے اور اعلان کیا کہ جو شخص بہادری دکھائے گا انعام پائے گا۔ یہ اعلان سن کر ہندو فوج پھر آگے بڑھی۔ رومی خاں نے اس وقت کی سب سے بڑی توپ "مالک میدان" میں تانبے کے سکے بھر کر چلائی ایک ہی وقت میں پانچ ہزار ہندو گرے، ہندو فوج فرار ہونے لگی۔ ان میں ابتری پھیل گئی۔ جنرل کشور خاں بیجاپور نے اسی وقت حملہ کیا جس سے ہندو فوج کا قلب کامل طور پر منتشر ہو گیا۔ ایسے وقت میں رام راج کی فوج میں جو دو مسلمان جنرل تھے وہ رام راج کا ساتھ چھوڑ کر مسلمانوں سے آملے۔ اس سے ہندو لشکر کے دل اور بھی چھوٹ گئے ہندو جنرل اپنی فوج کو سنبھالنا چاہتے تھے لیکن وہ نہیں سنبھل سکی۔[1]

میسور گزیٹیر کا مصنف دوسری قومی روایات کو یکسر نظر انداز کر کے دو مسلمان جنرلوں کی عین وقت پر غداری کے جس فسانہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عمداً مسلمانوں کی فتح کا سہرا ان دو جنرلوں کے سر تھوپنے کی کوشش میں اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے چنانچہ آگے لکھتا ہے کہ:۔

"دو مسلمان جنرل رام راج کا ساتھ چھوڑ کر دشمن سے مل گئے۔ یہ غداری بقول ریڈہر صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ جنگ کی قسمت یکایک کیوں پلٹ کر رہ گئی۔ اس نے یہ روایت بیرنز فریڈرک

---

[1] میسور گزیٹیر ص ۲۰۶۹ ترجمہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۲۴

سے لی ہے جس نے اس جنگ کے ایک سال بعد جب وہ وجیا نگر آیا ہوا تھا اسنی تھی۔"

حیرت کا مقام ہے کہ میسور گزیٹر کا مصنف سر فریڈرک کی ایک سال بعد وجیا نگر پہونچ کر سنی سنائی روایت کو تو تسلیم کرتا ہے اور نہیں تسلیم کرتا ہے تو دیگر مورخین خصوصاً اسلامی مورخین کی روایات کو۔ حالانکہ فرشتہ اس زمانہ میں بیجاپور میں موجود تھا اور عجب نہیں کہ وہ میدان جنگ بھی پہونچ گیا ہو اور اس جنگ سے متعلق اس کا بیان ذاتی مشاہدات پر مبنی ہو اس کے بارے میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس کی (فرشتہ کے مصنف کی) دیانت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے آقا علی عادل کی بھی رعایت نہیں کرتا۔ اس جنگ کی فتح کا سہرا اس نے حسین نظام شاہ کے سر باندھا اگرچہ یہ اس کے لیے آسان تھا کہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے حسین نظام شاہ کے نام کو نظر انداز کر دے۔"

سر فریڈرک کی اس سنی سنائی روایت کو نقل کرنے اور اس پر زور دینے سے بھی معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں اپنے جنگ کے تین سو بہتر سال بعد فتح کا سہرا بزور قلم مسلمانوں سے چھین لیا جائے۔[1]

اس بے حقیقت روایت کو نقل کرنے سے پہلے میسور گزیٹر کو دیکھنا چاہیے تھا کہ کرشنا دیو رایا کے بعد کسی مسلمان کو کسی بڑے عہدے پر تو کجا کسی چھوٹی سی ملازمت پر بھی مسلمانوں کو رکھا گیا تھا۔ اور یہ کہ رام راج زندگی بھر مسلمانوں کے ساتھ جس سیاسی فریب اور چالبازی سے کام لیتا رہا تھا اس کی موجودگی میں اس سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی فوج کے اعلیٰ اور اہم عہدوں پر بھی مسلمانوں پر اعتماد کرے گا۔ کرشنا دیو رایا نے اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کو وجیا نگر کی سلطنت کے حدود سے خارج کر دیا تھا اس کے بعد مسلمانوں کا وہاں دوبارہ پایا جانا کسی بھی تاریخ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایک ایسی بات میسور گزیٹر کا زور قلم صرف کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی فتح یابی کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے ایک کمزور روایت کا سہارا لے کر اپنی قوم پرستی کے جذبہ کو تسکین دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ جبکہ گزیٹر نے ان دو مسلمان جنرلوں میں سے ایک کا نام عین الملک لکھا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو اپنی قومی عصبیت کی وکالت کرتے وقت یہ تک یاد نہ رہا کہ عین الملک کے بارے میں وہ خود اپنی کتاب کے گزشتہ صفحات میں لکھ آیا ہے کہ "وہ عین الملک جو گول کنڈہ کا ایک سردار تھا اس جنگ سے تیس سال بیشتر ہو چکی تھی۔" اور وہ بھی وجیا نگر کی ملازمت میں نہیں تھا۔ کیا اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ مصنف مذکور کو تعصب کے اندھیرے میں اصل حقیقت گم ہو گئی اور اندھیرے میں جو تیر چلایا گیا وہ بھی نشانہ پر نہیں پہونچا۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۲۶

جہاں تک تاریخی روایات کا تعلق ہے اس قدر زبردست قوت اور کثرت فوج کے باوجود وجیانگر کی شکست کی اسباب میں سے یہ دو اسباب نمایاں تھے۔ ایک "مالک میدان" توپ کی اندھا دھند گولہ باری، دوسرا رام راج کا قتل اور اس کا سر نیزے پر چڑھا کر فوج میں گشت کرانا واقعہ یہ ہے کہ ہندو فوج نے جب اپنے راجہ کا سر دیکھا تو ان میں خوف و دہشت طاری ہوگئی اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی اور ان کی رہی سہی طاقت جواب دے گئی۔ ساتھ ہی رام راج کے بھائی وینکٹ رائے اور ترملا آگے بڑھ کر فوج کو سنبھالنے اور ہمت سے اپنے حریف فوج سے مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کی۔ ترملا اس جنگ میں اپنی ایک آنکھ کھو چکا تھا اور وینکٹ رائے بہت مجروح۔ ہو سکتا ہے کہ فرار ہی میں اپنی عافیت سمجھی ہو۔ اگر وہ ہمت نہ ہارتے وجیانگر میں قلعہ بند ہو کر یا اس کے اطراف کی پہاڑیوں سے مدافعانہ جنگ لڑ سکتے تھے لیکن ایسا کرنے کے بجائے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان دو کمانڈروں کے غائب ہو جانے سے فوج میں بدنظمی اور ابتری کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا جب کہ وہ اپنی آنکھوں سے بے پناہ لاشوں کے پشتے دیکھ رہے تھے۔ میدان جنگ خون انسانی سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ ایک ایسے قتل عام میں فوج کا ٹھہرنا جب کہ اس کا نظم ٹوٹ چکا ہو، اس پر خوف و ہراس طاری ہو چکا ہو، اس میں افراتفری اور اداسی پھیل گئی ہو جس کے دو جنرل وینکٹ رائے اور ترملا فرار ہو گئے ہوں کیوں کر ممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج اپنی جانیں بچانے کے لیے فرار ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اس جنگ میں کتنی جانیں کام آئیں ان کی تعداد مورخین کے بیان کے مطابق ملاحظہ فرمائیے۔ بیگ اپنی کتاب میں لکھتا ہے[1]

"ہندوؤں نے شکست کھا کر میدان چھوڑ دیا۔ فاتحین قتل عام کرتے ہوئے ان کا تعاقب کیا۔ مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔"

لیکن میسور گزیٹر لکھتا ہے کہ:۔

"میدان جنگ میں ہندو مقتولین کی تعداد کل نو ہزار تھی۔" حالانکہ یہی مصنف اپنی کتاب میں دوسری جگہ پر یہ اقرار کرتا ہے کہ:۔

"رومی خان نے "مالک میدان" توپ کو چلایا تو پانچ ہزار ہندو مارے گئے۔"[2]

اس کا یہ مطلب ہوا کہ اس ہولناک ہنگامۂ کارزار میں صرف چار ہزار ہندو کھپ رہے تھے۔ لاکھوں کی تعداد رکھنے والی فوج میں کل ملا کر صرف نو ہزار کا قتل ہو جانا کوئی بہت بڑا نقصان تو نہیں تھا۔ کہ اس پر فوج میں بھگدڑ مچ جاتی اور اس کے جرنیل وینکٹ رائے اور ترملا میدان چھوڑ

---

[1] بیگ ص۱۳۱ [2] گزیٹر ص۲۰۷

کر غائب ہو جاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جانی نقصان بہت زیادہ ہوا تھا اور مخالف متحدہ فوج کے پے در پے حملوں نے حالات کو بالکل ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ میسور گزیٹیر نے مہربان تاریخ کا حوالہ دے کر جہاں ہندو فوج کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کی کوشش کی ہے وہاں اس کے پس منظر میں ہندو فوج کی کمزوری اور پست ہمتی اور عریاں صورت میں زیادہ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اتنی بڑی کثیر التعداد ساز و سامان سے لیس فوج محض نو ہزار کے قتل ہو جانے سے ہمت ہار گئی اور اس سے عیب ناک حد تک کمزوری ان جنرلوں کی ثابت ہوتی ہے جو نو ہزار مقتولین کے معمولی نقصان سے فرار ہو گئے۔ آگے یہی گزیٹیر لکھتا ہے کہ:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ کی صورت حال دیکھتے ہی ترملا پایہ تخت کو چلا گیا۔ وینکٹ رائے بھاگ گیا۔ ان کی اس فراری کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وینکٹ رائے چندرگیری کے قلعہ کو چلا گیا اور وہاں سے ترپتی کو۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے جدا ہونے سے پیشتر آئندہ کی کارروائی کے متعلق سمجھوتہ کر لیا تھا۔"[1]

اس کے بعد یہی مصنف آگے لکھتا ہے:۔

"اس سمجھوتہ کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے انھوں نے اس سمجھوتہ پر عمل بھی کیا۔ وینکٹ رائے اپنے تعاقب کرنے والوں سے بچتے ہوئے چندرگیری اور وہاں سے ترپتی پہونچا کہ بادشاہ کا استقبال کرے۔ ترملا پایہ تخت پہونچ کر خزانہ اور بادشاہ کو منتقل کرنے کا انتظام کیا۔"[2]

ترملا کے بارے میں رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے "وجیانگر پہونچ کر ترملا نے جو کچھ زر و جواہر اور خزانہ لے جا سکا لے کر جنوب کی جانب پیلگنڈہ چلا گیا۔"

رام رچیو اپنی ہندو تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں نے وینکٹ رائے کو بھی گرفتار کرانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔"

ریورنڈ ہراس لکھتا ہے:۔

"جنگ کا نقشہ بدلتے ہی ترملا اور وینکٹ رائے فرار ہو گئے۔"[3]

ان سے کیا معلوم ہوتا ہے یہی نا کہ وینکٹ اور ترملا میدان جنگ سے فرار ہو گئے تھے اب رہی میسور گزیٹیر کی یہ بات کہ جنگ کی یہ حالت دیکھ کر انھوں نے آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیا اور فرار ہو گئے اور بعد میں اس پر عمل بھی کیا۔ اس بارے میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"بالکل غلط ہے واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ ترملا اور وینکٹ رائے کا فرار کسی سمجھوتہ کے تحت

---

[1] میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۶ [2] میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۹ [3] بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۲

نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے الگ الگ راہ فرار اختیار کی۔ وینکٹ رائے جو فرار ہوا تو سیدھا چندر گیری پہونچا۔ ممکن ہے کہ بعد میں ترتی (؟) بھی پہونچا ہو۔ لیکن ترملا فرار ہو کر سیدھا وجیانگر پہونچا اور وہاں سے جو کچھ مل سکا لے لیا۔ اور ساتھ ہی راجہ سیورایا کو جو ۲۳ سال سے قید میں تھا لے کر پلگنڈہ چلا گیا اگر ترملا اور وینکٹ رائے میں کوئی سمجھوتہ ہوا ہوتا تو ترملا بھی چندر گیری جاتا اس کے عوض پل گنڈہ پہونچتا ہے[۱]۔

میبور گزیٹر کی تردید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو فرشتہ نے لکھا ہے:۔

"وینکٹ رائے نے چندر گیری پہونچ کر سلاطین اسلام سے صلح کی درخواست کی تھی۔ بہر حال اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وینکٹ رائے اور ترملا فرار ہوئے اور انھیں فرار ہوتے دیکھ کر ان کے ساتھ ان کی فوج کے جوان بھی بھاگنے لگے۔ مسلمانوں نے کچھ دور تک ان کا تعاقب کیا اور اس لیے پلٹ آئے کہ انھیں یہاں مال غنیمت بٹورنا تھا"

اس کے بعد کیا ہوا اس کی کچھ تفصیل فرشتہ کے قلم حقیقت رقم سے سن لیجئے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بہادران اسلام نے کفار کے لشکر ہزیمت خوردہ کا پیچھا کیا اور تیغ ایمانی سے اس قدر مشرکین کی سر افشانی کی کہ ان تیرہ بختوں کے خون سے زمین نے لعل رمانی کا رنگ قبول کیا اور بروایت مشہور عدد کشتوں کے تین لاکھ پہنچ گئے تھے اور بقول صحیح لاکھ کافر کے قریب اصل معرکہ اور تعاقب کے تہ تیغ ہو کر قتل ہوئے۔ چنانچہ مقام جنگ سے اناگنڈی تک جو دس کوس بیجانگر سے ہے جا بجا لاشیں پڑی تھیں۔ دامن صحرا کفار کی لاشوں سے بھرا پڑا تھا۔ مال وافر اور خزانہ بے شمار، زر وجواہر، تیغیں، ڈھالیں اور کمانیں دمشقی اور نیزہ خطی اور اسپ و اشتر اور خیمہ و خرگاہ اور کنیز و غلام اس قدر غنیمت عساکر نصرت مآثر کے ہاتھ آئے کہ بحر و کان کی مانند مستغنی اور بے نیاز ہوئے اور سلاطین دین پناہ اسلام سے فرمان واجب الاذعان صادر ہوئے کہ فیل کے سوا جو شئے جس کے ہاتھ آئی وہ اس کا مالک و مختار رہے۔"

برہان مآثر کا مصنف لکھتا ہے:۔

"رام راج کی تمام دولت فاتحین کے ہاتھ لگی۔ بے حساب کنیز و غلام کے علاوہ ہاتھی اور اونٹ خیمہ و خرگاہ اور زر و جواہر اس قدر ہاتھ لگے کہ تمام مسلمان مالا مال ہو گئے۔"

اس قیامت صغریٰ کے بعد وجیانگر کا انجام:۔ ادھر میدان جنگ میں

---

[۱] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۳۰

ہولناک حشر برپا تھا اور ادھر باشندگان بیجانگر جنگ کے حالات سے غافل اور اپنے انجام سے بے خبر، اپنے عیش و تنعم میں سرشار، رقص و سرود کی رنگ رلیوں میں گرفتار تھے۔ انھیں اس بات کا وہم و گمان تک نہیں تھا کہ اس جیسی زبردست طاقت ور فوج کبھی شکست سے بھی دوچار ہو سکتی ہے۔ خلاف توقع انھوں نے دیکھا جنگی میدان سے فرار ہو کر آنے والوں کا ایک تانتا سا لگ گیا ہے تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ساری آبادی میں ہوش ربا اضطراب اور سنسنی خیز حالت پھیل گئی۔ سارے شہر میں ایک کہرام مچ گیا۔ رقص و سرود کی مجلسیں نالۂ آہ و فغاں میں بدل گئی۔ ساری فضا گریہ و ماتم کی چیخ و پکار سے گونجنے لگی۔ ریونڈ ہیراس لکھتا ہے:۔

"ترملائے جاتے ہوئے شہر میں کوئی فوج نہیں چھوڑی تھی"

اس کے خلاف میسور گزیٹر لکھتا ہے:۔

"یہ صحیح نہیں ہے کہ ترملائے شہر میں کوئی فوج نہیں چھوڑی تھی۔ فوج تھی لیکن اس پر اس قدر خوف و ہراس طاری تھا کہ وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے دیہاتیوں نے جنھیں بیڈر کہا جاتا ہے حملہ شروع کر دیا اور جو کچھ امراء کے مکانات میں مال و خزانہ مل سکا لوٹ کر لے گئے ان کی اس لوٹ سے عام دکاندار اور شہری نہ بچ سکے"[1]

فرشتہ لکھتا ہے:۔

"بیراگیوں نے شہر کو لوٹنا شروع کیا" سیول لکھتا ہے:۔ "بیڈروں نے شہر پر چھ دفعہ حملہ کیا تھا"

مولوی بشیر الدین دہلوی نے بیجانگر کی تاریخ پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

"یہ جنگ کاہے کو تھی بلکہ ایک طوفان عظیم کی روانی تھی جو اس کے سامنے آگیا اس کو بہا لے گئی۔ سب امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ شہر کے باشندے جو لاکھوں میں تھے بے یار و مددگار رہ گئے سوائے چند کے ان بیچاروں کو بھاگنے کا موقع بھی نہ ملا کیونکہ بار برداری کے تمام بیل گاڑیاں سب کی سب فوج کے ساتھ چلی گئی تھیں جو اب تک واپس نہیں آئی تھیں ایسی حالت میں سوائے اس کے بن نہیں پڑی کہ خزانوں کو گاڑ دیا، بوڑھے، عورتوں، اور بچوں کے سوائے نوجوانوں نے ہتھیار سنبھال لیے اور آنے والی مصیبت کے منتظر ہو گئے۔ دوسرے دن بیجانگر کے اطراف کی جنگلی اقوام اور بیڈروں نے آکر شہر کو لوٹنا شروع کیا۔ بنجاروں (خانہ بدوش اقوام) لمباڑوں کروڑوں اور اسی قسم کے لٹیروں کے گروہ کے گروہ بدنصیب باشندگان شہر پر آن

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۳۳ [2] میسور گزیٹر ص ۲۰۷۹

پڑے اور مال واسباب، دکانوں، بازاروں کو لوٹ کھسوٹ کر ساری دولت لے گئے۔[1]

مسلمان ہفتہ بھر آرام لینے اور زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد وجیانگر کی طرف روانہ ہوئے اس بد قسمت شہر میں اسلامی لشکر کے داخل ہونے سے روکنے ٹوکنے والا تو تھا ہی نہیں۔ یہ فوج ظفر موج بہ آسانی وجیانگر پہونچ کر لوٹ کھسوٹ میں لگ گئی۔ بیجانگر کے شہری جاتے ہوئے اپنا مال واسباب زمین میں دفنا کر اور کنوؤں میں چھپا کر گئے تھے، اس لیے انھوں نے ان کے مکانات کھودنا اور جلانا شروع کیا۔ ۲۰ ہفتوں سے زیادہ انھیں زمین میں پوشیدہ مال کے برآمد کرنے میں لگ گئے۔ اس اثنا میں ایک روز سیر کرتے ہوئے نظام شاہ ایک ایسی جگہ پہونچے جہاں فوجی تقسیم مال کے سلسلے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اس جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ مروارید وجواہر سے بھرا ہوا ایک طبق علی عادل کی فوج کے ہاتھ آیا تھا۔ نظام شاہی فوج چاہتی تھی کہ اس میں انھیں بھی اس کا حصہ ملے۔ اس پر تکرار بڑھتے بڑھتے نوبت کشت و خون تک پہونچ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر نظام شاہ نے کہا آپس میں لڑنے جھگڑنے سے کیا فائدہ؟ بہتر یہ ہے کہ شہر کو جلا دو تا کہ قضیہ اور فساد موقوف ہو۔ چنانچہ حسب فرمان شاہی نہ صرف پورے شہر کو نذر آتش کیا گیا بلکہ اس کے ملحقہ تمام قصبات ۲۰ کوس تک جلا کر خاکستر بنا دیا گیا۔ اس کی عالیشان عمارتیں اور بڑے چھوٹے سب مقامات راکھ ہو کر رہ گئے۔ فاتح فوج نے ایک وہ اندھیر اور ادھم مچایا کہ جو کچھ ہاتھ آیا لوٹ لیا اور جو ملا اسے قتل کر ڈالا۔ مندروں کو مسمار اور اچھی اچھی عمارتوں کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ راجہ کا وہ عالیشان اور پرشکوہ محل جو اپنی حسن صنعت اور خوبصورتی کی بنا پر لاثانی سمجھا جاتا تھا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر اس طرح اجاڑ دیا گیا کہ اس کی شکستہ دیواریں ہی بطور یادگار باقی رہ گئیں۔[2]

وجیانگر کا لق ودق حسین وخوبصورت شہر جس کو سیاح عروس البلاد کے نام سے یاد کرتے تھے اب ملبوں اور کھنڈروں، مٹی کے ٹیلوں اور راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سر بفلک عمارتیں زمین بوس ہو گئیں پر رونق بازار اپنے سیاہ ماتمی لباس میں شہر خموشاں کی طرح سنسان وہ بلند چبوترہ بردا تیج عالیشان منڈپ جہاں سے تہواروں میں تماشا دیکھا جاتا تھا اس کو اکھاڑ کر اس طرح پھینک دیا گیا کہ اس کا کچھ نشان تک باقی نہ چھوڑا گیا۔ غرض آگ، تلوار درانتی، کلہاڑی لیے ۵ مہینے برابر شہر کی تباہی و بربادی ہوتی رہی۔ سیول نے اپنی تاریخ میں اس بربادی کا اس طرح تجزیہ کیا ہے۔ "شہر کے مندروں میں جس قدر بت تھے مسلمانوں نے

---

[1] تاریخ وجیانگر مولوی مولوی بشیر الدین دہلوی بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۳۳ [2] یہ پرتگالی مورخ کوٹو کی تاریخ وجیانگر کی تباہی کے طویل مضمون "وہ زبان ان کی تھی بات میری" کے مصداق مختصر خلاصہ ہے۔

انھیں توڑ دیا۔ مسلمان انتقام لینے کے لیے آئے تھے انھوں نے پوری طرح انتقام لیا۔"

اب ہیراس کی زبانی بھی کچھ باتیں سن لیجیے، وہ لکھتا ہے :۔

"وجیانگر کی موجودہ حالت سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ یہ تمام مسلمانوں کی لائی ہوئی تھی یا امتداد زمانہ نے بھی اپنا کام کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شہر میں رہنے کے لیے پھر جدید عمارات تعمیر کرنی شروع کیں لیکن بعد میں ان کو ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔ آج جو شکستہ دیواریں نظر آتی ہیں وہ مسلمانوں کی یادگار ہیں ورنہ منہدم تعمیرات سے مسلمانوں نے کچھ بھی باقی نہ رکھا۔"

ایک اطالوی سیاح سیزر فریڈرک اس کی تباہی کے دو سال بعد بیجانگر پہونچا تھا وہ اپنے سیاحت نامہ میں لکھتا ہے :۔

"میں نے دنیا کے اور شاہی محلات کو بھی دیکھا ہے لیکن وجیانگر کے شاہی محل کی ہمسری کوئی محل نہیں کر سکتا۔ اس محل کے نو دروازے ہیں۔ کھنڈرات میں اب بھی اوڈ با کا مندر، ہاتھیوں کا اصطبل اور حرم سرا کے غسل خانے پائے جاتے ہیں۔ کھنڈرات ایک وسیع رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہاں پھرتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ گزرے ہوئے زمانے میں اس کی شان و شوکت کیا ہوگی۔ کس طرح اس زمانے میں جب فن تعمیر محدود تھا بڑی بڑی چٹانیں زمین سے ہمدا قدم اونچی اٹھا کر اپنی موزونیت سے رکھی گئی تھیں۔ اس شہر خموشاں کی عظمت اس وقت کیا ہوگی جب کہ عظیم المرتبت راجاؤں کا جلوس اس کی بھری ہوئی گلیوں سے گزرتا ہوگا اور جیا وِشں صدا دے رہے ہوں گے۔"[1]

جہاں تک وجیانگر کی تباہی کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فاتح مسلمانوں نے وجیانگر کو تہس نہس کر دیا تھا کہ اس کا کوئی ایک نشان باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اکثر تاریخی کتابوں میں یہی لکھا گیا ہے کہ فاتح مسلمانوں نے بیجانگر اس طرح تہس نہس کر دیا تھا کہ اس کی کوئی ایک عمارت کو بھی باقی نہ رکھ چھوڑا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فاتح مسلمانوں نے اس کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام عمارتیں ڈھا دی گئی تھیں یا جلا دی گئی تھیں اس کی تصدیق بعض مورخین کی ان تحریروں سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ریورنڈ ہیراس لکھتا ہے :۔

"فاتح مسلمانوں کے جانے کے بعد تر ملا پھر وجیانگر آکر اسی قدیم محل میں مقیم ہوا۔" اس کی توثیق فریڈرک کے سیاحت نامہ سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتا ہے :۔ "محل اسی حالت میں ہے جس طرح کہ پہلے تھا۔"

---

[1] سیاحت نامہ سیزر فریڈرک بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۳۶

اب ذرا میسور گزیٹر کی اس انوکھی تحقیق پر نظر ڈال لیجئے وہ لکھتا ہے :۔

"کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترملانے پھر اس شہر کو آباد کرنا چاہا لیکن ترملا کی حرص اور ناقابلیت اس شہر کو آباد نہ کرسکی"[1]

الغرض تاریخی کتابوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہی محل اور پمپاپتی مندر بالکل محفوظ تھے۔ ہو سکتا ہے شاہی محل اس لیے محفوظ رہ گیا ہو کہ اس میں مسلم سلاطین قیام پذیر تھے۔

ریورنڈ ہراس ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"مسلمان جب پورے شہر کو تباہ کر چکے تو انھوں نے پھر اس کو اپنی طرز پر آباد کرنا چاہا اور عمارتیں بھی تیار ہونا شروع ہوئیں لیکن بعد میں مسلمان انھیں ادھورا چھوڑ کر چلے گئے" پھر آگے ریورنڈ ہراس وجیانگر کے ہولناک بر عبرت منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"اگر مسلمان سلاطین اس شہر کو تباہ نہ ہونے دیتے تو وہ تاریخ میں ایک عظیم کارنامہ چھوڑ جاتے اسی طرح جیسے کہ کرشنا دیورایا نے رائچور میں کیا تھا لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا ان کے دل جوش انتقام سے بھرے ہوئے تھے :"[2]

ہراس کے اس بیان سے اس کی تاریخی صحت نگاری میں ذاتی جذبات کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس کو یہ لکھتے وقت یہ بات یاد نہیں رہی کہ دیورایا نے بیجاپور پر فتح حاصل کرنے کے بعد اس کی تباہی میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔ خود رام راج اور اس کی فوج نے احمد نگر میں جو کیا وہ اس سے کم تھا؟

وجیانگر کی اس تباہی سے جنوبی ہند کی سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور اس سے کس قسم کے تغیرات واقع ہوئے اس کی وضاحت میسور گزیٹر اس طرح کرتا ہے :۔

۱۔ اس تباہی نے ہندو طاقت کو جنوب میں ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ گو سلطنت اور ایک صدی تک دوسرے خاندان میں رہی۔

۲۔ آہستگی سے لیکن یقینی طور پر مسلمانوں کو جنوب پر حملہ آور ہونے کا راستہ کھل گیا۔

۳۔ ایک مضبوط سلطنت یعنی مرکز کے نہ ہونے سے جنوب میں ہر جگہ چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں پیدا ہو گئیں۔

۴۔ وجیانگر کے زوال کے ساتھ پرتگالیوں پر بھی زوال آگیا جن کی تجارت اس ملک میں ایک وسیع پیمانہ پر ہوتی تھی۔ علاوہ دوسری اشیا کے صرف گھوڑوں کی تجارت سے انھیں ½ ۱ لاکھ وکٹ (ایک پرتگالی سکہ) سالانہ وصول ہوتے تھے۔ ہر سال جنوبی ہندوستان پانچ لاکھ گھوڑے

[1] میسور گزیٹر ص ۲۰۸۵ [2] ریورنڈ ہراس ص ۲۲۶

پرتگال بھیجے جاتے تھے۔"[1]

اب پرتگالی مورخ موڈوکا کے اس مرثیہ کو بھی سن لیجئے وہ لکھتا ہے:۔

"سلطنت وجیانگر کی تباہی سے گوا کی تجارت بھی تباہ ہو گئی۔ ہماری تجارت کا دار و مدار اسی سلطنت پر تھا۔ وجیانگر کی تباہی کیا ہوئی گویا ہماری بربادی تھی کہ اس دن سے گوا کے باشندوں کی کشادہ حالی کا خاتمہ ہو گیا۔"

ناظرین اس طویل بحث سے اکتا سے گئے ہوں گے لہٰذا ہم آخر میں جناب محمود خاں مصنف تاریخ جنوبی ہند کے اس بیان پر اس عبرت خیز داستان کو ختم کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

"بہر طور وجیانگر تباہ ہو گیا اور اس کے تباہ ہوئے آج تین سو پچھتر (۳۷۵) سال ہو گئے۔ یہ عالیشان شہر اس طرح تباہ ہوا کہ پھر پنپ نہ سکا۔ دنیا میں ہزارہا شہر آباد ہوئے اور مٹ گئے۔ قانون قدرت ایک وقت مقررہ تک ہر قوم اور ہر آبادی کو مہلت دیتا ہے۔ یہی مہلت وجیانگر کو ملی تھی اور جب وقت آیا تو وجیانگر بھی اسی طرح برباد ہوا کہ آج تصور میں بھی اس کی شان و شوکت اور عظمت وصولت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی آباد گلیاں اس کے بھرے ہوئے بازار، اس کی فلک بوس عمارتیں، اس کے عالیشان معابد سب خاک میں مل گئے۔ وہ گنجان شہر جہاں کثرت آبادی سے راستہ چلنا دشوار ہو جاتا تھا، وہ بازار جہاں دنیا بھر کی نعمتیں میسر تھیں۔ وہ عمارتیں جہاں خوشی اور سرور کے نغمے ہمیشہ بلند رہا کرتے تھے۔ وہ معابد جہاں حسین و جمیل دیو داسیوں کے پرے کے پرے ناچ گا کر کوہ قاف کا نظارہ پیش کرتے تھے۔ سب مٹ گئے۔ ہندو قوم کا یہ عروس البلاد، ان کی تمدن اور معاشرت کا یہ گہوارہ۔ ان کے مذہب کا یہ محافظ شہر تباہ ہو گیا اور اس طرح تباہ ہو گیا کہ اس کے ویرانوں کھنڈروں میں جاتے ہوئے بھی روح کانپتی ہے۔"[2]

---

[1] میسور گزیٹر ص ۲۸۷ [2] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۲۶ / ۲۲۹

نوٹ:۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی۔ اس وقت وجیانگر کی تباہی پر ۳۷۵ سال گزرے۔ آج اس پر ۴۴۰ سال شمار کرنا چاہئے۔

اراویدوا خاندان کا نیا دور

ترملا کی کارگزاریاں

جیسا کہ آپ پڑھ آئے ہیں کہ تالیکوٹہ کی جنگ سنہ ۱۵۶۵ء میں ہوئی اور اسی جنگ کے دوران ترملا فرار ہو کر بلگنڈہ میں پناہ لیے ہوئے تھا۔ مسلم فاتحین تقریباً چھ مہینے تک وجیانگر میں ٹھہرے رہے۔ واپسی میں انھوں نے رائچور اور مدگل پر قبضہ کے لیے اپنی فوج کا ایک دستہ بھیجدیا۔ جس نے اس کو فتح کر لیا اور اس کا الحاق بیجاپور سے کیا گیا۔ اس طرح دوآبہ رائچور جس کے لیے ڈھائی سو سال تک ہندو اور مسلمانوں میں مسلسل تصادم اور نبرد آزمائیاں اور خونریزیاں ہوتی رہیں تھیں اور جس کی قسمت کا چکر ادھر ادھر پھیرتا رہتا تھا۔ اب وہ مستقلاً مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ اب اس طرح وجیانگر کی وسیع اور قدیم سلطنت کے حدود کٹ ٹوٹ کر تنگبھدرا تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ فاتح مسلمان واپس ہوتے ہوئے رائچور کے قریب ٹھہر گئے اور انھوں نے جنوب کی تقسیم کے بارے میں باہم صلاح و مشورہ کیا لیکن رائے و فکر کے اختلاف کی وجہ سے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکے پھر ان کے اتحاد میں شگاف پڑ گیا اور اسی نااتفاقی کی بنا پر جنوب کی طرف پیش قدمی کا سارا پروگرام التوا میں پڑ گیا جب ترملا کو معلوم ہو گیا کہ مسلم سلاطین کا اتحادی رشتہ ٹوٹ گیا ہے تو وہ بلگنڈہ کے گوشۂ عافیت سے نکل کر وجیانگر پہونچا اور ہر چند اس کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ اس نے فوج کو از سرِ نو منظم کرنے پر پوری توجہ صرف کی۔ اس نے احمد نگر سے باہمی دوستی کی بنیاد پر ایک نیا رابطہ قائم کر لیا دوسری طرف پرتگالیوں سے پیمان تعلق استوار کیا اور ان سے گھوڑے خرید لیے لیکن ان کی قیمت ادا کرنے میں تساہل سے کام لیا۔ اس پر پرتگالی مورخ لکھتا ہے :۔

"ترملا گھوڑے خرید کر کے اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ جس کی وجہ سے پرتگالیوں کو سخت نقصان پہونچا"

اس پر میسور گزیٹیر لکھتا ہے :۔

"ملک کی خوشحالی اور فوج کی طاقت کا بہت بڑا راز پرتگال والوں سے تجارت میں مضمر تھا۔ ترملا نے گھوڑوں کی رقم نہ دے کر اپنے آپ کو سخت نقصان پہونچایا"[1]

---

[1] میسور گزیٹیر صفحہ ۲۰۶۱

ترملا کی اس خفیہ تیاری کا راز بیجاپور والوں پر کھل گیا۔ اور علی عادل نے بلاتاخیر بیجانگر کا رخ کیا لیکن اس وقت ترملا کو احمد نگر کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لیے اس نے اس کی حمایت میں بیجاپور کے بعض مقبوضہ علاقوں پر حملہ کر دیا۔ علی عادل کو جب یہ خبر پہنچا تو وہ فوراً پایہ تخت کی طرف پلٹ گیا اور اپنے جنرل کشور خاں کو وجیانگر پر حملے کے لیے مامور کر دیا۔ کشور خاں کی آمد سن کر ترملا اس طرح نکل گیا کہ اس کے بعد وہ پھر کبھی سرزمین بیجانگر میں دیکھا نہیں گیا۔ کشور خاں اس مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد ادھونی پہونچا۔ ادھونی اپنے موقع و محل کے اعتبار سے جنوبی ہند کا ایک اہم اور کلیدی مقام سمجھا جاتا تھا۔ بہمنی حکومت اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کی تسخیر میں ناکام رہی تھی۔ وجیانگر کے زوال کے بعد اس کا گورنر ایک آزاد و خود مختار راجہ بن گیا تھا وہ مخالف فوج کی اپنی سرحد میں داخل ہوتے ہی قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنے لگا۔ لیکن کشور خاں کا محاصرہ اتنا شدید تھا جس نے آخر کار اس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اس طرح شہر ادھونی پر بیجاپور کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح مسلمانوں کو ملباری اور کرنول کی طرف آگے بڑھنے کی راہ ہموار ہو گئی۔ لیکن آگے بڑھنے کیونکر جبکہ مسلم سلاطین کا باہمی اختلاف اور نا اتفاقی اس کے لیے سد راہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن اس کو حسن اتفاق کہیے یا موقع کی نزاکت کا احساس جلد ہی بیجاپور، احمد نگر، گول کنڈہ نے . . .

. . . . . . آپس کی گفتگو کے نتیجہ میں ایک مصالحانہ سمجھوتہ کر لیا۔ اس سمجھوتہ کی رو سے بیجاپور کو جنوبی ہند اور گول کنڈہ دریائے کرشنا سے شمال میں واقع اضلاع کے فتوحات کا راستہ ہموار ہو گیا لیکن بیجاپور ۱۵۷۳ء تک بعض اپنے داخلی مسائل میں مبتلا رہنے کی وجہ سے اس کی پیش قدمی رکی رہی۔

ترملا کی وجیانگر سے واپسی سے اس کی رہی سہی ساکھ کو زبردست جھٹکا پہونچا۔ ہندوؤں نے محسوس کیا کہ وجیانگر اب اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ اس میں جنوبی ہند کی حفاظت کا دم خم نہیں رہا۔ اس لیے اس کے ماتحت کے تمام راجہ اور گورنر اپنی اپنی جگہ آزاد و خود مختار بن بیٹھے کرنول اور ملباری وغیرہ ترملا کے کھلے باغی ہو گئے۔ اور کوکن کا مغربی علاقہ تھا اس کے اقتدار سے نکل گیا لیکن پلگنڈہ کا جنوبی حصہ بدستور اس کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہاں کے حکمراں رام راج کے رشتہ دار تھے۔

مدت سے ترملا خود راجہ بن جانے کی فکر میں تھا مگر اس کے لیے راجہ سداسیو رایا کی ذات رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ اب تک وہ برائے نام ہی کا راجہ تھا اور اس کے پردے میں رام راج یا بعد کے کل اختیارات و انتظامات ترملا کے ہاتھوں میں رہے تھے۔ پھر بھی وہ اس سے مطمئن نہیں تھا اور وہ اپنے چہرے سے اس پردے کو ہٹا کر کھلے منہ سامنے آنے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے آقا اور برائے نام راجہ کو زہر دے کر اسے ٹھکانے لگا دیا۔ لیکن میسور گزیٹر لکھتا ہے:۔

"ترمل راج کے بیٹے وینکٹ رائے نے سداسیو رایا کو قتل کر دیا"

صورت زہر یا قتل جو بھی رہی ہو مگر سداسیو رایا کے قتل سے وجیانگر کے تیسرے شاہی خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب ترملا کا راستہ صاف تھا چنانچہ وہ خود راجہ بن گیا لیکن اس کی تخت نشینی کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں نئے نئے فتنے جاگ اٹھے۔ مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی اور حکومت بدنظمی اور ابتری کا شکار ہوگئی۔ رام راج کے بیٹے تخت و راج کے دعوے دار بن کر کھڑے ہوگئے اور طرفین میں ایک دوسرے کے خلاف لڑائیاں بھی ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے تاریخ جنوبی ہند کی روایت کے مطابق "علی عادل کے پاس جا کر اناگنڈی میں ٹھہرنے کی اجازت چاہی۔ جو کہ دے دی گئی"

۱۵۷۳ء میں بیجاپور نے ملک کے مغربی حصہ پر حملہ کیا اور دھارواڑ، برکور، اور رکوگن کے بعض علاقے فتح کرلیے اور جنوب میں چندر گیری اس کے قبضہ میں آگئے[1] اسی ۱۵۷۴ء میں ترملا اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ بیجاپور تمام مغربی ساحلی مقامات سے جنوبی کنارہ تک فتحیاب ہونے کے بعد اب وہ پلگنڈہ پر حملہ آور ہوا۔ سارے شہر کا محاصرہ کیا گیا۔ جب محاصرہ کی سختی ناقابل برداشت ہوگئی تو سری رنگا رائل نے پالیگاروں کو رشوت بھیج کر اپنی طرف ملالیا۔ جس سے حالات کے رخ یکسر بدل گئے۔ اور بیجاپور کی فوج اپنا محاصرہ اٹھا کر واپس ہوگئی۔

دوسری طرف گول کنڈہ والوں نے وجیانگر کے مشرقی حصہ پر قبضہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا اس کے بعد نلور کی طرف بڑھے اور لونکنڈہ جیسے اہم اور مضبوط قلعہ کو فتح کرلیا۔ لونکنڈہ میں انھیں شدید مقابلہ کرنا پڑا جس میں رام راج کا ایک بیٹا مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوا۔ اس کو گول کنڈہ بھیجا گیا۔ لونکنڈہ کی فتحیابی کے بعد گول کنڈہ کی فوج کرنول پہونچ گئی۔ اور اس کو بھی فتح کرلیا لیکن وہاں کی حکومت ایک برہمن راجہ راؤ کے سپرد کردی"

سری رنگا کی عہد حکومت ۱۵۸۶ء تک رہا۔ اس کا بعد اس کا ایک بھائی رام رائل تخت سنبھال کر چند روز گزرے تھے کہ اس کی موت واقع ہوگئی اور وینکٹ پتی رائل اس کی جگہ پر تخت نشین ہوا۔ اس وقت شمال مشرقی علاقہ پر مسلمانوں کی فاتحانہ پیش قدمی کا سلسلہ جاری تھا وینکٹ رائل کے لیے اپنی حکومت کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا ضروری ہوگیا۔ اور اس نے گول کنڈہ کے بعض مقبوضہ علاقوں پر حملہ کردیا اس کے جواب میں

---

[1] یہ مقام ستوگڑہ کا ضلع میں واقع ہے

گول کنڈہ نے بلگنڈہ پر حملہ آور ہوا لیکن اس کے محاصرہ میں مسلمانوں کو شکست اٹھانا پڑا اور وہ ناکام گولکنڈہ واپس چلے گئے، ان کی واپسی سے وینکٹ رائل کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے اوڈگیری اور نلور کے راجہ کو مسلمانوں پر حملہ کے لیے ابھارا اس کے ساتھ ہی کمک کو ایک کثیر فوج بھیجدی اس کی اطلاع ملنے پر راجہ راؤ جو بلگنڈہ کی طرف سے رنوکنڈہ کا حکمراں تھا۔ اپنی فوج کے ساتھ مدافعت کے لیے نکلا۔ جنگ ہوئی اور خوب ہوئی لیکن نتیجہ میں اوڈگیری کو شکست ہوئی۔ اور مسلمانوں نے اوڈگیری اور نلور پر فاتحانہ قبضہ کر لیا۔ ادھر تو یہ ہوا اور ادھر مغربی علاقہ پر بیجاپور کی مسلسل بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف وینکٹ پتی نے احمد نگر سے اتحاد کر لیا۔ جب علی عادل کو ایک نئے متحدہ محاذ کی خبر پہونچ گئی تو اس نے دوبارہ بلگنڈہ پر دھاوا کر دیا۔ اس جنگ میں اپنی شکست کے آثار دیکھتے ہوا وینکٹ پتی رائل بلگنڈہ سے خاموشی کے ساتھ نکل گیا۔ اور چندرگیری میں پناہ لیا۔ اس طرح ۱۵۹۲ء میں وجیانگر کی اس باقی رہی سہی آخری راج دھانی بلگنڈہ پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح جنوبی ہند کا سارا نقشہ بدل کر ایک نئی ترتیب اور رنگ کے ساتھ ابھر آیا۔ بالخصوص ان دو مسلم سلطنتوں کی سرحدیں اپنی وسعت میں کافی دور تک پہونچ گئی تھیں۔ بیجاپور راستہ کے تمام ملکوں کو اپنے تسلط میں لیتے ہوئے میسور تک اور گول کنڈہ دریائے کرشنا کے تحتی علاقہ کو سمیٹتا ہوا کرنول اور نلور تک پہونچ گیا۔

بیجاپور اور گول کنڈہ کی یہ آخری فتوحات تھیں اس کے بعد انھیں آگے بڑھنا اور اس طرف اپنی توجہ مبذول کرنا تو الگ رہا خود اپنی سلطنتوں کو بچانے کا مسئلہ کافی توجہ طلب ہو گیا تھا کیونکہ ان کی شمالی سرحدوں پر ایک اور طاقت ابھر آئی تھی اور یہ طاقت مغلوں کی تھی۔ دلی میں اکبر اعظم اپنی شہنشاہی کی شہنائی بجاتے ہوئے سربرآرائے سلطنت ہو گیا تھا۔ چنانچہ مورخ ہراس اس سلسلہ میں لکھتا ہے "یہ اکبر نے وینکٹ پتی رائل کے پاس اپنے سفیر کو بھیجکر دکن کے مسلمانوں کے خلاف مدد چاہی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت ہندوؤں نے خیال کیا کہ دکن کی سلطنت فتح ہونے کے بعد مغل جنوبی ہند پر قبضہ کر لیں گے۔"

"یہی مورخ آگے لکھتا ہے :-

"ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے بھی وینکٹ پتی رائل سے مغلوں کے خلاف مدد چاہی لیکن ہندوؤں نے یہی مصلحت سمجھا کہ کسی فریق کو بھی مدد نہ دی جائے۔"[له]

مورخ ہراس یہ لکھتے وقت اس بات کو نظرانداز کر دیا کہ خود وینکٹ پتی رائل کی اس وقت

له تاریخ جنوبی ہند ص۲۲۶

کیا حالت تھی۔ اور وہ کس قدر اپنے اندرونی معاملات اور گرد و پیش کے مسائل میں الجھا ہوا تھا اس کا پایہ تخت بلگنڈہ سے منتقل ہو جانے سے اس کی رہی سہی سلطنت کو کتنا زبردست دھچکا پہونچا تھا اور وہ کس قدر داخلی انتشار میں مبتلا تھا، میسور، تنجاور، مدورا اور جنجی کے راجہ اس سے اپنا تعلق توڑ کر خود مختار ہو گئے تھے۔ میسور میں واقع سرنگا پٹم میں جو وجیانگر کا حاکم تھا اسے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا گیا تھا۔ اس لیے وینکٹ پتی رائل کو ان باغیوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چندرگیری کو چھوڑ کر اپنا پایہ تخت ویلور میں منتقل کر دیا تاکہ جنوب کے وسطی مقام تک رہ کر باغیوں کے خلاف مناسب اقدام کر سکے اس کے علاوہ ولیعہدی کا ایک نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور یہ مسئلہ کسی طرح بھی حل نہیں ہو پا رہا تھا آخر وینکٹ پتی رائل نے اپنے مرنے سے تین دن پہلے سری رنگا سوم کو اپنا ولی عہد مقرر کیا وینکٹ پتی کے بعد سری رنگا رائل تخت نشین ہو گیا لیکن اس کے خلاف اندرونی سازشوں کا جال ایسا پھیلایا گیا جس سے تنگ آکر اس کو ایک ہی سال میں تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس سلسلہ میں کرشنا سوامی اینگار لکھتے ہیں:۔

"اور اسی سال اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کے بعد راما دیو رائل تخت نشین ہوا۔ لیکن خاندان کا ایک اور شخص جگ رایا تخت کا دعویدار ہوا اور اس کی حمایت میں تنجاور کا راجہ تھا۔ جنگ میں جگ رایا کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے امید ہو چلی تھی کہ راما دیو رائل کا اقتدار بحال ہو جائے گا۔ اسی وقت مدورا کا نائک جو جنوب میں سب سے زبردست تھا رام دیو ا کے خلاف ہو گیا"[1]

اس پر مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹر لکھتا ہے:۔

"اگر مدورا والے اس وقت مخالفت نہ کرتے تو تمام ملک میں پھر ہندو سلطنت قائم ہو جاتی لیکن یہ آخری امید بھی ختم ہو گئی"

وینکٹ پتی رائل کے بعد اس کے خاندان میں چار راجاؤں کے نام آتے ہیں جن کے نام اور عہد کی تفصیل یہ ہے:۔

سری رنگا رائل	سنہ ۱۶۱۴ء	سے	سنہ ۱۶۱۵ء
راما دیو رائل	سنہ ۱۶۱۵ء	سے	سنہ ۱۶۳۰ء
وینکٹ پتی رائل	سنہ ۱۶۳۰ء	سے	سنہ ۱۶۴۲ء

---

[1] تاریخ ہند مس کرشنا سوامی اینگار صہ ۲۷۱

سری رائل رنگا دوم سنہ ۱۶۳۲ء سے سنہ ۱۶۴۲ء

وجیانگر کے نام سے یہ چار راجہ بھی ۲۹ سال تک راج گدی سنبھالتے رہے لیکن درحقیقت وجیا نگر کی رہی سہی شان وشوکت اور اس کی بچی کھچی طاقت تھی۔ وینکٹ رائے کے بعد کچھ نہ رہ گئی تھی۔ یہ وجہ تھی کہ متذکرہ چار راجاؤں کی حیثیت معمولی پالیگاروں جیسی تھی۔ اور وہ بھی دوسرے پالیگاروں کی چھینا جھپٹی کی نذر ہو رہی تھی۔ علاوہ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کے خاندان میں پھوٹ اور نااتفاقی پیدا ہو گئی تھی۔

پرتگیزی مشرقی علاقہ میں اب تک صرف تجارت میں لگے رہے اس سے باہر قدم اٹھانے کی کبھی انھوں نے ہمت نہیں کی تھی۔ لیکن ملک کی بدلی، بگڑی ہوئی حالت اور کمزوری دیکھ کر اپنی تجارتی بندرگاہوں پر فوجی قبضہ کر لیا۔ اس کی تفصیل پرتگیزی مورخ ہراڈاس اس طرح لکھتا ہے :-

"اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سینٹ تھامس (ملے پورم) کے پرتگالی تاجروں نے جو اب تک خراج ومحصول ادا کرتے تھے۔ اس علاقہ کو بادشاہ پرتگال کی ملکیت قرار دیا اور انھوں نے بڑھ کر اطراف کے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا"[1]

ملک اور اس کے اطراف پھیلی ہوئی اس خانہ جنگی کے زمانہ میں رام دیو علیل ہوا اور وینکٹ پتی رائل دوم تخت نشین ہو گیا۔ مگر اس کی حکومت کا دائرہ ویلور اور اس کے مضافات تک محدود تھا۔ لیکن وجیانگر کے شاندار ماضی اور دبدبہ کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب بھی باقی تھی۔ اسی لیے اس کے امرا اپنی ذاتی مفادات کی خاطر رام دیو مہاراج کے نام کو برابر اچھالتے اور اپنے مقصد برآری کے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔ اور یہ ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بھی اسی زمانہ میں پیش آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی EAST INDIA Company اپنی تجارت کے لیے مدراس کی بندرگاہ پوناملے منڈر راجہ وینکٹ دری رائے سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اسی خانہ جنگی کے پرآشوب دور سنہ ۱۶۴۲ء میں وینکٹ پتی رائل رحلت کر گیا اور سری رنگا رائل چہارم نے تخت سنبھالا۔ لیکن اسی سال بیجاپور اور گولکنڈہ نے مل کر ویلور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ سری رنگا وہاں سے فرار ہو کر بدنور (میسور) کے راجہ کے پاس پناہ گیر ہوا۔ اس کے بعد کے واقعات میں یہ ہے جس کا ذکر تاریخ ہند میں کیا گیا ہے کہ :-

"سری رنگا رائل نے مغل شہنشاہ شاہجہاں کو مدد کے لیے خط لکھا اس خط میں لکھا گیا تھا کہ

---

[1] بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۲۸

جنوب کے تمام ملک اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ لیکن شاہجہاں نے توجہ نہیں کی۔"[1]

سری رنگا رائل نے اپنی زندگی کے آخری ایام بلگنڈہ میں گزارے جہاں وہ ۱۶۶۹ء میں اس کا دیہانت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا ایک بھتیجا کوتھنڈارا راجہ ہوا۔ اس برائے نام راجہ کی حیثیت ایک معمولی جاگیردار جیسی تھی۔ اس کے بعد کم و بیش ۱۸۰۰ء تک بلگنڈہ کی حکومت اسی خاندان میں بطور یادگار باقی کے جلتی بجھتی رہی اور پہلے بیجاپور کو اور بعد میں مغلیہ سلطنت کی خراج گزار رہا۔ اس کے بعد جو انقلاب آیا وہ انھیں وہاں بھی امن و اطمینان سے نہ رہنے دیا۔ اور وہ اناگندی کے آخری پناہ گاہ پہنچ کر اس طرح گم ہو گئی کہ پھر کبھی نہ ابھری۔

یہ واضح رہے کہ یہ اناگندی وہی ہے جہاں ابتدا میں وجیانگر کی بنیاد رکھی گئی تھی جب پر رام راج کی اولاد حکمراں تھی۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق "تالیکوٹ کی جنگ کے بعد رام راج کا ایک بھتیجا رام راج نے علی عادل شاہ کے پاس پناہ لیا تھا۔ علی عادل نے اناگندی کی حکومت رام راج کے حوالہ کر دی تھی۔ اس وقت سے رام راج کا خاندان اناگندی میں اقامت گزیں تھا۔ اس پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :-

"حکومت وجیانگر کی بنیاد اسی شہر میں پڑی۔ وسعت پذیر ہوئی اور پھر سمٹ کر اسی خطہ پر آگئی۔"

زوال وجیانگر پر تبصرہ کرتے ہوئے تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے: "تالیکوٹ کی جنگ ۱۵۶۵ء میں ہوئی۔ وجیانگر کی تاریخ کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے بعد کے واقعات بھی جو اس سلطنت سے تعلق رکھتے تھے آخر تک یعنی سنہ ۱۶۳۰ء تک لکھ دیے گئے ہیں۔ جب اسی سال اس سلطنت کی آخری شمع بھی گل ہو گئی۔ تاریخی لحاظ سے ۸۰ سال کا یہ زمانہ دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۵۶۵ء سے ۱۵۹۲ء تک، ۲۷ سال۔ دوسرا ۱۵۹۲ء سے ۱۶۳۶ء تک۔

دوسرا دور ۱۵۹۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس سال مسلمانوں کی فوجیں جنوبی ہندوستان کو چھوڑ کر دکن چلی گئیں کیونکہ ان کے مقابلہ میں شمالی سرحد پر ایک زبردست طاقت مغلوں کی تھی۔ صف آرا ہو چکی تھی۔[2]

تاریخی لحاظ سے ہندوؤں کے لیے یہ ایک نہایت بہتر اور بہت مناسب موقع تھا کہ وہ دریائے کرشنا تک کے دوآبے سارے ملک پر اپنا تسلط جما سکتے تھے کیونکہ ان کی مدافعت کرنے والے مسلمانوں کا اب اس پورے علاقہ سے تخلیہ کر چکے تھے ان کی مزاحمت کرنے والی کوئی دوسری طاقت بھی اس وقت موجود نہ تھی لیکن ہندوؤں نے اس سنہرے موقع کو گنوا دیا۔ دراصل وہ اپنی ہمت کھو چکے تھے۔ ان کے حوصلے پست تھے۔ ان کی فوجی تنظیم منتشر ہو چکی تھی۔ ان میں نااتفاقی اور طوائف الملوکی خودسری اور خودپسندی کا رجحان غالب ہو چکا تھا۔ ان کے آپس میں جوتوں میں دال بٹنے لگی تھی۔ انہی اسباب سے وہ موقع سے اٹھانے

میں کسی طرح کی پہل نہ کر سکے. حالانکہ ڈھائی سال پہلے محمد بن تغلق کے بعد دکن کے مسلم حکمراں جب آپس میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائی اور لڑائی میں سرگرم تھے۔ تو اس سے فائدہ اٹھا کر ہندوں نے اپنی اجتماعی طاقت سے وجیانگر کی سلطنت کو جنم دیا تھا اور اب وہ اپنی باہمی رقابتوں کا چاپیوں خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو کر خود اپنے ہاتھوں وجیانگر کی سلطنت کا گلا گھونٹ کر اس کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا۔ اور اس واحد سلطنت کی جگہ خود مختاری کے روپ میں متعدد حکومتیں نمودار ہو گئیں۔ جنوبی ہند میں ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو پالیگار کہا جاتا تھا۔ ان میں بعض اتنے چھوٹے کہ اس کے ماتحت صرف چند دیہات ہوتے اور ان میں چند ایسے تھے جو اپنے رقبہ کے لحاظ سے وسیع تر اور کافی طاقتور تھے۔ ان میں مدورا، میسور، تنجاور کی ریاستیں ہر طرح ممتاز و نمایاں تھیں لیکن یہاں واقعہ یہ ہے جس کو مختلف مورخین نے لکھا ہے یاد رکھنا چاہیے کہ ملک میں اسی خانہ جنگی کے دوران ۱۶۴۷ء میں جب مسلمان جنوب پر حملہ آور ہوئے تو تمام ملک۔ کو صرف ایک سال میں فتح کر لیا تھا۔

مغل جنوبی ہند میں

مسلم سلاطین دکن کے سامنے اب دو محاذ کھل گئے۔ (۱) مغلوں سے خلاف مدافعانہ صف آرائی (۲) ان کی آپس کی رقیبانہ جنگ و جدال۔ اس طرح اب جنگ کے میدان بدل گئے۔ پہلے ان کا رخ جنوب کے ہندوں کی طرف سے ہٹ کر شمال سے آنے والے مغلوں کی جانب پھر گیا۔ ادھر مغل افواج سیلاب کی طرح کچلتے پیستے روندتے بڑھتے آرہی تھی۔ اور ادھر یہ سلاطین آپس میں لڑتے کٹتے کٹاتے مٹتے مٹاتے اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کی قبریں کھودتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سولہویں صدی میں احمد نگر کی حکومت صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہ گئی۔ اس کے بعد شہزادہ اورنگ زیب عالمگیر جو اس وقت دکن کا صوبیدار تھا سوچا کہ اب جنوبی ہند کو بغیر کسی تاخیر کے فتح کر لینا چاہیئے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بیجاپور کو مامور کر دیا ۱۶۳۶ء میں بیجاپور سے ایک لشکر جرار ایک مشہور جرنل رنڈولہ خاں کی سالاری میں روانہ کیا۔ رنڈولہ خاں کا نائب مشہور مرہٹہ سردار شاہ جی تھا۔ یہ لشکر طوفان کی طرح اٹھا اور جنوب کے اکثر شہروں کو اپنی لپیٹ،

چھین لیا۔ بنکاپور، ہری ہر، بسواپٹن، ترکیرہ وغیرہ پر فتح و کامیابی کے جھنڈوں کو لہراتا ہوا آگے بڑھا اور سرنگاپٹم کا محاصرہ کیا۔ لیکن یہ محاصرہ نہایت سنگین اور لاحاصل ثابت ہوا۔ بالآخر محاصرہ اٹھا کر لشکر ملکوٹ پہونچا اور اس کو فتح کر لیا۔ پھر یہ لشکر بنگلور کی طرف بڑھنے لگا۔ بنگلور ریاست اس وقت ماگڑی کمپے گوڑا کا راج تھا۔ بیجاپور کے لشکر کا اس نے مقابلہ کیا لیکن اس کے نتیجہ میں کمپے گوڑا کو شکست اٹھانی پڑی۔ اس طرح ۱۶۳۹ء میں بنگلور پر بیجاپور کا قبضہ ہو گیا اس کے بعد رندولہ خان سکوٹہ، کولار، ویلور اور جنجی کو فتح کرتا ہوا پھر بنگلور واپس آیا۔ اور چند ہی دنوں بعد میراباللاپور، چیلدرگ، اور ادہر اُدھر دھاوا کر دیا۔ اور فتحیاب ہوا۔ اس طرح ایک سال میں جنوبی ہند کے ایک بہت بڑے حصہ پر مسلمانوں نے فاتحانہ قبضہ کر لیا۔ بنگلور اور سنجی شاہ جی کو اس جنگ میں نمایاں کارگذاری کے عوض بطور جاگیر دی گئی۔

ان فتوحات کے بعد جنوبی ہند کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں میسور، پاٹین گوداٹ، جنوبی ارکاٹ، بلاری، اننت پور وغیرہ میں جو مسلمان آباد ہیں زیادہ تمام تر اسی زمانہ میں بیجاپور سے آئے ہوئے ہیں۔

جنوب کے متعلق مغل حکومت کی ایک نئی حکمت عملی

یہ ذکر آپ گذشتہ صفحات میں دیکھ آئے ہیں کہ جنوبی ہند پر یہ نیا حملہ بیجاپور کا اس کا اپنا حملہ نہ تھا بلکہ مغل حکومت کے دکن کے اس وقت کے صوبیدار اورنگ زیب کے حکم سے کیا گیا تھا اورنگ زیب پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی گذشتہ باہمی جنگ وجدال نے جنوبی ہند کو کس قدر برباد کر ڈالا تھا اس لیے اورنگ زیب نے ایک فرمان کے ذریعہ حکم دیا کہ جس آباد علاقہ پر ہمارا قبضہ ہوا ہے وہاں کے نسبتاً غیر آباد علاقے گو اس کے حکمرانوں کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ اس حکمت عملی کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے غیر آباد علاقے آباد ہو گئے اور نئے شہر وجود میں آگئے۔ اور ان شہروں کے حکمران راضی و مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ اس پالیسی کے بارے میں میسور گزیٹیر لکھتا ہے:۔

"حملہ آوروں کی پالیسی یہ تھی کہ ہر مقام پر قبضہ کرنے کے بعد اس علاقہ کا مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر وہاں کے مقامی سردار کو اسی علاقہ میں ایسی جگہ دی جائے جو زیادہ زرخیز نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام بنجر اور غیر مزروعہ زمینیں بھی قابل زراعت بن گئیں۔ اور لوگ وہاں آکر آباد ہونا شروع ہوئے حملہ آوروں نے سیرا پٹن لے کر وہاں کے پالیگاروں کو ترکیرہ دے دیا گیا۔ بنگلور لے کر کیمپے گوڑا کو ماگڑی دیا گیا۔ ہسکوٹ کے عوض انیکل۔ کولار کے عوض

بنگلور، اور سرا کے عوض، تن گیری دے دیے گئے تھے۔ اس طرح تمام ملک آباد ہو گیا اور زمینیں قابل زراعت بن گئیں۔ [1]

جنوبی ہند کی تاریخ کا ایک نیا موڑ

مرہٹوں کی کارگزاریاں :- گزشتہ صفحات میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ بنگلور بطور جاگیر شاہ جی کو بخش دی گئی۔ ان کا تعلق مرہٹہ قوم سے تھا۔ اسی لیے مرہٹے بنگلور اور سرا کے نواحی علاقوں میں آنے اور بسنے لگے۔ مرہٹوں میں دو ذاتیں تھیں ایک راجپوت نسل کے جنگجو۔ اور دوسری صنعت پیشہ چنانچہ اس بارے میں ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :

"مرہٹوں سے مراد وہ مرہٹے نہیں جو شہروں میں درزی کا پیشہ کرتے ہیں یہ نامدیو ہے ہیں۔ یہاں مرہٹوں سے مراد وہ جنگی قوم ہے جو راجپوت نسل سے ہیں اور اب بھی میسور وغیرہ کی فوج میں ملازم ہیں۔"

یہاں سے ہم کچھ دیر کے لیے آپ کو مغلیہ سلطنت کی طرف لے چلتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا بادشاہ اس وقت شاہ جہاں تھا۔ دارا شکوہ اس کا فرزند اکبر تھا۔ وہ نیک دل ضرور تھا لیکن وہ تدبر و دور اندیشی سے عاری، امور سلطنت سے نابلد اور سیاسی سوجھ بوجھ سے یکسر بے بہرہ تھا اس کے مقابلہ میں عالمگیر دور اندیش، امور سلطنت سے باخبر اور سیاسی فہم تدبر میں وسیع النظر تھا۔ جنوب کی فتوحات پر ابھی چند ہی دن گزرے تھے شاہجہاں نے اپنے بیٹے عالمگیر کو دکن سے ہٹا کر گجرات کی صوبیداری پر مامور کر دیا۔ ایسا کیوں کر دیا؟ اس کی تفصیل ڈاکٹر کرشنا سوامی آینگار سے سن لیجیے :

"عالمگیر کی کامیابی ... کو اس کے بھائی دارا شکوہ نے پسند نہیں کیا اس نے اپنے باپ شاہ جہاں سے کہہ کر عالمگیر کو گجرات کی صوبیداری پر بھیج دیا۔" [2]

عالمگیر کے دکن سے چلے جانے سے نہ صرف فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ بلکہ اس نے آئندہ کی حالوں انک مسلمانوں کو مسلسل جنگوں کے کٹھن اور صبر آزما حالات میں مبتلا کر دیا۔ شاہ جہاں کا دارا شکوہ کے کہنے پر بے سوچے سمجھے عالمگیر کو دکن سے منتقل کرنا ایک زبردست غلطی تھی جس کا

بد ترین خمیازہ مغلیہ سلطنت کو مدتوں تک بھگتنا پڑا۔ اور یہی غلطی آئندہ چل کر مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک موثر سبب بن گئی۔ دکن کی تاریخ ہمارے سامنے اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ مہاراشٹر کے غالب حصہ کو جو دکن کے مغربی جانب میں واقع ہے۔ علاء الدین کے زمانے میں مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس پر بہمنی حکومت کا بدستور قبضہ رہا۔ جب بہمنی سلطنت اپنے زوال کے آخری ایام میں پہونچی تو اس کی کوکھ سے بیجاپور، احمد نگر، گول کنڈہ اور بیدر پیدا ہوئے اور اس کو بانٹ چھانٹ کر اس کے حصہ دار اور مالک بن گئے اور اس طرح جب مسلمان اور مرہٹے یکجا ہوگئے تو ان کے آپس میں اختلاط اور ارتباط پیدا ہو گیا اور سالہا سال تک ان کے ہم وطنی اور ہم نشینی تعلقات نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ان کی معاشرت ان کی سیرت اور کردار پر نہایت گہرے اثرات چھوڑے۔ رفتہ رفتہ دکنی مسلمان بہت سی باتوں میں ان کے ہم رنگ ہو گئے۔ ان مسلم سلطنتوں میں مرہٹے چھوٹے سے لے کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے بلکہ ان میں سے جو جاگیرداری کے مناصب سے بھی سرفراز تھے۔

جب دکن میں مغلوں کے حملے شروع ہوئے تو دکن کی مسلم سلطنتوں نے غیر مسلمانوں کو اپنی حمایت اور تائید میں لے کر ایک نعرہ بلند کیا وہ نعرہ یہ تھا "مغل غیر ملکی ہیں" اس کو اس قدر اچھالا گیا کہ یہ ایک عام نعرہ بن گیا۔ یہاں تک کہ اس زمانے کے مشہور شعراتک نے اپنے اشعار میں اس جذبہ کو ابھارنے میں نمایاں حصہ لیا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مغل غیر ملکی تھے یا اور دوسرے بھی غیر ملکی ہوئے یہ حجاب آج اور کل کے فرق کے ساتھ دوسروں پر بھی لگ سکتی ہے۔"

ہندوؤں کو اپنا حلیف اور شریک کار بنانے کے لیے ایک سیاسی حربے کے طور پر اس نعرہ کو غلط تو نہیں کہا جا سکتا لیکن پالیسی سے جذبہ یہ کہ ہندو اور مرہٹے اس ملکی ہونے کے ناطے کو برقرار رکھیں گے۔ یا وقت آنے پر ان کے ساتھ اشتراک و تعاون کریں گے یہ محض ان کی خوش فہمی تھی، خیال خام تھا، امید باطل تھی اور ناقص فہم کی غلطی۔

بعد میں جو واقعات پیش آئے انھیں تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پالیسی نہ صرف ناکام رہی بلکہ اس کے برعکس یہ پالیسی تمام تر ہندوؤں اور مرہٹوں کے مفاد میں رہی اور انھوں نے آئندہ چل کر اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس پالیسی کے تحت مسلم سلاطین نے مسلمانوں اور مرہٹوں کے تعلقات میں مزید وسعت

لہ تاریخ ہند کرشنا سوامی اینگار

دینے کی ضرورت محسوس کی۔ اور اپنی باقاعدہ فوج میں مرہٹوں کی بھرتی شروع کر دی۔ اس کا انجام یہ ہوا جیسا کہ ولکس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:۔

"ان کی باقاعدہ فوج کا بیشتر حصہ مرہٹوں پر مشتمل تھا۔"

مرہٹوں سے مسلمانوں کے ہمہ جہتی تعلقات تمدن و معاشرت پر نہایت گہرے اثرات چھوڑ گئے رفتہ رفتہ مرہٹوں کے سارے رسوم و رواج مسلمانوں میں نفوذ کر گئے۔ شادی بیاہ کی رسمیں اور بہت سی غیر اسلامی بدعتیں اس زمانہ کے اختلاط و ارتباط اور باہمی تعلقات کی یادگار ہیں۔ اور تاریخ جنوبی ہند کے مصنف کے بیان کے مطابق ہر اس رسم و رواج کا اثر ابھی تک دکن اور جنوبی ہند کے مسلمانوں میں باقی ہے۔"

عالمگیر کے جانے کے بعد دکن کے مغل اقتدار کا زور گھٹ گیا اور گول کنڈہ نے اس سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔ خراج روک لیا۔ اور اپنے مصالح اور مفاد کے مدنظر مرہٹوں کی امداد و حمایت کرنے لگے۔ اس سے مرہٹوں کی قوت میں کافی استحکام پیدا ہو گیا۔ اور وہ آگے بڑھ کر مغلوں کے علاقوں پر چھاپے مارنے لگے۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کی خواہش اور یہ کوشش تھی کہ جس طرح بھی ہو مغلوں کو دکن سے اکھاڑ کر باہر کر دیا۔ اور اس کے لیے وہ ان چھاپہ ماروں کو خفیہ طریقے سے امداد دیتے رہے۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے اور بد سے بدتر صورت اختیار کر گئے تو شاہجہاں کو اپنی گذشتہ غلطی کا احساس ہوا اور اس نے ۱۶۵۳ء میں عالمگیر کو دوبارہ دکن جانے کا حکم دیا۔ عالمگیر کے دوبارہ دکن پہونچنے پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ عالمگیر نے اس وقت بھی چاہا کہ بیجاپور اور گول کنڈہ کو جو مرہٹوں کی طاقت کا اصل سرچشمہ ہیں خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن شاہ جہاں نے پھر وہی غلطی کی۔ اس نے عالمگیر کو حکم دیا کہ ان اسلامی سلطنتوں سے تعرض نہ کیا جائے بلکہ مرہٹوں پر توجہ کرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹی طاقت مستقل رہ سکی۔ ابھی لڑائیاں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہ جہاں بیمار پڑا۔ اور بھائیوں میں تخت کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ عالمگیر ۱۶۵۶ء دکن چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا۔"[1]

مرہٹوں کا جنوبی ہند میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنا

شاہ جی کو اس جنگی خدمات کے صلہ میں بنگلور اور جنجی کے علاقے جاگیر کے طور پر دے جانے

---

[1] تاریخ جنوبی ہند مصنفہ محمود خاں ص ۲۶۰/۲۶۱

کا حال آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں۔ شاہ جی نے جنوبی ہند کے حالات کا بغور جائزہ لیا تو یہ باتیں کھل کر ان کے سامنے آ گئیں۔ ایک یہ کہ جنوبی ہند میں جو ریاستیں ہیں ان میں کچھ دم خم نہیں رہا ہے اور ہندو منتشر ہیں اور ان کے حوصلے پست ہیں اور عسکری تنظیم اور قوت سے تہی ہیں۔ دوسرے طرف مسلمان ہیں ان میں دم خم کافی موجود ہے لیکن ان کی ساری قوت اور توانائی ان کے آپس کے اختلاف اور نااتفاقی میں صرف ہو رہی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں ایک نئی ہندو حکومت کو جنم دینے کی کوشش شروع کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ شاہ جی کے بارے میں جنرل ولکس لکھتا ہے :۔

"شاہ جی ملک سے بہت زیادہ لگان حاصل کرتا تھا۔ اس کا ایک حصہ تو بیجاپور بھیج دیا جاتا تھا اور دوسرا حصہ بغاوت کے لیے محفوظ رکھتا تھا۔ جنوب میں آنے سے پہلے ہی اسکی ایک جاگیر پونہ میں تھی۔ یہاں اس کا بڑا لڑکا سیواجی تربیت پا رہا تھا۔ اس جاگیر کا انتظام دادا جی کونڈو کے ہاتھ میں تھا جو نہایت رازداری سے کام کرتا ہوا سیواجی کو فوجی تربیت دے رہا تھا۔ سیواجی خود بھی نہایت ذہین تھا۔ اس نے اپنی عمر کے سترہ سال میں ایک جتھا جمع کر کے لوٹ مار شروع کر دی اور رفتہ رفتہ اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ بیجاپور کے چند امراء نے بھانپ لیا کہ سیواجی جو کچھ کر رہا ہے باپ کے اشارہ سے کر رہا ہے۔ بس شاہ جی کو دربار میں طلب کیا گیا۔ لیکن شاہ جی نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ سیواجی کی ماں کو پہلے سے چھوڑ چکا ہے اور سیواجی سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن بیجاپور والوں نے اسے قید کر لیا۔" [1]

یہی مورخ اس باپ بیٹے کے تعلق کے بارے میں لکھتا ہے :۔

"شاہ جی کا ایک خط اس کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کا تعلق اپنے بیٹے سے ضرور تھا اس خط میں اس نے سیواجی کو لکھا تھا کہ تو اگر میرا بیٹا ہے تو منگل کے جاگیردار باجی راؤ گھوڑپورے کو ضرور سزا دینا۔" [2]

باجی راؤ گھوڑپورے ایک دوسرا مرہٹہ جاگیردار تھا۔ بیجاپور والوں نے شاہ جی کو اسی کے حوالہ کیا تھا۔ شاہ جی کو قید میں اس نے سخت تکلیفیں پہونچائی تھیں۔ بیجاپور نے شاہ جی کے قتل کا حکم بھی دے دیا تھا لیکن رندولہ خاں نے سفارش کر کے اس کی جان بچا لی۔

شاہ جی چند ہی دنوں میں بیجاپور کے دربار میں اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی پونہ کی جاگیر سیواجی کے سپرد کر دی۔ اس طرح بنگلور اور رنجی ایکوجی کو

---

[1] تاریخ میسور ص ۲۶ [2] ایضاً تاریخ میسور

سونپ دیا۔ یکوجی نے تنجاور کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور یہ قبضہ اپنے باپ کے حکم ہی سے لیا تھا۔ اب یہ نئی مرہٹی سلطنت شمال میں پونہ اور جنوب میں تنجاور تک کافی وسیع ہو گئی۔ اس طرح شاہ جی کا خواب ایک نئی ہندو حکومت کا قیام اپنی تعبیری صورت میں سامنے آگیا۔ شاہ جہاں کے رحلت کے بعد اس کے بیٹوں میں تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور نوبت آخر جنگ تک پہونچ گئی۔ اور عالمگیر اسی میں مصروف رہا اور ادھر شیواجی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو بڑھاتا رہا۔ اور جب وہ کافی طاقتور ہو گیا تو مغلیہ سلطنت کے بعض علاقوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیا۔

۱۶۵۸ء میں عالمگیر تخت نشین ہوا اس نے دکن کی مہم پر اپنے ایک جنرل شائستہ خاں کو بھیجا اس کے ساتھ راجہ جسونت سنگھ بھی تھا۔ راجہ جسونت سنگھ دکن پہونچ کر کچھ اور ہی کھیل کھیلنے لگا وہ در پردہ ہر طریقہ سے سیواجی کو مدد پہنچاتا رہا۔ اس کی سازش اور غداری کی وجہ سے شائستہ خاں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس کے بجائے شہزادہ اعظم کو دکن کا صوبیدار بنایا گیا۔ اس کے آنے سے حالات کچھ بدلتے نظر آنے لگے۔ اور اب راجہ جسونت سنگھ نے مصلحت اسی میں سمجھا کہ جس طرح بھی ہو سکے سیواجی کو مغلیہ سلطنت کی سرداری قبول کرنے پر رضامند کرے اس کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا ۱۶۶۶ء میں سیواجی کو دلی بھیجدیا گیا۔ وہاں اس کو پانچ ہزاری منصب کا اعزاز بخشا گیا۔ لیکن سیواجی اس منصب سے خوش نہ ہوا اور اس کو قبول کرنا اپنے وقار کے خلاف سمجھا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اس کو قیدخانہ کے حوالہ کر دیا گیا۔ لیکن سیواجی قیدخانہ سے فرار ہو گیا اور اپنے مستقر مہاراشٹر پہونچ گیا اور مغل حکومت سے دوبارہ چھیڑ چھاڑ اور صف آرائی شروع کی اور بعض علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ان کامیابیوں سے اس کی ہمت بڑھ گئی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعض اہم علاقے بھی اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے اس طرح جب وہ زبردست طاقت بن گیا اور ۱۶۷۴ء میں ستارا کو اپنی راجدھانی بنا کر تخت نشین ہو گیا۔ اس طرح اس کو راجہ کا ایک نیا خطاب بھی مل گیا۔ اس کی تخت نشینی کی تقریب میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مبارکباد دینے کے لیے مسٹر ہنری اکسترین کو اپنا ایک خاص نمائندہ بنا کر ستارا بھیجا تھا۔

اس زمانہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی باہمی رقابت نقطۂ عروج پر پہونچ گئی تھی۔ سیواجی نے ان دونوں کی نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر گولکنڈہ کے تاناشاہ سے رابطہ پیدا کر لیا۔ اور اس کی خدمت میں بطور ملازمانہ اپنی خدمات پیش کیا۔ اور تاناشاہ کو اس بات کا یقین دلایا کہ جنوب میں بیجاپور کے ماتحت جتنے علاقے ہیں ان پر قبضہ کر کے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔ بیجاپور سے اس کو عناد تو تھا ہی اس کو بہ آسانی ہاتھ آنے والی اس غنیمت موقع کو منظور کر لینے میں عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تاناشاہ نے بغیر کسی پیش اندیشی اور انجام بینی کے اس پیشکش

کو منظور کر لیا۔ تانا شاہ کا وزیر اعظم ایک ہندو پنڈت مارنا تھا۔ اس نے ہی ایک گہرے سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت سیواجی کی پیش کش کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ درحقیقت مارنا نے سیواجی کے ساتھ مل کر ایک خفیہ پلان تیار کیا تھا۔ اور اس کا راز بعد میں کھل گیا۔ چنانچہ کرنل ولسن اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :-

"مارنا پنڈت اور سیواجی کے درمیان جو خفیہ عہد نامہ ہوا اس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ سیواجی گول کنڈہ کی مدد سے جنوبی ہند کے تمام علاقوں پر قبضہ کرلے اور بہ باطن تمام مسلمانوں کو جنوبی ہند اور دکن سے نکال دے اور آخر میں گول کنڈہ پر بھی قبضہ کرے"

یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ پانچ ہزاری اعزاز سے انکار کرکے قیند سے فرار ہونے والا شیواجی نے اب گول کنڈہ کی ملازمت اختیار کرلی تھی۔ جنوبی ہند سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کے لیے جس کا سہارا لیا گیا وہ کسی غیر کا نہیں مسلمان ہی کا تھا۔ ۱۶۷۷ء کا سن تھا کہ گول کنڈہ کی فوج کا یہ سالار ہو کر شیواجی نے جنوب پر حملہ کردیا۔ اس کے فوج میں اس کے ساتھ کثیر التعداد مرہٹی فوج بھی شریک تھی اس وقت بیجاپور اپنے ملک میں اٹھی ہوئی سازشوں اور اندرونی مسائل میں بری طرح الجھا ہوا تھا اس لیے اس کی نظر میں جنوب کے اس نئے ابھرتے ہوئے واقعات تک نہ پہونچ سکیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کے اندرونی حالات نے اس طرف توجہ کرنے کا موقعہ نہ دیا ہو۔ اس کی اس بے توجہی کی بنا پر مقامی حکام کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ بہر حال سیواجی کرنول اور مدورا پر فتوحات کا جھنڈا نصب کرتا ہوا جنجی پہونچ گیا۔ جنجی کا قلعہ دار سدی عنبر پوری قوت سے اس کی مدافعت میں ڈٹا رہا لیکن سیواجی جنگ بازی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ حرب فن اور فریب کاری میں بھی استاد تھا۔ اس نے دیکھا کہ سدی عنبر پر فتح پانا آسان نہیں ہے تو اس کو دھوکہ دے کر مار ڈالا۔ اس کے بعد جنجی کے قلعہ پر اس کی فتح کا پرچم لہرانے لگا۔ اس مضبوط قلعہ پر قبضہ ہوتے ہی سیواجی کی سیاسی روش میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اور وہ اپنے پہلے سے طے کیے ہوئے منصوبے کو بروئے کار لانا شروع کیا۔ اس کی اب تک کی ساری کارگزاریاں گول کنڈہ کی طرف سے اس کے ماتحت ملازمانہ طور سے ہو رہی تھی۔ لیکن جنجی کے فتح کے بعد اس نے گول کنڈہ سے بغاوت اور سرکشی اختیار کرلی۔ مسلم افسروں کو ان کے عہدوں سے معزول کرنا شروع کردیا اور ان کی جگہ مرہٹہ افسروں کو مقرر کردیا۔ اس کی تصدیق ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس سے بھی ہوتی ہے اس میں لکھا گیا ہے :-

"جنجی جون کو سیواجی اپنے آپ کو گول کنڈہ کا ملازم ظاہر کرتا رہا۔ تیسری جولائی کو معلوم ہوا کہ وہ گول کنڈہ کے افسروں کو نکال کر ہر جگہ اپنے مرہٹہ افسر مقرر کر رہا ہے" [1]

[1] ہنگل بیٹ ڈسٹرکٹ گزیٹر ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند ص ۲۷۵

"تاناشاہ کو جب اس کی اطلاع پہونچ گئی تو فرط حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ اور صاف نظر آیا کہ اس کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ محض ایک سیاسی فریب تھا۔ ایک گہری چال تھی اور سراسر دھوکا تھا۔ پانی اب سر سے اونچا ہو چکا تھا اس لیے اس کے خلاف کوئی فوری اقدام ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن رسل و رسائل اور اخراجات کے لیے مالی وسائل کا سلسلہ موقوف کر دیا گیا۔ لیکن مرہٹوں نے اس کی پروانہ کی کیونکہ ان کے حصول کے دوسرے دروازے ان کے سامنے برابر کھلے ہوئے تھے لوٹ مار اور چنگیزی غارت گری ایشا شہرت عام کی سند انھیں پہلے ہی سے حاصل تھی اب انھوں نے اپنے روز افزوں اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اسی کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بنایا۔ اس بارے میں اسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریکارڈس میں ۲۳ر اکتوبر کی تحریر ملاحظہ فرمایئے :-

"اگر یہ کہا جائے تو بالکل موزوں ہوگا کہ ملک کی ہڈیاں تک چوس لی گئی تھیں۔ سیواجی اپنے فن میں نہایت درجہ ماہر تھا اس کے ہاتھ سے زمین میں گڑے ہوئے خزانے بھی محفوظ نہیں رہے اس کا خفیہ محکمہ نہایت چست اور اعلیٰ درجہ کا تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جس نے توہم پرست لوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت کو بڑھا دیا۔"

سیواجی جنجی کے بعد ویلور پر قبضہ کے ساتھ تنجاور کا رخ کیا۔ تنجاور میں سیواجی کا سوتیلا بھائی اکوجی حکمراں تھا۔ وہ اپنے بھائی سیواجی کی مدافعت کے لیے نکل پڑا۔ طرفین میں زوردار جنگ ہوئی۔ ابھی یہ جنگ جاری تھی اور کسی فیصلہ پر نہیں پہونچی تھی کہ سیواجی جنوب کی ایک مہم اپنے ایک جنگی افسر کے سپرد کرکے پونہ روانہ ہو گیا۔ روانگی کے وقت راستہ میں ملنے والے تمام ملکوں پر قبضہ کرتا گیا اس طرح سہکوٹہ، بنگلور، بالاپور، شاہ نور وغیرہ جن میں اکثر بیجاپور کے علاقے تھے اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور وہاں کے حکام کو نکال کر اپنے حکام کے حوالے کر دیا اس طرح اب تنجاور سے لے کر پونہ تک ایک نئی مرہٹی حکومت وجود میں آ گئی تھی۔ اور عام طور پر ہندوؤں میں یہ پھیلی ہوئی یہ پیشین گوئی کہ عنقریب ایک فاتح اور نجات دہندہ آنے والا ہے۔ جس سے ہندو فتح و کامرانی فراغت و خوشحالی سے ہمکنار ہو گئی۔ اب ہندو یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ نجات دہندہ آ گیا ہے۔ اور وہ ہے سیواجی چنانچہ کرنل ولکس اپنی تاریخ میں اس عجیب و غریب پیشین گوئی کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے :

"اس زمانہ میں جب ذوالفقار خاں کی فوجیں جنوبی ہند پر قبضہ کر رہی تھیں تو کسی ہندو نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ زمین پر آسمانی بلائیں نازل ہوں گی۔ کالی جی زمین پر اتر آئے گی اور اس وقت اس کے غضب سے کوئی نہیں بچے گا۔ بچہ ہو یا بوڑھا، شریف ہو یا رذیل سرمایہ دار ہو یا مزدور سب تباہ ہو جائیں گے۔ انسانیت کا نام تک باقی نہیں رہے گا۔ جب اس حالت پر دیگر گزر جائے گا تو ایک فاتح اور نجات دینے والا آئے گا جو ہندوؤں کو اس ظلم و ستم سے نجات

دے گا۔"

"سیواجی کو ہندوؤں نے دہری نجات دہندہ سمجھ لیا۔"[1]

سیواجی کی ان فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا جنوبی ہند اب مرہٹی ہندوؤں کے قبضہ میں تھا۔

جنوبی ہند مغلیہ دور میں

۱۶۷۷ء میں مغل حکومت بیجاپور میں حملہ آور ہوئی۔ اور اسی سال سیواجی جنوبی ہند سے پونہ واپس آگیا تھا۔ اس حملے کے دوران بیجاپور نے گول کنڈہ اور سیواجی سے امداد طلب کی۔ جنگ کا سلسلہ بڑی شد و مد سے جاری تھا کہ سیواجی ۱۶۸۰ء میں چل بسا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سنبھاجی نے سنبھالا۔ عالمگیر اورنگ زیب نے دیکھا کہ جنگ طول پکڑتی جارہی ہے اور اس کا نتیجہ نہیں نکلتا ہے تو وہ خود ۱۶۸۲ء میں دکن آیا اور اپنی فوج کو بیجاپور کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ بیجاپور اپنے وسائل سے کام لے کر مدافعت اور مزاحمت کرتا رہا اور یہ لڑائی مسلسل چار سال تک چلتی رہی۔ بالآخر بیجاپور کو شکست اٹھانا پڑی اور ۱۶۸۶ء میں بیجاپور پر مغلیہ پرچم لہرانے لگا۔ اور اس کے ٹھیک ایک سال بعد ۱۶۸۷ء میں گول کنڈہ پر بھی مغلیہ سلطنت کا قبضہ ہوگیا اس طرح دکن کی دونوں عظیم سلطنتیں عالمگیر کے ہاتھوں صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہ گئیں۔ جنوب کی ان دونوں سلطنتوں کے خاتمہ کے متعلق مقامی اور غیر مقامی جن میں انگریز مورخین بھی شامل ہیں بہت کچھ لکھا ہے اور ان سب کا نچوڑ بہ تغیر الفاظ یہ ہے کہ :۔

"اگر یہ سلطنتیں باقی رہتیں تو مرہٹی طاقت ترقی نہ کرسکتی ان سلطنتوں کو عالمگیر نے تباہ کرکے مرہٹی طاقت کو ترقی کا موقعہ دیا۔" "عالمگیر نے اسلامی سلطنتوں کو مٹا کر اچھا کام نہیں کیا۔"

"دکنی سلطنتیں اگر باقی رہتیں تو جنوب میں اسلام کو بہت ترقی ہوتی۔" اس پر تاریخ جنوبی ہند لکھتا ہے :۔

لیکن اگر واقعات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالمگیر نے جو کچھ کیا وہ عین مصلحت اور سیاست وقت کے مطابق تھا۔ ہاں اس بات کو ماننے سے انکار نہیں کہ بیجاپور اور گول کنڈہ کی سلطنت بہت دیر میں فتح ہوئی یہ سلطنتیں اگر فتح ہوجاتیں جب وہ دکن کا صوبیدار بن کر آیا تھا تو اس کے

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۱۶۶

دو نتیجہ نکلتے۔ (۱) مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت اسی وقت ختم ہو جاتی (۲) تمام جنوبی ہند مغلوں کے قبضہ میں اسی وقت آجاتا۔" [1]

لیکن تاریخی پس منظر میں ہمیں جو اسباب نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں (۱) عالم گیر دکن میں اپنے صوبیداری کے زمانہ میں سولہویں صدی میں احمد نگر کا خاتمہ کر کے ، ۲ سال بعد بیجاپور اور گول کنڈہ کو اپنا باجگزار بنایا (۲) دوسری طرف اس نے ۱۶۳۶ء میں جنوب کے دوسرے ملکوں پر قبضہ کے لیے بیجاپور کو مامور کر دیا اور بیجاپور کی فوج دولہ خاں مشہور جنرل کی سپہ سالاری میں ایک سال میں جنوبی ہند کا بہت بڑا حصہ اپنے قبضہ میں لے لیا۔ (۳) اسی عالم گیر کے حکم سے جنجی اور بنگلور جیسے اہم مقامات شاہ جی کو اس کی جنگی خدمات کے بدلہ میں بطور جاگیر دے کر مرہٹوں کو جنوب میں ایک طاقت بن کر ابھرنے کا زریں موقع فراہم کر دیا۔ اور اسی زمانہ سے جنوب میں مرہٹے آباد ہونے لگے (۴) شاہ جہاں کا اس کے سیاسی اور ملکی لحاظ سے اچھی کارگزاری اور کامیابی کے عین زمانہ میں اس کو دکن سے ہٹا کر گجرات بھیجنا (۵) شاہ جہاں کا اپنی غلطی کا احساس ہونے پر عالم گیر کو ۱۶۵۲ء میں دوبارہ دکن بھیجنا اور عالم گیر کا بیجاپور اور گول کنڈہ کو جو مرہٹوں کی طاقت کا اصلی سرچشمہ تھے انھیں ختم کرنے کے لیے قدم اٹھانے پر شاہ جہاں کا اس کو اس سے باز رکھنا (۶) یہ مسلم سلطنتیں بھی ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی اور اپنی طاقتوں اور توانائیوں کو باہمی جنگ و جدال پر صرف کرتی رہیں ان کی ان رقیبانہ اور مخالفانہ سرگرمیوں نے دوسری مخالف طاقتوں کو جنم دیا۔ اور انھیں ابھرنے اور پنپنے کا موقع بہم پہونچایا۔ (۷) شاہ جہاں کی رحلت کے بعد تخت نشینی کے لیے خانہ جنگیاں اور اس میں اورنگ زیب کا الجھ جانا۔ (۸) پرتگیزوں اور انگریزوں کی آپس میں لڑانے کی چالبازیاں۔

ان متضاد حالات کو سامنے رکھ کر اگر بغور دیکھا جائے تو سیاسی کوتاہیاں، بے اندیشی کی لغزشیں، شاہ جہاں، عالم گیر، شاہ جی، سیوا جی، فرماں روایان بیجاپور و گولکنڈہ کی غلطیوں کا کم و بیش حصہ رہا اور انھیں اپنی غلطیوں کا خمیازہ جلد یا بدیر بھگتنا بھی پڑا۔

ان حالات میں تاریخ جنوبی ہند کے مصنف کا یہ لکھنا کہ :-

" عالمگیر نے جو کچھ کیا وہ عین مصلحت اور سیاست وقت کے مطابق تھا" تمام تر درست نہیں کہا جا سکتا اور یہ عالمگیر ہی تھا جس نے ۱۶۵۷ء میں اپنے جنرل شائستہ خاں کو جب دکن کی مہم پر روانہ کیا تو اس کے ساتھ راجہ جسونت سنگھ کو بھی متعین کر دیا اور اس نے سیوا جی

---

[1] تاریخ جنوبی ہند محمود خاں محمود ص ۲۶۸

سے باز رکھا۔ درپردہ وہ اس کو ہر طریقہ سے امداد پہونچاتا رہا۔ جس کے نتیجہ میں شائستہ خاں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہوسکا اور اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ راجہ جسونت سنگھ کی غداری اور اس کی خفیہ کمک رسانی سے سیواجی اتنا زور پکڑ گیا تھا۔ اور یہی وجہ شائستہ خاں کی ناکامی کی تھی۔ درحقیقت مرہٹوں کو ایک زوردار طاقت بنا کر ابھارنے میں راجہ جسونت سنگھ کا بہت بڑا حصہ تھا۔ کیا یہ عالمگیر کی کم اندیشی اور نا قابل فراموش غلطی نہ تھی۔

بیجاپور اور گول کنڈہ کے فتح کے بعد عالمگیر کی نظریں جنوبی ہند کی طرف اٹھنے لگیں۔ اس نے دیکھا کہ سرا جیسے اہم مقام سے اس کی صوبیداری سیواجی کے ہاتھوں لٹ چکی ہے اور سارا ملک مرہٹی راج بن گیا ہے۔ دوسری طرف تنجاور سیواجی کے بھائی ایکوجی کی حکمرانی میں ہے اور شاہ جی نے اپنی بنگلور کی جاگیر دمن کو دے دی تھی۔ لیکن سیواجی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سیواجی کے آنجہانی ہونے کے بعد بنگلور، میسور کے راجہ کے ہاتھ فروخت کا معاملہ طے کیا۔ صرف قبضہ دینے کا ایک مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ اور اس کے لیے ایکوجی نے تنجاور سے فوج اس لیے بھیجی کہ بنگلور کو سیواجی کے نظم ونسق کے ذمہ داروں اور کارکنوں کے قبضہ سے لے کر اسے میسور کے راجہ کے قبضہ میں دے دیا جائے۔ اور دوسری جانب میسور کی فوج قبضہ لینے کے لیے سرنگاپٹم سے روانہ ہوگئی تیسری طرف سیواجی کے جانشینوں کی ہدایت کے مطابق اس کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جنجی کی مرہٹہ فوج بنگلور کی طرف بڑھتی آرہی تھی۔ اس طرح قبضہ دینے، لینے، اور روکنے کی تین طرفہ طاقتیں بنگلور کی سمت بڑھتی آرہی تھیں۔

ادھر گول کنڈہ فتح کر کے اس کے قریب ہی عالمگیر ٹھہرا ہوا تھا اس کو بنگلور کے بارے میں تازہ صورت حال کی اطلاع پہونچ گئی۔ وہ بنگلور کی مقامی حیثیت اور اس کی اہمیت سے باخبر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بنگلور کی تسخیر سے بالا گھاٹ اور پائیں گھاٹ پر اس کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔ عالمگیر نے اپنے ایک جنرل قاسم خاں کو حکم دیا کہ وہ جس قدر جلد ہوسکے برق رفتاری کے ساتھ بنگلور پہونچ جائے۔ اور اس کو قبضہ میں لائے جنرل قاسم خاں ——— ایک آندھی کی طرح بنگلور پہونچا۔ وہاں کی فوج سے اس کی ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی بنگلور کی فوج مدافعت میں ناکام ہوگئی۔ اور قاسم خاں بنگلور پر فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا میسور کا راجہ چک دیو سلطنت مغلیہ کا باج گزار بن کر کچھ شرائط پر بنگلور کا اقتدار اس کے سپرد کر دیا۔ تنجاور اور جنجی کی فوجیں قاسم خاں کی آمد سنتے ہی واپس ہوگئیں قاسم خاں نے سرا ہی کو اپنا صدر مقام تجویز کیا۔ اس کے بعد قاسم خاں بالا گھاٹ کی ان ریاستوں کی طرف کوچ کیا جن پر مرہٹے اور پالیگار اپنا تسلط جمائے بیٹھے تھے ان سب پر قاسم خاں نے قبضہ کر لیا۔

اس طرح سرا کی از سرِ نو صوبیداری قائم ہوئی۔ سرا کے صوبہ کے ماتحت حسب ذیل ریاستیں باجگذار تھیں میسور، بالاپور، چیتلدرگ، سیرا ایٹن، بڈنور، ماگڑی، ساگنور، اراکور، بلندور، کلالی اور باکل واڑی۔ ان میں میسور ہی سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور اس کو مذکورہ بالا ریاستوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل تھی۔ بالاگھاٹ کا علاقہ بیجاپور سے میسور تک ایک سال کی مختصر مدت میں مغلیہ حکومت کے قبضہ میں آنے کے بعد عالمگیر کی توجہ اب پائیں گھاٹ کی طرف اٹھنے لگیں۔ پائیں گھاٹ میں اس وقت تنجاور میں سیواجی کا بھائی ایکوجی، مدورا، میں نائک اور جنجی مرہٹہ سردار کی طاقتور حکومتیں تھیں۔ اس کے علاوہ زاجاؤں، پالیگاروں کی مختلف اور متعدد خود مختار ریاستیں تھیں۔ عالمگیر نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ذوالفقار خان کو بھیجا۔ ذوالفقار خان نے یکے بعد دیگرے جنوب کے تمام ملک فتح کر لیے، مدورا اور تنجاور باجگذار بن گئے۔ لیکن جنجی کا مضبوط قلعہ جس پر مرہٹہ قابض تھے۔ اس کو سر کرنے میں نہایت ہی دشواریاں پیش آگئیں ۱۶۹۳ء میں ذوالفقار خان جنجی کے قلعہ کا محاصرہ کیا تھا۔ لیکن یہ محاصرہ طول پکڑتا گیا۔ مرہٹی علاقوں سے اس کی مدد کے لیے فوجیں بڑھتی چلی آرہی تھیں، اس لیے بار بار محاصرہ اٹھا کر ان کا تعاقب کرنا پڑا۔ بالآخر پانچ سال کی مسلسل مجاہدانہ سرگرمیوں کے بعد ۱۶۹۸ء میں جنجی کا قلعہ فتح کر لیا گیا۔

اس قلعہ کی فتح کے بعد جنوب کا سارا ملک راس کماری تک مغلیہ حکومت کے زیر اقتدار آگیا۔ یہی مغلیہ سلطنت کے انتہائی عروج اور سربلندی کا زمانہ تھا۔

قوم نوایط

قوم :۔ قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو خواہ مذہب یا وطنیت، نسل یا پیشہ رنگت یا اور کوئی صفت مادی معنوی وغیرہ ہو۔
القوم: الجماعۃ من الرجال و النساء معاً او الرجال خاصۃ او تدخلۃ النساء تبعیۃ [1]

نائط :۔ کے لفظی معنی عربی میں رگ، پشت کے ہیں اس کی تشریح میں وجہ تسمیہ کی ضمن میں تاریخ النوائط کے مصنف لکھتے ہیں :۔
"اس قوم کا اتفاق زمانہ سلف میں حد سے زیادہ تھا اور ایک جز وضعیف کی پستی پر ساری قوم ٹوٹ پڑتی تھی۔ اور اس اتفاق کی وجہ سے قوم کا پیام رہا غالباً اسی لیے عربوں نے قوم النوائط کو اسی نام سے موسوم کیا" [2]
اس قوم کے نام کے بارے میں تاریخی کتابوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً نایطہ یا نائط، بنوالنوائط، نایت، نوابتہ، نوآمدہ، نووارد، نواعط وغیرہ۔

نایط :۔ بعض مورخین لکھتے ہیں۔ نضر ابن کنانہ کے ایک فرزند کا نام نائط تھا اسی نسبت سے ان کی اولاد نایطی کہلاتی ہے۔
چنانچہ مشہور مورخ امام ابو جعفر طبری لکھتے ہیں :۔
"النایطہ طائفۃ من قریش تفرقت من المدینۃ المبارکۃ الطیبۃ خوفاً من الحجاج بن یوسف الذی قتل خمسین الفاً من العلماء و الاولیاء

---

[1] قاموس ، [2] تاریخ النوائط ص ۲۵

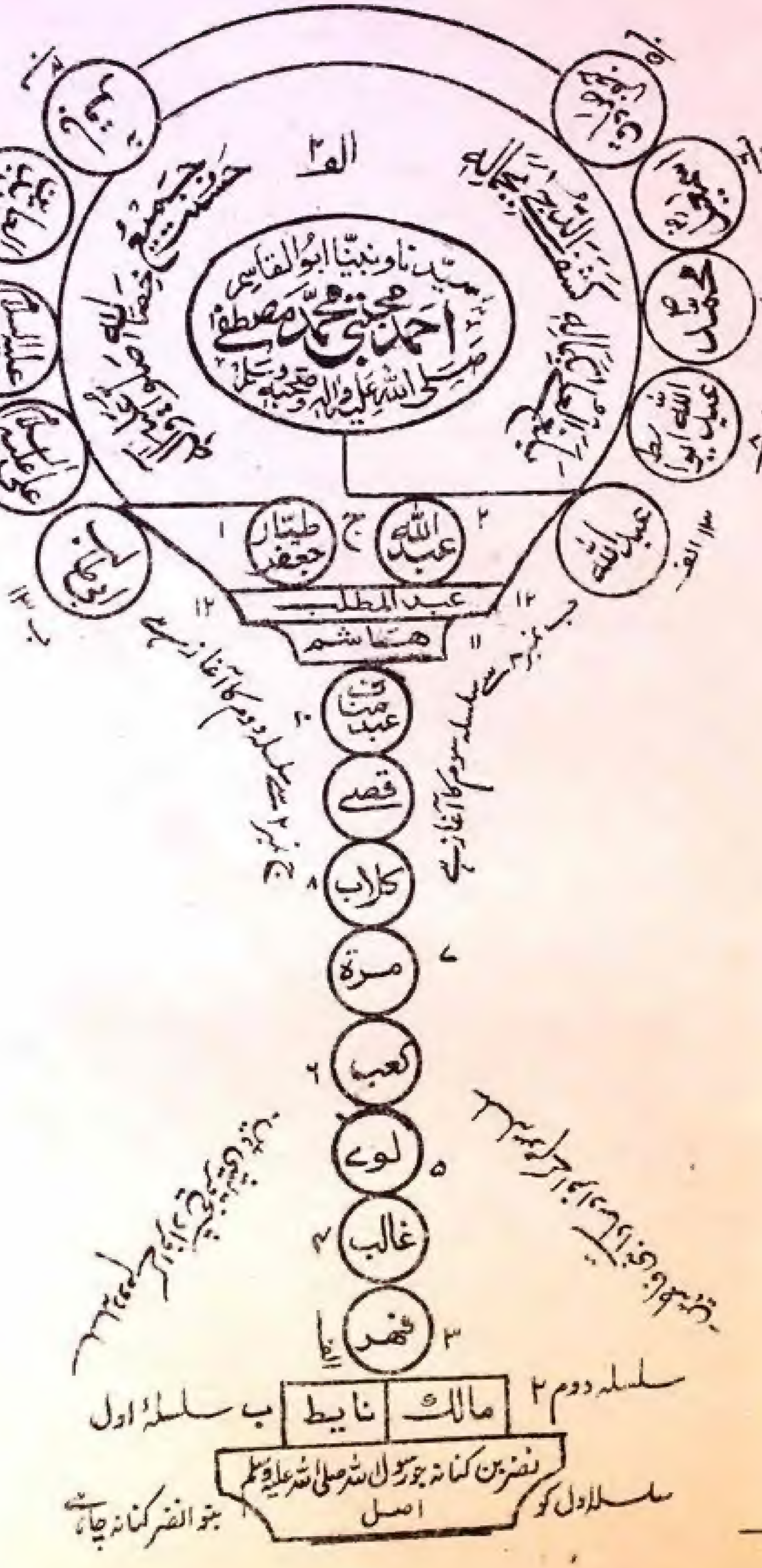

منقول از تاریخ النوایط

حتی وصلت الی بحر الھند فتوطنت فی اماکن فیھا"۔ [1]

یعنی نایط قریش کا ایک گروہ ہے ان کی ہجرت مدینہ طیبہ سے حجاج بن یوسف کے خوف کی بنا پر ہوئی جس نے پچاس ہزار علماء، اولیاء کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آخر وہ بحر ہند کی طرف پہونچے اور وہیں کی سکونت اختیار کی۔ النایطۃ طائفۃ من قریش کی تشریح میں آگے لکھتے ہیں:۔

وقریش اولاد نضر بن کنانہ بن مدرکۃ بن الیاس من اجداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثانی عشر منھم [2]

قوم نایط کا تعلق قریش سے ہے اور قریش نضر بن کنانہ بن مدرکہ بن الیاس کی اولاد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّی سلسلہ کے بارہویں بزرگ ہیں۔

علامہ لوذی لکھتے ہیں:۔ وان سئلت عن قوم یسمونھم فی بلاد الھند بالنایطہ فھم من قوم بنی ھاشم بن عبد مناف بن قصیٰ لان بنی ھاشم آل علی وآل عباس وآل جعفر الطیار والحارث بن عبدالمطلب وھم ینتسبون الیھم۔

اور اگر اس قوم کے بارے میں دریافت کیا جائے جنھیں ہندوستان میں نائطے کے نام سے پکارا جاتا ہے تو ان کا قومی تعلق بنی ہاشم بن عبدمناف بن قصیٰ سے ہے اس بنا پر آل علی، آل عباس، آل حمزہ، آل جعفر طیار اور آل حارث بن عبدالمطلب ان سب کی نسبت بنی ہاشم سے ہے آگے لکھتے ہیں وھم مشھورون باستجابۃ دعائھم اشر عظیمۃ معروف وھم المھاجرون ایام حجاج بن یوسف المدینۃ المنورۃ سنۃ احدی وستین من الھجرۃ النبویۃ [3]

ان کی دعائیں بڑی پر اثر ہوتیں اس لیے وہ استجابت دعا کے لیے مشہور تھے ان کی ہجرت مدینہ منورہ سے ۶۱ھ میں حجاج بن یوسف کے زمانے میں ہوئی۔

مولانا باقر آگاہ ویلوری متوفی ۱۲۲۰ھ لکھتے ہیں۔ اعلم ان النایطۃ قوم من قریش مجتمعون بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم فی نضر بن کنانہ کانوا من جیران المدینۃ زادھا اللہ تشریفا وفارقوا من زمن الحجاج بن یوسف الثقفی الذی جار دایا ذواحل قومہ دار البوار ونزلوا علی سواحل

---

[1] تاریخ طبری منقول از گلستان نسب [2] ایضاً

[3] کفایۃ الطالبین باب الفی والغنیمۃ لوذی رحمۃ اللہ علیہ

بحر الهند، ذکرہ الامام ابوجعفر طبریؒ فی تاریخہ والامام النوویؒ فی کتب الفقہ فی باب الفئی والغنیمۃ اقول سواحل بحر الهند فی قول الطبری عبارۃ عن الکوکنین الکوکن العادل شاهی المضاف الی بیجا فور والکوکن النظام شاهی الی احمد نگر وکلاهما علی الالسنۃ مشهوران وفی الکتب المعتبرۃ مسطوران [1]

جاننا چاہیئے کہ نایطہ کا قومی تعلق قریش سے ہے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدی سلسلہ میں نضر بن کنانہ میں جا ملتے ہیں وہ مدینہ شریف کے باشندے تھے۔ انھوں نے حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں ترک وطن کیا جس نے ان پر ظلم و ستم ڈھایا۔ تباہی مچائی اور ان کی قوم کو ہلاکت کے گھاٹ اتارا۔ وہ بحر ہند کے سواحل پر اتر پڑے امام ابو جعفر طبری نے اپنی تاریخ میں اور امام نووی نے اپنی فقہی کتابوں میں قریش کے خاندان اور قبائل کے تقسیم کے سلسلہ میں باب الفئی والغنیمۃ میں ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں طبری کے قول میں سواحل بحر ہند سے دونوں کوکن میں عادل شاہی کوکن جس کا تعلق بیجا پور سے تھا۔ اور نظام شاہی کوکن جس کا تعلق احمد نگر سے اور وہ دونوں زبان زد خاص و عام ہیں مشہور اور ان کا ذکر معتبر کتابوں میں مذکور ہے۔ اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ عینیہ کی تشریح میں لکھتے ہیں "نایط ایضا قبیلۃ علی احد ماحر فی زبیان وتجمع علی نوایط وحذفت التاء بالترخیم وهذا جائز بالاتفاق ونایطہ جد القبیلۃ بن نضر بن کنانہ وبقیۃ النسب الشریف معروفۃ

نایط بھی ایک ایسا قبیلہ ہے جیسے زبیان کا قبیلہ تھا۔ نوایط ۔ نایط کی جمع ہے ترخیم کی وجہ سے "ت" حذف ہوگئی۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے اور اس قبیلے کے جد اعلیٰ نایط نضر بن کنانہ کے فرزند تھے اور اس قبیلہ کا باقی نسب شریف تو مشہور و معروف ہے۔ [2]

میر غلام علی بلگرامی لکھتے ہیں النوایت کنوابت قوم فی بلاد دکن رأیت فی کتاب فارسی ما ترجمتہ قال الطبری فی تاریخہ النایطہ طائفۃ من قریش خرجوا من المدینۃ المنورۃ خوفا من الحجاج بن یوسف الثقفی قتل خمسین الفا من العلماء والاولیاء وغیرهم علی غیر الحق وبلغوا ساحل بحر الهند وسکنوا بہ [3]

---

[1] النفحۃ العنبریہ فی مدحۃ الخیر البریہ [2] ایضا النفحۃ العنبریۃ
[3] سبحۃ المرجان مصنفہ میر غلام علی بلگرامی

نوائیت جو بلاد دکن میں رہتے ہیں ان کے بارے میں میں نے ایک فارسی کتاب جو تاریخ طبری کا ترجمہ تھا دیکھا جس میں وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :۔

" نایطہ کا تعلق جماعت قریش سے ہے انھوں نے حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں اس کے خوف کی بنا پر مدینہ منورہ سے ترک وطن کیا تھا جس نے پچاس ہزار علماء و اولیاء وغیرہ کو ناحق موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ ہندوستان کے سواحل پر پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کی۔"

میر برہان خاں ہانڈوی لکھتے ہیں :۔

" نوائط صیغہ جمع و مفرد مش نائط قومے است از عرب مختلف الشرح، بتحقیق تاریخ طبری بنی قریش و بہ تحقیق بعض از قوم ملاحین و بہ توضیح منتخب اللباب شرفائے کوفہ اند و علی ای حال از تظلم حجاج بن یوسف جلا وطن از دریا واصل سواحل ہند و بر زمین مرہٹہ مقیم ہند و کوکن شدند و در اوقات سلاطین اربع دکن امتیاز یافتند[1]

خان خانان نظام الملک نے اپنی کتاب میں اس قوم کے ہندوستان آنے اور یہاں آنے کے بعد انھیں کن ناگوار حالات سے گزرنا پڑا۔ اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ہم یہاں ان کے فارسی بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

" کہا جاتا ہے سنہ ۹۰ھ عبد الملک مروان کے دور حکومت میں جب کہ عرب و عجم پر حجاج کا اقتدار تھا۔ سادات بنی ہاشم اور شرفائے قوم کو جہاں کہیں پاتا قتل کر ڈالتا ان کے مکانوں کو جلا ڈالتا۔ اس کے ظلم و تشدد کی بنا پر آل مصطفوی در تنفیذی کی زندگی تنگ ہو گئی اور انھیں اپنا وطن چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ تو وہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کے ساتھ سات یا آٹھ کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ اور کوکن، دابل، چیول، کھمبایت بھروچ اور اطراف مہائم بمبئی بندر کی بندرگاہوں پر جہاں جہاں انھیں موقع ملا اتر پڑے لیکن وہاں کے حکمراں راجہ اور اس کے حکام ان نو واردوں کے اسلام کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے۔ ان کے ٹھہرنے کی راہ میں مزاحم ہوئے۔ آخر ان نو واردوں یا نوودوں نے نہایت پریشانی کے عالم میں اس عہد و پیمان کے ساتھ کہ وہ اپنے دین و ایمان کا کسی حال میں اظہار نہیں کریں گے اور اپنے معبود برحق کی عبادت اور اسلامی رسوم اپنے طور طریقہ پر اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر بجالائیں گے اور جہاں تک ظاہر داری کا تعلق ہے لباس وغیرہ میں اس ملک کے موافق اختیار کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسلامی فرائض عبادات

---

[1] تزک والاجاہی برہان خاں ہانڈوی

کی ادائیگی میں اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ ان کی کوئی بات راجہ اور اس کی قوم کی ناراضگی کا سبب نہ بنے۔ اس طرح کسب و پیشہ وضع و لباس بھی اس ملک کا سا اختیار کرلیا۔ چنانچہ اکثر ساحلی مقامات میں جو قوم نوائتہ کے نام سے مشہور ہیں وہ عرب النسل ہیں اور وہ خود کو حضرت عباسؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، اور دیگر اصحاب رضی اللہ عنہم سے منسوب کرتے ہیں ان اشراف کی عورتیں ہندوانہ رنگ ڈھنگ اور ان کا سا لباس پہننے لگیں اور خدا کی عبادت چھپ چھپا کے بجالائیں یہاں تک کہ شادی بیاہ میں بھی اکثر انھیں کی رسمیں اپنائی جاتی رہیں۔ اس طرح وہ غریب الوطنی اور دوسری قوموں کی ہم نشینی اور حالات کی مجبوری کی بنا پر غیر شرعی امور اور ناجائز رسموں میں مبتلا ہو گئے۔[1]

اب مورخ محمد امین صاحب وقائع سعادت سے بھی کچھ سن لیجئے وہ لکھتے ہیں کہ :-

"نائط عرب کے شیوخ کی ایک جماعت ہے وہ عرب کے باشندے ہیں اور علم و تقوی سے متصف، ان کا شمار شرفائے عرب میں تھا۔ بنو امیہ کا زمانہ ان کے لیے تکلیف دہ رہا تھا۔ حجاج بن یوسف نے اپنے دور نظارت میں اس جماعت کے بعض بزرگوں کو جلا وطن کیا تھا وہ بصرہ سے دکن کے اطراف میں پہونچے اور کوکن نظام شاہی میں پناہ گیر ہو گئے۔ اور ان کے یہاں آنے کے وقت سے اس کتاب کی تحریر سنہ ۱۹۱۸ء تک سات سو سال کا زمانہ گذر گیا۔ یہاں وہ اپنی معاش کے لیے، تجارت زراعت وغیرہ مختلف پیشوں میں لگ گئے۔"[2]

اس سلسلہ میں تاریخ جنوبی ہند کے مصنف لکھتے ہیں :-

"اب ان روایات کے بعد خود اہل نوایط کی روایات کو دیکھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ قوم قریش سے ہیں اس کا سبب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ قریش مکہ معظمہ کی ایک معزز اور سردار قوم تھی۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے ایک نزد بزرگ ہیں۔ بہرحال نوایط کے تین گروہ ہیں (۱) جو اپنے کو نایطہ بن کنانہ کی اولاد بتاتا ہے۔

۲۔ جو مالک بن نضر بن کنانہ کے نام سے مشہور ہے۔

۳۔ جو اپنے آپ کو حضرت امام زین العابدینؒ کی اولاد ظاہر کر کے اپنے نسب نامہ کو مالک بن کنانہ پر ختم کرتا ہے۔[3]

ان تینوں روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ نایط نضر بن کنانہ کی اولاد سے ہیں۔

---

[1] منتخب اللباب خافی خاں جلد سوم (ترجمہ)

[2] وقائع سعادت مصنفہ محمد امین عطار د [3] ایضاً تاریخ جنوبی ہند

ذیل کا شجرہ اس کو اچھی طرح واضح کرتا ہے

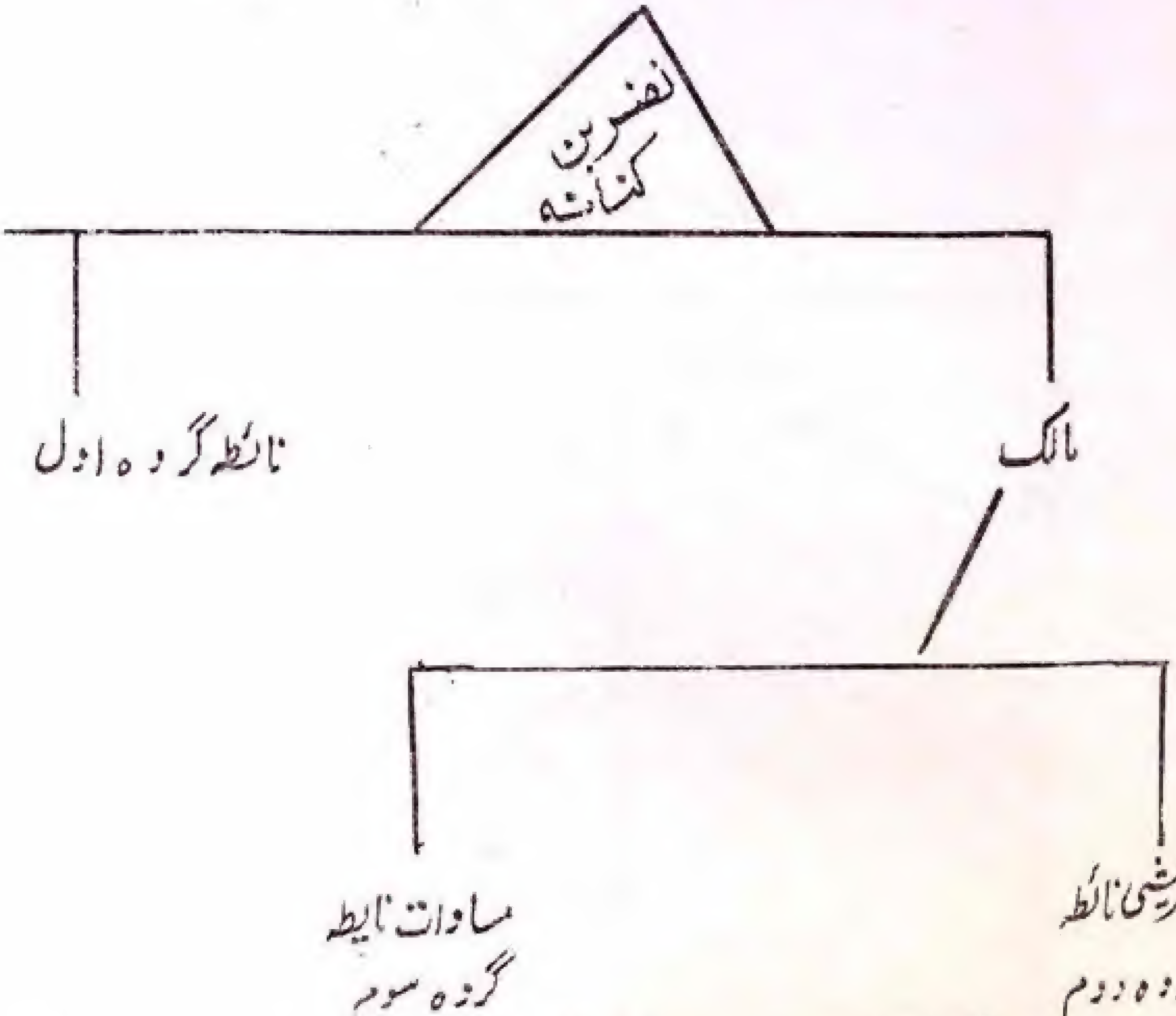

نضر بن کنانہ چونکہ قریش تھا اس لیے تینوں گروہ قریشی ہیں پہلے اور دوسرے گروہ کو چھوڑ کر تیسرا گروہ اہلِ بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ نسب رکھتا ہے اس لیے سادات نائطہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔

ان کا شجرہ حسب ذیل ہے

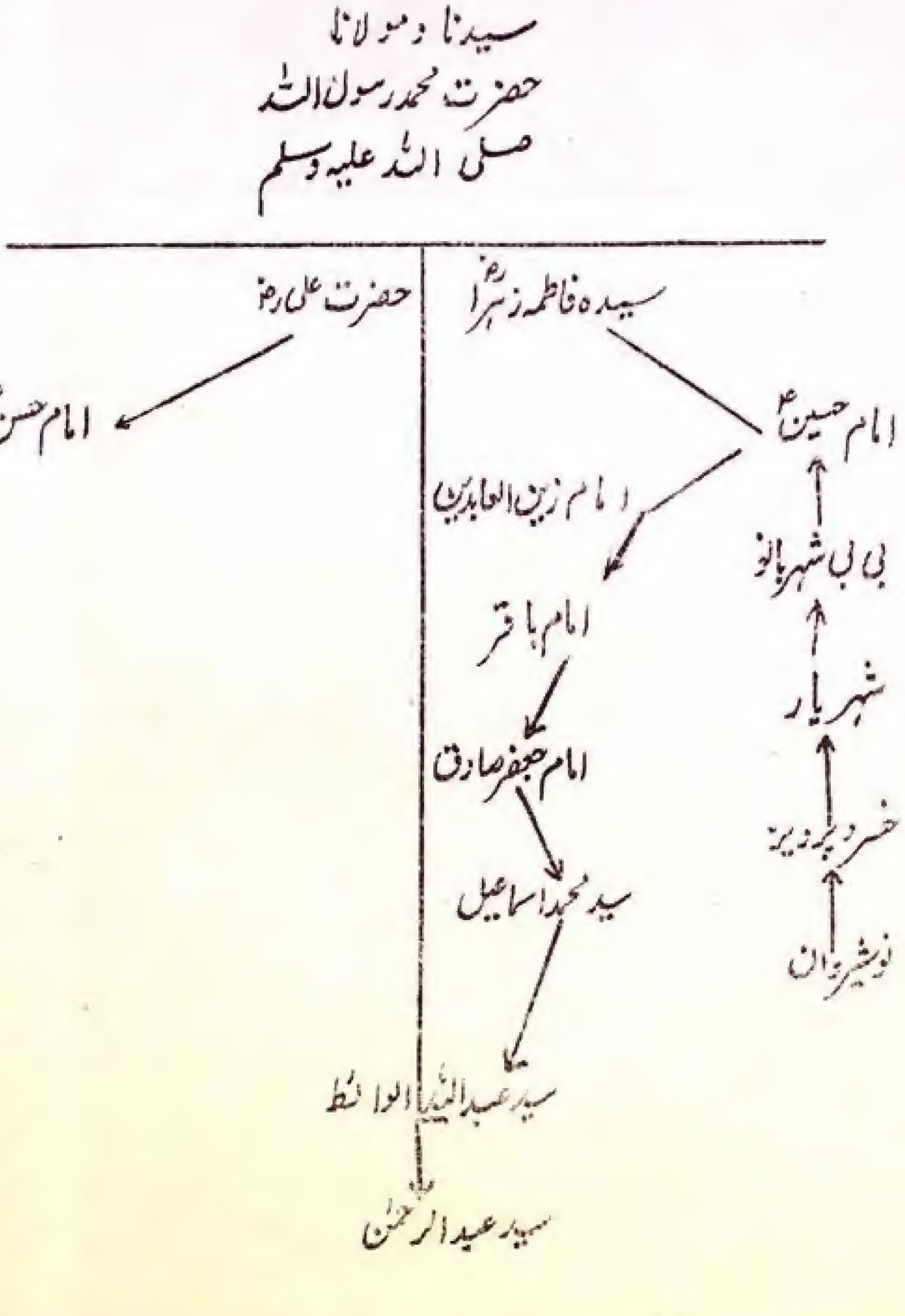

تاریخ جنوبی ہند آگے لکھتا ہے۔
"اس روایت کو تسلیم کرنے میں بعض مورخین کو بجا طور پر شک ہے وہ روایت یہ ہے کہ مالک بن النضر بن کنانہ کی اولاد جس میں پہلا اور دوسرا گروہ شامل ہے نائطہ کہلاتا ہے تیسرا گروہ سید کہلاتا ہے۔ یہ شبہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ صرف نائطہ کی اولاد نائطہ کہلانے کی

مستحق ہو سکتی ہے مالک کی اولاد نائط نہیں کہلا سکتی۔[۱]

اگر مالک کی اولاد خود کو نائطی کہلاتی ہے تو اس شبہ کو بجا قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر وہ اول نایطہ سے نسبی انتساب کی بنا پر نائطی کہلا سکتی ہے لیکن مالک کی اولاد کا نام نائط سے انتساب ناقابل فہم ہے انھیں نائطی نہیں بلکہ مالکی کہنا چاہیئے۔

بنو الوایط

بعض مورخین و محققین اس قوم کو بنو الوایط کے نام سے یاد کرتے ہیں علامہ جلال الدین سیوطی رح لکھتے ہیں۔

"فبلنوالوایط قوم وهم اولاد عبد الله الوابط بن محمد اسماعیل الذی مات فی المدینة المنورة وهو ابن جعفر الصادق رضی الله تعالیٰ عنه وسبب خروجه من المدینة المشرفة انه وقع ذات یوم بینه وبین الخلیفة بحث کثیر وکلام طویل حتی غلب علی الخلیفة والزم علیه الزاماً شدیداً فغضب علی عبد الله الوابط فاخرجه من المدینة الطیبة مع اولاده وقبایله فقدم سیدنا مع عشیرته واهله البغداد وسکن واقام فی موضع الوایط الذی بینه وبین البغداد مسیرة ثلاثة ایام فاقام فیه ایاماً کثیرة۔[۱]

بنی وایط ایک قوم ہے اور وہ عبد اللہ الوایط بن محمد بن اسماعیل جن کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی وحضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فرزند تھے۔ حضرت عبد اللہ کے مدینہ طیبہ سے نکلنے کا سبب یہ تھا کہ ایک دن ان کے اور خلیفہ کے درمیان بحث وگفتگو کا ایک طویل سلسلہ چھڑ گیا جس میں انھوں نے خلیفہ پر نہایت شدید قسم کے الزامات عائد کئے۔ اس طرح وہ خلیفہ پر اپنی بحث میں غالب رہے اور خلیفہ ان سے ناراض ہوگیا اور انھیں ان کی اولاد قبیلے کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکال دیا۔ اور سید عبد اللہ اپنے اہل وعیال اور خاندان کے ساتھ بغداد تشریف لے گئے اور موضع وایط میں جو بغداد سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے بہت

---

[۱] نزہتہ الحقائق، منقول از گلستان نسب

دنوں تک مقیم رہے۔ اس کے بعد علامہ سیوطیؒ آگے لکھتے ہیں۔

"نبينا هم كذلك غلب الروافض على اهل حوالى البغداد وكلفوهم بالرفض البدعة القبيحة فقبل بعضهم الرفض والبدعة الشنيعة واطاعوا فى ذالك الامير الروافض لايقدر ان يكلف قوم بنى الوايط لاجل الاستجاب دعوتهم وحرمة سيادتهم، فانشاء الامير العذر وارسل عليهم رسولا ومعه كتابه مضمونه ان مذهب الشيعة حق وان الخلافة بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم لعلى رضى الله عنه لامدخل لغيره وانتم سادات العظام لم لاتعترفوا الخلافة لجدكم لعلى رضى الله عنه وان اطاعتنا واجبة عليكم قال الله تعالى اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم. فاولى ان تعترفوا بطريقتنا وتقبلوا مذهبنا والا فعليكم الجزية والخراج فابى بنوالوايط من الاطاعة وما قبلوا مذهبهم ولامن الجزية شيئا واشتغلوا بالدعاء عليهم حتى انزل الله تعالى على الروافض المذكورين الوباء والبلاء ووقع فى قلوبهم الرعب وحصل لهم الخوف والهيبة. فندموا وتابوا الى الله جميعا. وجاؤا عندهم للمعذرة وان كان باطنهم مملوا من المكر والخداع فقالوا لهم ادعوا لنا حتى يرفع الله عن البلاء ببركة دعاءكم وايضا ملتمس فى خدمتكم ان بعض الناس لايقبلون اطاعتنا لعدم اطاعتكم لنا فلاانسب ان يعطى كل واحد منكم بيضة من الدجاجة ليعلموا ان قوم بنى الوايط اطاعوا الامير، بعد المشورة لاجل رفع الخصومة والجدال فجاء كل واحد منهم عند الامير بيضة فامر بجمع البيض فى مكان عليحدة فاذا اجتمعوا فقال لهم لايجوز ان ناخذ من بنى فاطمة رضى الله تعالى عنها شيئا قليلا اوكثيرا وقال خذوا حقكم من البيض وارجعوا الى مكانكم فاخذ كل واحد منهم حقه وقالوا للامير انا اخذنا حقنا من البيض ورجعوا الى مكانهم واكلوا اكلهم البيض. فدخل عليهم رسول الامير بعد ثلاثة ايام فقال لهم ظهر الكذب منكم والفساد بينكم لانه اخذ كل واحد منكم حق غيره واكلهم حق غيركم فحصل بهذا السبب ذنبان عظيمان الاولى الكذب والثانى اكل الحرام۔

فالان اعطوا الجزية ام اقبلوا مذهبنا فتفكر بنو الوايط فاشتغلوا

بالدعاء علیھم فما قبل اللہ تعالیٰ الدعاء منھم لان قبول الدعاء مشترطین اکل الحلال وصدق المقال وبعد ذالک سلط الامیر علیھم العساکر وامر بالظلم والایذاء والاخراج ثم ھاجروا من ذالک الموضع الی البصرۃ ونزلوا فیہ۔“ [۱] (خلاصہ)

اس دوران میں بغداد اور اس کے اطراف میں رافضیوں کا غلبہ ہو چلا تھا اور رفض جیسی بدعت قبیحہ اختیار کرنے کے لیے انھیں ہر طرح تنگ کیا جانے لگا۔ ان میں سے بعض نے اسے قبول بھی کر لیا اور امیر روافض کے اطاعت گذار بن گئے لیکن امیر الروافض بنی نوابط کی دعا کی مقبولیت اور عبادت کی حرمت کی بنا پر انھیں زیادہ تنگ کرنے سے ہچکچاتا رہا۔ آخر اپنے ایک قاصد کے ذریعہ اس مضمون کا فرمان بھیجا :۔

”کہ مذہب شیعہ حق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بغیر کسی دخل کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت درست اور صحیح ہے اور آپ بزرگان سادات میں ہونے کے باوجود اپنے جد بزرگوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ہماری اطاعت بھی آپ پر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ان کی جو تمھارے اولوالامر ہیں۔ لہذا تمھارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم ہمارا طریقہ اختیار کرو اور ہمارا مذہب قبول کر لو ورنہ تمھیں جزیہ اور خراج لوازا کرنا ہی پڑے گا۔ بنو نوابط نے نہ شیعی مذہب قبول کیا اور نہ کچھ جزیہ ہی ادا کرنے پر رضامند ہوئے بلکہ اس امر میں امیر کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ اور ان کے حق میں بد دعا کرنے میں لگ گئے۔“

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان رافضیوں پر وبا اور بلا کا عذاب نازل کر دیا جس سے ان کے دلوں میں رعب اور ہیبت طاری ہو گئی پھر وہ اپنے کیے ہوئے پر نادم ہوئے اور اللہ کی طرف رجوع ہو گئے۔ اس کے بعد اہل نوابط کے پاس ملتے بظاہر ان کا یہ آنا معذرت کے لیے تھا مگر ان کا باطن مکر و فریب سے لبریز تھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی دعا کی برکت سے اللہ نے ہماری مصیبت کو دور کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک اور درخواست آپ کی خدمت میں یہ ہے کہ آپ کے ہماری اطاعت کے نہ کرنے سے بعض لوگ ہماری اطاعت نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات مناسب ہو گی کہ آپ کا ہر فرد اپنے طرف سے بطور جزیہ ایک مرغ کا انڈا ہی ادا کر دے تاکہ وہ لوگ یہ جان لیں کہ قوم نوابط بھی امیر کی اطاعت گذار ہے۔

قوم نوابط نے رفع خصومت اور رفع نزاع کے لیے باہمی مشورے کے بعد ان کے ہر فرد نے

---

[۱] نزہت الخفائق منقول از گلستان نسب

ایک ایک انڈا امیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور امیر نے ان سب انڈوں کو ایک الگ جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب یہ سب انڈے اکٹھے ہو گئے تو امیر نے کہا کہ ہمارے لیے بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کسی قسم کا ٹیکس لینے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ جائز نہیں ہے اس لیے آپ ان انڈوں میں سے اپنا اپنا انڈا اٹھالیں اور اپنے گھر چلے جائیں پھر ہر ایک نے ان جمع شدہ انڈوں میں سے ایک ایک انڈا اٹھا لیا اور امیر سے کہا کہ ہم نے اپنا انڈا لے لیا اور اپنے گھر لوٹ آئے اور اس کو کھا لیا اس کے تیسرے دن امیر کا قاصد ان کے پاس پہونچا اور کہا کہ تمھارا کذب اور فساد تو اب ظاہر ہو گیا کیونکہ تم نے دوسرے کے مال کو اپنا کہہ کر لیا۔ اور اس مال غیر کو کھا لیا اس طرح تم بیک وقت دو عظیم گناہوں کے مرتکب ہو گئے ایک تو کذب اور دوسرا اکل مال حرام!

اب تمھارے لیے یہی راستہ ہے کہ ٹیکس ادا کرو، یا ہمارا مذہب اختیار کر لو اس پر اہل نوایط گہری سوچ میں پڑ گئے اور ان کے حق بد دعا میں مشغول ہو گئے لیکن اس مرتبہ بارگاہ خداوندی میں ان کی دعا قبولیت کا شرف نہ حاصل کر سکی کیونکہ قبولیت دعا کے لیے دو شرطیں ہیں۔ اکل حلال، و صدق مقال۔

اس کے بعد امیر روافض نے ان پر فوج مسلط کر دی اور انھیں ظلم و زبردستی سے ملک بدر کرنے کا حکم دیا اور وہ موضع والبطے ہجرت کر کے بصرہ چلے گئے۔ اور وہیں ٹھہر گئے اس کے بعد علامہ سبوطی رح لکھتے ہیں:

ومات رئیس المذکورین السید عبد الرحمان فی البصرۃ تغشاہ اللہ بالرحمۃ والرضوان والمغفرت والاحسان وذالک الوفات والھجرۃ والتفرقۃ والفتن فی سنۃ اثنین وخمسین وسبع مائۃ من الھجرۃ المصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم ثم بعد وفاتہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تعالیٰ ھاجروا من البصرۃ الی سواحل بحر الھند وتوطنوا فیہ [1]

اس دوران میں بصرہ میں اس قوم کے ایک رئیس سید عبد الرحمان انتقال کر گئے اللہ انھیں اپنی رحمت اور رضا کے دامن میں پناہ دے اور ان کے ساتھ احسان و مغفرت کا معاملہ فرمائے یہ وفات و ہجرت اور تفریق دشمنی و فتنہ خیز واقعات ۷۵۲ھ ہجری صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش آئے تھے۔ رئیس مذکور کی وفات کے بعد وہ بصرہ سے سواحل ہند کی طرف

---

[1] کشف الانساب۔ بعض مورخین نے اس کا نام بحر الغنب لکھا ہے۔ بھٹکل میں بعض قدیم گھرانوں میں اس کے قدیم قلمی نسخے اب تک محفوظ ہیں کسی میں اختصار ہے اور کسی میں تفصیل۔ ہم نے متعدد نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد ان میں سب سے قدیم قلمی نسخے جس میں ۱۳ ھ ہجری کی تاریخ پڑی ہوئی ہے نقل کیا ہے۔

روانہ ہوئے اور وہاں کی اقامت اختیار کی"۔

حضرت علامہ نودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

" وان سئلت عن قوم یسمون فی البلاد الہند بالنایطہ فھم من قوم بنی ھاشم بن عبد مناف بن قصی لان بنی ھاشم آل علی و آل عباس و آل جعفر الطیار و الحارث بن عبد المطلب وھم ینسبون الیھم "

اگر اس قوم کے بارے میں دریافت کیا جائے جنھیں ہندوستان میں نایطہ کہا جاتا ہے تو ان کا قومی تعلق بنی ہاشم بن عبد مناف بن قصی سے ہے کیونکہ آل علی، عباس، جعفر الطیار اور حارث بن مطلب ان سب کی نسبت بنی ہاشم سے ہے۔

آگے لکھتے ہیں:۔

" وھم مشھورون باستجابۃ دعاء لھم اثر عظیم معروف "

وہ استجابت دعا کے لیے مشہور رہتے کہ ان کی دعائیں بڑی پر اثر ہوتی تھیں۔

وھم المھاجرون ایام حجاج بن یوسف من المدینۃ المشرفۃ سنۃ احدی وستین من الھجرۃ الطیبۃ زمن استیلاء یزید بن معاویہ۔

انھوں نے یزید بن معاویہ کے غلبہ اقتدار کے دوران حجاج بن یوسف کے زمانہ میں سنہ ۶۱ھ مدینہ مشرفہ سے ہجرت کی۔

" ھاجروا الی سواحل بحر الہند بعد ما قاتل اکثرھم نبعد ماھاجروا ولقد فروا بلادھم صار ومضطرین متحیرین فی دیار الکفر حتی اشتغلوا بالمکاسب الردیہ الی ان اشتھروا فی الاطراف بالسنۃ الکفار بالھنا بانھم ملاحون "

حجاج کے انھیں مظالم سے جب ان کے اکثر افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تو انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور اس کفر آباد ہندوستان میں غریب الوطنی کی پریشانیوں سے انھیں نامناسب پیشے اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جس سے وہ یہاں کے لوگوں کی زبانوں پر ملاحوں کے نام سے مشہور ہو گئے"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

حتی کتب بعض اھل اللغۃ مثل مجد الدین ابی طاھر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی مصنف قاموس اللغۃ النوائی الملاحون فی البحر فولادتہ فی سنۃ عشرین وسبع مائۃ ووفاتہ خمسین وثمان مائۃ وکان

فی زمان هجرة القوم المسطورین سنة احدی وستین فما کتب صاحب القاموس وغیرہ غلط محض عفا اللہ عنہ مع انہم اشرف الاشراف شعوباً وقبائل وہم السادات العظام والمشائخ الکرام طبقتہم اعلیٰ من الطبقات النسبة المعروفة ادامہم اللہ بمحاسن اعمالہم واظبہم فی مکارم انما لہم بقول حسان رضی وانی سنام المجد من آل ھاشم [1]

خلاصہ یہ ہے کہ :-

"بعض اہل لغت نے جیسے مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی صاحب قاموس نے اپنی کتاب میں لکھ مارا کہ نوایت ملاحوں کی ایک قوم ہے وہ ۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۵۰۰ھ میں ہوئی اور اس قوم کی ہجرت کا زمانہ ان سے بہت پہلے ۶۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ اللہ صاحب قاموس کو معاف فرمائے۔ انھوں نے جو لکھا ہے وہ سراسر غلط ہے اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان اور قبیلے کے لحاظ سے نہایت اشراف اور بزرگان سادات اور مشائخ کرام سے تھے اور ان کی نسبت اعلیٰ اور مشہور طبقہ سے ہے۔ اللہ ان کے حسن اعمال اور بزرگانہ افعال کو ہمیشہ قائم رکھے جیسا کہ حضرت حسان رضی بن ثابت کہتے ہیں" آل ہاشم شرف و مجد کا بلند مقام رکھنے والے ہیں۔

علامہ موصوف اپنے بیان کے آخر میں لکھتے ہیں :-

وھذا غایة ما تحقق من اکثر کتب التواریخ ونھایة التنقیح من کتب الارباب وھم الرواة الثقات فی الاحادیث وھم مجتھدون فی مذاھب الاربعہ من اھل السنة والجماعة [2]

اور یہ اکثر تاریخی کتابوں کی تحقیق و تنقیح کا نچوڑ ہے ان کتابوں کے راوی حدیث میں ثقہ اور معتبر ہیں اور وہ اہل سنت والجماعت کے چاروں مذاہب میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔"

علامہ سیوطی نزہت الحقائق میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"نایت ایک ناحیہ کا نام ہے جو بصرہ میں واقع ہے [3]

شیخ احمد طرطوسی اپنی کتاب تاریخ طرطوسی میں لکھتے ہیں۔

" بنو الوائظ سید عبد الوائظ کی اولاد پر مشتمل ایک قوم ہے جو اسماعیل ابن سید جعفر الصادق رضی اللہ عنہما کے فرزند تھے۔

---

[1] لب اللباب فی تحریر الانساب [2] لب اللباب [3] نزہت الحقائق

نایت (بتائے قرشت)

شیخ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی اپنی مشہور کتاب قاموس میں لکھتے ہیں۔
"النواتی الملاحون فی البحر[1] الواحد نوتی یعنی نواتی دریا میں کشتی رانوں کی قوم ہے۔ اس کا واحد نوتی ہے۔

تاج العروس کا مصنف لکھتا ہے۔

الناثیة موضع فی البصرة والیہ نسب ابو الحسن علی بن عبدالعزیز الناثئی المؤدب والمحدث عن فاروق بن عبدالکبیر الخطابی وعنہ ابو طاہر الاشتانی[2]

نایت بصرہ میں واقع ایک موضع ہے اور ابو الحسن علی بن عبدالعزیز اسکی نسبت سے نائتی مشہور ہیں۔ وہ ایک ادیب اور محدث تھے۔ روایت حدیث میں ان کا تعلق فاروق بن عبدالکبیر سے اور وہ ابو طاہر اشتانی سے روایت کرتے ہیں"

مولوی عظیم الدین مدراسی لکھتے ہیں :۔

"اس قوم کا نام بقول صاحب قاموس نواتی تسلیم کیا جائے تو ان کی ملاحی کا ثبوت اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۵۲ھ میں جب اس قوم نے حاکم الوقت کے مظالم کی وجہ سے بصرہ سے ہند کا ارادہ کیا تو بصرہ کا حاکم جس کے مظالم طشت از بام تھے۔ ان کی ہلاکت کا درپے ہوا جن کشتیوں پر یہ لوگ سوار ہو چکے تھے ان کے ملاح بحکم امیر بصرہ کشتیوں سے اتار لیے گئے تو سمجھا گیا کہ اب اس قوم کی ہلاکت یقینی ہے لیکن اس قوم کے بعض افراد کشتی رانی سے کما حقہ واقف تھے جن کی سنی دور نے جہاز کو منزل مقصود پر بسلامت پہونچایا اس واقعہ کے بعد انھوں نے انھیں نواتی کا خطاب دیا[3]۔

چہ خوب۔ اہل عراق نے اس واقعہ کے بعد انھیں نواتی کا خطاب دیا"

یہ مولوی عظیم الدین صاحب کا قیاس محض ہے جس کی کوئی تاریخی قابل اعتماد بنیاد نہیں ہے۔

صمصام الملک شہنواز خاں اور نظام الملک خان خانی مصنف منتخب اللباب نے اس قوم کا ذکر نوایت نوآ بتہ تائے قرشت کے ساتھ کیا ہے۔

تاریخ یمن کا مصنف اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ :۔

---

[1] قاموس [2] تاج العروس شرح قاموس
[3] تاریخ صحیح النسب

"نوایت ملاحوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جامع اللباب کا مصنف لکھتا ہے :۔

"نوایت عائدین کو نہسے ہیں"

اس پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

"تیسری روایت عائدین کو نہ ہونے کی ہے۔ اس سے صرف اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ عجب نہیں نوائط چند شہر کو نہ سے آئے ہوں۔ جو وایطہ سے قریب ہے۔[۱]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب سے آنے والے مختلف حالات میں مختلف ملکوں سے آئے تھے۔ ان آنے والوں میں یمن کے باشندے بھی رہے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تاریخ یمن کے مصنف کو مغالطہ ہو گیا ہو کیونکہ یمن کے ایک شہر جس کا نام صنعا ہے وہاں کا ایک مشہور قبیلہ ناعط ہے اس قبیلہ کے افراد اپنے قبیلہ کی نسبت سے اپنے آپ کو نواعطی سے منسوب کرتے تھے یہ ایک الگ قبیلہ ہے انھیں زیر بحث نوایط سے کوئی تعلق اور نسبت نہیں ہے۔ عجب نہیں کہ اس قبیلہ نواعط کے بعض افراد جہاز ران بھی رہے ہوں۔

نوایت کے متعلق تاریخ فرشتہ کا ایک انکشاف

ملا قاسم ہندو شاہ تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے :۔

"بعد ازاں کہ رفتہ رفتہ نزد مسلمانان دراں ملک بسیار شد بسیارے از ملوک ملیبار بحلقۂ اسلام درآمدند و راجہائے بندرگاہ دوال و چیول وغیرہ از طریق حکام ملیبار مسلمانان راکہ از عربستان آمدند و سواحل آں دیار مسکن دارند مخاطب بہ نوایت یعنے خدا وندگار دانیدند الخ[۲]

فرشتہ کے اس انکشاف کا مطلب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملیبار کے راجہ اور پرجا عرب مہاجرین کو عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے ان کی اسلامی قدر و منزلت کے مد نظر انھیں نایت کے خطاب سے نوازا تھا۔

بعض مورخین کے نزدیک یہ نائک کا بدل اور اسی مفہوم کا حامل ہے۔ جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے ملیبار کی کسی قدیم تاریخی کتاب میں یا ملیالم زبان میں نوایت یا نائک کے فرشتہ کے مفہوم کا کوئی لفظ مروج ثابت نہ ہو سکا البتہ کنڑ زبان میں کم و بیش اس مفہوم کو ادا کرنے والا ایک ملتا جلتا لفظ نائک ہے لیکن نوایت اور نائک میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے اور فرشتہ نے نائک نہیں

---

[۱] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۷۰

[۲] تاریخ فرشتہ جلد دوم بہ ضمن وقائع ملیبار

بلکہ لوایت لکھا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"مسلماناں را از عربستان آمدند و سواحل آں دیار مسکن دارند مخاطب لوایت یعنے خداوند گردانیدند"

ہمارا خیال ہے کہ عربستان سے ابتدا میں جو مسلمان ہند میں آئے ان کا تعلق قریشی نایطہ قبیلہ سے تھا اور اسی نسبت کی بنا پر انھیں نایت یا لوایت سے مخاطب کیا گیا۔

ملیبار کے مسلمان دو حصوں میں منقسم ہیں نایت اور ماپلے، ان میں وہ قدیم مسلمان جو عرب سے ترک وطن کرکے ہند میں مستقل طور پر بود و باش اختیار کی وہ نایطہ یا نائت کہلائے اور جو مقامی باشندے بعد میں مسلمان ہوگئے اور جو یہاں کی عورتوں سے شادی بیاہ کی اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ ماپلوں سے منسوب اور موسوم رہے۔

چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :۔

"جنوبی ہندوستان میں ایک شریف عرب النسل قوم نایت اور نوایط آباد ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ وہ ان ہی نوائتین یعنی جہاز رانوں کی اولاد میں ہیں جو بعد کو سواحل ہند پر آباد ہوگئی تھیں[1]۔

عربوں کی جہاز رانی، کے مصنف کے اس خیال سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے "کہ وہ ان نوائتین یعنی جہاز رانوں کی اولاد میں ہیں"

بحرین، یمامہ، عمان، حضرموت، یمن، مسقط، عمان وغیرہ سر سبز اور زرخیز ساحلی مقامات ہیں اور اکثر عربی ممالک ساحلی علاقوں میں واقع ہیں۔ اس لیے طبعی اسباب اور مواقع کے لحاظ سے ان کے بعض افراد بوقت ضرورت جہازرانی کی خدمات انجام دیے لیکن اس بنا پر پوری قومیت کو نوائیں یعنی جہاز رانوں کی اولاد قرار دینا تاریخی روایات کی روشنی میں جس کا ذکر ہم گزشتہ صفحات میں کر آئے ہیں درست نہیں کہا جا سکتا۔ عرب وغیرہ ملکوں سے آنے والے اکثر تاجر تھے اور تجارت ہی کی غرض سے ان کی آمد و رفت کا سلسلہ قائم رہا۔ اور ان میں سے بعض نے یہاں کی رہائش اختیار کی تو اس کا مقصد بھی تجارت ہی تھا جس کو دوسرے مورخین کے علاوہ خود عرب و ہند کے تعلقات کے مصنف نے بھی انھیں تاجر اور سوداگر کے نام سے یاد کیا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکین وطن ہیں جو موپلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی ان کے

---

[1] عرب جہاز رانی ص۴۲

ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو دیسی باشندوں میں سے مسلمان ہو گئے ہیں یا شادی بیاہ کے ذریعہ سے ان کی برادری میں آ گئے ہیں[1]

شیخ زین الدین معبری المتوفی ۹۲۸ھ لکھتے ہیں :-

"مسلمانوں کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد یہودی اور عیسائی تاجر یہاں آتے رہے اور یہیں کی رہائش اختیار کی ظہور اسلام پر اسلام کی دو صدیاں گزرنے پر عرب و عجم کے مسلمان درویشوں کی ایک جماعت حضرت آدم علیہ السلام کے نقش قدم کی زیارت کے لیے سراندیپ (سری لنکا) جاتے ہوئے مخالف ہوا کے زد میں آ کر ان کا جہاز ملیبار کے ایک ساحل کدنگلور کرنگانور میں آ لگا اور اس طرح ان کے آنے کی اطلاع اس وقت کے راجہ زیمورساموری تک پہونچ گئی۔ اس نے انھیں عزت و اکرام کے ساتھ اپنے دربار میں بلایا۔ اثنائے ملاقات میں دیگر باتوں کے علاوہ اسلام کا ذکر بھی آ گیا راجہ نے کہا کہ میں یہودیوں اور عیسائیوں سے تمھارے پیغمبر اور مذہب کے بارے میں کچھ باتیں سنتا آیا ہوں۔ اب تم ہی اس کے متعلق بتلاؤ قافلے کے سردار نے اسلام کی حقیقت اور معجزہ شق القمر کو نہایت سوز دروں اور موثر انداز میں بیان کیا راجہ کا دل اس سے متاثر ہوا اور اس کے دل میں اسلام اور پیغمبر اسلام سے محبت پیدا ہو گئی۔ اسلام کی حقیقت اور صداقت اس کے دل میں اتر گئی۔ فادخل اللّٰہ سبحانہ فی قلبہ صدق النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فامن بہ ودخل فی قلبہ حب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم[2]

پھر راجہ نے ان سے کہا سیلون سے آدم علیہ السلام کی قدم کی زیارت کے بعد وہ اور ان کے ساتھی جب لوٹ آئیں گے تو وہ بھی ان کے ہمراہ جائے گا۔ اور تاکید کی کہ وہ اس راز کو ملیباریوں سے پوشیدہ رکھیں گے۔

سیلون سے جماعت لوٹ آئی تو راجہ نے شیخ قافلے سے کہا کہ وہ سفر کے لیے کسی جہاز کا انتظام کریں اس طرح کہ اس کے سفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو پائے اس بندرگاہ پر عرب تاجروں کے بکثرت جہاز موجود تھے ایک جہاز راں سے شیخ نے کہا کہ میں اور میرے ساتھ درویشوں کی جماعت تمھارے جہاز پر سفر کرنا چاہتے ہیں مالک جہاز رضامند ہو گیا۔ عین سفر کے وقت راجہ نے اپنے گھروالوں اور اپنے وزیروں سے کہا کہ وہ سات روز تک اس کے پاس آنے اور ملنے سے باز رہیں۔ اور اپنی غیر حاضری میں اپنی زیر حکومت شہروں کا انتظام ایک ایک شخص کے سپرد کر دیا اور ہر ایک کے لیے فرامین لکھ دیے جس میں ان کی حکومت کی سرحدوں کی تفصیل تھی تاکہ کوئی

---

1. عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۶۹
2. تحفۃ المجاہدین صفحہ ۱۳

ان حدود سے تجاوز نہ کرسکے۔

ثم انھم سافروا الی سیلون و رجعوا الیہ فامر الشیخ الملک بان یدھی مرکبًا لسفر من غیر ان یعلم بہ احد وکان فی البند رالمذکور مراکب کثیرۃ للتجار العرباء فقال الشیخ لصاحب مرکب انا جماعۃ الفقراء یتوقعون ان یرکبوا فی مرکبک فرضی بذالک صاحب المرکب لما قرب وقت السفر نھی الملک اھل بیتہ و وزرائہ ان یدخل احدٌ منھم مدۃ سبعۃ ایام وعین فی کل بلدۃ من بلدانہ شخصا وکتب لکل کتابًا مفصلا بتعین الحدود حتیٰ لایتجاوز احدٌ من حدہ الذی عینہ۔[1]

راجہ نے سب امرا کو بلاکر کہا کہ میں اب خدا کی یاد کے لیے کچھ وقت دینا چاہتا ہوں یہ کہہ کر اس نے ملک سب افسروں میں برابر تقسیم کردیا اور خود چھپ کر ان درویشوں کے ساتھ عرب چلا گیا اور مسلمان ہوگیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ملیبار میں اسلام پھیلانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ تم لوگ ملیبار میں تجارت اور سوداگری کا کاروبار شروع کرو اور اپنے امرا کے نام ایک ہدایت نامہ لکھ کر ان کے سپرد کردیا کہ ان غیر ملکی سوداگروں کے ساتھ ہر قسم کی رعایت وعنایت اور مہر وکرم کا سلوک کیا جائے اور ہر نیک کام میں ان کی مدد کیجائے۔ انھیں اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے اس طرح تمھارا احسن سلوک انھیں وہاں اپنے اور اس کو اپنا وطن بنانے میں کسی قسم کی رکاوٹ واقع نہ ہونے دے۔

اس خط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سوداگروں کو وہاں ضروری سہولتیں حاصل ہوگئیں اور وہ اس زمانہ سے وہاں آنے جانے اور رہنے بسنے لگے۔

ایک دوسری جگہ صاحب تحفۃ المجاہدین لکھتے ہیں جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی نقل کیا ہے۔

"ہندوستان کی مغربی ساحل کی بندرگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے شہر آباد ہوگئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان کی آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے بن گئے ہیں یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر سختیاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں باوجودیکہ یہ سردار اور ان کی سپاہ بت پرست ہے مگر وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کے شعائر کا بہت کچھ پاس ولحاظ کرتے ہیں بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد سے

---

[1] تحفۃ المجاہدین صفحہ ۱۴

اس لیے اور تعجب ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بحیثیت مجموعی ملیبار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیونکہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انھیں مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے ۔

متذکرہ حوالجات سے ہمارا مطلب یہ بتانا ہے کہ ملیبار میں آنے والے جہاز راں نہ تھے بلکہ تاجر اور سوداگر تھے ۔ وہ اسی غرض سے وہاں آتے جاتے رہے اور بعد میں اسی تجارت ہی کے لیے وہاں رہنے سہنے لگے ۔

فاضل مصنف جناب ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی اپنی کتاب تاریخ کوکن میں بعنوان " نوائط " نایت " مسلمان لکھتے ہیں ۔

" علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی تصنیف کشف الانساب سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مسلم عرب مہاجرین کا پہلا قافلہ حجاج بن یوسف کے مظالم سے تنگ آکر سنہ ۸۰ھ مطابق سنہ ۶۹۹ء کے دوران ہندوستان میں پناہ گزین ہوا تھا ۔ اس قافلے میں بصرہ کے موضع وایط کے مہاجر تھے ۔ بنو النظر کے توسط سے قوم قریش سے جن کا شجرہ ملتا ہے [1]

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے جرأت مندانہ اقدام کے خلاف عبدالملک بن مروان کی استعماری طاقتیں حجاج بن یوسف کی سرکردگی میں مکہ معظمہ میں صف آرا ہو چکی تھیں ۔ پانچ ہزار کے قریب علماء و صلحا کی شہادت میں ابن زبیر کی شہادت کا خون زیادہ گہرا نظر آتا ہے ۔ سادات بنوہاشم زندانی بن گئے اور کچھ گھرانے بند حیات سے آزاد ہو گئے ۔ انصار کچل دیے گئے اور باقیات صالحات حرمین شریفین سے ہجرت کر کے شمالی افریقہ اور اندلس کے محاذوں پر چلے گئے ۔ ایک قافلہ نے اس طرف کا رخ کیا جہاں سے بیرِ عرب کو ٹھنڈی ہوا آتی تھی ۔ مہاجرین عرب کا یہ قافلہ جزائر بمبئی کے آس پاس ، سوپارہ ، تھانہ ، یا چیمور کی بندرگاہ پر اترا تھا ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو آل عباسؓ و زبیرؓ و طلحہؓ سے منسوب کرتے تھے عبد الملک بن مروان نے جب مختار بن ابی عبید الثقفی کو کوفہ کا مختار اعلیٰ مقرر کیا تو امویہ اقتدار کے دامن تلے انتقام حسینؓ کی ایسی آگ بھڑکائی کہ قاتلین کے بچے کھچے گھرانے بھسم ہو گئے ۔ جو بچ نکلے وہ خوف کا پہرہ توڑ کر بھاگ نکلے ۔ فرات کی وادیوں کے باسیوں کو باٹکوٹ کی کھاڑی کے کنارے عربوں کی قدیم بستیوں میں پناہیں ملیں ان میں سے کچھ کھمبایت کی طرف چلے گئے جہاں ان کی اولاد کیمنو آئیتہ کہتے تھے اور جب سنہ ۳۶-۹۲۳ کے درمیان

---

[1] تحفۃ المجاہدین منقول از عرب و ہند کے تعلقات ص ۲۶۷/۲۶۸ بحوالہ دعوت اسلام صفحہ ۲۸۲ — ۲۸۳

قرمطیوں نے تلواریں سونت لیں تو تارکین وطن کا تیسرا قافلہ کوفہ اور بصرہ سے کوچ کر کے ملیبار پہونچ گیا یہاں انھیں موپلا اور بتی کہنے لگے۔ سقوط بغداد ۱۲۵۸ھ کے بعد جب خلافت اپاہج اور جذباتی علامت بن کر رہ گئی تھی ہلاکو کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تو عرب و عجم کے آشفتہ سروں کو ہندوستان ہی میں سر چھپانے کی جگہ ملی۔ کچھ دلی کی گلیوں میں جا بسے اور کچھ بحری مسافروں کو کوکن کا کنارا مل گیا۔ ترک وطن کا سلسلہ ہر دور میں چلتا رہا۔ کبھی تجارت کا تعلق ترک وطن کا سلسلہ بن گیا اور کبھی حفاظت کی حاجت ہجرت کا بہانہ بن گئی اور جب دکن میں اسلامی حکومت کا دہنیج چڑھا تو دجلہ و فرات کے کنارے اور جیحون و سیحون کے کنارے مغربی ساحل سے مل گئے۔

اس کے بعد انھوں نے تاریخ فرشتہ کی وہ عبارت نقل کی ہے جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں پھر آگے لکھتے ہیں :۔

" مورخین گجرات سے لے کر ملیبار تک بسنے والے نوآبادکاروں کی نسلوں کو نوایط یا نایت ہی کے لقب سے موسوم کرتے ہیں مگر نوایطی قوم کی وحدت میں ہزاروں گھرانوں اور قبیلوں کی اکائیاں ملتی ہیں۔ تاریخ جن کو ایک سلسلہ کی کڑیاں شمار کرتی ہے مگر عمرانی اور بدنی جائزوں کو یہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں۔"

پھر لکھتے ہیں :۔

" نوایط " فرشتہ بیان کرتا ہے کہ ملیبار کے راجہ عرب مہاجرین کے تیسرے قافلے کو جو کہ گومنت کے سلاہار اور کدمب حکومتوں کے دوران میں آیا تھا) ان کے سیاسی مرتبت کے پیش نظر "نایت" کہتے تھے جو غالباً "نائک" کا بدل اور اسی مفہوم کا حامل ہے۔ گجرات میں بھڑوچ، کھمبایت اور بعد میں نداندربار میں بسنے والے نوداردوں کو نوایت ہی کہتے تھے۔ جو سنسکرت کے نوآیتا کی ترکیب ہے۔ قاموس کے اللغاتی فی البحر سے اس کے معنی ملاح ہی کے ملتے ہیں یعنی "خدائے کشتی" (ناخدا)۔

تاریخ النوائط میں ان تمام مختلف قبیلوں کو نوائط ہی کہا گیا ہے اس زمرے میں کوکن کے قدیم مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ جبکہ یہ مہاجرین کے اولین قافلوں کے گزرکاروں میں ہیں جنھیں حجاج بن یوسف اور مختار بن ابی ثقفی نے ڈیرے اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا یہ فرات کی وادیوں اور عراق کی بندرگاہ ہوسے آئے تھے۔ تحفۃ المجاہدین کی روایت سے یہ تاریکی دھندلکا اور بھی صاف ہوجاتا ہے جس میں ملیبار کے نوآبادکاروں کی اولادوں کی دو تقسیم ملتی ہے (۱) ملیبار کے موپلا اور (۲) نایت۔ انھیں کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگیں تھیں۔ خافی خان کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ عہد عالم گیر تک قدیم نوآبادکاروں

کی نسل کو مجموعی طور پر نوائط ہی کہتے تھے۔ مگر اس میں وہ قبیلے بھی خلط ملط ہو چکے تھے جو اپنے آپ کو سادات بنو ہاشم اور اصحاب کبار کے خلاف سے بتاتے تھے۔ "بقوم عرب و نوائط مشہور اند و جمعے کہ از اولاد عباس و زبیر و طلحہ و دیگر اصحاب کبار خود را می گیرند .... الخ" وقت اور حالات کے تھپیڑوں نے انھیں چیول، دابھول، گوا، بھٹکل، چیلون اور دیگر ساحلی علاقوں تک پھیلا دیا۔ انھیں میں غالباً اولین مبلغ اسلام کی اولاد بھی شامل ہو گئیں۔" [1]

یہاں بحث ان کی جہازرانی اور ملاحی سے مطلقاً انکار یا اختلاف سے نہیں بلکہ اختلاف ان کے کسب و پیشہ سے متعلق ہے جہازرانی سے فنی طور پر واقف ہونا اور اس کو بوقت ضرورت انجام دینا اور چیز ہے لیکن اس کو ان کا موروثی کسب و پیشہ قرار دینا اور اس بنیاد پر ساری قوم کو ملاحین سے منسوب کرنا محل بحث و نظر ہے۔

چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"جو کچھ روایت ان کی ملاحی اور بحری ان کے پیشے سے تعلق ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا جب کہ وہ اپنے آپ کو قبیلہ قریش اور حجاز سے بتلاتے ہیں تو مکہ و مدینہ میں سمندر نہیں ہے" [2]

صمصام الملک نواب شاہنواز خاں اپنی کتاب مآثر الامراء میں لکھتے ہیں۔

"گویند کہ حجاج بن یوسف ظالم مشہور از روی عناد باستیصال اشراف و اعیان ہمت گماشتہ بسیارے از صلحا و علماء را بہ تیغ بیداد گزرانید ناگزیر مردم از بیم خوفش جلاء وطن اختیار نمودہ ہر جا رفتند بعضے رفتند فریبند جمع از قریش در ۱۵۳ھ از مدینہ طیبہ ہجرت کردہ بہ جہاز بر آمدند و در سواحل بحر ہند متعلق بولایت دکن کہ موسوم بہ کوکن است فرود آمدہ توطن گزیدند زبرور ایام و دھور اعوان کثرت تشعب و ترقی راہ یافتہ اما کن و مواضع آن ناحیہ فرو گرفتند و برائے شناسائی ہر فرقہ را یا بدالگ ملابست یا چیزے نسبت یا آں چیز ملقب ساختند عزیب لقب در یں گروہ شائع است۔"

وہ لوگ جو نوایت کو ملاح کہتے ہیں اور سند قاموس سے لیتے ہیں غلطی کا شکار ہو گئے ہیں کہا جاتا ہے کہ مشہور ظالم حجاج بن یوسف نے محض عناد کی وجہ سے قوم کے اعیان و اشراف کو کچل ڈالنے پر کمربستہ ہو کر بہت سارے علما و صلحا کو ناحق مار ڈالا۔ اس کے خوف کی وجہ سے ان لوگوں کو جلا وطنی اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا اور جہاں انھیں امن ملا وہ وہیں رہ گئے۔ اسی طرح بنو قریش

---

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۱۰۳۔۱۰۴ بحوالہ تاریخ گجرات (۲) تاریخ فرشتہ

[2] منتخب اللباب (۴) رتناگیری گزیٹر صفحہ ۱۴۳ قلابہ گزیٹیڈ ۸۱ (۲) تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۷۰

کی ایک جماعت ۱۵۳ھ میں مدینہ طیبہ سے ہجرت کر کے جہاز کے ذریعہ ساحل ہند دکن میں جس کا نام کوکن ہے اتر گئے اور رہائش اختیار کی۔ اور انھیں وہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تو ان کی بہت سی شاخیں اور ٹولیاں پیدا ہو گئیں اور ان کی شناسائی کے لیے جس فرقہ کو جس چیز سے کچھ تھوڑی سی مناسبت ہوتی انھیں اس سے منسوب و ملقب کیا جاتا اس وجہ سے اس گروہ میں عجیب القاب پیدا ہو گئے۔

مآثر الامراء کے مصنف بضمن حالات ملا احمد فرماتے ہیں۔ آنانکہ نوایت را مد حسین گویند و سند از ناموس گیرند در غلط افتادہ اند[1]

علامہ شیخ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

"نایت ایک ناحیہ کا نام ہے جو بصرہ میں واقع ہے تاج العروس فی شرح القاموس کے مصنف لکھتے ہیں النایة موضع فی البصرہ الخ اس سلسلہ میں نواب عزیز جنگ بہادر کا نوایط اور نوایت کا تجزیہ بھی قابل ملاحظہ ہے لکھتے ہیں کہ جن اہل تصانیف نے اس قوم کے نام کو تائے قرشت سے خیال کیا ہے من وجہ ان کا خیال بھی درست ہے اس لیے کہ اس فصل میں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ ہجرت ثانی میں اس قوم کا مقام حدود بصرہ میں واقع تھا پس موضع سکونت سے منسوب کر کے نائتی کہنا بالکل صحیح ہے مولف نے وجہ تسمیہ کے متعلق جس قدر تحقیق کی ہے اس کے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں (۱) یہ کہ اس قوم کا املا طائے حطی کے ساتھ موضع نایط اور دوسرے معنوں سے متعلق ہونے کے سوا نسب سے بھی تعلق رکھتا ہے اس لیے مولانا باقر آگاہ رحمۃ اللہ علیہ نے جد قبیلہ کا نام نائط بن نضر کہا ہے لیکن تائے قرشت کا املا متعلق بہ نسب نہیں ہو سکتا یا تو بقول تاریخ فرشتہ ملیباری زبان سے متعلق ہے یا موضع نایت کی سکونت سے منسوب جیسا کہ لب اللباب اور تاج العروس سے موضع کا پتہ چلتا ہے بس اس قوم کو اعتبارات مختلفہ کے لحاظ سے طاء مہملہ کے ساتھ نایطی کہنا بھی صحیح ہے اور تائے فوقانی کے ساتھ نائتی بھی[2]

مولوی قادر عظیم صاحب جو کرناٹک ریاست میں ایک ممتاز عہدے پر فائز تھے اور بعد میں مدراس کی ریاست میں ایک اعلا منصب سے سرفراز ہوئے وہ اپنی تصنیف گلستان نسب میں لکھتے ہیں۔

نایط گفتن این ہا را بسبب نسبت فرزندی از نائط نبیرۂ جعفر طیار رضی اللہ عنہ است بسبب کثرت استعمال نائے مبدل بنون شد[3]

---

[1] مآثر الامراء بحوالہ تاریخ نوائط صفحہ ۲۷۔ [2] تاریخ النوائط صفحہ ۲۸
[3] گلستان نسب۔

"راقم سطور مولوی قادر عظیم صاحب کے اس خیال سے بوجوہ ذیل اتفاق نہیں کرسکتا۔

(۱) ایک یہ کہ اس میں بنیرہ جعفر طیار کہا گیا ہے جو تاریخی لحاظ سے درست نہیں ہے کہ حضرت جعفر طیار کا زمانہ ان واقعات کے وقوع سے بہت پہلے گذر چکا تھا اور سید عبداللہ والیط کو بنیرہ جعفر طیار جو بتایا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں کہ صاحب گلستان نسب نے سہواً جعفر صادق کے بجائے جعفر طیار لکھ دیا ہو۔

۲۔ کثرت استعمال کے سبب سے واؤ کا نون سے بدل جانے والی بات بھی محض ظنی اور بے تکی سی معلوم ہوتی ہے اس کے بجائے صاحب کشف الانساب کے مصنف علامہ جلال الدین سیوطی کا یہ خیال زیادہ قرین قیاس ہے فبنو الوائط قوم وهم اولاد عبد الله الوائط بن محمد اسماعيل الذى مات فى المدينة المنورة وهو ابن جعفر الصادق رضی اللہ عنہ۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سید عبداللہ بخاری امام جعفر صادق کے پوتے تھے اور عجب کہ نہیں کثرت استعمال سے بنوالوائط صرف نوائط ہو کر رہ گیا ہو۔

اس سلسلہ میں علامہ نووی کی یہ وضاحت بھی قابل لحاظ ہے وہ لکھتے ہیں جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آتے ہیں۔

" نبعد ما هاجروا وتفرقوا بلادهم صاروا مضطرين ومتحيرين فى ديار الكفر حتى اشتغلوا بالمكاسب الرديه الى ان اشتهروا فى الاطراف بالسنة الكفار الهند بانهم ملاحون حتى كتب بعض اهل اللغة مثل مجد الدين ابى طاهر محمد بن يعقوب الفيروزآبادى ومصنف قاموس اللغة النواتى الملاحون فى البحر نولادته فى سنة عشرين وسبع مائة ووفاته خمسين وثمان مائة وكان فى هجرة القوم المسطورين سنة اجدى وستين۔

سلسلہ بیان کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

فما كتب صاحب القاموس وغيره غلط محض عفا الله عنه مع انهم اشراف الاشراف مشهوربا وقبائل وهم السادات العظام والمشائخ الكرام الخ[1]

اور انھوں نے (بنی الوائطہ) اپنے وطن سے ہجرت کے بعد دیار کفر میں پہنچے تو پریشانیوں نے انھیں گھیر لیا اور وہ معمولی پیشے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے یہاں تک کہ ہندوستان کے اطراف کے کافروں کی زبانوں پر ملاحوں کے نام سے مشہور ہو گئے اور بعض اہل لغت نے

---

[1] نزہت الحقائق امام نووی رحمۃ اللہ علیہ

جیسے مجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی صاحب قاموس نے لکھ دیا۔ "السواتی الملاحون فی البحر" ان کی ولادت سنہ ۷۲۹ھ اور وفات سنہ ۸۱۷ھ میں ہوئی تھی اور اس قوم کی ہجرت کا واقعہ سنہ ۶۱ھ میں لکھا گیا ہے۔ خدا بخشے صاحب قاموس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے اس کے باوجود وہ (الہانوائط) اپنے خاندان اور قبیلے کے لحاظ سے نہایت شریف ہیں اور ان کا تعلق بزرگان سادات اور مشائخین عظام سے ہے۔

قاضی سمعانی متوفی سنہ ۵۶۲ھ اپنی مشہور و معتبر تصنیف "کتاب الانساب" میں النائتی کی تشریح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

النائتی بالنون المفتوحہ بعدھا یاء مکسورہ منقوطۃ من تحتھا بنقطتین و فی آخرھا التاء المنقوطۃ باثنتین من فوقھا ھذہ النسبۃ ظنی انھا ناحیۃ بنواحی البصرہ یقال لھا نایت و المشہور بالنسبۃ الیھا ابو الحسن بن عبد العزیز المودب البصری المعروف بالنائتی روی عن الفاروق بن عبد الکبیر الخطابی روی عنہ ابوطاھر محمد بن ابی احمد بن الاشبانی ھکذا ذکرہ ابوبکر الخطیب فی کتابہ المؤتلف نائتی۔

نون مفتوحہ کے ساتھ اس کو بعد نیچے دو نقطے والی یاء مکسورہ اس کے آخر میں اوپر دو نقطے والا 'تا' اس میں میرا خیال یہ ہے اس کی نسبت بصرہ کے ایک نواحی علاقہ کی طرف ہے جس کو نائت کہا جاتا ہے اور اسی نسبت سے شیخ ابوالحسن بن عبدالعزیز موذب بصری نائتی مشہور ہیں ان کی روایت کا تعلق فاروق بن عبدالکبیر خطابی سے اور وہ ابوطاہر محمد بن احمد بن الاشبانی سے روایت کرتے ہیں اسی طرح ابوبکر الخطیب نے اپنی کتاب المؤتلف میں ذکر کیا ہے۔

نو آمدہ

کشف النسب کے مصنف جامع العلوم کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

'این لفظ در اصل نو آمدہ بود بسبب تصرف مستعملیان نوایت شد"

ہسٹری آف میسور ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی اس کے مصنف ایک انگریز مورخ مسٹر بارک دلکس ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

"نوایت در اصل نو آمدہ تھا" یہ تو محض ان کی دماغی اپج معلوم ہوتی ہے جس کا ثبوت بتذکرہ دو مورخین کے سوا کسی اور کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا اسی طرح بعض مورخین نے

اس قوم کو نو وارد کا نام بخشا ہے اور انھوں نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر اسی نام سے کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ وہ عرب سے مستقل قیام کے ارادے سے اس ملک میں وارد ہوئے اور اہل ملک سے تعلقات بڑھے شادی بیاہ رچایا تو نو وارد کہلائے ان کا خیال ہے کہ نو وارد کا لفظ بگڑ کر "نوائط" بن گیا۔ عام طور پر باہر سے کسی ملک میں ہر نئے آنے والے کو نو وارد کہا جاتا ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی قوم کا نسبی، قومی، اصلی نام کس طرح ہو سکتا ہے۔

ناعط

ناعط :۔ شیخ ابو سعید بن ابی بکر محمد سمعانی نے ان سب سے الگ ایک نئے نام کا انکشاف کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"اس قوم کا تعلق یمن کے ایک مشہور قبیلہ ناعط سے ہے یمن کے شہر صنعا میں ناعط نام کا ایک سربرآوردہ نامور اور مشہور قبیلہ گذرا ہے اور اس قبیلہ کا تعلق وہاں کے خاندان شاہی سے تھا تاریخی کتابوں میں اس قبیلہ کے بعض بلند پایہ ادیبوں شاعروں اور مورخوں کا پتہ ملتا ہے عرب کا ایک مشہور شاعر ابو نواس بھی اسی قبیلہ سے تھا چنانچہ وہ اس قبیلہ ناعط سے اپنے تعلق پر فخر کے ساتھ شاعرانہ انداز میں کہتا ہے۔

لست بدا ءعنت وغیرها ضربان من نوءها وحا صبها
بل نحن ارباب ناعط ولنا صنعاء والمسك فی محا ربها

میں اس گھرانے سے نہیں ہوں جس کو آندھی اور بارش تتر بتر اور اپنے خیمے اٹھانے پر مجبور کردے بلکہ ہم تو اہل ناعط ہیں اور ہمارے لیے شہر صنعا ہے جس کی محرابیں مشک آلودہ ہیں۔ یعنی ہم قبیلہ نزار جیسے خانہ بدوش بیابانی نہیں بلکہ صنعا کے شاہی خاندان سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ ہم شیخ سمعانی کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتے کہ "اس قوم کا تعلق یمن کے ایک مشہور قبیلہ ناعط سے ہے کیونکہ یمن نسبتاً پر امن سرسبز زرخیز اور ساحلی علاقہ ہے۔ ایک ایسے علاقے سے اس قبیلہ کی ہجرت کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس کے علاوہ ناعط ایک الگ قبیلہ ہے جس کو زیر بحث قوم نوائط سے کسی قسم کا تعلق کسی بھی معتبر تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تجارتی اقتصادی اور سیاحتی کی غرض سے عرب جہاں دوسرے ملکوں سے آئے وہاں یمن سے بھی کچھ لوگ شروع میں آتے جاتے رہے ہوں اور ان میں سے بعض تجارتی مقصد کے

ماتحت یہاں مستقل طور پر رہنے بسنے لگے ہوں۔ لیکن قوم نوایط کے لیے یہ کہہ دیناکہ وہ درحقیقت نواغطی ہیں یا وہ سب یمن ہی سے آئے تھے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

ان تمام مختلف روایات اور متضاد بیانات کے پیش نظر نوایط کی وجہ تسمیہ اور ان کی اصلیت کا پتہ لگانا اور اس کے بارے میں کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنا اتنا آسان نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اب اگر مذکورہ بالا تمام روایات پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ نوایط کی اصلیت کیا ہے؟ شہر وایط سے اگر منسوب کیا جائے تو قریش کی اولاد نایط ہونے کی دلیل کمزور ہو جاتی ہے دوسری روایت جس کا تعلق لغوی معنی متفق و متحد ہونے والے سے ہے وہ تو بالکل ہی کمزور ہے کیونکہ پہلے تو یہی ثابت نہیں ہوتا کہ تمام قوم نوایط ایک ہی سردار کے ماتحت رہی ہے خصوصاً جب کہ لوگوں کا مختلف اوقات میں نکلنا ثابت ہے اس کے علاوہ پہلے دوسرے اور تیسرے کے درمیان خون کے اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل ہے یعنی سادات نایطہ میں حضرت شہربانو کی اولاد ہونے سے عجمی خون بھی شامل ہو گیا ہے نیز اس روایت کو ثابت کرنے کے لیے جو دلیل دی گئی ہے وہ عقلاً بھی بعید کمزور ہے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ایک ہی سردار کے ماتحت رہتے تھے تو محض اس وجہ سے ہمیشہ کے لیے یہ نام ان کو دیا ہی نہیں جا سکتا اور اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں شاید کہیں نہیں ملے گی[1]"

ہمارے خیال میں تاریخ جنوبی ہند کا یہ لکھنا بجائے خود بہت ہی کمزور ہے اگر وہ اس قوم کی ابتدائی ہجرت کے تاریخی پس منظر پر غور کرنے کی زحمت گوارہ کرتے تو اس قوم کی اتحاد یکجہتی اور ایک سردار کے ماتحت رہنے پر انھیں کمزور دلیل کا راگ الاپنا نہ پڑتا۔ سید عبداللہ النایط کا مدینہ سے ہجرت کے وقت ان کے ساتھ وہی لوگ تھے جو انھیں سردار مانتے تھے اور انھیں کی قیادت میں ان کے تمام ساتھی متفق و متحد تھے ان کی رحلت کے بعد ان کے فرزند سید عبدالرحمن ان کے جانشین ہوئے اور قوم کی امارت و قیادت ان سے وابستہ رہی لیکن جب بصرہ میں ان کا انتقال ہوا تو ان کا کوئی مقتدر جانشین نہیں رہا۔ اس لیے قوم کا مرکزی شیرازہ بکھر گیا اور وہ تفریق کی شکار ہو گئی ان میں سے کچھ جنوبی افریقہ کی طرف گئے اور کچھ ادھر ہندوستان میں چلے آئے۔ اس طرح تاریخ جنوبی کا وہ پہلو بھی بہت کمزور ہے جس میں انھوں نے مدینہ منورہ سے ۔۔ھ کی ہجرت کا تعلق حجاج بن یوسف کے مظالم سے جوڑتے ہوئے کہا ہے کہ: "سنہ ۶۔ھ وہ سنہ ہے

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۳۷

جب کہ حجاج بن یوسف کا پتہ بھی نہیں تھا۔"
درحقیقت ان کے خروج کی اصل وجہ حجاج بن یوسف سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے تھی جیسا کہ علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں :۔

"وسبب خروجه من المدينة الشريفة انه وقع ذات يوم بينه و بين عبد الله النوائط و بين الخليفة بحث كثير" وكلامٌ طويل حتى غلب على الخليفة والزم عليه الزاماً شديداً فغضب على عبد الله النوائط واخرجه من المدينة الطيبة مع اولاده وقبائله" [1]

اور مدینہ شریف سے ان کی ہجرت کی وجہ یہ ہے کہ ایک دن سید عبداللہ النوائط اور خلیفہ کے درمیان باہمی بحث ومکالمہ کا ایک طویل سلسلہ چھڑ گیا اور انھوں نے خلیفہ پر سخت الزامات عائد کیے اور اپنے مباحثہ میں غلبہ حاصل کیا اس پر وہ سید عبداللہ النوائط سے برہم ہوگیا اور وہ انھیں اور ان کی اولاد اور قبائل کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکال دیا۔"
ظاہر ہے کہ یہ مباحثہ خلیفۂ وقت کے ساتھ ہوا تھا اور اسی نے انھیں مدینہ طیبہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا حجاج بن یوسف کبھی خلیفہ نہیں تھا بلکہ عبدالملک بن مروان کے ماتحت حجاز وعراق کا گورنر تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۷۷ھ میں نکلنے والے پہلے قافلے کا تعلق حجاج بن یوسف سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے تھا اور اسی نے انھیں بحث میں ناکامی کے انفعالی جذبہ کے تحت انھیں مدینہ شریف سے نکال دیا تھا۔
اب رہا یہ سوال کہ اس قوم کے نام کا تعلق نسب سے ہے یا نسبت سے مورخین محققین میں سے امام جعفر طبری، امام نوویؒ یا قرآگاہ وغیرہ نام کا تعلق نسب ہی کو قرار دیتے ہیں اور بعض مورخین نسبت کے حق میں ہیں جیسے کشف الانساب لب اللباب، تاج العروس شرح قاموس اور کتاب الانساب وغیرہ جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکی ہے۔ مشہور مورخ ابوجعفر طبری کہتے ہیں۔النایط طائفة من قوم قریش الخ۔[2] نوایط کا قومی تعلق قریش سے ہے۔

امام نووی لکھتے ہیں :۔
"فان سئلت عن قوم يسمونهم في بلاد الهند بالنايط فهم من قوم بني هاشم بن عبد مناف بن قصي الخ۔[3]

---

[1] کشف الانساب علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ [2] تاریخ طبری [3] نزہت الحقائق

اس قوم کے بارے میں پوچھا جائے، جن کو ہندوستان میں نایطہ کہا جاتا ہے تو ان کا قومی تعلق بنی ہاشم بن عبدمناف بن قصی سے ہے۔

مولانا باقر آگاہ لکھتے ہیں:۔

النایطہ جد القبیلہ بن نضر بن کنانہ وبقیۃ النسب الشریفۃ معروفہ[1]۔

نایطہ جد قبیلہ نضر بن کنانہ کے بیٹے ہیں اور باقی نسب شریف تو مشہور و معروف ہے۔

اسی طرح تاریخ جنوبی ہند کا یہ کہنا کہ کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سے پہلے اہل مدینہ یا مکہ پر کسی مسلم گورنر کی جانب سے ظلم ہوا ہو۔

اسی طرح ان کی ہجرت کے بارے میں تین مختلف زمانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی ہجرت ۱۶۱ھ میں

دوسری ہجرت ۱۵۲ھ میں

تیسری ہجرت ۷۵۲ھ میں واقع ہوئی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہند میں عرب انھیں سنوں میں آئے اس کے علاوہ نہیں آئے ہم گذشتہ صفحات میں بتا آئے ہیں کہ ہندوستان میں عربوں کی آمد کا سلسلہ تاریخ کے نامعلوم دور سے جاری تھا اور وہ زیادہ تر تجارتی مقصد کے لیے ہوتا تھا۔ ظہور اسلام کے بعد ان کی آمد کا سلسلہ بہت ترقی کر گیا جس کے اسباب کم و بیش یہ تھے۔

(۱) تجارت (۲) تبلیغ و اشاعت دین (۳) ملکی ناسازگار حالات اور ہندستان کے موافق حالات (۴) سیاحت (۵) سیاست

گذشتہ سطور میں جن مختلف سنوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق زیادہ تر نمبر ۳ سے ہے جنھیں غیر موافق اور ناساعد حالات نے ترک وطن کرنے پر ابھارا تھا۔ انھوں نے اول مدینہ منورہ سے ۱۶۱ھ میں ہجرت کی اور عراق سے نو میل کی مسافت پر نایت نامی ایک قصبہ میں اقامت اختیار کی لیکن وہاں بھی انھیں امن و سکون نصیب نہ ہو سکا اور حکومت وقت سے اختلاف پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں آخر کار اس کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اور وہ وہاں سے چل کر بصرہ میں مقیم ہو گئے لیکن جب وہاں کچھ عرصہ بعد سیاسی انقلاب آیا امن و سلامتی کے لیے خطرہ لاحق ہو گیا تو حالات کی ناہمواری اور ابتری نے انھیں نسبتاً پر امن مقامات کی طرف رخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ان میں سے چند خلیج فارس کی طرف گئے اور بعض جنوبی افریقہ کی جانب اور کچھ ادھر ہندوستان میں بھی پہنچ گئے۔ اور یہاں کی

---

[1] نفحۃ العنبریہ فی مدحت خیر البریہ۔

قدیم اسلامی آبادی میں گھل مل کر بس گئے۔

۱۶۱ھ میں مدینہ منورہ سے سید عبداللہ النوائط کی سیادت و سرکردگی میں جو پہلا قافلہ روانہ ہوا ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال متعلقین اور خاندان کے لوگوں کے علاوہ ان کے پیرو کار اور خدمت گذار بھی ہمراہ تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر سادات کے مقابلہ میں سادات کی ایک بہت بڑی تعداد تھی اور ہجرت در ہجرت کے تقریباً سات سو سالوں کے درمیان ان کی آبادی میں بہت ہی کافی اضافہ ہو گیا۔ اور وہ مختلف حالات اور مصالح کے ماتحت مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیل گئے کیونکہ سادات بنی فاطمہ ہر جگہ احترام و عزت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس طرح ۸۵۲ھ ہجری جو جماعت ہندوستان آئی ان میں ایک اچھی خاصی تعداد سادات نائتہ کی تھی۔

اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ سب سادات یہاں اسی ۸۵۲ھ میں آئے ہیں۔ مراد یہ ہے پہلے بھی سادات کرام مختلف اوقات میں یہاں آئے ان میں سے بعض نے یہاں کی سکونت بھی اختیار کر لی تھی لیکن ۸۵۲ھ میں جو سادات یہاں آئے ہیں ان کا تعلق حضرت اسماعیل ابن سید جعفر صادق کی اولاد سے تھا۔ چنانچہ "تاریخ النوائط" کا مصنف لکھتا ہے:۔

"یہ تمام واقعات قوم نوائط کے اس گروہ سے متعلق ہیں جو اسماعیل بن جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہے۔"[1]

ہر گاہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا میلاد ۸۳ھ میں ثابت ہے اور آپ کی وفات ۱۴۸ھ میں تو اس گروہ کے واقعہ ہجرت اولین کا وجود حجاج بن یوسف کے عہد میں نہیں مانا جا سکتا اس لیے کہ حجاج خلیفہ نہ تھا اور اس کی حکومت کا زمانہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی ولادت سے پہلے گذر چکا تھا واقعات اور سنین کی مطابقت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس گروہ کی ہجرت مدینہ طیبہ سے خلافت عباسیہ کے زمانے میں واقع ہوئی ہو۔[2]

خانوادۂ قاضی بدر الدولہ کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"بعض لوگوں نے ان کو ملاح اور کشتی ران قرار دیا جو صحیح نہیں ہے یہ لوگ نایت کے مقام سے آئے تھے اسی لیے نائتی کہلائے مگر آگے چل کر علمائے اہل نوائط نے "ت" کو "ط" سے بدل کر نایطی لکھنا شروع کر دیا۔ اور اب تک "ط" سے رائج ہے۔"[3]

آگے لکھتے ہیں اگر ہندوستان کے اہل نوایط کی تاریخ کو تلاش کرتے ہیں تو ساتویں صدی ہجری سے پہلے کسی کا نام نہیں ملتا۔ اگر مذکورہ بالا روایت کو صحیح مانا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] یہ تو چند حوالجات کا خلاصہ ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ [2] تاریخ النوائط ص ۲۹
[3] خانوادۂ قاضی بدر الدولہ صفحہ ۲۴/۲۵ مؤلفہ محمد یوسف عمری افضل العلماء۔ ایم۔ اے

نوایت نصرے اول اول سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دورِ حکومت میں آئے تھے اس نے ۷۴۸ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تھا اور دہلی کی مرکزی حکومت سے اپنا رشتہ توڑ کر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کرنی شروع کی تھی۔ شمالی ہند میں اس وقت سلطان محمد تغلق کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا چچیرا بھائی سلطان فیروز ۲۴ محرم ۷۵۲ھ کو تخت پر بیٹھا تھا۔"

آخر میں لکھتے ہیں اہل نوائط کو اول اول ہندوستان کے ہندو امراء اور حکام کی سرد مہری سے سابقہ پڑا مگر ان لوگوں نے اپنی ذاتی قابلیت اور لیاقت اور رواداری کی بدولت بہت جلد یہاں اپنے لیے جگہ پیدا کرلی نسل اور سماجی حیثیت سے وہ دوسروں سے بالکل ممتاز تھے وہ دوسروں سے اپنا رشتہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے ان کو اپنی نسلی امتیاز پر اسی طرح کا فخر تھا جس طرح عرب میں قریش کے قبیلے والوں کو فخر حاصل تھا۔ علم و فضل کے لحاظ سے بھی وہ بہت ممتاز تھے۔ بہمنی سلاطین اور پھر اس کے بعد عادل شاہی اور نظام شاہی حکمرانوں نے ان کی بڑی عزت کی۔ انھیں بہت بڑے بڑے عہدے دیے اور ان کے قابل ترین افراد کو اپنا وزیر اور دیوان بنایا۔[1]

بہرحال اس وقت نوائط قوم ہند کے حسب ذیل مقامات میں کثرت سے آباد ہیں۔

بھٹکل۔ کوکن۔ ملیبار، دھلی، بیجاپور، احمد نگر، بمبئی، مدراس، حیدرآباد، بنگلور، کرناٹک، جاورہ، مالوہ وغیرہ

نوٹ:۔ ملیبار، جاورہ میں اس قوم کے اکثر افراد زراعت پیشہ ہیں۔

نسب

جہاں تک نسب کا تعلق ہے اس کا شجرہ اہل تحقیق نے تین شاخوں پر مشتمل کیا ہے اور ان تینوں کی اصل نضر بن کنانہ ہیں اور یہ وہ بزرگ ہیں جن کو عرب جد القریش کے نام سے یاد کرتے ہیں اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں۔ نسب کے متعلق تاریخ النوائط کے مؤلف کی تشریح یہ ہے:۔

پہلی شاخ کی ابتدا نائط بن نضر سے ہوتی ہے۔ نضر بن کنانہ کو عربوں نے جد القریش کہا ہے اور وہ ان کی وہ اولاد جو مالک بن نضر کے سوا دوسرے سلسلوں میں ہے بنو نضر کہلاتی ہے۔ اگرچہ مصنفین کتب انساب نے نضر بن کنانہ کے تین فرزندوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ (۱) مالک بن نضر (۲) صلت بن نضر (۳) مخلد بن نضر۔ لیکن محقق کامل ادیب فاضل حقائق دستگاہ جناب مولانا باقر آگاہ کان مثواہ فی قرب اللہ نے اپنی تصنیف نفحۃ العنبریہ فی مدحۃ الخیر البریہ میں فرمایا ہے کہ النائط جد القبیلہ بن نضر بن کنانہ ولقبیۃ النسب الشریف محی و نسہ

---

[1] تاریخ النوائط ص ۳۶

ابو جعفر طبری محدث و محقق کامل نے سلسلہ دوم کا بیان فرمایا ہے وہ فرماتے ہیں النائط طائفة من قوم، قریش الخ و قریش اولاد نضر بن کنانہ بن مدرکة بن الیاس من احبداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ثانی عشر منھم۔

یہ سلسلہ عبداللہ بن حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے۔ سلسلہ سوم کی صراحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کشف الانساب میں فرماتے ہیں جس کے متعلق مولف نے بحث کی ہے یہ سلسلہ سیدنا حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے ذیل میں آپ کے فرزند اسماعیل رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے اسماعیل بن جعفر صادق کی اولاد میں بھی ایک بزرگ عبداللہ کے نام سے گذرے ہیں جو فرزند ہیں محمد بن اسماعیل کے شجرہ ذیل کے ملاحظہ سے ان سلسلوں کا باہمی تعلق اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے [1]

اس شجرہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نائط نضر بن کنانہ کے ایک فرزند تھے اور ان کی اولاد اسی نسبتی تعلق کی بنا پر نایطی سے منسوب ہوئی۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکی ہے آگے تاریخ النوائط کا مؤلف لکھتا ہے۔

"بس جو افراد تو م پہلے سلسلہ میں ہیں وہ بنو النضر ہیں اور جن افراد کا سلسلہ دوسری شاخ سے ملتا ہے وہ شیخ قریشی اور جو سلسلہ تیسری شاخ تک پہونچتاہے وہ بطن مطہرہ حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سادات حسینی اور اسماعیلی کہلاتے ہیں [2]

بعض مورخین نایت سے نسبت کو وجہ تسمیہ قرار دیتے ہیں لیکن اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ عراق سے نوسیل کی مسافت پر واقعہ قصبہ نایت ہے یا وایط بعض مورخین نے اس کا نام وائط لکھا ہے اور اسی لیے سید عبداللہ وایطی سے مشہور ہیں اور جو قافلہ ان کے اہل وعیال خاندان اور معتقدین متعلقین کا ان کے ساتھ ہجرت کیا تھا انھیں بنو الوائط کہا گیا ہے وہ کہتے ہیں بعد میں کثرت استعمال سے یہ لفظ بگڑ کر صرف نوایط ہو کر رہ گیا۔

جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی کو عیزہ کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکی ہے۔

سادات کرام آل رسول کے متعلق کچھ تاریخی جھلکیاں

اپنے موقع و محل کے اعتبار سے یہاں دور اول کے اکابر سادات کے متعلق کچھ تاریخی حقائق

---

[1] تاریخ النوائط ص۳۱

پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے بنی فاطمہ آل نبی ہونے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس لیے انھیں امتیاز و فوقیت کا بلند مقام حاصل تھا اور وہی بنو امیہ کے زوال اور بنی عباس کے عروج و اقبال کے باعث ہوتے تھے ظاہری تخت و تاج ان کے حصہ میں نہیں آیا لیکن مذہبی اقتدار اور علم ان پر وہی فائز رہے ان میں حضرت جعفر صادق اپنے وقت میں اپنے محاسن و فضائل ظاہری و باطنی اور مقبولیت عامہ کی بنا پر نہایت بلند اور ممتاز مقام پر پہنچ گئے تھے اس لیے اکابر علماء و فضلاء کی ایک بڑی جماعت آپ کی بیعت سے شرف ہوگئی تھی۔

بیعت جب اسلام میں موروثی سلطنت کی بنیا پڑگئی اور دینی امور میں ان خلفاء کی وہ روش نہیں رہی جو خلفائے راشدین مہدیین کی تھی توحید کی اشاعت میں سستی غفلت برتی جانے لگی دین میں نئے نئے فتنے سر اٹھانے لگے دینی مقاصد و مصالح پر شخصی و سیاسی رنگ ابھرنے لگا۔ تقویٰ و صلاح کے راستہ سے قدم ہٹنے لگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد اسلام میں معتقدات اور رخنہ اندازی پیدا ہونے لگی تو بعض باعمل علماء حق نے تبلیغ حق قرآنی کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ ایک خاص اسلامی مشن قائم ہوگیا جو اپنے شاگردوں مریدوں کو زہد و تقویٰ، صبر و قناعت رضا و تسلیم کی تعلیم دیتا اور بے غرضانہ متوکلانہ صاف و ستھری زندگی گذارنے سادگی اور بے تکلفی اختیار کرنے اور متحمل شدائد کے لیے مشاق و خوگر بنانا اور انھیں اشاعت اسلام اور تبلیغ دین میں لگانا۔ تابعین میں ایسے روحانی معلمین میں امام زین العابدین، خواجہ حسن بصری، قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق وغیرہ حضرات ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ پاکیزہ جماعت اپنے اعمال صالح اور بے لوث کردار اور للہی مجاہدات کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہوگئی۔ یہی جماعت بعد میں عرف عام میں صوفیا[1] کے نام منسوب و معروف ہوگئی مجاہدہ و ریاضت کے مفید اصول سے نفس کشی کی تربیت کی جاتی ہے ان کے قوائے بہیمانہ کو کچل کر انھیں ملکوتی صفات سے آراستہ کیا جاتا۔ دنیاوی لذائذ و مادی خواہشات کی تاریکیوں سے نکال کر روحانی انوار و برکات سے انھیں سرفراز و مستفید کیا جاتا۔ اس طرح اپنے طور و طریقہ سے بہت جلد یہ گروہ عوام کی ارادت و عقیدت کا آماجگاہ بن گیا یہ تو بر سبیل ذکر آل رسول ایک ضمنی بحث تھی جس کا ہمارے نفس موضوع سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

---

[1] یہ بزرگان اپنے سادہ لباس صوف کی چادر پہا اوڑھتے تھے اس لیے صوفی کہلائے۔

واقعہ کربلا کے بعد امام زین العابدین اور ان کے جلیل القدر فرزند اور پوتے امام محمد باقر اور جعفر صادق رضی اللہ عنہم نے حکومت اور ظاہری امارت و سیاست کے طلب و دعویٰ سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ مگر زید بن امام زین العابدین اور ان کے فرزند ارجمند یحییٰ بن زید رضی اللہ عنہ نے بنی امیہ کی حکومت کے خلاف علم مخالفت بلند کیا مگر ان دونوں بزرگوں نے اپنے ہزاروں رفیقوں اور ساتھیوں کے ساتھ اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں۔ زیدؒ تو جاں بحق ہو گئے مگر شیعہ زیدیہ کے نام سے ایک نئے فرقہ کی بنیاد پڑ گئی وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے افضلیت کے تو قائل تھے مگر خلفائے ثلاثہ کا نہ انکار کرتے نہ ان کی شان میں گستاخی اور بدزبانی روا رکھتے۔ محمد المعروف بہ نفس الزکیہ بن عبد اللہ محض بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علیؓ بن ابی طالب نے حسینی سادات میں سے عہد منصور عباسی ۱۴۵ھ میں خلافت حسینی کا دعویٰ کیا جس کی بیعت امام ابو حنیفہؒ اور امام مالک وغیرہ اس وقت کے علمائے کرام و مجتہدین عظام نے کی اور مکہ اور مدینہ زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً پر قبضہ کیا مگر آخر منصور عباسی کے فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے پھر ان کے عم زاد بھائی حسین بن علی حسن مثنیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ ہادی کے عہد حکومت میں مکہ پر قبضہ کر لیا اور انجام کار اپنی جان عزیز کی شہادت کے سوا ان کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

ان تمام واقعات میں حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنی سلامت روی۔ امن پسندی کی بنا پر نہایت محتاط رویہ اپنایا اور ان سب باتوں سے الگ تھلگ رہے اور وہ اپنے کسی قول و عمل سے حکومت وقت کو بدظنی کا موقع نہیں دیا۔ لیکن انھوں نے اپنے تقدس و تقویٰ شعاری، مصلحت اندیشی اور دیگر اوصاف حسنہ اور صفات جمیلہ کی بدولت اپنی امامت اور اپنے خاندان کی عظمت و محبت کا سکہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا تھا۔

امام جعفر صادق کے ایک فرزند اسماعیل تھے مورخین کے بیان کے مطابق وہ اپنے بزرگوں کے خلاف سیاسی اقتدار و ظاہری حکومت کے بھی خواہ تھے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سادات عموماً کبھی بھی دعویٰ سلطنت سے دست بردار نہیں ہوئے تھے اور ہمیشہ اس کے لیے سعی و سرگرمی دکھاتے رہے تھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ حضرت اسماعیل کو اپنے پدر بزرگوار کی عظمت اور مقبولیت کو دیکھ کر باطنی کے ساتھ ظاہری امارت کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اپنے بزرگوں کی ظاہری امارت سے ناکامی کا کافی تجربہ رکھتے تھے وہ اپنے فرزند اسماعیل کے اس خیال کو کیسے گوارہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے امامت اپنے دوسرے فرزند امام موسیٰ کاظم کی سپرد کر دی اور اسماعیل مذہب امامت

محروم رہے۔

امام جعفر صادق کی رحلت کے بعد بعض موقع پرستوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور شیعہ اسماعیلیہ کی بنیاد پڑگئی اور اسماعیل کے فرزند محمد بھی بدستور اپنی امامت کے مدعی رہے گو امام موسیٰ کاظم کی امامت کے سامنے اسماعیلیہ کا دعویٰ چل سکا اور نہ ان کا چراغ جل سکا۔

اس تفریق باہمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرامطیوں نے اس سے خوب نفع اٹھایا شروع شروع میں وہ محمد اسماعیل کے بیٹے یا پوتے کی اشاعت امامت کی آڑ لے کر خوب اور دھوکہ سے بے شمار شیعوں کو اپنے ساتھ ملایا اور اس سے انھیں اپنے مقصد کے لیے کافی تقویت بھی حاصل ہو گئی لیکن امام موسیٰ کاظم اور ان کے فرزند ارجمند علی رضا اور ان کے پاکباز جانشینوں اور مریدوں کے سامنے وہ ہر جگہ ناکامیاب ہی رہے۔ اس لیے اسماعیلی نے عراق کو چھوڑ کر شمالی افریقہ چلے گئے اور اسی کو اپنا مستقر اور اڈا بنایا اور وہاں وہ بہ اطمینان اپنا کام انجام دینے لگے کیونکہ وہاں خلیفۂ وقت کی حاکمیت اور عباسی گورنر کا زور قائم نہیں رہا تھا وہاں اس گروہ کو اپنے عقائد پھیلانے اور مریدوں کے بڑھانے کا وسیع میدان ہاتھ آیا وہ بظاہر صوفیوں کی سی وضع قطع اور شکل و شباہت میں اسلام کے صوفی یا مبلغ بن کر اپنے پیروؤں کی تعداد بڑھانے لگے۔

راقم سطور کو یہاں ان کے عقائد پر بحث مقصود نہیں ہاں بر سبیل تذکرہ صرف اتنا لکھا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اپنے عقائد کی آہستہ آہستہ خفیہ تعلیم دیتے تھے اور ہر ایک مسئلہ کا ظاہر و باطن مانتے تھے اور احکام قطعی کی بھی تاویل کر لیتے اس وجہ سے ان کو باطنی بھی کہا جاتا تھا۔ مشہور فرقوں کی طرح ان کے مختلف عہدیدار ہوتے رہے۔ بڑا عہدہ داعی الدعاۃ کا ہوتا۔ تعلیم سادات طبقوں پر منقسم تھی ان کی سب سے بڑی درسگاہ قیروان شمالی افریقہ میں تھی۔ اس مذہب کے داعی اور نقیب مختلف ملکوں میں جاتے اور خلافت عباسیہ اور امامت کاظمیہ کے خلاف شرانگیز پروپیگنڈہ کرتے اور لوگوں کے خیالات اپنے موافق بنانے کی کوشش کرتے۔ منصور بن محمد، جعفر، حبیب تینوں کو مخفی امام شمار کیا جاتا وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ہر طرح کا جوڑ توڑ کرتے رہتے۔ ظاہری حکومت تو ان کے حصہ میں نہیں آئی لیکن در پردہ خفیہ سلطنت کے لیے سازش کرتے رہے۔ اس کے بعد عبید اللہ مہدی بڑی شان اور طنطنہ کے ساتھ نمودار ہوا جس نے بغداد کے ماتحت طرابلس الغرب کی ایک برائے نام حکومت پر قبضہ کر لیا اور خاندان فاطمی کی ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی یہاں ہم کو عبید اللہ کے عقائد سے بحث نہیں ہے بلکہ تاریخی لحاظ سے اس کی کارگزاریاں اور خدمات دکھانا ہے۔

ادھر دارالخلافہ بغداد کی حالت نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے آئے دن کی مختلف فتنوں سے گذر رہی تھی۔ ہارون، مامون، معتصم، واثق جیسے جلیل القدر عظیم الشان خلفائے عباسیہ کے بعد

عباسیہ سلطنت میں ابتری اور بدنظمی پیدا ہوتی جارہی تھی۔ ان میں مامون اور واثق تو علم و دانش میں نہایت ممتاز اور بلند مقام پر فائز تھے اور یہی علم انھیں اعتزال کے راستہ پر ڈال دیا اور وہ معتزلی ہی نہیں بلکہ اس کے زبردست داعی اور معتزلی گر ہوگئے۔ علماء و صلحاء کو مشق ظلم و ستم بنایا انھیں قید و بند میں مبتلا کیا اور مخالفوں کو قتل کیا۔

ان میں المتوکل نے اپنے دور میں دینی خدمت کے کچھ نمونے دکھائے لیکن معتبر مورخین کے بیان کے مطابق لذت شراب میں مست و مگن رہا اور کہا جاتا ہے کہ چار ہزار کنیزوں سے تمتع اٹھا چکا تھا اس کے بعد المستنصر، المستعین اور المعتز یا تو معزول ہوئے یا قتل کر دیے گئے۔ المہدی اچھا خاصا عالم تھا اور اس میں کچھ خوبیاں تھیں لیکن نقص یہ تھا کہ وہ کچھ سخت مزاج اور ناعاقبت اندیش بھی واقع ہوا تھا۔ اس لیے امراء کے ہاتھوں ۲۵۶ھ ہجری میں اس کا چراغ گل ہو گیا۔ اسی سال معتمد خلیفہ ہوا اس کی چوبیس سالہ دور حکومت میں زنجیوں نے ابتلاء کو چیک اور شام میں وہ اودھم مچایا کہ خدا کی پناہ ادھر خراسان کرمان میں احمد نامی ایک شخص بغاوت پر اتر آیا اور انجام کار اس نے ان پر قبضہ کر لیا۔ خلفائے عباسیہ کی ساکھ روز بروز بیٹھتی جارہی تھی اور ان میں وہ دم خم نہیں رہا تھا جو بار دلی عظمت قائم رکھ سکتا اب عبید اللہ ہی ایک تھا جو دنیا میں ایک نئی بڑی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔

اکثر مورخین اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ خوارستان کا یہودی تھا اور اس کے اس دعویٰ کو کہ وہ فاطمی ہے تسلیم نہیں کرتے چنانچہ تاریخ اسلام کا مصنف لکھتا ہے :۔

"اس کو اکثر مسلمان مورخ خوارستان کا یہودی کہتے ہیں اور اس کا فاطمی ہونا تسلیم نہیں کرتے لکھتے ہیں کہ چونکہ فتح خوارستان میں عبید اللہ کے یہودی بزرگوں کو مسلمانوں سے تکالیف پہنچی تھیں اس لیے عبید اللہ نے بخیال انتقام مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کی کوشش کی اور علم و فضل کے سبب اس کی تصانیف علمائے اسلام کی کتابوں میں مل گئیں۔[1]

ہمارے خیال میں عبید اللہ ہی کو مسلمانوں میں نفاق و افتراق کا موجب قرار دینا اس زمانے کے تاریخی حقائق کے پیش نظر درست اور قابل تسلیم نہیں کیونکہ اختلاف و نفاق کی بنیاد تو خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کی شہادت ہی سے پڑ چکی تھی۔ اس کے بعد کربلا کے عظیم سانحہ نے نفاق کی دبی آگ کو شعلوں کی صورت میں بدل دیا جس سے یہ امت ایک شدید قسم کے اختلافی بحران کا شکار ہو گئی۔

ابتدا میں بنی ہاشم اور بنو امیہ کا اختلاف ایک پولیٹیکل نوعیت کا تھا لیکن فریقین نے اس کو بعد میں مذہبی رنگ دے دیا جس کا نتیجہ ہوا کہ ہر فریق نے اپنی اپنی فضیلت و برتری اور اپنے حقوق و مراتب پر بیسوں حدیثیں وضع کیں اور ان سے تفرقہ بازی کا کام لیا۔ حضرت امام حسینؓ

امام زید، یحییٰ اور نفس الزکیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اموی و عباسی خلفاء سے صف آرائی ہو چکی تھی شیعہ امامیہ و زیدیہ کا اختلاف موجود تھا جس طرح بنی ہاشم نے حصول سلطنت کے لیے مختلف ذرائع اختیار کئے اسی طرح عبید اللہ بھی چند بدعات و اختراعات اور اپنے مفاد و مصالح کے مطابق چند قواعد و ضوابط کو رواج دینا اور پھیلانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن چونکہ اس کے عقائد و خیالات اہل سنت والجماعت اور جمہور امت کے مسلک کے خلاف تھے اس لیے اس کے خلاف شور و شر اور فتنہ کا ایک نیا دروازہ کھل گیا اور نفاق و شقاق کی ایک نئی آگ بھڑک اٹھی تقیہ تو شروع ہی سے شیعوں میں موجود تھا عبید اللہ نے اس کو مزید پختہ اور وسیع کر دیا اور اس سے اس نے مفید مقصد کے لیے کام لیا اور اپنے مذہب کو فریمن کی طرح زیادہ پر اسرار بنا دیا وہ ایک بلند نظر آزاد مشرب موقع شناس ہونے کے علاوہ جلتر باز اور پولیٹیکل طریقہ کار کا ماہر بھی تھا۔ اس کے لیے دین کے مروجہ اصول میں قطع و برید کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ہمراز و جاں باز و فادار رفقاء کے ذریعہ اپنے مذہب کو نہایت خفیہ طور پر پھیلاتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے اردگرد اس کے معتقدین اور پیروکاروں کا ایک زبردست اور وسیع حلقہ پیدا ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے رعد بن عبید اللہ بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے تعلق کی آڑ میں اور ان سے بے پناہ محبت کا دلفریب جال پھیلا کر لاکھوں شیعوں کو اپنے دام زریں میں پھانس لیا۔ شروع میں اس نے اس بات کا عام شہرہ کر دیا کہ عنقریب امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے اس کے بعد سنہ ۲۹۷ھ میں عبید اللہ نے خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ وہ اپنا نسب عبید اللہ بن حبیب بن جعفر بن منصور بن محمد بن اسماعیل سے ملاتا تھا۔ اس نے سنہ ۲۶۸ ہجری میں حج کیا اور واپسی میں بیوی بچوں کے ساتھ مغرب کی طرف چلے گئے۔ یہاں میدان خالی تھا۔ خلفائے عباسیہ کا رعب و داب اٹھ چکا تھا۔ معتمد کی حکومت مذہبی اور ملکی مخمصوں میں مبتلا تھی مصر کا گورنر کمزور تھا قیروان میں انھوں نے فریمن کی طرح اپنا ایک مرکز قائم کر دیا تھا اور اس کے ماتحت ایک مجلس تعلیم و اشاعت قائم کی جس کے سات درجے تھے۔ اس کے خاص اہم اغراض یہ تھے۔ قرآن میں تاویل بلا فرضیت تکلفات شرعی سے آزادی بنی فاطمہ کی سلطنت کا استقلال یہ تعلیم تدریجی طور پر مریدوں کے عقائد کے امتحان کے بعد دی جاتی تھی۔ بعد میں ان سے عام مسلمانوں میں اپنے عقاید مذہب کی اشاعت کے لیے داعی اور منادی کی خدمت لی جاتی تھی اور ان سے یہ خدمت نہایت خفیہ طور پر مسلمانوں سے مل جل کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ چونکہ وہ اپنے تمام کام ظاہراً نہیں بلکہ رفقاء کے ساتھ کرتے تھے اس لیے انھیں باطنی بھی کہا گیا رفتہ رفتہ جب عبید اللہ کے معتقدوں اور رفیقوں کا حلقہ کافی وسیع ہو گیا تو وہ چھوٹے پیمانے سے آگے بڑھ کر خلیفۃ اللہ

بن بیٹھا اور سلطنت اسماعیلیہ عبیدیہ فاطمیہ کا بانی ہو گیا۔ وہ ۱۹۶ سنہ ہجری میں ایک آزاد و خود مختار خلیفہ کا ایک روپ اختیار کر لیا۔ اور ۲۰۱ سنہ ہجری میں چالیس ہزار کا لشکر لے کر مصر پر حملہ کیا لیکن کامیاب تو نہ ہو سکا۔ البتہ اسکندریہ اور فیقوم پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ۲۰۶ سنہ ہجری میں اس کا فرزند القائم بن عبید اللہ نے مصر اور پورٹ سعید پر قبضہ کر لیا اس کے علاوہ جزیرہ نسطاط پر بھی اس طرح عبید اللہ اپنی ایک سلطنت قائم کر کے ۲۲۲ سنہ ہجری میں راہی ملک عدم ہوا۔

اور القائم بامر اللہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ اپنے مذہب کے بارے میں باپ سے کہیں زیادہ سرگرم اور سخت نکلا۔ جس نے اپنے مخالف بے شمار علماء کا قتل ناحق کیا اور بے دریغ خون بہایا اور ۳۴۱ سنہ ہجری میں مر گیا اس کے بعد اس کا بیٹا منصور جانشین ہوا۔ اسی سال والی مصر رخشید چل بسا اور کافور کے بعد پورے علاقہ مصر پر عبیدیوں کا تسلط ہو گیا۔ منصور اپنے دور خلافت میں قاہرہ آباد کیا اور ۳۶۱ سنہ ہجری میں جامع ازہر کی تعمیر عمل میں آئی وہ ۳۶۵ سنہ ہجری میں انتقال کر گیا۔ اس کے جانشین بیٹے نزار کے عہد میں جزیرہ یمن، حمص، حلب اور سسلی پر بھی اس کا تسلط ہو گیا۔ نزار ۳۸۱ سنہ ہجری میں فوت ہوا اور حاکم بامر اللہ اس کا جانشین ہوا یہ بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم اسماعیلیہ مذہب کا زبردست حامی اور سرگرم مبلغ تھا ایک طرف مصر، طرابلس، الجزائر، مراکو، شام، حجاز، یمن وغیرہ میں اس کا تسلط تھا اور دوسری طرف عرب و عراق اور سندھ تک اسماعیلیہ مذہب کی اشاعت و وسعت ہو گئی تھی۔ درحقیقت یہ عبیدیوں کا ایک روشن اور کامیاب دور تھا۔ اس کے مقابلہ میں خلیفہ بغداد کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ اپنی اس زور و قوت اور کامیابی سے وہ اس قدر خود از رفتہ (بدمست) ہوا کہ اس کے خیال میں انسانیت کے درجے سے برتری کا ایک خبط اس کی ایجادی طبیعت میں جاگ اٹھا اور وہ خود کو اللہ تعالیٰ کا مظہر ہونے اور نزول وحی کی بڑ ہانکنے لگا۔ اور بقول تاریخ اسلام خود الوہیت کا دعویٰ کیا اور جن علماء نے انکار کر دیا انھیں موت کے گھاٹ اتار کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا یہی نہیں بلکہ مساجد کے دروازوں اور شارع عام پر صحابۂ کرام کے خلاف نہایت نازیبا اور سخت گستاخانہ کلمات لکھ کر لگائے اس نے شراب کو حلال اور حرام گوشت کو کھانا جائز کر دیا۔

عبید اللہ مہدی نے آیات قرآنی میں من مانی تاویلات کی جو گمراہ کن بدعت کی ابتدا کی تھی اس میں بھی اب مزید جدت طرازیاں اور تخیل پردازیاں ہونے لگیں یہاں تک کہ ذات اقدس رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا گیا کہ آپ قرآن کے حقیقی معنی نہیں جانتے تھے ان کا عالم صرف الحاکم ہے کہا جاتا ہے کہ ۴۱۱ سنہ ہجری میں وہ اپنی پھوپھی کے کہنے سے ایک پہاڑی پر خدائی پیغام اور وحی لانے کے لیے گیا تھا چنانچہ تاریخ اسلام کا مصنف

لکھتا ہے :-

"ظاہر ہے کہ اس قدر ظلم و سفاکی کا نتیجہ نفرت، کراہت اور بد دلی تھی اور اسماعیلیہ خاندان کی ترقی رک گئی اس کے بیٹے الظاہر لاعزاز اللہ نے ۴۲۸ھ ہجری تک حکومت کی مگر حلب و شام کا بڑا حصہ قبضہ سے نکل گیا۔ ظاہر کے بعد اس کا بیٹا المستنصر خلیفہ ہوا جس کے عہد میں دیار مغرب پر مغرب ہیں بادلیس نے قابض ہو کر عباسیوں کا خطبہ پڑھا اور یہی حال شام و حجاز کا ہوا"[1]

خاندان عبیدیہ جس کو فاطمیہ بھی کہتے ہیں ڈیڑھ سو سال تک افریقہ میں اس کے عروج اور اقبال کا ایک تابناک دور رہا۔ اس کے بعد المستنصر ۴۸۷ھ ہجری ۴۹۵ھ مستعلی پھر الآمر باحکام اللہ کی وہ سال تک عنان حکومت سنبھالا اس کے بعد اس کا چچا زاد بھائی عبد المجید بن محمد بن مستنصر آیا اس کے بعد اس کا بیٹا ظاہر ۵۵۵ھ میں جانشین ہوا اور ظاہر کے بعد اب اس کا کمسن بیٹا فائز عیسیٰ آیا۔ فائز کے بعد عاضد سلطان مصر ہوا۔ اور عاضد ہی وہ آخری سلطان تھا جس کے بعد اس حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا مصر پر سلطان نور الدین کا فاتحانہ قبضہ ہو گیا اس کے فاتح اسد الدین شیرکوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین تھے۔

یہ تذکرہ بظاہر ہمارے موضوع سے کچھ ہٹا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے موضوع کا اس سے ایک خاص اور گہرا تعلق ہے۔ شجرہ میں اور دوسری تاریخی کتابوں میں سید اسماعیل بن جعفر الصادق کے بیٹے سید محمد اور ان کے فرزند سید عبداللہ کو مدینہ منورہ سے اپنے اہل و عیال اور خاندان و متعلقین کے ساتھ ہجرت کر کے عراق سے نو میل کے فاصلہ پر نایت میں آباد ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے ان میں چند باتیں قابل غور ہیں ان میں سے ایک یہ کہ امام جعفر صادقؒ اپنی بزرگی اور روحانی مسند اور جانشین سید اسماعیل کو نہیں بلکہ اپنے دوسرے فرزند امام محمد باقر کو بخشا تھا کیونکہ سید اسماعیل اپنے بزرگوں کے طور طریقے کے خلاف سیاسی اقتدار ظاہری کی خلافت و حکومت کے بھی طالب و ساعی تھے۔

۲۔ اسی بنا پر اسماعیل کا ایک فرقہ مسلمانوں میں پیدا ہو گیا اور ان سے جو سنگین قسم کے فتنے سر اٹھائے اور جس بے دردی سے خون ریزیاں ہوئیں اور جس بے رحمی سے بے شمار علماء و فضلا کو قتل کیا گیا۔

اس کا کچھ ذکر گذشتہ صفحات میں آپ دیکھ آئے ہیں۔ یہ فتنہ ابھی ختم نہیں ہوا اس دوران میں پیدا شدہ سارے نقصانوں اور کمزوریوں کی تلافی کے لیے ایک مرد مومن کا ظہور ہوا جس نے

---

[1] تاریخ اسلام ص ۹۳

نہ صرف عقائد اسماعیلیہ کو پھیلانے میں زبردست کارنامہ انجام دیا بلکہ جہاں اسماعیلیہ فرقہ کے داعی کا قدم تک رکھنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے وہاں بھی ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم کر دی۔

فرقہ اسماعیلیہ کو ایک نئی زندگی بخشنے والا اور اس کو ایک بھرپور دہشت کے روپ میں استوار کرنے والا کون تھا؟ یہ "حسن بن صباح تھا"۔ اس نے عقائد میں جو جدت آفرینیاں کیں اور جو حیرت انگیز حرکتیں ایجاد کیں وہ ایسی کہ پوری تاریخ میں اس کی کوئی نظیر اور جواب نہیں مل سکتا لیکن ہم کو یہاں اس کی تفصیلات سے بحث نہیں ہے جس کو ہم ایک خاص عنوان کے تحت آئندہ صفحہ میں پیش کریں گے۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سید عبداللہ ابو یعلیٰ اعفیں سید اسماعیل کے پوتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ حکومت وقت سے انھیں اور ان سے حکومت وقت کو کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہوں یا ان کے کسی سیاسی رجحان کی وجہ سے یا ان کی شان و عظمت کے خلاف حکومت وقت سے کوئی نازیبا سلوک یا ناقدری سرزد ہو گئی ہو یا سید عبداللہ کا مدینہ منورہ میں قیام حکومت کے مفاد و مصالح اور اس کی سیاسی پالیسی کے منافی رہا ہو یا ان کی موجودگی امن و سلامتی کے لیے خطرہ کا باعث بن گئی ہو بہر حال جو بھی وجہ رہی ہو حکومت وقت نے سید عبداللہ کو مع اہل و عیال و خاندان کے مدینہ طیبہ سے نکال دیا اور وہ عراق کے ایک قصبہ نابت میں جا کر آباد ہو گئے۔ تاریخی حالات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی۔ سادات کا وہ فرقہ جس کا تعلق اسماعیل اور ان کی اولاد سے ہے اپنے سیاسی اغراض و رجحان کے خاطر اور حصول حکومت و اقتدار میں سعی و سرگرمی کی بنا پر جہاں بھی گئے تغیر احوال و انقلاب کا باعث ہوا حوادث و فتن ہنگامے اٹھے۔ انتشار بدامنی پھیلی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا نئے نئے فرقے پیدا ہوئے اور ان اسماعیلیوں اور ان سے نسبت جوڑنے والوں نے وہ وہ ہولناک کھیل کھیلے جس سے سارا عالم اسلامی لرزا اٹھا تھا۔ معرکہ آرائیاں اور زور آزمائیاں اور بے شمار خون ریزیاں ہوئیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد اور اس کے مسلم اصول پر کھلے بندوں ضرب کاریاں اور دخل اندازیاں ہوئیں۔ عبیداللہ کے کچھ حالات گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکے ہیں وہ بھی اپنا سلسلۂ نسب حضرت سید اسماعیل سے اس طرح ملاتا تھا۔ عبیداللہ بن حبیب بن جعفر بن منصور بن محمد بن اسماعیل بن جعفر الصادق اس کے علاوہ بانی فرقہ قرامطہ نے محمد بن عبداللہ بن محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق کی محبت کی ہی آڑ میں لاکھوں شیعوں کو اپنا ہمنوا اور شریک کار بنا لیا تھا گو سید عبداللہ الوائط کا بذات خود سیاسی سرگرمیوں اور حصول اقتدار کی کوششوں میں ملوث ہونے یا کسی قسم کی تفرقہ بازی میں حصہ لینے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ تاہم مدینہ طیبہ سے ان کا اخراج اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ حکومت وقت

انھیں شبہ کی نظروں سے دیکھتی تھی اور ان کا وہاں قیام اپنی حکومت کے لیے شاید ایک بڑا خطرہ بھی سمجھتی تھی کیونکہ سادات کرام اور بنی ہاشم کا جہاں تک تعلق ہے وہ ان معلوم اور مشہور حقائق و اسباب کی بنا پر شروع ہی سے بنو امیہ سے کبیدہ خاطر اور ناخوش رہے اس لیے بنی امیہ ان کے تعاون و اشتراک سے اپنے دور حکومت میں تقریباً محروم رہی اور وہ اکثر ان سے بدظن رہی اور ان کا سلوک ان بزرگوں کے ساتھ کچھ اطمینان بخش نہیں رہا تھا۔ چونکہ بنو ہاشم اپنی خاندانی عظمت و برتری کی بنا پر اور سادات بنی فاطمہ آل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں زیادہ محبوب تھے اور انھیں نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اس لیے دینی پیشوائی اور روحانی اثر و نفوذ کے ذریعے ہر طرح حاصل تھے۔ اور عوام کا رجوع عام ان کی طرف ہی تھا۔ ان میں بعض بزرگوار صلاح و تقویٰ اور زہد و صفا میں ممتاز اور اہل بیت کی روایات پر قائم تھے اس لیے باطنی اقتدار و رسوخ کا مقام انھیں ہی حاصل تھا اور رجوع عام انھیں کی طرف تھا لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے بعض ظاہری حکومت اور سیاسی اقتدار کے حصول میں پیش پیش رہے اس لیے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے جو فتنے اور ہولناک ہنگامے اٹھے اس کا سلسلہ مدتوں تک مختلف صورتوں اور فتنوں میں برقرار رہا پھیلتا رہا اور نت نئے فتنوں کو جگاتا میدان کارزار گرم کرتا اور بے شمار انسانی جانوں کی ہلاکت و تباہی کے نذر کرتا چلا گیا۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ اٹھتے ہوئے طوفان سمیٹ لیتے گئے۔

بلاشبہ بنی امیہ نے اپنے دور حکومت میں شاندار فتوحات اور نہایت مفید و روشن خدمات انجام دیں واقعۂ ہائلہ کربلا اور حجاج بن یوسف کے پر تشدد حرکات اور اس کے ظالمانہ واقعات کی بنا پر ہی بنو امیہ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی گھٹتی جا رہی تھی اور مادۂ مخالفت اندر ہی اندر پکتا اور جڑ پکڑتا جا رہا تھا لیکن کچھ تو ولید بن عبدالملک کا حسن تدبیر اور اقبال کی یاوری تھی حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؒ جیسی بے مثال شخصیت کا عدل و انصاف جس کے بدولت یہ آگ دبی رہی لیکن بنی ہاشم اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے اور اپنا اعتبار جماتے رہے۔ ولید ہی کے زمانہ میں حضرت زید بن علی بن حسن نے کوفیوں کے ساتھ علم بغاوت بلند کیا اور آخر شہید ہوئے اس کے بعد ان کے ایک فرزند حضرت یحییٰ ثانی ولید بن یزید بن عبدالملک کے زمانے میں حضرت زید بن علی بن حسین نے کوفیوں کے ساتھ علم بغاوت بلند کیا اور آخر شہید ہو گئے۔

- - - - - - - - - -

۔۔ یہ دونوں فرزندان آل رسول کوفیوں کی شروع میں حمایت اور بعد میں ترک رفاقت کی وجہ سے بنی امیہ کے مقابلے میں ناکام رہے اور ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔ لیکن اس کے باوجود بنی ہاشم

اور ان کے حامیوں کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ اور وہ برابر موقع کی تاک میں رہے اس دوران میں قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم کا قتل اور یزید بن مہلب کی بغاوت سے بنی امیہ کی ساکھ بیٹھ گئی اور سلطنت تفریق کا شکار ہو گئی۔ اس کے نظام و استحکام میں فتور پیدا ہو گیا جو بالآخر اسکے زوال کے اسباب میں ایک قوی سبب بن گیا۔ ان حالات میں بنو امیہ کا قریش اور خاندان نبوت سے نبرد آزما ہونا ایک بکھری اور بگڑی ہوئی کمزور طاقت کا ایک اندر ہی اندر جمی ہوئی اور زور و قوت کے ساتھ ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ خطرناک مقابلہ تھا اب بنو امیہ کو اپنی گذشتہ بے راہ روی اور احکام حق سے روگردانی اور صحابہ کرام کی تقلید سے بے پروائی اور اپنے دور کے بے شمار ظلم و استبداد کا نتیجہ بھگتنے کا وقت آ گیا تھا۔ چنانچہ وہ وقت آیا بنی امیہ کا آفتاب مغرب میں جا چھپا اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھین لی گئی بنی عباس اس پر قابض ہو گئے۔

عبّاسیہ

عباسیہ کا ابتدائی دور نہایت روشن اور شاندار رہا۔ لیکن ہارون رشید کے بعد اس کے جانشین علوم عقلیہ کی زد میں کچھ اس طرح بہ گئے جس نے اس امت میں ایک نئے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔ یونانی فلسفہ خود اپنی زادت گاہ یونان میں قابل لحاظ اثر نہ دکھا سکا مگر وہی فلسفہ عرب میں آکر بعض اونچے دماغوں میں جڑ پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنے تلخ ترین اثرات و ثمرات سے عربی ممالک کی فضا کو مکدر و مسموم کرنے لگا۔ جس نے مامون رشید جیسے عالم و فاضل خلیفہ کو اس قدر مغلوب و متاثر کیا کہ وہ نہ صرف خلق قرآن کا معتقد ہوا بلکہ اس نے اپنا اعتقاد تسلیم کرانے کے لیے زور زبردستی کا ایک ہولناک فتنہ کھڑا کیا جن علماء نے اس عقیدے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا وہ عتاب و عقاب کے مستحق قرار پائے۔ امام احمد بن حنبل جیسے پاکباز مسلمہ امام اور مجتہد عالیمقام کو خلق قرآن کو تسلیم نہ کرنے پر قید و بند اور ضرب شدید کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑا اس عقیدے کے لیے مجبور رکھے جانے پر عوام میں حکومت کے خلاف بد دلی اور ناراضگی پیدا ہو گئی مگر وہ حکومت کے رعب و داب کی وجہ سے دم مار کر رہ گئے۔

اس ناراضگی نے رفتہ رفتہ نفرت کی جگہ لے لی جو آئندہ چل کر حکومت کے مضبوط قلعہ کو نیچے

حکمت سے اڑنے والا بارودی سرنگ بن گئی۔

ہارون رشید کے بعد اب خلفائے عباسیہ کے اسلامی رنگ میں تغیر پیدا ہو چلا تھا اسلامی امامت کی جگہ شہنشاہی عظمت و جلال اور کسروی شان و اقبال کا جابرانہ نظام نمایاں نظر آنے لگا تھا اس ظاہری شان و شوکت کے پیچھے پڑنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا دائرہ فتوحات اموی عہد کے فتوحات سے آگے بڑھانہ وسعت اختیار کر سکا۔

مامون کے بعد معتصم سریر آرائے خلافت ہوا وہ اگرچہ علمی لحاظ سے اپنے باپ دادا کے نسبت کورا تھا تاہم خلق قرآن کے مسئلہ میں اس کا رویہ بھی نہایت سخت اور کافی نمایاں رہا اس کا دور بھی علمائے اسلام کے لیے حد درجہ صبر آزما اور ابتلا انگیز رہا۔ اس کے علاوہ اکثر مورخین اس کے بارے میں حرف گیری کے طور پر لکھتے ہیں کہ اس نے عربوں کی جگہ ترکوں کو فوجی اور ملکی کاروبار میں داخل کیا جس سے عرب بے دل ہو کر کاروبار خلافت اجنبیوں کے ہاتھ چھوڑ کر علاحدہ ہو گئے۔ اور اکثر بدویانہ زندگی بسر کرنے لگے اس غلط مسلک اور پالیسی نے آخر خلافت کو بے دست و پا کر دیا[1]

معتصم ان غلام ترکوں پر اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ اس کو عربوں میں رہنا بھی گوارہ نہیں ہوا اور اس نے بغداد کے نواح میں ایک جدید شہر سامرہ نام سے آباد کیا اور ترکوں کے ساتھ وہیں رہنے لگا یہ ظاہر ہے کہ خلافت عباسیہ کے ساتھ جو قومی اور ملکی تعلق عربوں کا تھا وہ کس طرح ترکوں سے ہو سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ عرب عام طور پر معتصم کے اس طرز عمل سے بدظن اور دل برداشتہ رہے لیکن بعض مورخین لکھتے ہیں کہ :۔

"معتصم باللہ نے ان انقلاب پسند عربوں کا زور گھٹانے اور آئندہ کی مشکلات سے بچنے کے لیے ترکوں کو بڑھایا یہ لوگ وسط ایشیا کے خوبصورت قوی ہیکل جوان تھے جو بچپن سے خریدے جاتے تھے اور بجائے والدین کے خلیفہ ہی کو اپنا مربی اور ہوا خواہ پاتے ان کو نہ قریشی جوش تھا نہ عادی فخر نہ دعوائے امارت نہ استحقاق خلافت نہ قومی زور نہ ملکی شعور ان کو الائمۃ من قریش سے کوئی تعلق نہ تھا[2]

بلاشبہ اس حدیث کے سامنے ترکوں، معالم، سلاجقہ، اتابکوں، کردوں، خوارزم شاہوں، غزنویوں، سامانیوں جیسے زبردست سلاطین کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اسی بنیاد پر بغداد کی خلافت و سلطنت کے سامنے ان کی گردنیں جھکتی رہیں اور پانچسو سال سے زیادہ عرصہ تک بغداد میں اور ۳۴۲ سال مصر میں عباسی خاندان کا چراغ کم و بیش جلتا رہا۔

---

[1] تاریخ اسلام صـ۲۲ [2] تاریخ اسلام صـ۹۴

معتصم باللہ نے ۲۲۷ھ میں رحلت کیا اس کی جگہ اس کا بیٹا واثق باللہ خلیفہ ہوا۔ لیکن واثق باللہ نے اپنے دور خلافت میں کچھ تاریخی کارنامے بھی انجام دیے جس کی تفصیلات ہمارے موضوع سے باہر ہے الحاصل واثق ۲۳۲ھ میں انتقال کر گیا اس کا بھائی المتوکل علی اللہ مسند آرائے خلافت ہوا۔ اس وقت بھی عربوں اور ترکوں کا اختلاف بغداد میں عروج پر تھا رومی جو فتنہ کی تاک میں تھے اس باہمی اختلاف سے رومیوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اور وہ مصر کی سرحد پر واقع دمیاط پر حملہ کر دیا اور اس کو تاخت و تاراج کر کے چلے گئے۔ اس طرح وہ ایک طرف ایشیائے کوچک کے اسلامی علاقہ پر دست درازیوں میں سرگرم تھے۔ اور عیسائیوں کے تن مردہ میں ایک نئی زندگی اور تازہ جوش ابھار رہے تھے تو دوسری طرف نوبہ کے وحشی حبشیوں نے بغاوت کا ایک نیا طوفان اٹھایا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔

یہی نہیں بلکہ وہ اور آگے بڑھ کر مصر کے جنوبی علاقے کو لوٹ مار کر اس کو بہت نقصان پہونچایا یہ واقعہ ۲۴۱ھ میں پیش آیا تھا۔ متوکل نے محمد بن عبد اللہ قمی کو بیس ہزار سوار اور پیادہ مصری فوج کے ساتھ نوبہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا چونکہ نوبہ دور دراز دشوار گذار مسافت پر واقع ایک بنجر علاقہ تھا پھر بھی مصری فوج خشکی کے راستے سے اسے طے کیا۔ شاہ نوبہ کی فوج مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی ہر چند نوبہ لڑائی کو طول دینا چاہتا تھا تاکہ مسلمان رسد کی کمی کی وجہ سے بھوک و فاقہ سے ہلاک ہو جائیں لیکن متوکل نے ادھر فوج روانہ کر دیا اور ادھر اناج سے لدے ہوئے سات بڑے جہاز بحر قلزم کے مغربی ساحل پر روانہ کیے یہ جہاز بر موقع پہونچ جانے سے شاہ نوبہ کا منصوبہ خاک میں مل گیا بہادرانہ مقابلہ ہوا، نوبہ کی فوج شتر سوار تھی۔ محمد بن عبد اللہ نے گھوڑوں کے گردنوں میں جرس باندھ دیے جن کے شور سے اونٹ بلبلا اٹھے اور جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ گئے۔ مسلم فوجوں نے ان کا تعاقب کیا ہزاروں کو قتل کیا۔ شاہ نوبہ نے اطاعت قبول کی۔ گذشتہ سالوں کا خراج ادا کر دیا۔ محمد بن عبد اللہ فتح یاب واپس آیا اور متوکل کے انعام و اکرام سے سرفراز ہوا۔

متوکل کے بارے میں کتب تاریخ میں بہت سی تفصیلات موجود ہیں مگر ہم کو یہاں ان سے بحث نہیں یہ ۲۴۷ھ کو ترکی غلاموں کے ہاتھ قتل ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا منتصر باللہ خلیفہ ہوا کچھ مہینے کے بعد وہ اس دنیا سے چل بسا اور مستعین باللہ بن معتصم باللہ سر براہ آرائے خلافت ہوا: اس کی دو ایک دفعہ رومیوں سے کچھ چھیڑ چھاڑ ہوئی اس میں عمر بن عبد العزیز اور علی بن یحییٰ جیسے نیک نام جانباز اسلام کی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں اس کے علاوہ متوکل کے مارے جانے اور ترکوں کے اختیارات کے غلبہ کی وجہ سے دار الخلافہ بغداد میں سخت تہم

کے فسادات رونما ہو گئے جن کی تفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے ان فسادات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵۱ھ ہجری میں مستعین معزول اور پھر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اس کے بعد معتز باللہ خلیفہ ہوا اور وہ بھی ۲۵۵ھ ہجری میں معزول اور پھر قتل کیا گیا اور اس کی جگہ مہدی بن واثق آیا اور ۲۵۶ھ ہجری میں اس کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا گیا۔ اور ۲۵۶ھ ہجری میں معتمد بن متوکل جلوس فرمائے تخت خلافت ہوا۔ اس طرح عباسی خلافت کی کشتی ایک سو بارہ سال تک مختلف حوادث و حالات کے تھپیڑوں سے ہچکولے کھاتی رہی اور مختلف قسم کے فسادات اور خونی ڈرامے اسٹیج ہوتے رہے۔

یہ نتیجہ تھا خدا اور اس کے رسول کی اطاعت سے روگردانی کا۔ باہمی نفاق و افتراق کا، قومی مفاد کے بجائے ذاتی اغراض و نفسانی خواہشات کا، خلفاء کی معزولیت اور بے راہ روی کا، ان کی بد انتظامیوں کا اور کوتاہیوں کا دربار خلافت کا وقار اٹھ چکا تھا اس کی قوت منتشر و پراگندہ اور اس کے رعب و داب کا بھرم کھل چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے مدعی نکل پڑے اور بہت سے فرقے جنم لینے لگے ایک طرف سلطنت عباسیہ کی طرف زوال کے آثار تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے اور دوسری طرف زنادقہ کے فتنے سر اٹھانے لگے۔

زنادقہ کا ظہور

گو ۲۲۲ھ عباسی سلطنت کا عروج و کمال کا دور تھا لیکن اس کے اس دورِ اقبال ہی میں چند ایسے فرقے ابھر آئے جنھیں در حقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ اسلام کے نام سے اسلام کی جڑیں اکھاڑنے کے درپے رہتے تھے اسلام کا اصلی نقشہ بگاڑ کر اس کے بجائے خود ساختہ ایک نیا نقشہ پھیلانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس گمراہ کن فرقہ کے چند ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کے نمونے۔ "وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک دانا اور حکیم سمجھتے تھے اور کلام اللہ کو ایک نہایت فصیح و بلیغ کلام انسانی تعبیر کرتے، نماز، روزہ، حج زکوٰۃ کی پابندی سے جی چراتے اور آیات محکمات کی تعمیل سے گریز کرتے مگر متشابہات کی من گھڑت تاویلات میں سرگرم رہتے رکوع، سجود، طواف وغیرہ ارکان اسلام پر پھبتیاں کستے اور ان کا تمسخر اڑاتے روزہ کے قائل تھے نہ پابند عرب کے چند مسلم ادیب مشاق و ماہر بنا اس گروہ کے نمایاں اشخاص تھے اور ان کا سرگروہ ایک مشہور شعلہ بیان آتش زبان ابن مقفع تھا یہ وہی تھا جس نے کلیلہ و دمنہ کا عربی میں ترجمہ کیا اس زمانہ میں وہی عرب کا سب سے بڑا ادیب شمار کیا جاتا تھا یہ فتنہ سب سے

پہلا خلیفہ ہادی عباسی کے دور میں سر اٹھایا تھا اور اس کا یہ سالار علی بن یقطین ابن مقفع کا ہمنوا اور اس کا پشتیبان تھا اس کے علاوہ خاندان عباسی میں عبداللہ بن داؤد بن علی بن عبداللہ بن عباس اور بنی ہاشم میں سے یعقوب بن عقیل بن عبداللہ بن عباس، بن ربیع بن حارث بن عبدالمطلب اس کے معاون و مددگار تھے۔ ان عمائدین حکومت کے اثر و رسوخ اور ان کی حمایت و عنایت کی وجہ سے بہت سے امیرزادوں، مالداروں، عیش پسندوں اور شریعت و مذہب کی قید و بند سے آزادی کے خواہاں نے مذہب زنادقہ کو اختیار کر لیا کیونکہ وہ احکام شرعی کو اپنی نفسانیت اور شہوت پرستی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے چونکہ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کا ایک بے نظیر و لاجواب معجزہ تسلیم کیا جاتا تھا اس لیے انھوں نے قرآن کے مقابلہ میں ایک نئی کتاب تصنیف کرنے کی سوچی اور یہ کام ابن مقفع کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے سال بھر میں اس کو انجام دینے کا وعدہ کیا اس کے لیے نہایت فرحت افزا مکان اور عمدہ غذائیں بہم پہنچانے کی ممکن سہولتیں فراہم کی گئیں وہ مہینوں مغز پاشی و دماغ سوزی کرتا رہا اور اس آیت کے مقابلہ میں کوئی جوابی آیت وضع نہ کر سکا۔

قیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی۔

وہ اس کی جوابی آیت لکھنے کی پوری کوشش کرتا لکھتا اور پھاڑ ڈالتا یہاں تک کہ ردیوں کا ایک انبار ہو گیا اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ چند مہینے گذرنے پر صرف ایک آیت کے مقابلہ میں کوئی عبارت وضع نہ کر سکا تمام قرآن کا مقابلہ وہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

اسلام میں منجملہ دیگر حوادث کے یہ بھی ایک عظیم حادثہ تھا جس کا منشا فساد عقاید اصول دین سے انحراف مسلمانوں کا ذہنی انتشار و افتراق تھا اور اسلام کو اس کے بیخ و بن سے اکھاڑ کر زندیقیت کو چلانا تھا علمائے دین و صوفیائے صالحین اس گمراہ فرقہ کے خلاف پوری تندہی اور کمال ہمت و دلیری کے ساتھ صف آرا ہو گئے بر سر عام بے دھڑک اظہار حق کیا مباحثے کئے جن میں انھیں فاش شکستیں اٹھانی پڑیں۔ یونانیوں کے وہم ساز ذہن تراش مفسد و مضر فلسفہ کے دعوے باطل کر کے رکھ دیتے اس طرح انھوں نے عام مسلمانوں میں علم و کلام کے زہریلے اثرات زیادہ بڑھنے نہیں دیے۔

حکومت وقت کو بھی ان کے دلائل کے سامنے جھکنا پڑا۔ زنادقہ بعض کٹر قسم کے سرپھرے لوگوں کو جو قرآن حکیم و رسالت رسول کریم کا اعلانیہ انکار کیا کرتے تھے من بدل دینہ فاقتلوہ کے مطابق انھیں قتل کیا گیا اس کے بعد سلطنت کی طرف سے بھی اس فرقہ کی بیخ کنی کی کوشش برابر جاری رہی لیکن بے دینی کا جو بیج بویا گیا تھا وہ درپردہ ان زہریلے جراثیم کو اپنی ذریت بنا

پھیلاتا رہا۔

دیلمی یا صوفیہ :- تاریخی کتابوں سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک فرقہ جس کے عقاید تقریباً زنادقہ جیسے تھے ۱۹۲ھ ہجری میں سر اٹھایا تھا۔ ہارون رشید نے ان کی کثیر جمعیت کا صفایا کر دیا تھا لیکن یہ فرقہ معتصم کے دور میں زور و قوت کے ساتھ پھر ابھر آیا اور تمام شمالی ایران، ہمدان وغیرہ پر اپنا تسلط جمایا۔ اس کا بانی ایک الخرمی تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ مجوسی تھا۔ عقاید زنادقہ کے علاوہ وہ تناسخ کا بھی قائل تھا اور عوام کو دھوکہ دینے کے لیے قرآن مجید سے استدلال کرتا تھا۔ درحقیقت اس کو مذہب سے کچھ سروکار نہ تھا وہ محض ایک سیاسی لیڈر تھا اور اس کی تمام سرگرمیاں مذہب کی آڑ لے کر پولیٹیکل مقاصد پر مبنی تھیں۔ معتصم باللہ نے اپنے ایک بہادر جرنل اسحاق بن ابراہیم کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا سخت جنگ ہوئی آخر اسحاق فتح یاب ہوا اور ساٹھ ہزار خرمی مارے گئے۔ اس طرح اس کا زور ٹوٹ گیا۔

صاحب الزنج کا ظہور

علی بن عبدالرحیم یہ اصفہان میں پیدا ہوا اور اس کا تعلق بحرین کے قبیلہ بنو عبدالقیس سے تھا ظاہر میں وہ ایک صالح نیک اور عبادت گذار تھا۔ وہ شروع میں مستنصر باللہ کا درباری شاعر اور مصاحب تھا اس کو رکابیہ کہتے تھے۔ حکومت کی کمزوریوں اور سیاسی چالوں اور حالات سے بخوبی واقف تھا شروع میں اس نے امامت کا اور بعض مورخین کے بیانات کے مطابق آگے بڑھ کر رسالت کا بھی دعوی کیا اس کے ساتھ وحی و الہام کی گپ اڑانے لگا اور عوام کو اپنی طرف رجوع کرنے کے لیے بعض ممنوع امور جائز قرار دیا وہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت طلحہؓ و زبیرؓ و حضرت عائشہؓ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین اکابرین صحابہ کی شان میں سخت گستاخی کرتا وہ اپنے معتقدین کو مسلمان اس کے علاوہ دوسروں کو کافر و مشرک سمجھتا۔ اس زمانہ میں زنگی غلاموں کے خلاف ظلم و تشدد کا سلوک کیا جارہا تھا اور وہ اس سے سخت نالاں و عاجز آ گئے تھے اسلیے ان کی حمایت کا نکتہ خوب اس کے ہاتھ آیا اس نے ان غلاموں کو ہر طرح کی ہمدردی و حمایت کا اور ان کی آزادی کا اطمینان دلایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کوئی غلام اپنے مالک کے تشدد سے تنگ آجاتا تو وہ صاحب الزنج کے پاس پناہ لینے کے لیے چلا جاتا اور جب مالک اسے لینے جاتا تو اس کی خوب پٹائی ہوتی اور وہ ناکام چلا آتا اس طرح زنگی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے پاس جمع ہو گئی اس کے علاوہ بحر احمر خلیج فارس کے مغربی ساحل کے اکثر لوگ اس کے دام تزویر کے اسیر ہو گئے اس سے اس کی قوت و زور میں

بہت کافی اضافہ ہوا مورخین کا بیان ہے کہ خاص بصرہ میں تقریباً تین لاکھ مسلمان اس کے ہاتھوں شہید ہوئے اور وہ نواح بصرہ میں اپنے اقتدار کا پھریرا اڑانے لگا۔ خلیفہ بغداد کو اس کے مقابلے میں پے در پے شکستیں ہی اٹھانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ صاحب الزنج کے ہاتھوں سے دس سے بیس لاکھ مسلمان قتل ہوئے بوڑھے بچے جوان عورتیں کوئی بھی اس سنگ دل کے خون ریز حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ مسعودی کی روایت کے مطابق موفق طلحہ بن متوکل اور اس کا بیٹا ابو العباس ۲۶۷ھ ہجری میں صاحب الزنج کے مقابلہ پر مقرر ہوئے اور ۲۷۰ھ ہجری میں اس ظالم فرقہ کا فیصلہ ہوا۔ چودہ سال چار مہینے تک خلیفہ بغداد کا نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا رہا اور خلیج کے دونوں ساحلوں پر اپنا قبضہ جمائے رہا۔ ابو العباس نے کئی ایک خونریز معرکوں کے بعد صاحب الزنج کو ٹھکانے لگا دیا اس کے دور اقتدار میں عربوں خاص کر شریف پاکدامن عورتوں کی عصمتیں بڑی بے دردی اور بے پروائی کے ساتھ لوٹی گئیں اور مسعودی کے بیان کے مطابق حسنی اور حسینی اور عباسی عورتیں دو یا تین درہم تک فروخت ہوتیں اور ایک ایک زنگی کے پاس دس دس بیس بیس تیس تیس ایسی شریف عورتیں موجود جن کی عصمت میں خلل ڈالا جاتا اور زنگی عورتوں کی خدمت کا کام ان سے لیا جاتا تھا۔

غرض یہ شخص اپنے سنگین اور سیاہ کرتوت اور ظالمانہ کارناموں کی وجہ سے امارت کے پردے میں چھپا ہوا ایک دجال سے کم نہ تھا۔ اس فتنہ گر کے تفصیلی حالات تاریخی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جب اس کا کٹا ہوا سر بغداد میں پہنچا تو وہ دن اہل بغداد کے لیے نہایت ہی خوشی اور خوشحالی کا دن تھا۔

مذہب قرامطہ

صاحب الزنج کے ہولناک فتنوں سے ابھی اطمینان کا سانس لینے بھی نہ پائے تھے ایک اور فتنہ گر قرمطی کا ظہور ہوا۔ ۲۶۴ھ ہجری میں معتمد بن متوکل کے دور خلافت میں خوزستان سے ایک شخص کوفہ میں چلا آیا جو بظاہر صوم و صلوٰۃ کا پابند، اور اوراد و وظائف میں مشغول زاہد، عابد صالح اور ریاضت پسند تھا جو اس کے پاس آتا اس کو اللہ رسول کی باتیں سناتا، بتاتے احکام بتاتا۔ نفسانی پیروی سے باز آنے کی ہدایت کرتا غرض لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے جو طریقے ہو سکتے وہ برابر کرتا رہا۔ عوام اس کی ظاہری صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوگئے اور اس

سے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے اس طرح وہ اپنا اثر و رسوخ بڑھاتا رہا اور سادہ لوح مسلمانوں کا ایک جم غفیر عقیدتمندانہ طور پر اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔ وہ کوفہ میں بیمار پڑ گیا کرمیہ نام کا ایک شخص اس کو اپنے گھر لے گیا اور مریض کی اچھی طرح خدمت کی اور وہ صحت یاب ہو گیا اس کی خدمت کے صلہ میں کرمیہ کہلانے لگا۔ اور بعد میں یہ لفظ بگڑ کر قرمطہ مشہور ہوا۔

اس نے شیعوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے ایک نئی ترکیب اختیار کی وہ اپنے مریدوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے لگا کہ امارت وخلافت کے مستحق اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور انھیں امام یا خلیفہ ہونا چاہیے چونکہ اب عباسی خلفاء کا زور گھٹتا اور ساکھ گرتی چلی جا رہی تھی اور حضرات سادات خلافت و امارت کے لیے ہمیشہ پا بجولاں رہتے تھے اور امام جعفر الصادقؒ اور ان کی اولاد بجا طور اپنے استحقاق و برتری کا سکہ ہر طرف بٹھا چکی تھی اور اہل بیت نبوی کی محبت و مودت دلوں کو سرشار کر چکی تھی اس لیے شیخ قرامطہ کے اس خیال سے کچھ زیادہ اختلاف ابھر نہ سکا اور اہل تشیع محض اس خیال سے کہ وہ محمد بن عبد اللہ بن محمد علی بن اسماعیل بن جعفر الصادقؒ کی طرف دعوت دیتا ہے زیادہ تر اس کے ساتھ شامل ہو گئے اس طرح جب اس کے مریدین و معتقدین کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی تھی تو اب وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آیا۔ اجماع سلف کے خلاف قرآن کے معانی بیان کرنے لگا اور باطل عقاید اور خلاف شرع احکام کی تعلیم دینے لگا چونکہ اس کے مریدین اکثر بدوی و دیہاتی تھے اور علم و دانش سے بے بہرہ تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو علم و فہم سے بے بہرہ ہوتے ہوئے بھی محض دنیوی منافع و دنیا کمانے کے لیے آئندہ کی ترقی و کامیابی کی امید سے ساتھ دے رہے تھے۔ وہ عراق میں اپنے الحادی مذہب کو قائم کر کے شام چلا گیا تاکہ دارالخلافہ سے دور رہ کر اپنے معتقدوں کو بر سر کار لا سکے۔ ملک شام میں وہ بہت کامیاب رہا اور اس کا مذہب کافی پھیل گیا لیکن تاریخ سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ اس کے بعد اس کا کیا ہوا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سلطنت اور علمائے وقت اس کے بارے میں سخت مغالطہ میں رہے کہ اس کے ظاہری اعمال سے اس کو زاہد و عابد سمجھ کر اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا اور اس کو اپنے کام کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جس کی بنا پر یہ ایک معمولی ذرہ بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا اس کے بعد ساده میں ابو القاسم بن یحییٰ شیخ قرامطہ ہوا۔ وہ قطیف میں ایک غالی شیعی سردار علی بن علی کے پاس پہونچا اور کہا کہ میں مہدی موعود کی طرف سے بھیجا گیا ہوں اور میں اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ مہدی علیہ السلام کے ظہور کا وقت آ گیا ہے چونکہ حکومت کے نظام میں ابتری و بد نظمی پیدا ہو گئی تھی۔ جا بجا فتنہ و فساد اور شر و سرکشی سر اٹھا رہی تھی انتشار و افتراق کی گھٹا چھا رہی تھی اس لیے اس کا یہ شعبدہ کارگر ہوا اور وہ اس میں بڑی

عروج کا وظیفہ لے کر بحرین چلا گیا اور وہاں کے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے میں لگا رہا اسی دوران اس نے ابوسعید جنابی نامی ایک شخص کو اپنے دام زریں میں پھانس لینے میں کامیاب ہوا۔ ابوسعید جنابی نے ۲۸۶ھ ہجری میں علم بغاوت بلند کیا جملہ قرامطیوں کے علاوہ بہت سے انقلاب پسند افراد اور مشرقی جانب کے کثیر التعداد اس کے شریک و مددگار ہو گئے۔ اور جنھوں نے اس کی اطاعت سے انکار کیا وہ ان کی جان لیوا تلواروں کی نذر ہو گئے۔ اس طرح قطیف اور بحرین کی تسخیر کے بعد بصرہ کی فکر میں لگا رہا لیکن خلیفہ معتضد بن موفق بن متوکل نے چودہ ہزار دینار سے بصرہ کے گرد ایک فصیل بنوادی ابوسعید نے نواح بصرہ ہجر لوٹ مار کر اس کو بہت نقصان پہونچایا۔ معتضد ابوسعید کے مقابلے کے لیے اپنی فوجی طاقت کے ذریعہ زور آزمائی کرتا رہا لیکن بغدادی فوج ابوسعید کی پرجوش و جانباز فوج کے سامنے غلبہ نہ پا سکی، شام حجاز، یمن، مصر کے سوا عراق کے کچھ حصہ پر بھی قرامطہ کا تسلط ہو گیا تھا۔ اس دوران معتضد باللہ ۲۸۹ھ ہجری میں رحلت کر گیا اور اس کا بیٹا مکتفی باللہ سریر آرائے خلافت ہوا اور وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ جنگ کرتا رہا لیکن قرامطہ کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان کے بڑھتے ہوئے زور و قوت اور پیش قدمی کے آگے دار الخلافہ بھی خطرات میں گھرا ہوا نظر آ رہا تھا اس کے باوجود دہر بغداد کے تخت نشینوں میں کچھ دم و خم باقی نہیں رہا تھا۔ اراکین خلافت و امرائے سلطنت باہمی نفاق و رقابت میں مبتلا تھے ان کی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے نہ خانگی اور داخلی فسادات کا سدباب ہو سکا نہ خارجی جارحیت کے خلاف منظم صف آرائی کی تگ و دو کی گئی۔

شہنشاہ قسطنطنیہ تو ایسے موقع کی تاک میں تھا چنانچہ اس نے گیارہ لاکھ فوج جرار کے ایشیا پر حملہ آور ہوا۔ اس قدر زبردست طاقت کے ساتھ حملہ کی مدافعت کوئی آسان بات نہ تھی لیکن عین وقت علمائے اسلام میدان میں نکل آئے انھوں نے مسلمانوں میں جہاد کا جوش پھیلایا ان کے خوابیدہ جذبات کو ابھارا۔ ان کے سکون و جمود کو توڑا ان کی غیرت و حمیت کو جھنجھوڑا اور انھیں مجاہدانہ کارگزاریوں کے لیے آمادہ کارزار بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا شاہ قسطنطنیہ مجاہدین کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر گھبرا اٹھا اور خلیفہ بغداد مکتفی باللہ سے صلح کر کے ناکام چلا گیا۔ بلاشبہ اس وقت ان مجاہدین نے اسلام کی آبرو رکھ لی۔

یہاں ہم کو بحث قرامطہ سے ہے۔ بغداد دعیزہ میں مسلمانوں میں پھیلے ہوئے مجاہدانہ

لہ جنابہ علاقہ فارس میں ایک گاؤں کا نام ہے۔

جوش کو دیکھ کر قرامطیوں نے اپنا رخ دوسرے طرف پھیر دیا۔ اب وہ عازمین حج کو لوٹنے اور انھیں قتل کرنے کا ایک نیا گھناونا سلسلہ چھیڑ دیا اور عراق و عرب میں ایک حشر نما طوفان برپا کر دیا۔

مکتفی باللہ ۲۹۵ھ ہجری میں چل بسا اور اس کی جگہ اس کا بھائی مقتدر باللہ آ گیا اور وہ قرامطہ کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ کئی خونریز جنگیں ہوئیں ان میں سے ایک جنگ میں ابو سعید مارا گیا۔ اس کا جانشین سعید ہوا اور وہ حمام میں قتل کر دیا گیا۔ اور اس کا بھائی ابو طاہر مذہب قرامطہ کا سرغنہ ہوا۔ جس نے اپنے آئندہ کرتوتوں سفاکانہ حرکتوں ظالمانہ تباہ کاریوں اور انسانی جانوں کی بے دریغ قتل و خونریزی سے ثابت کر دیا کہ وہی اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ قرامطی مذہب کا مرد آہن تھا۔ اس کے ناپاک کارناموں کی کوئی نظیر پوری تاریخ اسلام میں کسی بدترین عدو دین و ایمان سے پیش نہیں کی جا سکتی ان کے بارے میں تاریخ اسلام کا مورخ لکھتا ہے:۔

"ان ملحدوں کا اعتقاد تھا مسلمانوں کا خون جائز ہے ہجر الاحسا بحرین مشرقی عرب میں جو ہمیشہ مسلمانوں کے سواد اعظم کے برخلاف فتنہ و فساد کے معدن رہے ہیں۔ قرامطہ کی مستقل سلطنت کے مرکز تھے۔ ہجر اس کا دارالسلطنت تھا حجاز پر تصرف رکھتے تھے مسلمانوں کو مکہ معظمہ جانے اور بیت الحرام کے حج سے روکنے اور ہجر کے حج کے لیے مجبور کرتے تھے در اس مطلب کے لیے حاجیوں کو مارتے لوٹتے اور قتل کرتے اور ہر ایک قسم ظلم و تشدد مسلمانوں پر روا رکھتے اور باایں ہمہ اسلام کا دعویٰ کرتے ۳۱۷ھ میں ابو طاہر مع فوج جرار کے ناگہانی بلا کی طرح یوم الترویہ کو مکہ معظمہ پہنچا جبکہ بقول علامہ سیوطیؒ خود مقتدر بھی حج کو گیا ہوا تھا اور سوار و سلاح بند بیت اللہ میں داخل ہوا اور طائفین مصلین محرمین کا قتل عام شروع کر دیا اور ستر سو حاجیوں کو طواف کرتے ہوئے بے گناہ شہید کیا۔ انھیں شہدا میں شیخ الصوفیہ حضرت علی بن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ تلواریں پڑتی تھیں اور طواف کیے جاتے تھے۔

تری المجنون صرعی فی دیارھم کفتیۃ الکھف لا یدرون کم لبثوا

تیغ ہے۔ عاشقا مند عجب فرقہ آزار پسند تیغ بر سر رود و سر ز محبت نکشند

اس کمال درجہ کی تسلیم و رضا سے دکھلا دیا کہ عاشقان الٰہی و محبان رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فریضہ کس استقلال اور جگرداری سے کرتے ہیں اور تقدیر ربانی کے سامنے کس طرح سر تسلیم خم کرتے ہیں شہدا میں بڑے بڑے عالم فاضل فقیہ صوفی داخل تھے جن میں اکثر حاجی خراسان اور مغرب کے تھے۔

ابو طاہر نے خاص حرم کعبہ میں گھوڑے کی پیشاب اور لید کرائی تھی۔ کل مقتولوں کی تعداد جو اس ظالم خونخوار کے ہاتھ سے بیت اللہ اور شعاب مکہ میں مارے گئے تیس ہزار لکھی ہے جن

کے سرکاٹ کر چاہ زمزم غاروں گڑھوں کو بھر دیا اور لاشیں بلا کفن و جنازہ زمین دوز کی گئیں کعبہ کا دروازہ ابوطاہر نے اکھاڑ دیا وہ کافر عتبۃ الباب کعبہ پر کھڑا ہو کر کہتا تھا انا باللّٰہ، و باللّٰہ انا یخلق و فیھم انا۔ حاجیوں کو پکار کر کہتا تھا کہ اے گدھوں تم جو کہتے تھے ومن دخلہ کان آمنا، فاین الامان فعلنا ما فعلنا۔ ایک دل جلے مسلمان نے ابوطاہر کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کہا آیت شریفہ کے معنی ومن دخلہ فامنوہ ابوطاہر نے توجہ نہ کی اور بھاگ پھیر لی اور خدائے تعالیٰ نے اس مسلمان کو بچا لیا۔ اس مردود نے کعبہ کے میزاب سنہری کو اکھاڑنے کا حکم دیا ایک قرمطی اوپر چڑھا کوہ ابوقبیس سے ناگہانی تیر آکر لگا اور وہ مردہ ہو کر گرا پھر دوسرے کو حکم دیا وہ بھی گر کر داخل جہنم ہوا۔ باقی ڈر گئے ابوطاہر نے کہا چھوڑ دو خود صاحب الزماں مہدی آکر اکھاڑے گا جس کے ظہور کی وہ جلد امید کرتے تھے گھروں کو لوٹ لیا۔ عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ اکثر بھاگ گئے چند کنکھے کے میں رہ گئے اس سال کسی نے حج نہیں کیا۔ کعبہ کی پوشش اتار لی۔ قدم شریف لینا چاہا مگر کامیاب نہ ہوا حجر اسود روز منگل ۱۴ ذی الحجہ ۳۱۷ھ ہجری کو اکھاڑ لیا اور متکبرانہ بکواس بکتا رہا۔ زمزم کو گرا دیا گیا وہ روز تک مکہ میں رہا اور حجر اسود کو مقام ہجر لے گیا اور مسجد ضرار کے ساتویں ستون میں جانب مغرب لگا دیا اس خبیث کا خیال تھا کہ حج کا مدار حجر اسود پر ہے جب ہمارے پاس ہوگا تو بجائے مکہ معظمہ کے ہجر کو حج کے لیے آئیں گے لیکن سوائے قرامطہ کے اور کوئی بھی نہ گیا اور مسلمان بدستور سابق بیت اللہ زادہ اللہ شرفاً کے حج سے مشرف ہوتے رہے۔ جب قرامطہ لوگوں کو بیت اللہ کے حج سے نہ روک سکا تو ناچار ۳۳۹ھ ہجری میں بائیس سال کے بعد حجر اسود مکہ میں بھیج دیا اور وہ اپنی جگہ رکھا گیا۔ مسلمان سلاطین پچاس ہزار دینار دیتے رہے تھے مگر قرامطہ نے نہیں دیا تھا۔ ابوطاہر نے مکہ پر قبضہ کر کے عبیداللہ مہدی کو لکھا میں تمہارا خطبہ و سکہ جاری کرتا ہوں [1]

اس کا خیال تھا چونکہ عبیداللہ شیعہ ہے اور اس وقت خاندان فاطمیہ میں پورا جوش اور اٹھتی جوانی تھی اس کا سہارا مل جائے گا اور جدید تیز اور سلطنت کی طرف سے اندیشہ نہیں رہے گا۔ اسی جوان مرد عبیداللہ نے ۲۹۶ھ ہجری میں عباسی اقتدار سے آزاد کرا دیا اور مصر اور شام افریقہ کو یورپ کے نگاہ بد سے اس کے جانشینوں نے مدت تک بچایا تھا اگر کوئی لالچی ہوتا تو ابوطاہر کی درخواست کو نہایت غنیمت سمجھتا اور فائدہ اٹھا لیتا اور اس واقعہ سے حجاز شام سوخ بڑھا لیتا مگر عبیداللہ مہدی نے صاف جواب دیا کہ ابوطاہر۔

---

[1] تاریخ اسلام ص ۹۸

"خانہ کعبہ جو زمانہ جاہلیت اور اسلام میں محترم تھا اس کی توہین ہتک اور توہین کی اور حاجیوں کو خاص حرم کعبہ شریف میں ذبح کیا۔ مسلمانوں کا قتل جائز رکھا گیا مسلم عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا گیا اور حجر اسود کو اکھاڑ لیا گیا باوجود ان خلاف شرع امور کے مجھ سے تعلق اور تشکر کا خواستگار رہے۔ فلعنك الله ثم لعنك الله والسلام علی من سلم المسلمون من لسانه ويده" اس ظالم ابو طاہر کا عبرتناک انجام یہ ہوا کہ وہ ایک لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو گیا اس کے بدن میں کیڑے پڑ گئے اس کی عاقبت کی خبر تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن دنیا میں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ سخت عذاب اور تکلیف میں گھٹ گھٹ کے مر گیا۔

اس گمراہ فرقہ کے چند نمونے محمد بن حنیفہ کو رسول مانتے صبح کو دو اور شام کو دو رکعتوں کی نماز پڑھتے نبیذ کو حرام اور شراب کو حلال جانتے جنابت کا غسل نہ کرتے ۲۷۸ھ سے ۳۱۷ھ ہجری تک اس فرقہ کا عروج اور زور قائم رہا اور پھر زوال کی زد میں آ کر دبے رہ گئے اور یہی زمانہ عرب و عراق اور شام کے لیے نہایت بدبختی اور کڑی آزمائش کا دور تھا۔

حسن بن صباح

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سنی تھا۔

چوتھی صدی کے آغاز میں وہ شخص خراسان کے ایک قصبہ طوس میں پیدا ہوا اس کا سلسلہ نسب مورخین کے بیان کے مطابق اس طرح ہے حسن بن صباح بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن محمد الصباح اس کا والد صباح معاشی لحاظ سے ایک معمولی حیثیت رکھتا تھا اس کے باوجود اس کو اپنے نسب پر ناز تھا جس کو وہ عرب کے ایک قدیم سردار صباح حمیری کے سے جوڑتا تھا۔ کیونکہ حمیری بادشاہ یمن کی اولاد سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حسن سات برس کی عمر ہی سے اصلاحی خیالات کی طرف مائل نظر آتا تھا اور کم سنی ہی میں اس کو مارس کے ایک مشہور عالم و فاضل امام موفق الدین کی درسگاہ میں داخل کیا گیا۔ تعلیم کے دوران ہی میں اس کو ایک دو رفیق ایسے مل گئے جو ذہن و فہم کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ تھے ایک تو اس کا ہمنام حسن تھا جو اپنی صلاحیت و قابلیت کی بنا پر نظام الملک کے اعلیٰ خطاب سے نوازا گیا۔ دوسرا وہ جس کو

امارت وحکومت کا کوئی منصب تو نہیں ملا لیکن وہ اپنے ذہن او رعلم وکمالات کی بنا پر مشرق ومغرب میں ان دونوں سے زیادہ مشہور اور مقبول عام رہا۔ وہ تھا عمر خیام، ایک زبردست مہندس اور ایک مایہ ناز فلسفی اور مشہور شاعر۔

تعلیم کے زمانے میں ان تینوں کے تعلقات نہایت گہرے تھے انھوں نے ایک دوسرے سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ان میں سے جو کبھی برسر عروج و اقتدار آئے گا۔ وہ دوسرے دو ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ شریک وحصہ دار بنائے گا۔ تعلیم کے بعد حسن بن صباح نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس ناامیدی کے عالم میں اس کو پتہ چلا کہ اس کا ایک رفیق حسن دربار سلجوقی میں نظام الملک خطاب سے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس پہونچا اور گذشتہ وعدہ یاد دلایا اس پاک طینت نیک دل نے ایک نہایت اہم اور اونچا عہدہ اس کے سپرد کردیا۔ لیکن اس کی غیر قانع اور شرپسند طبیعت بھلا اس کو کس طرح گوارا کرسکتی تھی کہ نظام الملک تمام امور سلطنت کا کرتا دھرتا رہے اس کو ہر طرح کے وسیع اختیارات حاصل ہوں اور وہ اس کی ماتحتی میں رہے چنانچہ وہ اپنے محسن کو گرانے اور اس کے جوڑ توڑ میں رہنے لگا۔

اس دوران میں ملک شاہ نے اپنے وزیر سے اپنی وسیع تر سلطنت کے مختلف صیغہ جات آمد و خرچ کی مفصل رپورٹ طلب کی لیکن ان دنوں دفاتر کے حسابات صاف اور باقاعدہ نہ تھے اس لیے نظام الملک نے اس کے لیے دو سال کی مہلت طلب کی۔ اس پر اس عیار حسن بن صباح نے آگے بڑھ کر کہا وہ حسابات کی مکمل رپورٹ چالیس دن میں پیش کرے گا ملک شاہ نے یہ خدمت اس کے سپرد کردی اس چالاک شخص نے چالیسویں روز رپورٹ تو پیش کردی مگر جب ملک شاہ اس کو جانچنے کے سلسلہ میں جو باتیں دریافت کیں ان کا حسن کوئی معقول جواب نہ دے سکا اس سے بادشاہ کی نظر میں رپورٹ کا بوگس اور جعلی ہونا ثابت ہوا اور ملک شاہ جعل سازی پر اس کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن نیک بخت وزیر کی سفارش سے وہ بچ گیا اور پھر وہاں سے نکل گیا۔

اس زمانہ میں قاہرہ کی اسماعیلیہ کی زبردست خفیہ تنظیم کے داعی اور نقیب جابجا پھیل کر نہایت رازداری کے ساتھ سازشوں کا جال بچھانے اور سلطنت کی جڑیں اکھاڑنے میں لگے ہوئے تھے ان کے مذہب کے دو پہلو تھے ایک ظاہری اور دوسرا باطنی لیکن پردۂ راز در باطنی سرگرمیوں میں مرکوز رہتا تھا۔ چونکہ بنو امیہ کے خلاف بنو ہاشم (۳) خفیہ سازش ہی سے انقلاب برپا کرچکے تھے اسماعیلیہ اب وہی پرانا تجربہ عباسی حکومت کے خلاف دہرانا چاہتے تھے چنانچہ اب اسماعیلی خفیہ تنظیم کی ساری توانائیاں اور سرگرمیاں عباسیوں سے نفرت وعداوت اور فاطمیین سے محبت

دمودت کے لیے صرف ہو جاتی تھیں۔ چونکہ ان دنوں سلجوقی ایک زبردست طاقت کے روپ میں ابھر رہے تھے اور ان کا شاہانہ تسلط ایشیا کے اکثر اسلامی ممالک تک ہو گیا تھا اور وہ خلفائے عباسی کی عظمت کے قائل اور ان کی حکومت کے ہر طرح حمایتی تھے اور یہی پالیسی غزنوی سلاطین کی بھی تھی اس بنا پر حسن بن صباح کو جو ملک شاہ سے بغض و عناد رکھتا تھا اپنے انتقامی جذبے کے مدنظر فاطمین مصر کی طرف جھکنا پڑا۔ ابتدا میں اس کو ایک دو اسماعیلیوں سے ملاقات اور باہمی تبادلۂ خیال ہوا۔ پھر ایک اسماعیلی داعی مومن کے سمجھانے سے حسن جیسا فلاسفر اور آزاد مشرب زمرۂ اسماعیلی میں شامل ہو گیا اور پھر اس کو عبدالملک داعی عراق نے داعی مقرر کر دیا اور حسن چند ہی دنوں کے بعد المستنصر باللہ کی ملاقات کے لیے مصر چلا گیا حسن کی قابلیت اور صلاحیت کی شہرت تو پہلے ہی سے مصر میں پہونچ گئی تھی۔ مستنصر باللہ عزت و اکرام سے پیش آیا مگر بدر جمال سپہ سالار مصر مخالفت کی وجہ سے اس کو مصر سے نکل جانا پڑا۔ کہتے ہیں کہ وہ جس جہاز پر سفر کر رہا تھا اس پر دوسرے مسافر بھی سوار تھے۔ اتفاقاً جہاز طوفان کی زد میں آگیا، تمام اہل جہاز گھبرا اٹھے مگر حسن باطمینان بیٹھا رہا اور یہ پڑھا کہ گھبراؤ نہیں خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہم کو وہ نہیں ڈبائے گا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ڈوب گئے تو اس کی تکذیب کرنے والا کوئی رہے گا ہی نہیں اور اگر بچ گئے مفت کی کرامت و ولایت ہاتھ آجائے گی اتفاقی طور پر کشتی طوفان سے کوئی نقصان نہیں پہونچا اور وہ سب بچ گئے اور حسن کی ولایت کے معتقد ہو گئے اور اسماعیلیہ کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ ساحل شام پہونچ کر اسماعیلیہ کی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم رہا اس طرح شام، عراق، خوزستان، اصفہان، کرمان و رمضان پہونچا اور تین سال تک نہاں مذہب اسماعیلیہ پھیلاتا رہا اس طرح وہ دورے میں اپنے معتقدین اور مقلدین کی ایک بڑی تعداد کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا آخر قلعہ الموت کو اپنا اڈا بنایا یہ الموت ؟؟ وہ دبارتا طالقان کے علاقہ میں ہے۔ اس کا قلعہ نہایت دشوار گزار پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک اونچی چوٹی پر واقع تھا۔ وہ جیلم کے شاہوں کا بنایا ہوا تھا اس کا قلعہ دار مہدی فاطمی اور یہ حسن کا معتقد تھا وہ قلعہ ہر طرح حسن کی خواہش اور اس کے بالکل خیال کے مطابق تھا کیونکہ وہ ایک الگ تھلگ اور ہر لحاظ سے ایک محفوظ مقام تھا جہاں سے وہ اپنی مرضی کے مطابق سیاسی شعبدہ بازی اور شاطرانہ چالوں کے جال آزادی کے ساتھ بچھا سکتا تھا۔ اور اپنے خفیہ منصوبوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔ اب اس قلعہ کے حصول کے سلسلے میں اس کا پر فریب طریقہ ملکہ لطیفہ کہی سن لیجئے قلعہ دار جو ایک سیدھا سادہ مسلمان تھا اس سے کہا کہ یہ قلعہ میری عزلت گزینی کے لیے نہایت مناسب مقام ہے لیکن میں اس کو بلا عوض و قیمت اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں سمجھتا اور نہ لیا کرتا ہوں

شریعت اسلام کے حکم کے صریح خلاف ورزی ہے اس لیے تین ہزار دینار کے عوض بیل کی چمڑی بھر کی زمین مجھے دیجائے قلعہ دار اس کی چال کو سمجھ نہ سکا اور اس کے جال میں پھنس گیا بیع نامہ کے بعد بیل کی باریک باریک .... کاٹ کر اتنا بڑا حلقہ بنا لیا گیا کہ سارا قلعہ اس کے گھیرے میں آگیا۔ قلعہ دار اس طریقہ کار پر اعتراض کیا مگر حسن کے حمایتی مسلمانوں نے اس کا منہ بند کر دیا اور زبردستی اس کو قلعہ سے نکال دیا۔ اب حسن بے خوف و ہراس اپنے مذہبی تقدس کا رنگ لوگوں کی نظروں میں خوب جمایا اور سارے دربار پر قابض ہوگیا اس کی قوت روز بروز بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ ملک شاہ اور نظام الملک کو اس کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی ملک شاہ کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا مگر عین قلعہ کی تسخیر کے وقت ایک ایسا المناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے نقشے کو دگرگوں کر دیا۔ ہوا یہ کہ حسن نے ایک جانباز کو نظام الملک کے قتل پر مامور کیا یہ جانباز ایک درخواست لے کر راستہ میں کھڑا ہو گیا جب نظام الملک عرضی پڑھنے لگا تو معاً وہ جانباز چھری سے اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور اس کا کام تمام کر دیا ملک شاہ کو اس کا سخت دکھ اور صدمہ پہونچا اور اسی صدمہ سے چند دنوں میں راہی ملک بقا ہوئے۔ بعض مورخین لکھتے ہیں وہ بھی اسی حسن کے اشارے سے قتل کیا گیا۔

بادشاہ اور وزیر کے قتل کے بعد قلعہ کا محاصرہ اٹھا لیا گیا اور حسن اپنے عقائد کی اشاعت اور طاقت بڑھانے میں زیادہ آزاد ہو گیا ملک شاہ کی اولاد اس کے جھگڑوں میں گرفتار تھی اور ادھر حسن کو اپنی حکومت کو وسعت دینے کا موقع مل گیا نظام الملک کے قتل کی کامیابی سے اس کا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا چنانچہ اسی تدبیر کو ایک منظم شکل دی گئی اور ایک جانباز فوج فدائی کے نام تیار کی گئی جس کے ذمہ سلاطین امراء علماء اور سربرآوردہ حضرات کے قتل کا کام سونپا گیا۔ اس ذلیل طریقہ سے حسن اور اس کے جانشینوں نے عالم اسلام میں ایک زبردست تہلکہ فتنہ اور ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اور سر پھرے فدائی ایسی جگہ پر اپنے ناپاک مقصد کے لیے پہونچ کر کامیاب ہوتے تھے جہاں پہونچنا بظاہر ممکن نہ تھا۔

حسن میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو ایک سرغنہ کے لیے درکار ہوتی ہیں وہ ایک پرریاضت، مستقل مزاج ظاہرا بڑا پاکباز، پرہیزگار خدا پرست اور عبادت گزار تھا۔ وہ نفیر المتوفت بڑی عجیب و غریب شان کے اور بزرگانہ ان کے ساتھ وہ استقامت کی طرح اس طرح بیٹھا رہا کہ تیس سال کے عرصہ میں صرف دوبار زینہ سے نیچے اترا تھا اپنے خاص لوگوں کے سوا وہ کسی سے نہیں ملتا تھا وہ اپنی ریاضت کرتا اور اپنے عقائد سے متعلق تصنیف و تالیف میں مشغول رہتا تھا قواعد شرعی کی پابندی میں اس

قدر سخت تھا کہ اپنے ایک بیٹے کو قتل کرنے کے جرم میں اور دوسرے کو شراب خواری پر بے تامل قتل کرا دیا ایک شخص کو بانسری بجانے میں جلا وطن کر دیا۔ بھلا ایسے شخص پر بظاہر اعتراض کا کیا شبہ ہو سکتا تھا اور اب تو اس کو کافی مقبولیت اور شہرت کے ساتھ حکومت کا اقتدار اور طاقت بھی اس کے قبضہ میں تھی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ ہر شخص کو اس کے انداز قدر فہم کے مطابق سمجھاتا تھا حکماء کو عقلی اور علماء کو نقلی اور صوفیا کو وجدانی دلائل سے رام و مسخر کر لیتا تھا دنیاداروں کو رضامند کرنے کے لیے اس کے پاس حکومت موجود تھی رہے عامۃ الناس ان طبقات اکثر کو فدائی کی خدمت کے لیے مریدان باصفا کی صف میں شامل کیا جاتا اور ان کی تعلیم و تلقین اس طرح کی جاتی کہ وہ اس کے احکام کی تعمیل کو نجات ابدی اور اس کے ادنیٰ اشارے پر جان کی بازی لگانے اور کٹ مرنے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فریضہ اور سعادت سرمدی کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس نے اپنے معتقدین اور فدائین پیدا کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کے نتیجہ میں آئندہ کی بہترین زندگی کا قلبی اطمینان دلانے کے لیے ایک ایسی انوکھی تدبیر اختیار کی جس کی طرف اسلام میں پیدا شدہ فرقوں میں سے کسی کا ذہن اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔

اس نے التموت کی پہاڑیوں کے ایک سرسبز و شاداب حصہ پر حسین جنت تعمیر کی اور دریا سے نہریں کاٹ کر اس خود ساختہ بہشت میں جاری کر دی گئیں۔ مختلف قسم کے دید و زیب اور خوشنما محل تعمیر کیے گئے اور مختلف مقامات کی حسین و جمیل عورتوں اور خوبصورت اور دل زیب نازنینوں کو اس میں آباد کیا گیا۔ ہر قسم کے میوہ دار درخت لگائے گئے غرض انسانی ناقص فہم و دانست کی حد تک تمام نعائم لذائذ سے آراستہ شدادی کارنامہ وجود میں لایا گیا اور اس میں نفس و خواہش کا تقاضا پورا کرنے کی تمام ممکن چیزیں مہیا کی گئیں۔

طاقتور قوی ہیکل دیہاتی اور کوہستانی سیدھے سادے نوجوانوں کو چھانٹ چھانٹ کر لایا جاتا تھا اور ان کی ابتدائی جانچ پڑتال کے بعد جو افراد فدائی بننے کے قابل سمجھے جاتے تھے انھیں دارو اور بھنگ پلا کر بیہوش کیا جاتا اور اسی بیہوشی کی حالت میں انھیں خاص خفیہ راستوں کے ذریعہ جنت صباحی میں پہنچا دیا جاتا تھا جہاں وہ حوروں اور پری جمالوں کی گودوں میں آنکھیں کھولتے اور وہاں کے دلکش اور پرکشش نظاروں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے اور اس کو اپنے وہم و خیال سے برتر سمجھتے جو چیزیں انھیں خواب میں میسر نہیں ہو سکتی تھیں وہ یہاں ان پر از خود حاضر و موجود دیکھیں وہ نادان نا سمجھ جو محض بہیمی جذبات اور حیوانی خیالات میں مگن تھے جنت کا جو نقشہ اپنے فہم ناقص میں کھینچ رکھا تھا اس کو وہاں دیکھ لیتے اور سمجھتے کہ اس جنت کا دخولہ ہمارے مرشد و آقا کی اطاعت کا ثمرہ اور ان کے حسب مرضی چلنے کا عطیہ ہے۔ ایک

ہفتہ تک انھیں عیش و عشرت اور سکھ و راحت سے سرشار رکھنے کے بعد پھر وہی جام حشیش پلایا جاتا اور بیہوشی کی حالت میں انھیں پیر و مرشد کے سامنے پہنچا دیا جاتا اور وہ ان سے فدایانہ کارگزاری کا عہد لیتا اور انھیں امید دلاتا کہ میرے سچے فرمانبردار رہنے اور بہتر بن فدایانہ خدمات انجام دینے پر تم اس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل کیے جاؤ گے جس کا نظارہ تم ابھی کر آئے ہو۔

حسن کے مریدان جابجا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اس کی زمین دوز کارروائیوں سے یہ پتہ چلانا بہت مشکل تھا کہ کون اس کے حلقہ اثر و ارادت سے باہر ہے۔

ملک شاہ کے بیٹے محمد نے حسن کے خلاف فوج کشی کی لیکن اس کا وزیر حسن کا مرید نکلا جس سے حملہ ناکام ہوا۔ اور حسن بچ گیا۔ سلطان سنجر بن ملک شاہ نے تمام باہمی خاندانی جھگڑوں کو مٹا کر عرب و ایران روم و تاتار وغیرہ کا ایک بہت بڑی طاقت کا سلطان بن کر ابھرا تھا وہ حسن کا شر و فساد مٹانے کے لیے کمربستہ ہوا حسن میدان جنگ میں سلطان سنجر کے مقابلے کی طاقت کی تاب کہاں سے لاتا لیکن وہاں بھی یہی پرانا آزمودہ حربہ استعمال کیا کہ سلطان سنجر کی خوابگاہ میں ایک خنجر پوشیدہ طور پر رکھا گیا اور اس نے سلطان کو لکھا کہ اگر میں سلطان کا دشمن ہوتا تو یہ خنجر سینہ میں پیوست ہوتا سلطان اس خنجر کو اپنی خوابگاہ میں دیکھ کر حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس قدر پہرہ زبردست حفاظت و احتیاط کے باوجود حسن کی رسائی میری خوابگاہ تک ہو سکتی ہے تو میدان جنگ اور دیگر مواقع پر وہ کیا کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس وجہ سے اس کے خلاف یورش کا ارادہ ملتوی کر دیا اس کے علاوہ حسن اپنے عقائد کے متعلق اس بات کا یقین دلایا کہ اس کے عقائد و خیالات کتاب و سنت کے عین مطابق ہیں اور حسب ذیل یعنی شرائط پر مصالحت ہوگی۔ (

(۱) اسماعیلیہ فریق والے کوئی جدید عمارت نہ بنائیں (۲) جنگی اسلحہ جات اور گولہ بارود کہیں سے نہ خریدیں (۳) حسن کسی نئے شخص کو مرید نہ بنائے غرض اس مرتبہ بھی حسن اپنی شاطرانہ چال سے اپنے فرع کو بچالے گیا۔

سلطان سنجر کے ان شرائط کا حسن بن صباح اور اس کے ٹولے پر کیا اثر پڑ سکتا تھا جن لوگوں کی تمام عملی سرگرمیاں نہایت راز داری پر مبنی ہو جن کا ظاہر و باطن میں کسی قسم کی موافقت نہ ہو تقیہ اور اخفائے حال جن کا بنیادی اصول ہو جس کا اسلامی تعلق محض نمائشی ہو اور جن کے ذریعہ مسلمانوں کے متاع دین و ایمان کو بگاڑنا اور لوٹنا ہو اور جس کا مذہب اپنے پیر و مرشد کے احکام کے تابع ہو یہ شرائط کی ان کی ترقی و کامیابیوں کو کس طرح روک سکتے ہیں۔ حسن کی شہرت اب دور دراز تک پہنچ چکی تھی اس کے داعی و منادتمام اسلامی ممالک میں پھیل چکے تھے اور یہ داعی بظاہر زاہد و عابد عالم و صوفی بن کر جیسا موقع ہوتا ویسی کارروائی کرتے تھے ان میں فدائی نہایت

خطرناک اور بلا کے خونخوار ہوتے تھے جس کی زندگی کا مقصد مسلمانوں کا قتل اور خونریزی تھا اسی پر ان پر کفر کے فتوے عاید کئے گئے اور بہت سے فدائی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے لیکن نقیہ ایک پردہ تھا جس کی وجہ سے یہ خونخوار کو بہت ہی محفوظ رہے لیکن فدائی اب نسبتاً زیادہ محتاط رہنے لگے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ اور کوئی گروہ ان فدائیوں کے ہاتھوں کم ہی بچا رہا ان کی ظالمانہ سرگرمیاں اور سفاکیاں اس قدر عام ہوگئیں تھیں کہ کوئی شہر کوئی قصبہ یہاں تک کہ کوئی خاندان بھی ان سے خالی نظر نہیں آتا تھا جس کو شیخ الجبال کی سرپرستی حاصل رہتی اور جس کا نام اس کی فہرست مریدین میں لکھا رہتا وہ تو ہر طرح محفوظ رہتا لیکن جس کا نام اس کی فہرست میں لکھا نہیں ہوتا اس کی حفظ و سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیخ الجبال زبردست قائدانہ صلاحیتوں کا حامل، مستقل مزاج اور ایک بڑا مدبر اور کارگزار شخص تھا لیکن اس کی ذات سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہونچنے کے بجائے وہ اور اس کی تنظیم نہایت مہلک خونخوار اور بے اندازہ نقصان رسا ثابت ہوئی قتل و خون کا ہنگامہ برپا کیا گیا ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو کشتہ خنجر بنایا گیا سارے عالم اسلام میں شر و فساد اور بدامنی پھیلائی گئی اپنے مخصوص عقائد کی پیروی کرنے والوں کا ایک جتھہ تیار کیا گیا مسلمانوں میں نفاق و پھوٹ تشتت و انتشار کا ایک ایسا طوفان برپا کیا گیا جس سے عام مسلمانوں کے علاوہ سلاطین بھی گھبرا اٹھے تھے اور انھیں اپنی جانیں بھی خطرات میں گھری ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔

اگر اس تنظیم کا زور مسلمانوں کے بجائے اعداء اسلام کے مقابلہ میں صرف کیا جاتا تو بیت المقدس میں دشمنان دین کے ہاتھوں ستر ہزار مسلمان نہایت بے رحمانہ ظلم و تشدد کے ساتھ سروں کو کٹا کر شہادت سے ہم آغوش نہ ہوتے۔

حسن بن صباح کے دست راست

درحقیقت حسن بن صباح کو اسلام سے محض رسمی تعلق تھا حقیقی تعلق نہیں تھا اور اب وہ اسماعیلیہ مذہب میں من مانی ترمیمیں کرنے لگا تھا یعنی وہ اپنے ایک خود ساختہ نئے مذہب کی داغ بیل ڈال رہا تھا لیکن اس کو تکمیل تک پہونچانے کے لیے کچھ مہلت اور وقت کی ضرورت تھی جو اس کو مل نہ سکی۔

شیخ الجبال مدت دراز کی عزلت گزینی اور خلوت نشینی اور پینتیس سال کی حکومت کے بعد

ایک اتنی سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا اور سمجھ گیا کہ عنقریب میرا خاتمہ ہونے والا ہے لیکن اس حالت میں بھی اس کو فکر تھی اپنے نام اور کام کو زندہ رکھنے کی اور اپنے منصوبوں کو قائم رکھنے کی اس نے اس مقصد کے لیے ان تین افراد پر مشتمل ایک کونسل مقرر کی اور سارے اختیارات ان کے سپرد کر دیئے ان میں کیا بزرگ کو حاکم اعلیٰ دیدار علی کو ملکی انتظام اور حسن بفرانی کو فوج کا سپہ سالار اور ۲۶ جمادی الثانی ۵۱۸ھ ہجری میں وہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے روپوش ہو گیا۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ اس کے مرنے کے ساتھ اس کا سارا فتنہ ختم ہو گیا تھا بلکہ اس کا بویا ہوا بیج اور درخت برابر برگ و بار دے رہا تھا اس کا جانشین کیا بزرگ فدائیوں کے جوش و جذبات کو سرد نہ ہونے دیا بلکہ انہیں پہلے سے زیادہ سرگرم بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ نے قلعہ التموت پر قبضہ کر لیا مگر محمود کے انتقال کے بعد کیا بزرگ پھر اس پر قبضہ جما لیا۔ موصل کے حاکم پر یک وقت آٹھ فدائیوں نے حملہ کر دیا اور اس کو قتل کر دیا۔ ان میں سے سات تو وہیں مار ڈالے گئے لیکن ایک کسی طرح بچ کر نکل گیا اس کی ماں نے اپنے بیٹے کی موت کی خبر سن کر مارے خوشی کے اپنے کپڑے بدل کر زیور پہن لیے عطر لگایا اور فخر و ناز سے اترانے لگی کہ میرا بیٹا شہادت پا گیا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا مرا نہیں زندہ ہے تو اپنے کپڑے پھاڑ لیے رونے اور سر پیٹنے لگی کہ کیوں میرا بیٹا شہادت سے محروم رہا۔[1]

یہ تھا حسن بن صباح کی پھیلائی ہوئی تعلیم کا ایک نمونہ جس نے مرد تو مرد عورتوں تک کو ایثار و فدائیت کے جذبات سے سرشار کر رکھا تھا اس بارے میں تاریخ اسلام کا مصنف لکھتا ہے اس عہد میں فدائیوں کے ہاتھ سے خلیفہ مصر، خلیفہ بغداد۔ ابو سعید ہروی، ذولف شاہ والی اصفہان آق سنقر حاکم مراغہ۔ ابو القاسم حسن ثقفی قزوینی وغیرہ جیسے مشہور اور معتبر حضرات شہید کیے گئے۔[2]

اسی زمانہ میں سید ابو ہاشم نے امامت کا دعویٰ کیا مگر ان فدائی ظالموں نے اپنا مذہبی حریف سمجھ کر اس کو آگ میں زندہ جلا دیا۔ کیا بزرگ کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں الراشد باللہ خلیفہ بغداد کو فدائیوں نے ذبح کیا محمد کے بعد اس کا بیٹا حسن ثانی جانشین ہوا جو عالم و فاضل اور حسن بن صباح سے بھی چالاک تھا۔ مہدی موعود کا فرضی خط بنا کر اپنی امامت کو مضبوط کیا اور اپنی تقلید و اطاعت کے صلہ میں مریدوں کو قطعی جنتی اور بہشتی قرار دے کر جملہ قیود اور تکالیف شرعیہ سے آزاد

---

[1] یہ سارا مواد عرب کی بعض مستند و معتبر تاریخی کتابوں سے لیا گیا اس کے ساتھ تاریخ اسلام کے حوالہ سے بعض باتیں درج کی گئیں جو ان کتابوں میں ہماری نظر سے گزر گیا۔

[2] تاریخ اسلام ص ۹۹

کر دیا اور دیگر مسلمانوں میں ملحد کا ناپاک خطاب حاصل کیا اور اپنے آپ کو نزار بن مستنصر خلیفہ مصر کی اولاد سے بتا کر خود فاطمی بن گیا اور اس طرح فاطمیین کی امامت و خلافت کا جوا گردن سے اتار دیا۔[۱]

مگر حکومت کے چار ہی سال گزرے تھے کہ اس کے سالے نے اس کو قبر میں پہونچا کر اس کو اور آگے بڑھنے کا راستہ ہمیشہ کے لیے روک دیا۔ اب حسن ثانی کا بیٹا محمد ثانی تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا اس کے عہد میں اور واقعات کے علاوہ ایک خاص واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں امام فخر الدین رازی کی مجلس درس میں ایک فدائی بھی داخل ہوا اور سات ماہ تک پڑھتا رہا ایک دن موقع پا کر امام موصوف کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور خنجر نکال ان کی گردن پر رکھ دیا اور اس وقت تک نہ اترا جب تک ان سے اقرار نہیں لیا کہ وہ آئندہ ان کے مذہب کی مخالفت نہیں کریں گے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی عین اس وقت جب کہ وہ عیسائیوں کے ساتھ جہاد میں مصروف تھے اس پر چار فدائیوں نے یکے بعد دیگرے حملے کئے مگر خدا کو اسے بچانا منظور تھا اس لیے وہ اور سلطان بال بال بچ گئے۔ صلیبی جنگ میں چرچ شاہ انگلستان نے اپنے مخالف شاہ کراڈ کو ایک فدائی کے ہاتھ سے قتل کرا دیا تھا۔ محمد ثانی کو اس کے فرزند نے ہی ہلاک کیا اور اس کے بعد حسن بن محمد ثانی تخت سلطانی پر جلوہ دار ہوا۔ اس کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ اس کا مسلک اپنے آبا و اجداد کے خلاف تھا اس کے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک سچا مسلمان ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ حسن بن صباح کی ساری کتابوں کو نذر آتش کر دیا اور دیگر سلاطین سے ربط و ضبط اور باہمی تعلقات کو استوار کیا۔ نفرت، تلخی اور بدگمانی کی فضا کو بڑی حد تک دور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو زہر دیکر ہلاک کیا گیا۔ اس کا بیٹا علاء الدین محمد ثالث اس کا جانشین بنا۔ جس نے سن بلوغ کو پہونچتے ہی اپنے پدری مذہب کو اختیار کیا اس کے زمانہ میں خاص طور پر دو باتیں پیدا ہوئیں ایک بیجا ظلم و جبر اور دوسری عیش و عشرت کی طرف بڑھتا ہوا میلان۔ اس سے سلطنت کے انتظام میں فتور پیدا ضرور ہوا مگر فدائین کے جوش و سرگرمی میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا۔ اس نے شاہ خوارزم کے ایک سردار کو قتل کیا اور وزیر خوارزم کے تیج کے ملازمین میں پانچ فدائی پائے گئے۔ اس سے وزیر پر ایک خوف و دہشت کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ ذلیل شرائط کو تسلیم کرکے علاء الدین سے مصالحت کر لی طرفہ تماشا یہ ہوا کہ علاء الدین ایک اپنے ہی خادم کے ہاتھ سے قید ہستی سے آزاد ہو گیا اس کی جگہ رکن الدین خود تخت نشین ہوا۔ جو بگڑے ہوئے نظام کو سنبھالنے کی صلاحیت سے محروم تھا خواجہ نصیر الدین طوسی جس کو خلیفہ بغداد سے بغض و عناد تھا قلعہ الموت پہونچا اور وزارت کے عہدے پر فائز

---

[۱] تاریخ اسلام صفحہ ۱۶

ہو گیا۔ رکن الدین کو خلیفہ بغداد کے خلاف اکسانے کی کوشش میں وہ ناکام رہا تو وہ باطنیوں کی بیخ کنی کے لیے ہلاکو خاں مغل کو نامہ و پیام بھیج کر اس کو بلایا اس کی زبردست اور پرزور طاقت نے باطنیوں کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور دنیا کو اس خونخوار اور شر انگیز گروہ کے ہاتھ سے نجات دی۔

اس موقع پر تاریخ اسلام کا مؤلف لکھتا ہے :۔

"حسن بن صباح کی ظاہری علمیت اور ظاہری صلاحیت نے لوگوں کو کس قدر دھوکہ دیا اور اس کو کس قدر کامیابی ہوئی پس صرف علم و صلاح ظاہری ہی معیار اسلام قرار دینا غلطی ہے مدعیان اصلاح ہمیشہ نئے نئے روپ بدل کر ظاہر ہوتے رہے ہیں زمانہ حال کے مدعیان اصلاح کو بھی حسن بن صباح وغیرہ کے واقعات سے مقابلہ کرنا چاہیئے وللہ در القائل۔ واصدق ما قال

خلاصۂ بحث

گذشتہ واقعات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ پہلی صدی سے کم و بیش آٹھویں صدی تک پورے عالم اسلام میں مختلف قسم کے فتنوں، ہنگاموں، فرقہ بازیوں۔ دین کے نئے مدعیوں، آپس کی خانہ جنگیوں، خونریزیوں، الحاد پرستوں، مذہب بازوں اور امارت و اقتدار پسندوں کے ظلم و زبردستیوں کا تسلسل برابر قائم رہا کسی شہر کسی جگہ، کسی طبقہ اور کسی جماعت کو امن و اطمینان حاصل نہیں تھا ان حالات میں عرب کو اپنی جانوں کو محفوظ رکھنے اور آئے دن کے ان ابھرتے ہوئے فتنوں اور فسادوں سے اپنا دامن بچانے کے لیے اور اپنے دین و مذہب اور اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے ان مقامات کو چھوڑ دینے کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں رہا تھا چونکہ اس زمانے میں ہندوستان میں امن و سکون کی فضا نسبتاً سازگار تھی اور یہاں تجارت کے بھی وسیع امکانات روشن تھے اس کے علاوہ یہاں کے راجاؤں نے ان کے لیے کافی سہولتیں و مراعات مہیا کر دی تھیں اس لیے وہ وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہے ان میں سے بعض نے مال تجارت لانے لیجانے سے کام رکھا اور بعض یہاں رہنے بسنے لگے مختلف کتب تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے اور ان پر گہری نظر سے غور کرنے کے بعد ہم تحقیق کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری کی ممالک عربیہ سے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان میں بھی ایک بڑی

تعداد اہل نوائط ہی کی رہی تھی) اور ان کا تعلق نضر بن کنانہ کے فرزند نائط سے تھا اور اس نسبت کی بنا پر وہ عام طور پر نایطی کہلائے اور نضر بن کنانہ کی وہ اولاد جن کا تعلق دوسرے سلسلوں سے تھا مالک بن نضر کی اولاد کے سوا، باقی سب بنو النضر کہلائے لیکن بعد میں وہ [illegible] سے بنو النضر کہلانے کا سلسلہ رک گیا اور نایطی کا سلسلہ چل پڑا۔ اور یہ بھی لحاظ سے نائط کہلانے والے ابتدا میں ملیبار، کوکن، گجرات کچھ وغیرہ مقامات میں آباد ہو گئے۔

یہ سب اولین مہاجرین نضر بن کنانہ کے فرزند نائط کی اولاد ہونے کے ناطے نایطی سے منسوب و مشہور ہو گئے۔ جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا اور وہ اپنے قدیم مہاجرین کے ساتھ گھل مل کر رہ گئے اور بعض اپنے تجارتی اغراض و مقاصد کے مد نظر دوسرے نئے شہروں میں بھی آباد ہو گئے جہاں تک بنو النضر کا تعلق ہے وہ شیخ محقق اور اعلیٰ قریشی مورخین نے اس قوم کی ہجرت کے جن سنوں کو بیان کیا ہے اس سے یہ غلط تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ ان کی پہلی ہجرت سنہ ۱٦ھ ہجری میں ہوئی تھی اور دوسری ہجرت سنہ ۱۵۲ھ ہجری میں جہاں تک متذکرہ ہجرت کا تعلق ہے ان کی ہجرت ان سنوں میں بقول ان کے مدینہ طیبہ سے ہوئی تھی۔ اور وہ عراق نایط اور بصرہ کی طرف ہجرت در ہجرت کے دور سے گزرتا رہا ہے۔ اس کے بعد اغلباً سنہ ۱۵۱ھ ہجری میں وہ ہندوستان پہونچ گئے یہ جماعت جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر آئے ہیں زیادہ تر سادات اور ان کے متعلقین و متبعین پر مشتمل تھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ غیر سادات میں سے بھی کچھ لوگ شریک رہے ہوں چونکہ وہ ایطا یا نائت میں قیام کی وجہ سے اس قصبہ نائت سے منسوب ہو گئے اس لئے عام طور پر انھیں بنو النوائط یا نائتی کہا گیا اور اسی بنا پر سید عبد اللہ جو اس جماعت کے پیشوا اور سردار تھے نایتی یا نوائطی کی نسبت سے مشہور ہیں۔

درحقیقت ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا محض اتحاد لفظی یا صوت و مخرج کی مطابقت کی وجہ سے ان دونوں کو ایک سمجھا گیا اور اس کے لیے یہ سارے مباحث اٹھ کھڑے ہوئے۔

دراصل اولین قدیم مہاجرین نسبی لحاظ سے نایطی اور دوسرے نایت میں سکونت کی وجہ سے اس کی نسبت سے نایطی کہلائے ورنہ نسب سے تعلق رکھنے والے قدیم نایطی مسلمان ہندوستان میں صدیوں پہلے سے رہتے آئے تھے۔

ہند کے ورود و مسعود کے بارے میں مورخین کے نزدیک جس کا جو اختلاف ہے وہ کچھ زیادہ قابل بحث نہیں ہے اس لیے بعض کہتے ہیں پہلی صدی ہجری سے ان کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ دوسری صدی سے آنے لگے ان پر بحث گو گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے لیکن جہاں تک سادات کرام کا تعلق

ہے ان کی ایک بڑی تعداد ۵۱۲ ہجری میں اپنے ورود مسعود سے ہند کو زینت بخش چکی تھی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ سادات اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں آئے تھے بعض اکابر سادات کا اس سے بہت پہلے بھی ان کے آمد و رفت کا ثبوت تاریخ میں ملتا ہے۔ لیکن سادات نائطہ اجتماعی طور پر متذکرہ سن ہی میں آئے تھے لیکن یہ سادات نائطہ حضرت سید اسماعیل ہی کی اولاد ہونے کے ناطے انھیں سے جدی نسبت رکھتے تھے۔ ان کا سلسلہ اس طرح ہے۔

سید عبدالرحمٰن بن سید عبداللہ الوائطہ بن سید محمد بن سید اسماعیل بن امام جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

سید عبداللہ الوائطہ مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے وائطہ یا ... تک پہنچے تھے ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال و خاندان کے علاوہ ان سے متعلق کچھ دوسرے افراد بھی تھے۔ سید اسماعیل کی اولاد و اصفاد کے متعلق حالات گذشتہ صفحات میں آپ کی نظر سے گذر چکے ہیں انھیں سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام فتنوں ہنگاموں انقلابی تحریکوں قتل و کشت و خون کی داستانوں خصوصاً زیدیہ اور مسرکہ زیدیوں سے ان اسماعیلیوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہے چونکہ وہ اہل بیت کرام سے ہونے کی وجہ سے خود کو روحانی پیشوائی کے علاوہ ظاہری اور سیاسی اقتدار و حکمرانی کے خواہاں و جویاں سمجھتے رہتے تھے اس لیے وہ جہاں بھی گئے انھیں امن و سکون نصیب نہ ہوسکا مختلف قسم کے فتنے انسانی نام اور ذات کو آڑ بنا کر ان کا تعاقب کرتے رہے ناکامی و حرماں نصیبی سایہ کی طرح ان کے پیچھے لگے رہے اور مصائب و آلام کے گہرے بادل ان کے اطراف برابر چھائے رہے اس لیے وہ امن کی تلاش میں اجنبی طرف رخ اٹھا اس طرف رواں دواں ہوئے۔

گو ان کے پوتے سید عبداللہ الوائطہ کا دامن اس قسم کی آلائشوں سے ملوث ہونے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار کیا نہیں جا سکتا کہ حضرت اسماعیل کی اولاد جہاں کہیں بھی گئی ان کے ساتھ کم و بیش مختلف قسم کے فتنے بھی گئے۔

حضرت سید اسماعیل کو اپنے پدر بزرگوار کی عظمت اور مقبولیت عام دیکھ کر امارت ظاہری کا بھی خیال پیدا ہوا چونکہ امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ اپنے بزرگوں کی دنیوی ناکامی کا کافی تجربہ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کے ظاہری امارت اور سیاسی اقتدار کے رجحان کو ناپسند کرتے ہوئے امامت اپنے دوسرے بیٹے امام موسیٰ کاظم کو عطا فرما دی اور اسماعیل اس سے محروم رہے۔ لیکن امام جعفر الصادق رضؓ کی وفات کے بعد شیعہ اسماعیلیہ کا ایک نیا فرقہ پیدا ہوگیا اور اسماعیل کے بعد ان کے فرزند محمد بھی بدستور امامت کے مدعی رہے اور ان محمد کے فرزند جو ہمارے سادات نائطہ کے جد امجد سید عبداللہ الوائطہ تھے اور انھوں نے ہی خلیفۂ وقت کو مناظرہ میں شکست

دینے کے نتیجہ میں مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے زالیطیا انکلا چلے گئے تھے۔ گو سید عبداللہ الوالطت اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ مدعی امارت تھے یا ان کا دامن بھی فتنہ بازیوں سے آلودہ تھا بلکہ ثابت ہیں امیر روافض کے شیعت اختیار کرنے کی دعوت سے صریح انکار اور اس کے نتیجے میں وہاں سے بصرے کی طرف جانا ثابت کرتا ہے کہ سید عبداللہ اور ان کے فرزند جانشین سید عبداللہ اپنے جد بزرگوار امام جعفر الصادق کے نقش قدم پر سختی کے ساتھ قائم تھے اور ان کا دامن تفریق پسندانہ آلائشوں سے پاک و بے غبار نظر آتا ہے لیکن اولاد اور خاندان کے افراد کے متعلق جو بصرہ سے مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئے تھے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس دور کے فتنوں میں کس حد تک ملوث تھے۔

نوائط بحیثیت حاکم سلطنت یا ایڈمنسٹریٹر

ٹیپو سلطان ابن حیدر علی کے لقب فرمانروائے میسور۔ سلطان ٹیپو کا ذکر محتاج تعارف نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا مجاہد بڑے پایہ کا مدبر شجاعت و تہور کا مرد میدان، پاکباز سلیم الطبع مسلمان۔ ہمدرد و خیر خواہ بنی نوع انسان کا جلیل القدر اور عالیشان حکمران تھا۔ ان کے والد حیدر علی خان نایک کا سلسلہ شیخ ولی محمد قریشی سے ملتا ہے وہ عادل شاہی دور حکومت میں دہلی سے گلبرگہ پہنچے انھیں عام طور پر مشائخ کہا جاتا تھا ان کے سات فرزند تھے اور ایک دختر۔ بیجاپور کی ایک جنگ میں ان کے ساتوں فرزند سب کے سب شہید ہوئے۔ بھائیوں کے غم میں دل برداشتہ بہن اپنے شوہر کے ساتھ کولار پور آ گئیں۔ ان سے جو چار فرزند پیدا ہوئے ان میں ایک محمد فتح تھے۔ شروع میں انھیں نواب سعادت اللہ خاں نائطی والی ارکاٹ نے جمعدار کے منصب پر مامور کیا پھر رفتہ رفتہ وہ چھ سو پیدل اور دو سو سوار کے افسر ہو گئے نواب موصوف کی وفات کے بعد میسور کے راجہ کی ملازمت اختیار کی۔ وہاں کے حالات انھیں راس نہ آئے اور دل برداشتہ امیر سرا نواب قلی خاں کے پاس پہنچے وہ انھیں چار سو پیادہ اور سو سوار کے افسری کے ساتھ بالاپور کا قلعہ دار مقرر کیا اسی زمانہ میں بدران خاں کی دختر سے ان کی شادی ہو گئی اور ان سے

حیدر علی پیدا ہوئے۔ ٹیپو سلطان ان کے مدح الخصیص کے صاحبزادے ہیں۔ اس طرح مورخین کے نزدیک ٹیپو سلطان مغفور کی دادی نائطی تھیں۔ شیخ ولی محمد نسباً قریشی تھے اور جد القریش نضر بن کنانہ تھے ان کے فرزندوں میں ایک نایطہ اور دوسرے مالک تھے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں۔

اس لیے قریشی نسبت اور نایطہ کے ناطے سے ان کا انتساب نائطی سے کیا جانا غلط نہیں کہا جا سکتا اس لیے ان کا شمار اہل نوایط میں کیا جاتا ہے۔ بہرحال ان کا تعلق تمام تر قوم نوائط سے ہو یا نہ ہو۔ ٹیپو ایک مرد مسلمان تھا ان کی زندگی کے حالات پر مختلف مبسوط کتابیں، اردو، فارسی اور انگریزی میں موجود ہیں جن میں ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور ان کے زریں و روشن کارناموں پر سیر حاصل تذکرہ کیا گیا ہے اور جن سے عوام کم و بیش واقف بھی ہیں۔ چونکہ ہم کو یہاں ان کی پوری زندگی کے حالات سے بحث مقصود نہیں بلکہ صرف نوائط سے ان کے قومی تعلق سے ہے۔ اس لیے بر سبیل تذکرہ مختصراً چند باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

اہل تاریخ کے متفقہ بیان کا خلاصہ یہ ہے۔

" او از علوم متعددہ بہرہ ور بودہ فطرتاً درست سلیقہ و دانشور۔ در پرورش و تربیت اہل اسلام جہد بلیغ می نمود و از اقوام غیر دائماً متنفر می بود۔ تلاوت کلام مجید را ہموار عادت داشت و در صلاح و فلاح رعایا ہمت می گماشت۔

ہمیشہ آپ کی زبان پر یہ مصرعہ رہا کرتا تھا ؎

ع ۔ ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

وہ نہایت راسخ الاعتقاد پابند شرع اور بیباک حکمراں تھے مذہباً شافعی تھے۔ مصنف نشان حیدری ان کے متعلق لکھتا ہے :۔

آپ کا حد سے زیادہ درگزر اور آپ کی دشمن نوازی نے مہمات سلطنت کو نقصان پہونچایا۔ یہی ایک صفت تھی جس نے سلطنت کی عمارت کو ڈھایا۔ ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ میں انگریزی فوج کے مردانہ وار مقابلہ میں یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو کر رہ گیا "

یعنی میسور کا شیر سلطان ٹیپو کو اکثر انگریز مورخین نے ٹینگر آف میسور لکھا ہے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد   روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

نواب سعادت اللہ خان نائطی

ان کا اصلی نام محمد سعید کوکنی تھا۔ توزک والا جاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ :۔

"آپ کے برادر حقیقی غلام علی کے ساتھ عالمگیر کی فوج میں جگہ حاصل کرلی پھر داؤد خاں سپہ سالار فوج کی حسن التفات سے ان کا تعلق شاہی منصب داروں میں ہوگیا جس سے انھیں اپنی قابلیت اور حسن خدمت کے جوہر دکھانے کے مواقع حاصل ہوگئے اور عالم گیر کی مردم شناسی اور قدر افزائی نے انھیں کو سعادت اللہ خاں خطاب سے نوازا۔

جنوبی ہند کے پورے تسلط کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے انتظامی سہولت کے مدنظر دکن اور جنوبی ہند کو بالاگھاٹ اور پائیں گھاٹ دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ پائیں گھاٹ کے تحت ساحل سمندر سے ملا ہوا علاقہ تھا ان کے انتظام کے لیے ایک نائب صوبے دار کا تقرر ہوتا تھا شروع میں اس کا صدر مقام سرا تھا لیکن بعد میں اسے ارکاٹ منتقل کرلیا گیا۔

بالاگھاٹ کے ماتحت یہ اضلاع تھے۔ شمال میں دریائے تنگ بھدرا سے لے کر بلاری۔ اننت پور۔ میسور اور تمام مغربی ساحلی علاقہ جس میں جنوبی و شمالی کنارا۔ ملیبار وغیرہ۔ پائیں گھاٹ کے تحت شمالی ارکاٹ، ویلور، کویمتور، سیلم وغیرہ جنوب میں مدورا تک۔

ابتدا میں تو ذوالفقار خاں ایک ہی صوبے دار تھا اس کو فوجدار دیوان کا خطاب حاصل تھا ۱۷۰۰ء میں عالمگیر کی رحلت کے بعد ذوالفقار دہلی چلا گیا اس کی جگہ پر داؤد خاں کا تقرر ہوا اور اس نے جنوب میں سعادت اللہ خاں کو فوجدار دیوان مقرر کیا۔

سعادت اللہ خاں کے پاس سرا اور ارکاٹ کے دونوں علاقے تھے ۱۷۱۱ء میں سرا کی صوبے داری پر امین خاں کا تقرر ہوا۔ یہ تقرر نواب سعادت اللہ خاں کو پسند نہ آیا کیونکہ وہ سرا کو اپنے ہی ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔

کرنل ولکس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے :۔

"سرا کے ماتحت میسور کا زرخیز علاقہ تھا اس لیے سعادت اللہ خاں اس علاقہ کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا۔"[1]

اس سے سرا اور ارکاٹ میں باہمی رقابت کا ایک سلسلہ چل پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میسور سے حصول خراج کے لیے ایک طرف سرا کی فوجیں پیش قدمی کیں اور دوسری طرف ارکاٹ کی فوج سرنگا پٹم پر چڑھائی کی۔ مسلمانوں میں آپس میں تصادم اور لڑائی کی نازک صورت پیدا ہوگئی تھی لیکن فریقین نے مفاہمت سے کام لے کر جنگ کی نوبت آنے نہیں دی اور خراج آپس میں تقسیم کرلیا اس وقت سعادت اللہ خاں کے اعوان و انصار میں کڑپہ۔ کرنول اور ساونور کے نوابان کے علاوہ تنجاور جی

---

[1] تاریخ میسور بحوالہ جنوبی ہند صفحہ ۲۷۲

گھوڑ پڑے مرہٹہ راجہ بھی تھا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد دلی میں تاج و تخت کے لیے خانہ جنگی نے ادھر مرکز کو اپنے مسائل میں الجھا دیا تھا۔ اور ادھر اس کے ماتحت کے مختلف صوبے اپنی اپنی جگہوں پر آزاد اور خودمختار بن گئے۔

صوبیداروں کے رنگ ڈھنگ :۔ شمال کی بعض ریاستوں کو اپنے اقتدار کے لیے ایک نئے روپ کو اختیار کرتے دیکھ کر جنوب میں سرا اور ارکاٹ بھی اسی راستہ پر گامزن ہوئے اور وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگے لیکن سرا کی علیحدگی اور آزادی ارکاٹ کے لیے کھٹک رہی تھی اس موقع پر جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

"لیکن صوبہ سرا کی آزادی اور صوبہ سرا کا علیحدہ ہو جانا ارکاٹ والوں کو پسند نہیں تھا اس لیے دونوں صوبے داروں میں کش مکش ہونے لگی۔ اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے صوبہ دار دکن آصف جاہ اول نے سرا کی فوجداری دیوانی بھی ارکاٹ کے نواب سعادت اللہ خاں کو تفویض کر دی" [۱]

الغرض سرا کی صوبے داری نظام الملک کی مرضی سے سعادت اللہ خاں نے حاصل کر لی۔ ارکاٹ کی فوج سرا کی طرف بڑھی۔ سرا میں اس وقت امین خاں کا جانشین عبدالرسول خاں تھا لڑائی میں عبدالرسول خاں مارا گیا اور طاہر خاں سرا کا صوبے دار ہو گیا اس طرح سعادت اللہ خاں کل جنوبی ہند کا فوجدار و دیوان ہوا ۱۷۳۲ء میں نواب سعادت اللہ خاں انتقال کر گیا۔ دوست علی خاں اس کا جانشین ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا صفدر علی تخت نشین ہوا۔ نواب صفدر علی کی وفات پر ارکاٹ کے اہل نوائط نے اس کے چھوٹے بیٹے محمد سعید کو امارت کے لیے منتخب کیا۔ نظام الملک نے محمد سعید کے بالغ ہونے تک انوار الدین کو عارضی سربراہ مقرر کیا۔ اس نے ۱۷۴۲ء میں زہر دے کر محمد سعید کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن ولکس انوار الدین کو اس کا مورد الزام نہیں ٹھہراتا وہ لکھتا ہے کہ :۔

"خود اہل نوائط انوار الدین کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ اس کا الزام محمد حسین خاں طاہر اور غلام حسین خاں پر لگاتے ہیں جو اہل نوائط سے ہی ہیں" [۲]

---

[۱] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۷۳

[۲] ہسٹری آف میسور بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۷۸

لیکن تاریخ جنوبی ہند لکھتا ہے :۔

"محمد سعید کے قتل کے معاملہ میں اس کے ماموں مرتضیٰ خاں اور انوار الدین کا ہاتھ تھا اول الذکر خیال کرتا تھا محمد سعید کے مر جانے پر امارت اس کو مل جائے گی اور آخر الذکر خود اپنے لیے امارت چاہتا تھا۔ آخر انوار الدین کامیاب ہو گیا۔ نظام الدین نے اس کی امارت کی تصدیق کر دی۔ اس طرح اہل نوائط کی حکومت کا ۲۲ سال بعد ۱۷۴۳ء میں خاتمہ ہو گیا۔" [۱]

لیکن تاریخ النوائط کے مصنف لکھتے ہیں کہ :۔

"نواب سعادت اللہ خاں اکیس سال تک صوبہ کرناٹک کے نائب اور پانچ سال تک خود مستقل صوبے دار اور فرماں روائے صوبے دار رہے۔ نہایت دیندار اور خدا ترس شخص تھے آپ کی ذات ستودہ صفات سے خلق اللہ کو نہایت آرام نصیب ہوا۔" [۲]

خاندان انوری

محمد سعید کی رحلت کے بعد بظاہر اہل نوائط کی سعادت اللہ حکومت کا خاتمہ تھا لیکن اس کے بعد انھیں اہل نوائط نے ایک نیا انوری دور شروع ہو گیا اس کے بانی نواب انوار الدین خاں تھے۔ وہ ۱۷۴۳ء میں مسند نشین ہوئے وہ چند اصاحب کے مقابلہ میں آمبور میں قتل ہوئے۔ ان کے بعد ۱۷۴۹ء میں ان کے بیٹے محمد علی والا جاہ وارث تخت و تاج ہوئے اور وہ ۱۷۹۵ء میں رحلت کر گئے۔ ان کے بعد حسین علی خاں ملقب بہ عمدۃ الامراء ۱۷۹۵ء تخت نشین ہوئے اور وہ ۱۸۰۱ء میں انتقال کر گئے ان کے فرزند علی حسین تاج الامراء کی تخت نشینی کا دربار کلس محل میں ہو رہا تھا کہ انگریزی مسلح فوج آئی اور کلس محل کو گھیر لیا اور انگریز افسر اندر

---

[۱] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۰۸ [۲] تاریخ النوائط صفحہ ۳۱

داخل ہوا اور اس نے عمدۃ الامرا کو تخت سے اتار کر انھیں مقید کر دیا۔ تاج الامرا اسی قید و بند کے دوران چل بسے۔ مشہور ہے کہ ان کی موت زہر خورانی کے نتیجہ میں واقع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اعزازی نوابی کا دور شروع ہوا۔

۱۸۰۱ء میں امیر الامراء کے فرزند نواب عظیم الدولہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اعزازی نواب بنا دیا تھا ان کا انتقال ۱۸۱۹ء میں ہوا۔ ان کی جگہ ان کے فرزند محمد منور خاں قائم مقام ہوا اور وہ ۱۸۲۵ء میں رحلت کر گئے۔ اس کے بعد تیسرے اعزازی نواب غلام محمد غوث خاں ۱۸۴۲ء مسند نشین ہوئے ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد اعزازی نوابی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

اور پرنس کا ایک نیا سلسلہ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان کے تحت ۱۸۶۷ء سے چل پڑا اور عظیم جاہ پرنس اول قرار دیے گئے۔ وہ ۱۸۷۴ء میں چل بسے ان کے بعد بدیع اللہ خاں ظہیر الدولہ ۱۸۷۴ء میں پرنس آف ارکاٹ نامزد ہوئے۔ ان کی وفات ۱۸۷۹ء میں ہوئی اور وہ بعارضہ فالج ۱۸۷۹ء رحلت کر گئے۔

پھر محمد منور خاں اس طرح یہ اعزازی نوابی سلسلہ محض ایک اعزاز کی حد تک کسی نہ کسی طرح اب تک جاری ہے لیکن اس خاندان کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے گو وہ یکے بعد دیگرے مختلف حالات و حوادث سے گذرتے رہے پھر بھی ان کی بعض کارگزاریاں ایسی ہیں جو ان کے نام کے ساتھ ہمیشہ تابناک اور یادگار رہیں گی بالخصوص دین سے ان کا گہرا تعلق، مذہبی تعلیم کی طرف ان کا بڑھتا ہوا جھکاؤ، اہل علم و فضل کی پر خلوص عزت و تکریم۔ اہل اللہ و بزرگان دین سے ان کی عقیدت و احترام ان کی علمی و تعلیمی خدمات، ان کی معدلت گستری و رواداری ان کا بلا امتیاز مذہب و ملت اپنے عوام کے ساتھ سادیانہ سلوک و برتاؤ وغیرہ ان کے دور کی ایسی جھلکیاں ہیں جن سے ان کا دور کم و بیش آراستہ نظر آرہا ہے چنانچہ تاریخ نوابان کرناٹک کے مصنف لکھتے ہیں :-

"مولانا نظام الدین احمد، مولانا محمد غوث شرف الملک مولانا صبغۃ اللہ قاضی الملک مولانا عبدالوہاب مدار الامرا، سالار الملک حاجی قادر مرتضیٰ حسین صاحب، حاجی غلام محمد صاحب شرف الدولہ،

مذکورہ بالا حضرات نواب انوار الدین خاں کے عہد سے نواب غلام محمد غوث آخر نواب کرناٹک کے زمانے تک اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔"

آگے لکھتے ہیں :-

"ملک العلماء بحر العلوم مولانا عبدالعلی مغفور لکھنؤ میں شیعہ رئیسوں سے تکالیف پہونچنے کے

باعث لکھنؤ چھوڑ کر بنگال تشریف فرما ہوئے۔ نواب والاجاہ نے مولانا کو مدراس تشریف لانے کی درخواست کی تو مولانا سمندری جہاز میں مدراس فروکش ہوئے پالکی میں تشریف رکھتے ہوئے بڑے باغ محل کو پہونچے نواب صاحب نے اپنا کاندھا پالکی کو دیتے ہوئے مولانا کو تخت پر اتارا نواب صاحب نے مولانا کو ایک بھاری نذرانہ ماہوار جاری کیا جس سے مولانا نے مدراس میں ایک دارالعلوم قائم کیا اس میں کثیر رقم طلبہ کے طعام خوری وغیرہ میں صرف فرماتے تھے۔[۱]

پھر سے نواب غلام محمد غوث خاں کے ذکر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"نواب صاحب مدرسہ اعظم جب پاک کی بنا ڈالی جو مختلف علوم کی درسگاہ تھی اس کے مصارف کے لیے ماہوار ایک ہزار روپے دیتے تھے۔ ایک کتب خانہ والاجاہ روڈ پر مع ملحقہ مکانات کے تعمیر کیا جس کا نام "کتب خانۂ عام اہل اسلام" تھا۔ نواب صاحب علمی قابلیت رکھتے تھے اس وقت کے زبردست علماء سے تعلیم پائی تھی آپ کا تخلص اعظم تھا۔ بہت سے شاعروں کی تاریخ لکھی اس میں ان شعراء کے اشعار بھی درج کئے ہیں"۔[۲]

اس کے علاوہ اس خاندان میں جو سیاسی تبدیلیاں آئیں اور ان سے جو تغیرات پیدا ہوئے اور اس کے نتیجہ میں کیا حالات رونما ہوئے اس کی تفصیلات میں ہم نہیں گئے کہ بحث ذرا طویل اور اختلافی ہونے کے ساتھ ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل فراموش ہے کہ نواب محمد علی والاجاہ کی انگریز دوستی اور ان پر غیر معمولی اعتماد نے جنوبی ہند میں انگریزوں کو اپنے قدم جمانے کے مواقع فراہم کئے اور آخر میں وہ پورے ملک پر چھا گئے۔

انگریزوں سے ان کی دوستی اتنی گہری تھی کہ جارج سوم شاہ انگلستان اور ان کے درمیان مراسلت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جس میں وہ محمد علی کو ایک ذاتی دوست کی طرح مخاطب کرتے تھے اسی شاہ انگلستان جارج سوم کا ایک خط ملاحظہ ہو۔

> "آپ اور آپ کے بچوں کی تصویر ہم کو ہمیشہ اس محبت کی یاد دلائے گی جو آپ کو ہماری قوم سے ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہی محبت آپ کی اولاد بھی ہم سے کرے گی اور ہماری بھی ہر وقت یہی کوشش ہو گی کہ آپ کی اور آپ کے اولاد کی نسلاً بعد نسل اسی طرح حفاظت کرتے رہیں"۔[۳]

---

[۵] تاریخ نوابان کرناٹک مولفہ الحاج نادر علی صاحب ابن مولوی الحاج احمد علی صاحب شوق جو ہری مرحوم دیوان پرنس آف ارکاٹ چہارم پنجم۔ [۱] تاریخ نوابان کرناٹک مولفہ مولوی نادر علی صاحب ص ۸
[۲] ایضاً ص ۲۱۔ [۳] تحفۃ الاخبار بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۲۸۹

۱۷۹۰ء مدراس میں فورٹ سینٹ جارج میں جو میٹنگ ہوئی اس کی روداد لکھتے ہوئے پریذیڈنٹ لکھتا ہے:-

"ہماری تمام تر توجہ اور امداد نواب صاحب کے حق میں ہونی چاہیئے جو ہمارا قدیم اور پرخلوص دوست ہے۔"[1]

اس پرخلوص دوستی ہی کا یہ ثمرہ تھا کہ میسور کی تیسری جنگ ۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی اور انگریز فتحیاب ہوئے۔ اس طرح جنوبی ہند میں انگریزوں کا اقتدار مستحکم ہو گیا اور انھیں پوری برتری حاصل ہو گئی۔ غرض والاجاہی دور کی تاریخ یہ تاثر دیتی ہے کہ ان کی حیثیت شاہ شطرنج جیسی بنا کر رکھی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا اور ہم دوسروں کی غلامی میں آ گئے۔

محمد علی والاجاہ اپنی ایک یادداشت میں لکھتا ہے:-

"والد من بر ہمہ رابطہ دیرینہ اولا بظاہر دعوت انگریزاں قبول فرمودند نزد انگریزاں رفتند و اخلاص ایں قوم مضمر داشتند۔"

کارواں سالار جنگ

نواب تراب علی خاں نام تھا، ان کے لقب

خطابات:- شجاع الدولہ، مختار الملک، سر سالار جنگ بہادر، جی، سی، ایس آئی۔ ڈی۔ سی ایل وزیر اعظم ریاست حیدر آباد میں شجاع الدولہ، نواب محمد میر محمد علی خاں۔ سالار جنگ بن منیر الدولہ منیر الملک نواب علی زماں خاں۔ غیور جنگ بن اشجع الدولہ، اشجع الملک نواب محمد صفدر خاں۔ غیور جنگ بن منیر الدولہ، منیر الملک نواب شیخ محمد شمس الدین بن محمد تقی بن محمد باقر بن شیخ محمد علی۔

ان کا تعلق حیدر آباد (دکن) کے سربرآوردہ خاندانی امرا سے ہے کہا جاتا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب خواجہ اویس قرنی تک پہونچتا ہے۔ آپ کے جد بزرگوار شیخ محمد علی کی شادی ملا احمد نائتہ کی دختر سے ہوئی تھی ان کے ہی بطن سے شیخ محمد باقر پیدا ہوئے اس طرح نائتہ سے ان کا سلسلہ قائم

---

[1] تحفۃ الاخبار بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۲۰۹

ہو گیا۔ متذکرہ بالا افراد یکے بعد دیگرے اعلیٰ مناصب اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اس خاندان کا اقبال اورنگ زیب عالمگیر کے دور سے شروع ہوا اور نظام شاہی میں بام عروج تک پہونچ گیا۔ راجہ چندولال کے بعد راجہ کشن پرشاد تک حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ پر نواب تراب علی خاں سرسالار جنگ ہی فائز رہے۔ یہ خاندان اپنے تدبر دانشمندی حسن انتظام عوامی صلاح و فلاح کی خدمت جلیلہ علمی و تعلیمی میدان میں مساعی جمیلہ فیاضی و فراخ دلی کی بنا پر نہ صرف دکن میں بلکہ طول و عرض کشور ہند میں بہت مشہور اور کافی مقبول رہا۔

آپ کے بارے میں سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور دکن کے مختلف مورخین نے اپنی اپنی تاریخی کتابوں میں آپ کے حالات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے بعض مورخین نے آپ کا تعلق سادات شوشتر کی سے بتلایا ہے۔

ان پر دو بار جان لیوا حملے ہوئے اور وہ بال بال بچ گئے آخر سفیہ وبائی سے ۱۳۰۰ھ ہجری میں اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف چل بسے۔

سلطان جمال الدین ہنوری

عرب کے ایک جہاز راں شیخ حسن کے بیٹے جمال الدین تھے یہ دراصل علکیر کے باشندے تھے حسن کئی جہازات کا مالک اور اس کے ساتھ ہی ایک بڑا تاجر بھی تھا۔ اس نے اپنی طرف سے گوا میں ایک مسجد بھی تعمیر کی تھی جو اب تک قائم ہے۔

اہل نوائط یا دیسی عربوں کی ایک نئی سلطنت

اس سلطنت کی محرک ہندو راجاؤں کی طرف سے مسلمانوں پر آئے دن جو مظالم اور سختیاں ہو رہی تھیں ان کا سدباب اور ان کی شخصی آزادی اور ان کے حقوق و مفادات کا تحفظ تھا اس دشت عام طور پر گوا سے لے کر جنوبی و شمالی کنارا کے نوائط مسلمان بے انتہا پراگندگی، درماندگی اور خوف و ہراس کی حالت میں مبتلا تھے۔

اس اثنا میں راجہ دیوا یکشا کی ایک ظالمانہ اور نہایت وحشیانہ مسلمانوں کے قتل عام کی کارروائی نے اس ضرورت کو عملی صورت میں لانے کا بہانہ بن گئی۔ راجہ دیوا یکشا کا زمانہ حکومت ۱۲۶۶ء سے

۱۴۷۹ء تھا۔ یہ راجہ نہایت عیاش اور شراب خور تھا اس کی پوری زندگی عورتوں کے عیش خانہ میں گذری تھی امور سلطنت سے اس کی غفلت بے پروائی اور حد سے زیادہ عیاشی کی بنا پر سارے ملک میں بدنظمی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اسی کے زمانے کے اس ہولناک واقعہ کو تاریخ جنوبی ہند کے زبانی ہم یہاں نقل کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ :۔

"۱۴۷۹ء میں ویرا پکشا کو معلوم ہوا کہ بھٹکل کے مسلمان تاجروں نے جس قدر گھوڑے درآمد کیے تھے وہ سب کے سب بہمنی سلطان کے ہاتھ فروخت کر دیے ہیں۔ اور اس سال وجیا نگر کے لیے کوئی گھوڑا باقی نہیں رہا۔ ان کی اس کارروائی نے ویرا پکشا کو اس قدر برافروختہ کیا کہ اس نے یہاں کے تمام مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دے دیا اور ان تمام مسلمانوں کو جنھیں دیورایا نے فوج میں ملازم رکھا تھا ملک سے نکال دیا گیا۔ روسی سیاح بیاردس جو اس زمانہ میں سیاحت کے لیے وجیانگر آیا ہوا تھا اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے :۔

"راجہ ویرا پکشا کے حکم سے دس ہزار عرب تاجر قتل کر دیے گیے جن عربوں نے بھاگ کر گوا اور عرب میں پناہ لی بچ گئے لیکن ہندوؤں نے گوا کا بھی محاصرہ کر لیا۔"[1]

میسور گزیٹیر کا ہندو مصنف لکھتا ہے۔

"عربوں کا یہ قتل ویرا پکشا کی عادت سے بعید نہ تھا۔"

سیول اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"مسلمانوں کی اس قتل عام کی خبر جب گلبرگہ میں پہونچی تو بہمنی سلطان کے وزیر ملک التجار محمود گاواں نے گوا پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو ان مظالم سے نجات دلائی۔"[2]

روسی سیاح بیاردس نے دس ہزار عرب تاجروں کے قتل کی جو تعداد بیان کی ہے دوسرے مورخین اور سیاحوں نے ان کی تعداد بہ اختلاف ۱۵، ۱۶ ہزار تک بتائی ہے۔ سفاکانہ جوش و جذبہ سے بھری ہوئی فوج وجیانگر سے روانہ ہوئی اور چن چن کر مسلمانوں کا بیدردانہ قتل عام کرتی ہوئی بھٹکل پہونچی۔ بھٹکل کے مسلمانوں نے اس وحشی فوج کی آمد کی خبر سن کر اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے ادھر ادھر پناہ گاہوں کی تلاش میں روپوش ہو گئے۔

میسور گزیٹیر ایک جگہ لکھتا ہے :۔

بعض مقامی ہندوؤں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر بعض مسلمانوں کو اپنے گھروں میں چھپائے

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۶۱ [2] میسور گزیٹیر سیول بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۶۱

رکھا۔ بعض بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے سمندر کے راستہ عرب وگوا چلے گئے اور چند معمولی کشتیوں سے (سمندر میں ایک پہاڑی ہے) نطرہ فوراً پہونچ کر جان بچائی۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا فوج شہر میں گھس آئی لوگ ناچار بندرگاہ کی طرف بھاگنے لگے۔ فوج تعاقب میں بندرگاہ پہونچی اور جو ہاتھ آیا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح ہزاروں جانیں جام شہادت نوش کرکے اپنی زندگیوں سے محروم ہوگئیں۔ جب فوج اپنے سیاہ کرتوتوں کے بعد چلی گئی تو نطرہ کے پناہ گزیں واپس آئے۔

اور انھوں نے بندرگاہ میں پڑی ہوئی بے گور و کفن لاشوں کو ٹھکانے لگا دیا اور بعض برگزیدہ حضرات کو الگ ایک جگہ پر دفن کر دیا۔

غالباً بندرگاہ کی سات شہیدوں کی درگاہ انھیں بزرگوں کی یادگار ہو۔ درگاہوں کی موجودہ تعمیر سے پہلے سنہ ۱۹۱۶ء میں وہاں بے شمار قبریں تھیں۔ وہ گور غریباں کہیں گنج شہیداں تو نہیں ؟

مختلف حالات واوقات میں مسلمانوں پر مسلسل کیے جانے والے مظالم و شرانگیزی کی روک تھام کے لیے ایک نئی سلطنت وجود میں آگئی۔ ہناور سے قریب ہوسا پٹن میں اس کا پایہ تخت قرار پایا اور اس سلطنت کا پہلا حاکم سلطان جمال الدین منتخب ہوا۔ یہ سلطنت کب اور کس سن میں قائم ہوئی اس کا متعین تاریخی ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔ ابن بطوطہ کی سیاحت کے زمانہ میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس سلطنت کا قیام سنہ ۷۳۰ھ کے دوران عمل میں آیا تھا کیونکہ ابن بطوطہ ابتدائی آٹھویں صدی ہجری اور چودھویں صدی عیسوی میں کامل چھبیس سال تک سیاحت کیا تھا اور وہ سیاحت کے دوران مختلف اوقات میں تین بار ہوسا پٹن آیا تھا۔ اس لیے اس سلطنت اور اس کے فرماں رواؤں کا کچھ حال اس کی زبانی سن لیجیے۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے :-

"دوسرے دن صبح کو ہناور پہونچے یہ شہر ایک پہاڑی کی پر واقع ہے جس میں جہاز جا سکتے ہیں یہ سمندر سے نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ برسات کے موسم میں سمندر بہت چڑھتا ہے اور طوفانی آتا ہے۔ تو چار مہینے تک کوئی شخص سوا مچھلی شکار کرنے کے سمندر میں نہیں جاتا۔ جب ہم سندور (ہناور) میں پہونچے تو ایک جوگی ہمارے پاس آیا اور چھ دینار دے گیا میں نے یہ دینار اس سے لے لیے اور اسے ایک دینار دینا چاہا اس نے نہ لیا اور چلا گیا میں نے اپنے ہمراہیوں سے یہ بات کہی اور کہا اگر تم چاہتے ہو اپنا حصہ لے لو۔ انھوں نے کہا نہیں اور مجھے بتلایا کہ پہلے جو چھ دینار تو نے ہم کو دیے تھے اتنا چھ دینار تھا چھ دینار اور ملا کر

اسی جگہ جہاں جوگی بیٹھا تھا رکھ دیے تھے۔ مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا یہ دینار میں نے احتیاط سے اپنے پاس رکھ لیے۔

شہر ہناور کے باشندے شافعی مذہب ہیں۔ دیندار اور نیک بخت اور بحری طاقت کے لیے مشہور ہیں۔ سندابور فتح ہونے کے بعد وہ اور کمینہ ہو گئے نہ رہے تھے اس شہر کے عابدوں میں سے شیخ محمد ناگوری ہیں انھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی وہ اپنا کھانا آپ پکاتے ہیں۔ فقیہ اسماعیل کلام اللہ پڑھاتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق اور فیاض تھے قاضی شہر نور الدین علی ہے۔ خطیب کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس شہر کی عورتیں اور اس پورے ساحل کی عورتیں سلا ہوا کپڑا نہیں پہنتیں۔ بغیر سلا یا کپڑا اوڑھتی ہیں چادر کے ایک آنچل سے تمام بدن لپیٹ لیتی ہیں اور دوسرے کو سر اور چھاتی پر ڈال لیتی ہیں (ساڑی مراد ہے) یہ عورتیں خوبصورت اور باعفت ہوتی ہیں ناک میں سونے کا بلاق پہنتی ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کی سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے اور ۲۳ لڑکوں کے ہیں۔ سوا اس شہر کے یہ بات میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لوگ فقط بحری تجارت پر گذارہ کرتے ہیں۔ زراعت نہیں کرتے۔ مالابار کے لوگ بھی سلطان جمال الدین کو کچھ معین خراج دیتے ہیں کیونکہ اس کے پاس بحری طاقت بہت بڑی ہے اور چھ ہزار پیادہ اور سوار بھی رکھتا ہے[1]۔"

ابن بطوطہ آگے لکھتے ہیں :-

"بادشاہ جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے وہ ایک سردار راجہ کے ماتحت ہے جس کا نام ہریب ہے (ہری ہر) سلطان جمال الدین ہمیشہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اس کا دستور ہے کہ صبح ہونے سے پہلے مسجد میں چلا جاتا ہے اور صبح ہونے تک تلاوت کرتا رہتا ہے۔ اول وقت نماز پڑھتا ہے پھر شہر کے باہر سوار ہو کر چلا جاتا ہے چاشت کے وقت واپس آتا ہے پہلے مسجد میں دوگانہ پڑھ کر پھر محل میں جاتا ہے ایام بیض کے روزے رکھتا ہے۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا۔"

اس کے بعد کھانے کی ترتیب اور اس کے اقسام کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے:-

"میں اس وقت بادشاہ کے پاس دوسری دفعہ گیارہ مہینے ٹھہرا تھا اور اس اثنا میں

---

[1] تاریخ ابن بطوطہ

عرصہ میں کبھی روٹی نہیں کھائی کیونکہ ان لوگوں کی غذا اک فقط چاول ہے۔ اسی طرح جزائر مالدیپ اور سیلان اور مالابار اور معبر میں دو تین سال تک رہا تو سوائے چاول کے اور کچھ نہ کھایا میں انھیں پانی سے نگلتا تھا ورنہ منھ نہیں چلتے تھے۔"

"یہ بادشاہ ریشم اور باریک کتان کے کپڑے پہنتا ہے اور کمر میں چادر باندھتا ہے اور رضائیاں ایک پر دوسری لگا کر اوڑھتا ہے اور اپنے بالوں کو گندھا ہوا رکھتا ہے اس پر چھوٹا امامہ باندھتا ہے جب سوار ہوتا ہے تو قبا بھی پہن لیتا ہے اور اس پر رضائی بھی اوڑھ لیتا ہے اس کے آگے لوگ نقارے اور طبل بجاتے ہیں اور سجاتے ہوئے جایا کرتے ہیں۔ اس دفعہ ہم اس کے پاس تین دن ٹھہرے تھے۔ اس نے ہمیں زاد راہ دیا[1]۔"

ایک دوسری جگہ گوا کے جہاد میں اپنی شرکت کے عنوان کے ماتحت ابن بطوطہ لکھتا ہے :۔

"میں نے ارادہ کیا تھا کہ کولم سے دہلی واپس چلا جاؤں اور بادشاہ سے کچھ حال جو گذرا تھا بیان کروں لیکن ڈر گیا کہ کبھی مجھ سے یہ نہ پوچھے کہ تو تحائف سے علاحدہ کیوں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے سلطان جمال الدین کے پاس ہنور کے شہر میں آنے کا ارادہ کیا۔ جب تک کم کم کا پتہ نہ لگے میں اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ جب کالی کٹ پہنچا تو وہاں بادشاہ کے چند جہاز تھے جس میں اس نے سید ابوالحسن پردہ دار کو بہت سے مال دے کر بھیجا تھا کہ ہرمز اور قطیف میں جا کر جس قدر گھوڑے عرب سے لا سکے ہندستان میں لے آئے کیونکہ بادشاہ کو عربوں کے ساتھ بدرجہ کمال محبت تھی۔"

پھر چند سطور کے بعد لکھتا ہے :۔

"میں کالی کٹ سے جہاز پر سوار ہوا یہ اس موسم کا سب سے اخیر سفر تھا۔ آدھے دن تک تو ہم چلتے تھے اور آدھے دن لنگر ڈال کر کھڑے ہو جاتے تھے راہ میں ہمیں بحری قزاقوں کی چار کشتیاں ملیں۔ بڑا ڈر لگا لیکن انھوں نے کچھ تعرض نہ کیا اور ہم ہنور پہونچ گئے۔ میں سلطان ہنور کے پاس گیا اور سلام کیا اس نے مجھے ایک شخص کے گھر پر ٹھہرا دیا کیونکہ میرے پاس کوئی نوکر نہیں تھا۔ پھر کہلا بھیجا کہ اس کے ساتھ نماز پڑھ کر آؤں۔ میں اکثر مسجد میں بیٹھا رہتا تھا اور ہر روز ایک کلام اللہ ختم کرتا تھا اور پھر دو کلام اللہ ختم کرنا شروع کیے ایک تو صبح سے شروع کر کے ظہر کے وقت تک

---

[1] تاریخ ابن بطوطہ مترجمہ جعفری نفیس اکیڈمی کراچی ص ۲۰۲

اور دوسرا ظہر سے مغرب کے وقت تک، تین مہینے تک اس طرح کرتا رہا اور چالیس دن تک اعتکاف میں بھی رہا۔"

سلطان جمال الدین (۵۲) جہاز تیار کیے اس کا ارادہ سنداپور پر چڑھائی کرنے کا تھا۔ وہاں کے راجہ اور اس کے درمیان کچھ نقص تھا۔ راجہ کے بیٹے نے سلطان کو لکھا اگر سلطان سندپور فتح کرے گا تو وہ مسلمان ہو جائے گا اور اپنی بہن کا نکاح سلطان کے ساتھ کر دے گا۔ جب جہاز تیار ہوئے تو میرے دل میں آیا کہ میں بھی جہاد کے ثواب میں داخل ہو جاؤں۔ میں نے کلام اللہ میں فال دیکھی تو یہ آیت نکلی۔ یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً ولینصرن اللہ من ینصرہ۔" صاف فتح کی بشارت تھی۔ جب سلطان عصر کی نماز کے لیے مسجد میں آیا تو میں نے اس سے کہا میں بھی سفر کرنا چاہتا ہوں اس نے کہا اچھا میں تجھے جہاد کا امیر مقرر کرتا ہوں۔ میں نے کہا کلام اللہ میں یہ فال نکلی ہے وہ بہت خوش ہوا اور خود بھی چلنے کو تیار ہو گیا پہلے اس کا ارادہ نہ تھا میں اور وہ ایک جہاز پر سوار ہوئے۔ شنبہ کے دن ہم چلے منگل کے دن سنداپور میں پہنچے اور کھاڑی میں داخل ہوئے معلوم ہوا کہ سنداپور کے باشندے لڑائی کے لیے تیار ہیں اور منجنیق لگائے ہوئے ہیں رات کو ہم ٹھہرے رہے صبح ہوتے ہی نوبت نقارے بجنا شروع ہوئے اور جہاز لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ دشمن نے جہازوں پر منجنیق سے پتھر پھینکنے شروع کیے ایک شخص بادشاہ کے قریب کھڑا تھا اس کے پتھر آکر لگا۔ جہاز والے پانی میں کود پڑے ان کے ہاتھوں میں تلواریں اور ڈھالیں تھیں اور سلطان عکیری بھی اتر گیا اور میں بھی پانی میں کود پڑا۔ ہمارے پاس دو جہاز تھے جن کے پیچھے کھلے ہوئے تھے ان میں گھوڑے بھی سوار تھے یہ جہاز ایسے بنے ہوئے تھے کہ ان کے اندر ہی اندر آدمی گھوڑے پر چڑھا ہوا باہر نکل آتا تھا ہم نے بھی اسی طرح کیا۔

خدا نے مسلمانوں کو مدد دی، ہم تلواریں پکڑ کر شہر میں داخل ہو گئے۔ اکثر ہندو راجہ کے محل میں پناہ گزین ہوئے ہم نے ان پر آگ برسائی اور ان کو گرفتار کر لیا۔ سلطان نے ان کو امان دی اور ان کی عورتیں واپس کر دیں یہ لوگ دس ہزار کے قریب تھے۔ انھیں شہر کے باہر رہنے کے لیے جگہ دی۔ خود سلطان محل میں جا رہا اور آس پاس کا گھر اپنے ملازموں اور امیروں کو دے دیے مجھے ایک لونڈی دی جس کا نام مکی تھا میں نے اس کا نام مبارک رکھا اس کا خاوند مجھے فدیہ دینا تھا۔ میں نے پیسے سے انکار کیا سلطان نے مجھے ایک مصری جبہ بھی دیا جو راجہ کے توشہ خانہ سے برآمد ہوا تھا۔ میں سلطان کے پاس سنداپور میں ۱۳ جمادی الاول سے نصف شعبان تک رہا اور

لے سفر نامہ ابن بطوطہ مترجم جعفری صفحہ ۲۰۰

سفر کرنے کی اجازت طلب کی سلطان نے مجھ سے عہد لے لیا کہ میں پھر واپس آؤں گا۔"[1]

وجیانگر کو اپنے بغل میں اس اسلامی سلطنت کا وجود برابر کھٹک رہا تھا اس سلطنت کی ترقی واستحکام انہیں کسی طرح گوارہ نہیں تھا۔ یہ اسلامی سلطنت گو داخلی معاملات میں آزاد تھی تمام خارجی معاملات ومسائل میں اقتدار اعلیٰ وجیانگر کی زیر دستی تھا۔

چنانچہ تاریخ جنوبی ہند لکھتا ہے:۔

"تمام ملک کئی حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصہ میں ایک گورنر رہتا تھا۔ وجیانگر کے خراج گذار راجاؤں میں مشہور یہ تھے۔

پینکاپور، اگرسپا، برکلور، کالی کٹ۔ اور چنگل گورنری کے عہدوں پر زیادہ تر برہمن فائز تھے یہ گورنر فیوڈل (دہقانی) طریق پر راجہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خاص فوج رکھتا تھا ہر گورنر کا ایک نمائندہ پایہ تخت میں رہ کر ایک روزانہ رپورٹ دیتا تھا۔"[1]

یہ ماتحت ریاستیں بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھیں اور ان کی بالادستی کے خلاف کسی قسم کی شکایت کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ لیکن وہ جو مشہور ہے حیلہ جو را بہانہ بسیار۔ کہا جاتا ہے سنداپور کے تسلط کے بعد اس کا راجہ وجیانگر کے راجہ سے امداد طلب کی۔ وجیانگر نے اس کا راج اس کو واپس دینے کا حکم صادر فرمایا اور ادھر سے کچھ ڈھیل ہوئی کیونکہ سنداپور کی حکومت اس راجہ کے بیٹے کو جو مسلمان ہوگیا تھا فائز کیا گیا تھا۔ اور یہ بات بیجانگر کے لیے ناقابل برداشت تھی اور وہ اس اسلامی سلطنت کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے پر تل گئی۔

ایک لشکر جرار وجیانگر سے روانہ ہوا اور اس نے ہنور اور پاسیٹن کا محاصرہ کرلیا چونکہ جنگی تفصیلات ہمارے موضوعات سے باہر ہے۔ اس لیے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ چند قدیم کتابت اور مختلف تاریخی کتابوں سے جو حالات متفرق طور سے ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے یہی اندازہ ہوا کہ وجیانگر کی فوج بہت بڑی تعداد میں ہر قسم کے جنگی اسباب وسلحات سے لیس ہوکر آئی تھی۔ اس کے مقابلہ کی تاب ہوسیٹن کی معدود ومحدود طاقت کہاں سے لاسکتی تھی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پاس جو بحری کشتیاں تھیں۔ ان میں سوار ہو کر سلطان ان کا خاندان اور سلطنت کے اہم ارکان افراتفری کی تاریکیوں میں غائب ہوگئے اور ملک سے کوئی دشمن کے ہاتھ نہ آیا۔ رہی عام آبادی وہ نہتے تھے اور وہ بڑی منظم فوج سے لڑ نہیں سکتے تھے ان کی ایک بڑی تعداد قریب کی بندرگاہ میں جمع ہوگئی لیکن بہت سے لوگ ادھر ادھر قریب کی آبادیوں میں فرار ہو کر پناہ گزین ہوگئے۔

---

[1] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۱۸۸

اب دارالسلطنت بلا مقابلہ فوج کے قبضہ میں تھا اور فوج نے اس کے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مساجد و مکاتیب۔ سلطانی محلات، سرکاری عمارتیں پورے طور پر مسمار و برباد کر دی گئیں۔ نہ کوئی مکان اس کے دست برد سے بچا اور نہ کوئی اس کا نام و نشان ہی باقی رہا۔ اس عالیشان و پر رونق شہر کو اس طرح اجاڑ دیا گیا کہ اب وہاں دیدۂ عبرت نگاہ سے کوئی دیکھے تو اس کو مسمار شدہ مسجد کا ایک ٹوٹے پھوٹے محراب کے آثار اور ایک شکستہ منارہ کے باقی ماندہ حصے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آئے گا اور اس پوری آبادی میں کسی مسلمان کا کوئی گھر تک نہیں۔

یہ ایک عربوں اور نوائطیوں کی اسلامی سلطنت تھی جو بڑی امیدوں کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور جو بڑی تیزی کے ساتھ قوت و استحکام حاصل کرتی جا رہی تھی۔ دیندار سلطان کے عادلانہ نظام حکومت کے ماتحت ہندو اور مسلمان باہمی اتحاد کے ساتھ امن و اطمینان اور خوش حالی کی زندگیاں گذار رہے تھے۔ اس کو بحری طاقت میں دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ فوقیت اور برتری حاصل تھی۔ گو بری اور سوار فوج مقررہ تعداد سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہ تھی تاہم عندالضرورت فوج مطوعہ (والنٹیئرس) سے کام لینے کا انتظام تھا۔ اگر یہ سلطنت باقی رہتی تو جنوبی کنارا کے مسلمانوں کا نقشہ ہی کچھ اور نظر آتا۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایک ایسی سلطنت کو اس کے پورے طور پر ابھرنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ابن بطوطہ کی زبانی عرب و ہند کے تعلقات کے مصنف لکھتے ہیں۔

"ابن بطوطہ کو جہازوں کی تباہی کے سبب سے پھر اسی راستہ سے کالی کٹ کو لوٹ آنا پڑا اور راستہ میں وہ چالیات میں ٹھہرا جس کو عرب شالیات کہتے تھے اور اب اس کو چالیات کہتے ہیں۔ یہ کالی کٹ کے قریب تھا۔ ابن بطوطہ یہاں کے کپڑوں کی تعریف و توصیف کرتا ہے وہ یہاں سے ہنور اور وہاں سے چنداپور (گوا) پہنچتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ راجہ نے (شاید بیجانگر کا راجہ مراد ہے) لڑ کر سلطان جمال الدین ہنوری کے ہاتھ سے یہاں کی ریاست چھین لی۔ ابن بطوطہ یہاں سے سوار ہو کر مالدیپ چلا گیا[1]

وجیانگر کے راجاؤں نے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے۔ اس کو جہازوں کی تباہی کے سبب سے پھر اسی راستے سے کالی کٹ واپس آنا پڑا۔ راستے میں وہ چالیات میں ٹھہرا جس کو عرب شالیات کہتے ہیں یہ کالی کٹ کے قریب تھا وہ یہاں سے سنداپور پہنچا تو معلوم ہوا کہ راجا وجیانگر کا سلطان جمال الدین ہنوری سے لڑ کر ریاست چھین لی تھی[2]

اور جب اس سلطنت کی تباہی کی داستانیں مسلمان مرد عورتوں کے قتل و بے حرمتی کی خبر بیجاپور

---

[1] عرب و ہند تعلقات از مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۲۹۹ [2] قلندر برحق صفحہ ۱۷۶

اور احمد نگر کے سلاطین نے سنی تو انھوں نے اپنی قلبی عداوتوں کو دور کیا اور آپس میں اتفاق کر کے وجیانگر کے راجہ کا مقابلہ کیا اور سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی"۔ ؎۱

پاسیٹن کی اسلامی سلطنت وجیانگر کے قلب میں ایک کانٹا تھا جو نکل گیا۔

ڈاکٹر مومن محی الدین اپنی کوکن میں لکھتے ہیں:۔

"ابن بطوطہ نے جمال الدین ہنوری کی تعمیر کی ہوئی جامع مسجد میں بغداد کی فن معماری کی جھلکیاں دیکھی تھیں ہنور میں مسلم مکتبوں کی خاصی تعداد تھی مگر وقت کے استبداد اور تاریخ کی اجروت نے مکتبوں اور مسجدوں کو ملبوں میں دفن کر دیا"۔ ؎۲

چنانچہ جناب عبدالواسع عصری لکھتے ہیں:۔

"اس وقت ملک دکن اور اس کی اسلامی سلطنتوں میں باہمی نفاق نے جنوب میں ایک ہندو سلطنت کو فروغ دیا تھا۔ اس سلطنت کے راجاؤں نے مسلمانوں کی ناچاقیوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں اٹھا رکھی اسی ہندو سلطنت سے مالابار کے عرب تاجروں نے اور ساحلی علاقوں کے مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ راجہ ویر اپکشا کے عہد حکومت میں مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹے گئے قتل و غارت گری نے ان کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ راجگان وجیانگر کے ظلم و ستم کے روک تھام کے لیے عربوں نے ہنور میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس سلطنت کے بانی سلطان جمال الدین تھے پاسیٹن اس کا پایہ تخت تھا یہ شہر موجودہ گوا کے قریب تھا جس کو عرب سنداپور یا چنداپور کہتے تھے۔

ملاحظہ ہو ہو سپیٹن (ہناور) کی شکستہ مسجد کے باقی ماندہ نشانات :۔ اگلے صفحہ پر۔

معبر کے شیخ تقی الدین بن عبدالرحمن بن محمد الطیبی

شیخ تقی الدین کے بارے میں عرب و ہند کے تعلقات مصنف لکھتے ہیں:۔

"شیخ تقی الدین بن عبدالرحمن بن محمد الطیبی جو شیخ جمال الدین کا بھائی ہے اس راجہ کا وزیر اور مشیر تھا (سندر پانڈے کا رومنڈل کا راجہ) جس کو پٹن، ملی پتن، ہیم، ملا پٹم اور بادلی کی ریاست راجہ نے سپرد کر دی تھی سنہ ۶۹۲ ہجری اور ۱۲۹۳ء عیسوی میں دیوان مرگیا اور اس کی وفات اس کے وزیروں اور

؎۱ ایضاً تلندر برحق صفحہ ۱۷۶ ؎۲ تاریخ کوکن صفحہ ۲۰۸

مشیروں اور نائبوں میں بٹ گئی اور شیخ جمال الدین کو جو اس کا جانشین ہوا کہتے ہیں کہ سات ہزار بیلوں کا بوجھ سونا اور جواہرات ہاتھ آئے اور تقی الدین پہلے کے معاہدہ کے مطابق اس کا نائب مقرر ہوا[1]

تاریخ وصاف لکھتا ہے :۔

" اس بندرگاہ کایل اور ملیبار کے دوسرے بندرگاہوں کو دس ہزار گھوڑے فروخت کے لیے بھیجے گئے ان میں چودہ سو گھوڑے خاص ملک الاسلام جمال الدین مرزبان فارس کے ہیں۔ ہر گھوڑے کی قیمت دو سو بیس دینار سرخ ملتی ہے اگر کوئی گھوڑا راستہ میں مرجائے تو اس کی قیمت بھی ثبوت ملنے پر راجہ ادا کر دیتا تھا اس وقت معبر میں ملک الاسلام جمال الدین کا مختار (ایجنٹ)، اس کا ایک رشتہ دار بھائی تقی الدین عبدالرحمٰن بن محمد الطیبی عرف مرزبان نائی ہے۔ تقی الدین بندرگاہ کایل میں رہتا ہے اور اس کی نگرانی میں فتن، مالی فتن کی منڈیاں بھی ہیں ۔"[2]

مورخ پول، فتن اور مالی فتن کے متعلق لکھتا ہے :۔

"کہ ان شہروں کو موجودہ زمانے میں دیوی پٹن اور مرکیار پٹن کہتے ہیں ۔"[3]

مورخ پول اپنی تاریخ میں مزید لکھتا ہے :۔

" ملک الاسلام جمال الدین کے ایجنٹ تقی الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ۱۳۰۳ء میں ہوا۔ رشیدالدین جس نے وصاف کا ترجمہ کیا ہے ایک اور عرب تاجر جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ " جمال الدین اس ملک کے راجہ کا وزیر تھا۔"

اس پر جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں صرف ایک جمال الدین کا خاندان نہیں بلکہ کئی عرب خاندان آباد تھے اور ان عربوں کا راجاؤں کے دربار میں خاصہ اقتدار تھا ۔"[4]

مسلمان مورخ وصاف لکھتا ہے :۔

" جنوبی ہند کا ملک کولم سے لے کر شمال میں نلور تک تین سو فرسخ کے طول میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے حکمرانوں کو " دیور" کہتے ہیں۔ چین ماچین اور ہند و سندھ کی سوغات جہازوں میں بھری ہوئی یہاں آتی ہے خلیج ایران کے جزائر عراق اور خراسان روم و یورپ کے مخالف معبر کی منڈیوں میں آتی ہیں معبر ہند کی کنجی ہے دکور و منڈل)

---

[1] عرب و ہند صفحہ ۲۰۲ [2] جنوبی ہند صفحہ ۷۰ [3] مورخ پول بحوالہ جنوبی ہند صفحہ ۴۸

[4] تاریخ وصاف بحوالہ جنوبی ہند صفحہ ۴۹ ترجمہ جناب محمد علی صاحب ایم۔ اے۔

ایک اور جگہ بھی مورخ لکھتا ہے :۔

"اس جگہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ساحل ہے سمندر کے کناروں میں سے قدیم اور جدید نادر اشیاء سے پر اور جنس جنس کے خزانوں اور گراں مایہ جواہروں اور عمدہ سامانوں اور گراں قدر برگزیدہ متاعوں کی کثرت سے بے مثال کاریگری کی ندرت کو ظاہر کرتے ہیں اس علاقہ کے اطراف زجوانب عود اور قرنفل کی خوشبو سے مہکتے ہیں اور گرد ونواح کے علاقے طوطیوں کی زبان سے چہکتے ہیں" ؎

مدورا اور کورومنڈل کے ساحل کو اسلام کے ابتدا ہی سے تعلق رہا ہے بندرگاہ کایل پٹن عرب سوداگروں کی منڈی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ہند اور کل ہند میں ساحل کورومنڈل اور ملیبار ہی دو ایسے ملک ہیں کہ ان میں ظہور اسلام کے بعد ہی مسلمانوں کی آمد اور اسلام کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مدورا کی سیاسی تاریخ سے بھی مسلمانوں کا نہایت گہرا تعلق رہا ہے جنوبی ہند بلکہ کل ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی اولین بنیاد اسی ضلع اور شہر میں پڑی تھی اس مسلم حکومت کی اکثر باتیں ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے ہی معلوم ہوئی۔ بعض مورخین کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ اگر سیاح ابن بطوطہ اس حکومت کا اپنے سفرنامہ میں ذکر نہ کرتا تو مدورا کی ایک اسلامی تاریخ

سنہ ١٣١٠ء میں سلطان علاءالدین نے جنوبی ہند خاص کر مدورا پر حملہ کی وجہ یہ تھی کہ دو بھائی تخت کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے جس کی تفصیل میں مورخ اوصاف اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :۔

"جنوبی ہند میں اس وقت قابل ذکر دو سلطنتیں تھیں ایک میسور کی ہوئے سالار حکومت تھی جس کا پایہ تخت دوار سمندرم میں تھا اور دوسری مدورا کی پانڈیا حکومت تھی۔ ہوئے سالار حکومت دریا کرشنا سے نیچے ملیبار تک اور بحیرۂ عرب سے لیکر ساحل کورومنڈل تک پھیلی ہوئی تھی جنوب میں پانڈیا خاندان تمام ملک کو راس کماری تک حکومت کر رہا تھا۔ ملیبار اور بڑا دکور وغیرہ اسی کے ماتحت تھے۔ اس زمانہ میں جب دہلی میں شہنشاہ علاءالدین برسر حکومت تھے تو مدورا کے تخت کے لیے دو بھائیوں میں جس کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا لڑائی ہوئی۔ ویرا پانڈے نے سندرا پانڈے کو مدورا سے نکال دیا اور اس نے سلطان علاءالدین سے تائید مانگی" ؎

مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹر نے بھی مقامی روایتوں اور کتبوں سے نتیجہ نکالتے ہوئے لکھا ہے :

"مدورا کے تخت کے دعوے داروں میں سخت لڑائی ہوئی ان میں سے ایک نے سلطان علاؤالدین سے مدد مانگی اور اس نے اپنے جنرل ملک کافور کو جنوب میں بھیجدیا" ؎

ڈاکٹر ایس کرشنا اچاری لکھتا ہے :۔

؎ بحوالہ تاریخ وصاف وجنوبی ہند صفحہ ٢٩ ؎ ایضاً صفحہ ٣٠ ؎ سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویڈرس صفحہ ٩٢

"مدورا کے راجہ کے دو بیٹے تھے جن کا نام ویرا پانڈے اور سندر پانڈے تھا۔ باپ بڑے بیٹے کو بہت عزیز رکھتا تھا اور اس لیے اس نے اس کو ولی عہد بنایا۔ باپ کی اس کارروائی سے چھوٹا بیٹا سندرا پانڈے ناراض تھا اور موقع ملنے پر اس نے سلطان علاء الدین سے مدد چاہی۔"[1]

مندرجہ بالا عنوانات سے یہ اخذ ہوتا ہے۔ ہندو ملک کے باہمی اختلاف نے مسلمانوں کو جنوب کی طرف توجہ کرنے کا موقع فراہم کردیا اس وقت مدورا دو حصوں میں بٹا ہوا تھا ایک حصہ ویرا پانڈے کی حمایت میں اور دوسرا حصہ سندرا پانڈے کے ساتھ تھا دونوں بھائی عرصہ تک آپس میں لڑتے رہے آخر تنگ آکر ویرا پانڈے نے پڑوسی حکومت کی دوار سمندرم کے راجہ سے مدد طلب کی اس لیے چھوٹے بھائی سندرا پانڈے کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔

چونکہ جنوب میں اس وقت ایسی کوئی طاقتور حکومت نہیں تھی اس لیے اس نے اپنا ایک سفیر دہلی بھیجا اور مسلمانوں سے اپنی حمایت کی درخواست کی۔ علاء الدین نے اس کی حمایت منظور کرلی اور اپنے جنرل ملک کافور کو مدورا کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

یہاں سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کافور کو جانا تھا مدورا لیکن اس نے دوار سمندرم پر حملہ کیوں کیا؟ اس کا جواب مورخین نے یہ دیا ہے کہ دوار سمندرم کی حکومت جنوبی ہند کے شمالی حصہ پر قابض تھی اور اس کے حدود سے گذرے بغیر جنوب میں مدورا تک رسائی ممکن نہیں تھی اس کے علاوہ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اگر دوار سمندرم پر حملہ کیا جائے تو راجہ بلال سوم اپنے پایہ تخت کو بچانے کے لیے مدورا سے واپس ہو جائے گا اور اس سے وہاں سندرا پانڈے کو کچھ دم لینے کی مہلت مل جائے گی اور دوار سمندرم پر پہلے حملہ کرنے کا ایک اور اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ملک کافور کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر دوار سمندرم فتح کیے بغیر وہ مدورا کی طرف بڑھے گا تو بلال سوم اس کی واپسی کا راستہ روک نہ دے۔ ان وجوہ کی بنا پر کافور نے دوار سمندرم پر حملہ ناگزیر سمجھا۔

راجہ بلال سوم نے آخر کار صلح کر کے گھٹنے ٹیک دیے۔ کافور بلال سوم کو دہلی روانہ کردیا اس کے بعد مسلمانوں کے لیے مدورا تک کا راستہ صاف و بے خطر ہو گیا الغرض دوار سمندرم کے راجہ بلال سوم کی اس شکست فاش دیکھنے کے بعد ملک کافور مدورا پہونچا۔ راجہ ویرا پانڈے اپنی راجدھانی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا شہر خالی تھا اس طرح بغیر لڑے بھڑے مدورا پر ان کا قبضہ ہو گیا جہاں سے اسلامی فوج معبر کی طرف بڑھی کرناٹک کے ساحل پر پہونچ کر دین حق کو یہاں تک پہونچا دیا جائے اس جگہ ایک برہمن پانڈے گرد حکومت کرتا تھا اس کے قبضہ میں بہت سے شہر تھے اس کا پایہ تخت قتان تھا ان فتوحات کے بعد۔۔۔

ملک کافور نے سندرا پانڈے کو تخت نشین کر کے دہلی واپس ہوا۔

جنوبی ہند میں کافور کے حملے کے نتیجے پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"جس طرح ایک نامعلوم زمانہ سے مختلف قومیں اس ملک پر حملے کرتی رہی ہیں اسی طرح ۱۳۱۱ء میں مسلمانوں نے بھی اس ملک پر بھی حملے کئے دوسری قومیں جب ملک میں آئی تھیں تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں لیکن مسلمان اس حملہ کے بعد جلد ہی شمال کو واپس چلے گئے اگر وہ چاہتے تو نہایت آسانی سے مستقل حکمرانی کی داغ بیل اس مفتوحہ علاقے میں ڈال سکتے تھے مگر سلطان علاء الدین کی مصلحت نے کافور کو واپس بلا لیا اس کا سب سے بڑا سبب مورخین نے یہ لکھا ہے کہ علاء الدین کے شمال میں مغلوں کے حملوں کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ بہر طور مسلمان واپس ہوئے لیکن ملک کی سیاسی حالت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب تک جنوبی ہند کی دونوں حکومتیں یعنی مدورا اور دوار سمندرم جو آزاد تھیں مسلمانوں کی باجگذار بن گئیں چنانچہ مورخ اسمتھ اور دوسرے انگریزی مورخین لکھتے ہیں:۔

"ہندستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ تمام ملک ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک ایک شہنشاہ کے زیر نگیں آ گیا"

لیکن ملک کافور کے دہلی جانے کے بعد سلطان علاء الدین رحلت کر گیا اور کافور نے بڑے شاہزادگان کو حراست میں رکھ کر چھوٹے شاہزادے کو تخت پر بٹھایا اور خود بحیثیت نائب حکومت کے فرائض انجام دینے لگا اس سے امرائے دہلی میں بددلی اور ناراضگی پیدا ہو گئی اور امراؤں نے پچیس ہی دن میں ملک کافور کو قتل کر کے علاء الدین کے ایک بیٹے قطب الدین مبارک کو نائب بنایا جو بعد میں خود بادشاہ بن گیا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ

جس وقت علاء الدین کی وفات اور کافور کے قتل اور دہلی میں انقلابات کی خبریں جنوبی ہند میں پہونچیں تو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہیں یہ لکھا جا چکا ہے کہ کافور نے سندا پانڈے کو مدورا میں تخت نشین کر کے واپس ہوا تھا لیکن کافور کی واپسی کے بعد ملک میں پھر خانہ جنگی شروع ہو گئی لیکن دوار سمندرم کے راجہ بلال سوم نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا وہ اپنے گمشدہ رسوخ کو حاصل کرنے اور اپنے اجڑے ہوئے پایہ تخت کو دوبارہ تعمیر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ [1]

---

[1] سدرن انڈیا اینڈ محمڈن انویڈرس

لیکن ایک دوسری ہندو طاقت یعنی ہرداد نگور والوں نے راجہ راوی ورما کلیکرا کی ماتحت ملیبار اور مدورا پر چڑھائی کر دی۔ اور اس جنگ کا اثر اس وقت ان مسلمانوں پر پڑا جو ملیبار میں مقیم تھے اس سے پہلے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کبھی تعرض نہیں کیا تھا اس لیے کہ مسلمان صرف تاجروں کی حیثیت سے رہتے تھے ملک۔ کافور کے حملے کے بعد انھیں ملک میں ایک سیاسی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی خبریں جب مبارک کو پہنچیں جو اس وقت دکن میں مقیم تھا تو اس نے اپنے نومسلم غلام خسرو کو ملیبار فتح کے لیے بھیجا۔

خسرو دیوگیری سے نکل کر دوار سمندرم پہنچا۔ راجہ بلالا سوم نے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ دوار سمندرم سے خسرو جنوب کی طرف بڑھا یہ خبر سن کر راجہ راوی ورما ہرداد نگور کو واپس ہو گیا خسرو کی کسی بھی جگہ مزاحمت نہیں ہوئی لہ

مورخ برنی لکھتا ہے :۔

"خسرو کو جنوبی ممالک پر چڑھائی میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر راجہ فرار ہو گیا۔ مسلمانوں نے دو شہروں پر قبضہ کر لیا۔ یہاں ان کو دوسرا کھتی مال غنیمت میں ملے"

اس کے بعد محمد تغلق کے دور میں حکومت میں پھر خانہ جنگی، طوائف الملوکی، نا اتفاقی اور مختلف صوبوں کی خود مختاری کا ایک ایسا دور شروع ہو گیا جس سے مرکزی قوت و استحکام میں فتور پیدا ہو گیا مدورا کے حاکم جلال الدین احسن اور ملیبار کے فرمانروا سید حسن نے ۱۳۳۶ء میں بغاوت کی۔ بادشاہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے جنوب کی طرف متوجہ ہوا وہ بیدر کے قریب پہنچا تھا۔ اتفاقاً علیل ہو گیا۔ اسی عرصے میں ملتان کے گورنر کی بغاوت کی خبر پہنچی اور بادشاہ بیدر سے واپس ہو گیا ادھر اس کے بیدر سے واپس جاتے ہی دکن کے مسلم امراء نے بھی بغاوت کر دی۔ چنانچہ اس تو تعبیر تاریخ جنوبی ہند کے مصنف نے جو تبصرہ کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے نہیں بلکہ وہ اس وقت کے حالات کی واقعی عکاسی بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"مسلمانوں کی اس خانہ جنگی اور خصوصاً دکن کے مسلمانوں کی امراء کی شہنشاہ سے بغاوت اور ان کی آپس کی نا اتفاقی نے جنوب کے ہندوؤں کے لیے خود بخود ایک نادر موقع فراہم کر دیا اس سے بہتر موقع انھیں مل بھی نہیں سکتا تھا۔ گو خسرو زندہ نہیں تھا اور وہ اپنی تجویز میں (کہ مسلمانوں کو ملک سے باہر نکال دیا جائے) کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی تجویز جنوب میں برابر کام کرتی رہی۔ ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ جب تک ان میں اتحاد نہ ہو گا وہ اپنی تجویز میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لیے انھوں نے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ ۲ے

لہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۸۷ ۲ے تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۹۷

اس سے آئندہ جو حالات پیدا ہوئے اس کا تذکرہ وجیانگر کی سلطنت وجود میں آنے کی بحث کے دوران میں گزشتہ صفحات میں لکھ آئے ہیں۔ اب ہم مدورا اور کارومنڈل کی مسلم سلاطین کے اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ :-

"سلطان جلال الدین احسن شاہ نے چھ سال تک وفادار رہنے کے بعد ۱۳۳۵ء میں مدورا میں ایک آزاد خود مختار مسلم حکومت کی بنیاد قائم کی لیکن اس کی یہ خود مختار حکومت کا پانچ سال تک رہی"

ابن بطوطہ آگے لکھتا ہے :-

"سید احسن باغی ہونے کے پانچ سال تک بالاستقلال برسر حکومت رہا۔ اس کے بعد امراء نے اس کو قتل کر ڈالا۔ سید احسن کی بغاوت کی خبر سن کر سلطان محمد بن تغلق دہلی سے جنوب کی جانب نکلا جب تلنگانہ پہنچا تو بیمار ہو گیا اس وقت ملک سندھ میں بغاوت ہوئی یہ خبر سن کر بادشاہ سندھ کی طرف چلا گیا۔ سلطان محمد تغلق کی واپسی نے جلال الدین احسن کو ایک مستقل حکومت قائم کرنے کا اچھا موقع دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نہایت شان و شوکت سے حکومت کی اور بحری طاقت کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ یہی سیاح آگے لکھتا ہے :-

"اس نے مدورا شہر کی دہلی کے نمونہ پر بنیاد ڈالی اور اس میں اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں اور سلاطین معبر کی علمداری میں ہمیشہ ہنور کے بعد فتن کا بل کا درجہ تھا۔ شاہان معبر کا بحری بیڑہ اس جگہ رہا کرتا تھا جس کے لیے بندرگاہ کے قریب لکڑی کا عجیب و غریب برج بنایا گیا تھا جب کبھی سفائین کا ذخیرہ ہوتا تو اہل جہاز اس برج پر چڑھ کر محفوظ ہو جاتے تھے" [1]

پانچ سال کی حکومت کے بعد جلال الدین احسن انتقال کر گیا۔ اس کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام حور نسب تھا، اس کا نکاح دہلی میں ابن بطوطہ کے ساتھ ہوا تھا۔ ابن بطوطہ اپنی اس بیوی کے متعلق لکھتا ہے :-

"نہایت نیک بخت لڑکی تھی۔ رات کو تہجد پڑھتی تھی۔ پڑھنا لکھنا جانتی تھی لیکن لکھنا نہیں آتا تھا" [2]

جلال الدین کے بعد مقامی امراء نے علاءالدین اُدوجی کو سلطان منتخب کیا۔ اس کا زمانہ حکومت صرف ایک سال رہا اور وہ بھی ہندوؤں سے جنگ و جدال ہی میں گذرا۔ چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے [3]

---

[1] ابن بطوطہ [2] ابن بطوطہ

اس نے حکمراں ہونے کے بعد ہند و راجہ پر حملہ کیا اور بہت سامال و دولت لے کر اپنے دارالحکومت کو واپس آیا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد اس نے پھر ہند و راجہ پر چڑھائی کی۔ بادشاہ کو اثنائے جنگ میں ایک تیر آ کر لگا جس کے صدمہ سے فوراً مر گیا۔ [۱]

علاء الدین کے بعد اس کے داماد قطب الدین کو تخت شاہی پر بٹھایا گیا لیکن امراء اس کی عادتوں سے ناراض تھے اس لیے تخت نشینی کے چالیس دن بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد دوسرا امیر غیاث الدین دامغانی جو نسل کا تھا تخت نشین ہوا۔ اس نے جلال الدین احسن کی دوسری بیٹی جو ابن بطوطہ کی سالی تھی۔ نکاح کر لیا۔

اس کے عہد میں راجہ بلال سوم سے برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ بوڑھے سالار راجہ بلال پے در پے حملے کرتا رہا کہ مسلمانوں کو مٹا دیا جائے۔ لیکن جانباز مٹھی بھر مسلمان برابر مدافعت کرتے رہے یہاں تک کہ بلال سوم ایک جنگ میں مارا گیا اس جنگ کی جو تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے۔

"اس سے اس زمانہ کے مسلمانوں کا جوش و خروش ان کا جذبۂ ایمانی اور باوجود اس قدر قلیت میں ہونے کے ان کے استقلال اور جوانمردی کا پتہ چلتا ہے۔" [۲]

ابن بطوطہ لکھتا ہے :-

اس بادشاہ دامغانی کے قرب وجوار میں ایک راجہ بلال دیو تھا۔ بڑا عظیم الشان راجہ تھا اس کا لشکر ایک لاکھ کے قریب تھا اس کے ساتھ بیس ہزار مسلمان تھے جن میں اکثر چور اور ڈاکو اور بھاگے ہوئے غلام تھے۔ اس نے معبر پر حملہ کیا اس وقت بادشاہ کے پاس فقط چھ ہزار فوج تھی جن میں سے نصف تعداد تو اچھے سپاہیوں کی تھی اور باقی یونہی نفول اور بے سامان تھے۔ شہر کنان کے باہر مقابلہ ہوا معبر کے لشکر نے شکست کھائی اور وہ سب شہر مترہ دار الخلافہ کو واپس آ گئے اور راجہ کناں کا محاصرہ کیا یہ شہر بہت بڑا اور مضبوط تھا اس نے دس مہینے تک اس کا محاصرہ کیا اور قلعہ والوں کے پاس صرف چودہ دن کی خوراک باقی رہ گئی۔ راجہ نے ان کو پیغام بھیجا کہ اگر تم قلعہ چھوڑ کر تو تمہیں امان ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم پہلے بادشاہ سے خبر منگائیں۔ راجہ نے کہا اچھا اسی دن چودہ دن کے اندر میں اجازت منگا لو راجہ نے سلطان غیاث الدین کو لکھا اس نے جمعہ کے دن وہ خط سب لوگوں کو سنایا حاضرین سن کر رو دیئے اور کہا کہ ہم اپنی جانیں اللہ کے راستہ پر وقف کرتے ہیں کیونکہ اگر راجہ نے وہ شہر لے لیا تو ہمارے شہر پر آئے گا۔ گرفتار ہونے سے تلواروں کے سایے میں مرنا بہتر ہے انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ عہد کیا کہ کوئی نہ بھاگے اور دوسرے دن سب نکل کر اپنے عمامے گھوڑے

---

[۱] [۲] ابن بطوطہ۔

کی گردن پر باندھ دیے یہ علامت اس بات کی تھی کہ مر جائیں گے بھاگ کر نہ آئیں گے ان میں سے دلیر اور بہادر سب سے آگے بڑھے اور تعداد میں بھی سو کے قریب تھے۔ میمنہ پر سیف الدین بہادر کو کھڑا کیا یہ شخص بڑا عالم پرہیزگار اور بہادر تھا اور میسرہ پر محمد سلحدار کو اور سلطان خود قلب میں تھا اس کے ساتھ اس کی تین ہزار فوج تھی باقی تین ہزار کو ان کے پیچھے کیا اور ان پر اسد الدین کیخسرو فارسی کو سردار بنایا زوال کے وقت انھوں نے سفر کیا۔ دشمن بالکل غافل تھے ان کے گھوڑے چراگاہ میں گئے ہوئے تھے اسد الدین نے ان پر ناگہاں حملہ کیا راجہ نے سمجھا کہ چور ہیں اس لیے بغیر کسی تیاری کے مقابلے کے لیے نکلا اور ان کا مقابلہ کیا اتنے میں بادشاہ غیاث الدین بھی جا پہونچا۔ راجہ نے فاش شکست کھائی اور ارادہ کیا کہ سوار ہو کر بھاگ جائے وہ عمر میں اسی برس کا تھا۔ ناصر الدین نے جو غیاث الدین کا بھتیجہ تھا اس کو پکڑ لیا اور چاہتا تھا کہ اس کو قتل کرے کیونکہ وہ اس کو پہچانتا نہ تھا لیکن اس کے ایک غلام نے کہا کہ یہ راجہ ہے اس لیے ناصر الدین نے اس کو قید کر لیا اور اپنے چچا کے پاس پکڑ کر لے آیا۔ بادشاہ نے ظاہر میں اس کی تعظیم کی اور خراج میں بھی بہت سا مال ہاتھی اور گھوڑے لے لیے کیونکہ اس سے وعدہ کرتا تھا کہ تجھے چھوڑ دوں گا جب اس کے پاس کچھ نہ رہا تو اس کو ذبح کر ڈالا اور اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھوسہ بھر وا کر متھرہ کی فصیل پر اس کو لٹکوا دیا میں نے بھی اس کو وہاں لٹکا ہوا دیکھا۔[۱]

راجہ بلالا سوم کے خاتمہ کے بعد غیاث الدین دامغانی نے ابن بطوطہ کی ترغیب پر جزائر مالدیپ پر حملہ کی تیاری کرنے لگا چنانچہ ابن بطوطہ لکھتا ہے:۔

اس غرض کے لیے اس نے کئی جہاز مقرر کیے اور وہاں کی ملکہ کے لیے تحفے امراء کے لیے خلعتیں تیار کیں محتاجوں کے لیے تین جہازوں میں صدقہ بھر دیا لیکن یہ زمانہ مالدیپ کے سفر کا نہ تھا اس لیے یہ مہم تین مہینے کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ اس اثنا میں غیاث الدین دامغانی کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔[۲]

ابن بطوطہ اسی بادشاہ کے زمانہ میں مدورا پہونچا تھا اس نے وہاں کے حالات کی کچھ تفصیل لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:۔

"غیاث الدین دامغانی کا دور حکومت دو سال سے زیادہ نہ رہا تھا اس زمانے میں مدورا میں وبا پھیل گئی بادشاہ خود بھی اس وبا میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اب آگے کا حال خود اس کی زبانی سنیئے لکھتا ہے کہ:۔

جب میں کیمپ کے قریب پہونچا تو اس نے میرے استقبال کے لیے ایک آدمی کو بھیجا بادشاہ لکڑی

---

[۱] ترجمہ سفر نامہ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۳۴۳ / ۳۴۴ ۔ [۲] سفر نامہ ابن بطوطہ۔

کے برنج پر بیٹھا ہوا تھا۔ دستور ہے کہ بادشاہ کے روبرو کوئی بے موزے پہنے نہیں جا سکتا۔ میرے پاس اس وقت موزے نہیں تھے ایک ہندو نے مجھ کو موزے دیے حالانکہ بہت سے مسلمان موجود تھے اس ہندو کی مروت پر تعجب کیا۔ میں بادشاہ کے سامنے گیا مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور قاضی حاجی صدر الزماں بہاء الدین کو بلوایا اور اس کے قریب ہی ہم کو ٹھہرنے کے لیے دیئے اور فرش اور کھانا یعنی چاول اور گوشت بھجوائے اس ملک میں ہمارے ملک کی طرح کھانے کے بعد دودھ کی لسی بھی پیتے ہیں[1]

ابن بطوطہ میدان جنگ میں دامغانی کے ظلم و ستم کا بھی کچھ ذکر کرتا ہے جب ہندو رات کو کیمپ پر چھاپہ مارنے کے لیے آتے تھے تو سوار لوگ فوراً دشمن کے تعاقب میں چلے جاتے تھے اور جو قیدی شام کو پکڑ کر آتے تھے ان کو چار جماعتوں میں تقسیم کرتے تھے ہر ایک گروہ کو کٹھگڑ کے ایک ایک دروازے پر لے جاتے تھے اور ہر ایک دروازے کے قریب وہ لکڑی جو کل قیدی اپنے کندھوں پر جنگل سے لاتے تھے گاڑ دیتے تھے پھر اس لکڑی میں ہر ایک قیدی کو پرو دیتے تھے اور ان کی عورتوں کے بال اس لکڑی سے باندھ دیتے تھے اور بچوں کو ان کی گردنوں میں ذبح کرتے تھے۔[2]

یہ بے رحم اور قابل نفرت کارروائی میں نے کسی بادشاہ کو کرتے نہیں دیکھی اور اسی وبال سے یہ بادشاہ جلد مر گیا"[3]

غیاث الدین کے بعد اس کا بھتیجا ناصر الدین تخت نشین ہوا۔ اس کے بارے میں ابن بطوطہ لکھتا ہے:

"یہ ناصر الدین دہلی میں بادشاہ محمد بن تغلق کا لازم تھا۔ جب اس کا چچا معبر کا بادشاہ ہو گیا تو یہ شخص دہلی سے فقیروں کا بھیس بدل کر بھاگ آیا اس کی تقدیر میں غیاث الدین کے بعد بادشاہ ہونا لکھا تھا جب اس کی بیعت کی گئی تو شاعروں نے اس کی تعریف میں قصیدے پڑھے ان کو اس نے بڑے بڑے صلے دیے پھر ناصر الدین نے اپنی پھوپھی کے بیٹے کو جس کے ساتھ سلطان غیاث الدین دامغانی کی لڑکی بیاہی ہوئی تھی قتل کروا دیا اور اس کی بیوہ سے آپ نکاح کر لیا۔

ابن بطوطہ اپنی واپسی کے وقت کالی سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے:-

"اطراف عالم کے جہاز تجارت کی غرض سے یہاں آتے تھے اس شہر میں ایک خوبصورت سنگین مسجد ہے اور اس کے صحن میں انگور اور عمدہ انار کے کثرت سے درخت ہیں یہاں شیخ صالح محمد نیشاپوری سے ملا یہ ان مجذوب فقیروں میں سے ہیں جو اپنے بال بڑھاتے ہیں اور شانوں پر چھوڑ دیتے ہیں ان کے ساتھ ایک شیر رہتا تھا۔ شیخ کے ساتھ تیس فقیر بھی تھے۔

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ [2] ایضاً [3] ایضاً

شیر انھیں فقیروں کے پاس کھانا کھاتا اور انھیں میں مل کر سوتا تھا ایک فقیر کے پاس ایک ہرن بھی تھا اور سانپ دو مرغیاں بھی تھیں ہرن اور یہ مرغی اس سے ڈرتی نہیں تھیں بلکہ شیر کے ساتھ مل کر سوتی تھیں [1]

ناصر الدین کے بعد مدورا کے مزید کچھ حالات کسی تاریخ سے ہماری نظر سے نہیں گزرے لیکن تاریخ جنوبی ہند کے مصنف نے محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے سے بعد کے تین بادشاہوں کے نام لکھے ہیں (۱) عادل شاہ (۲) مبارک شاہ اور علاء الدین سکندر شاہ۔

ناصر الدین کے دور ہی میں وجیانگر کی حکومت ابھر کر خوب مستحکم ہو چکی تھی اور اب ہوئے سالا حکومت کے بجائے وجیانگر کی طرف سے مدورا پر پیہم حملے ہونے لگے تھے یہی وجہ ہے کہ ۱۳۴۴ء سے ناصر الدین کے زمانہ سے لے کر علاء الدین سکندر شاہ کے آخری بادشاہ ۱۳۷۷ء تک وہاں کے مسلمانوں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً اس تمام عرصہ میں وجیانگر جیسی زبردست اور طاقتور سلطنت سے مقابلہ میں گزرا ہو کیونکہ اس سال ۱۳۷۷ء مدورا پر وجیانگر کا قبضہ اور مسلم حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا مدورا پر قبضہ کے متعلق تاریخ فیروز شاہی میں لکھا گیا۔

"ہمسایہ سردار باکن نے معبر پر حملہ کیا تمام معبر اس کے قبضہ میں آ گیا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ مسلمانوں پر حد درجہ ظلم کیا گیا۔" [2]

اس پر ہندو مورخ لکھتا ہے کہ ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے مسلمان دشوار گزار پہاڑیوں اور جنگلوں میں اپنے مذہب کو چھپا کر رہنے لگے۔" [3]

مدورا کی فتح کے بعد راجگان وجیانگر نے شہنشاہ کا خطاب اختیار کر لیا۔ [4]

اس طرح یہ اسلامی حکومت بڑی شان و آن کے ساتھ اڑتالیس سال تک قائم رہی اور آخر وجیانگر کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مدورا ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا گیا ہے۔

"گوری پالیم میں (جو مدورا کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے) اس میں ایک مسجد اس زمانے کی ہے جس کو مسلمان نہایت اہمیت دیتے ہیں اس کے احاطہ میں دو قبریں ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ سلطان علاء الدین اور اس کے بھائی شمس الدین کی ہے۔"

اس پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سلطان علاء الدین آیا جلال الدین احسن کا جانشین تھا یا کوئی اور جو کہ ناصر الدین کے بعد ہوا۔ نتروپاکن رام جو مدورا سے چار میل پر ہے پہاڑ پر ایک قبر ہے جس کو مسلمان سکندر ولی کی قبر بتاتے ہیں غالباً یہ اس کا آخری سلطان مدورا کا ہے۔" [5]

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ [2] تاریخ فیروز شاہی بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ص ۳۲۷ [3] تاریخ جنوبی ہند ص ۳۲۷ ایضاً
[4] ایضاً ص ۳۴۳ [5] ایضاً

راجگان وجیانگر میں بکا راجا کا دور اپنی وسعت و استحکام اور اپنی جنگی فتوحات کے لحاظ سے ایک نہایت روشن اور کامیاب دور رہا تھا جس نے اپنی جنگی قابلیت اور سیاسی تدبر کی بنا پر دو سو سال[1] کے لیے جنوبی ہند ہندوؤں کے لیے محفوظ کر دیا تھا اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو اب تک جو فتوحات حاصل ہوتی تھیں وہ سب جنوب کے چھوٹے چھوٹے ہندو راجاؤں پر تھیں۔ کسی بڑی زبردست زور آور اور جنگ آزما طاقت سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مدورا اور ملیبار (کنانور) مسلم حکومتیں تھیں مگر ان کی فوجی طاقت اور عددی قوت اس قدر کمتر تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا کے برابر تھا۔ وہ محفوظ اس وقت تک رہے جب تک دہلی سے ان کا رابطہ قائم رہا۔ اور جب ۱۳۳۶ء میں یہ رابطہ ٹوٹ گیا تو یہ ہندوؤں کے نرغے میں گھر کر رہ گئے کیونکہ دہلی اور دکن کی مسلم سلاطین تک ان کی رسائی دشوار اور ان کی طرف سے کسی قسم کی کمک کا حصول ناممکن ہو گیا تھا کہ ان کے درمیان وجیانگر کی سلطنت حائل ہو گئی تھی اس کے باوجود ان کی ہمت و استقلال قابل تحسین و آفرین ہے کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں نے تیس سال تک اپنے حریفوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے تیس سال کا عرصہ ان پر نہایت ابتلا اور کڑی آزمائشوں میں گزرا کسی وقت انھیں امن و سکون نصیب نہ ہو سکا ۱۳۴۲ء تک انھیں دو دشمنوں سے سابقہ رہا۔ ٹراونکور اور دوار سمندرم کے ہندو راجاؤں کی حکومتوں سے اور اس کے بعد تیس برس تک وجیانگر جیسی زبردست سلطنت سے نبرد آزما رہے لڑتے لڑتے کٹ گئے اور مٹ گئے لیکن سر خم نہیں کیا ان فتوحات سے سرشار بکا راجا نے دکن کے مسلمانوں سے جنگ چھیڑ دی اور یہ ایسی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے بری طرح بھگتنا پڑا اور جس کا نتیجہ اس کے لیے نہایت تباہ کن ثابت ہوا۔ مدورا اور ملیبار کی مثالیں اس کے سامنے تھیں کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں نے مسلسل تیس سال تک اس کا کس کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ وہ دکن کے مسلمانوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔

بہمنی سلطان محمد شاہ کے ساتھ گزشتہ جنگ میں جو سبق اس کو ملا تھا وہ بھی اسے یاد نہیں رہا تھا تاریخ کی اس واضح شہادت کو کون انکار کر سکتا ہے کہ محمد شاہ بہمنی کی فوج کی آمد کی خبر سن کر ہی ہندو فوج فرار ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کافور اور تغلق کی ہیبت ان کے دلوں میں تاہنوز رچ بس گئی تھی۔ سب سے آخری حملہ تغلق کا تھا اور وہ ترک تھا اور اس کے حملے نے اناگنڈی، دوار سمندرم اور مدورا جیسی سلطنتوں کو روند ڈالا تھا اس سے مسلمانوں کی ہیبت ہندوؤں کے دلوں میں اس قدر چھا گئی تھی کہ ہندو ترک کے نام سے لرز اٹھتے تھے اور اسی وجہ سے بقول تاریخ جنوبی ہند، "جنوبی

---

[1] تاریخ جنوبی ہند ص ۲۹۹

میں مسلمانوں کو ترک کہا جاتا ہے۔"

"ان اسلامی حملوں کا اثر جلد زائل ہونا ناممکن تھا اس لیے ہندو فوج باوجود اس کثرت کے محمد شاہ اور مجاہد کے نام سے گھبرا کر میدان چھوڑ کر فرار ہو گئی۔ یہاں سوال موقع کھونے کا نہیں بلکہ ہندوؤں کی ذہنیت کا تھا۔ بہر طور جنگ میں مجاہد سے شکست کھانے کے بعد بکاریا کا دل ٹوٹ گیا چنانچہ اس کے چھ ماہ بعد ہی یعنی ~~۱۳۸۰ء~~ ۱۳۷۹ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱؎

شدامہ وزارت پر

گوا کا راجہ گھلادیو دوم جب سومنا تھ کے سفر پر تھا تو اس کا جہاز ایک طوفان میں پھنس گیا اس کو ایک عرب محمود تاجر نے بر وقت پہنچ کر بچا لیا اس کی اس خدمت کے صلہ میں اس کا پوتا راجہ جے کشی نے اپنے دادا کی جان بچانے والے محمود تاجر کے بیٹے شدامہ کو اپنا وزیر بنا لیا تھا جس کے حسن انتظام نے گوا پوری کی راجدھانی کو ایک نئی زندگی اور خوبصورتی بخشی تھی۔ گوا کی مسلم بستی نجی گڈھ کی جامع مسجد اسی نے تعمیر کی تھی اس خطہ کی غالباً یہ پہلی عبادت گاہ تھی جس کی اذانیں تاریخ کے ایوانوں سے اب تک گونج رہی ہیں اس مسجد کے اخراجات کے لیے راجہ جے کیشی نے زمینیں دے دی تھیں۔

نواب معتبر خاں

معتبر خاں سرزمین کوکن کا پہلا نوایتی امیر تھا جو اپنی صلاحیتوں اور حوصلہ مندیوں کے سبب علو مرتبت کو پہونچا۔ ثروت و دولت نے اس کے قدم چومے اور ملکی فتوحات نے اس کی ناموری کے دروازے دلی تک کھول دیے جہاں کا بادشاہ عالمگیر کہا کرتا تھا۔ "مثل معتبر خاں نوکرے باشد" عالمگیر کو بھی اپنی خواجگی کا پاس تھا اس لیے اس کی سفارش پر کلیان کے نواح میں سلطان علی حجی کو ~~۱۹۰۵~~ ۱۱۱۵ھ بیادر ... کی قلعہ داری تفویض کی اور جود و ... الی حقوق دیے ... میں دو ... مقرر کیا۔

۱؎ تاریخ جلیل صفحہ ۲۶۔ ۲؎ بعض مورخین نے اس کا نام محمد لکھا ہے۔

علی جی غالباً معتبر خاں کی قرابت میں تھا۔ معتبر خاں کی سپہ گری کی ہیبت سے پرتگیزوں پر لرزہ طاری رہتا تھا۔ جو اسے "مغل آسیب" کہتے تھے نواب اپنے عہد کے حکمراں طبقے اور اہل ثروت و اقتدار کا ایسا نمائندہ تھا جو قرون وسطیٰ کی عمارت، تہذیب اور ثقافت کا معیاری نمونہ بھی تھا۔ جس کی تہذیب و شائستگی کا عکس جمیل اس کے تہذیبی و ثقافتی کارناموں اور یادگاروں سے جھلکتا تھا۔ کلیان میں دوبارہ توطن اختیار کیا تو اس کی بگڑی اداؤں کو سنوارنے کے لیے تعمیرات کا طویل سلسلہ شروع کیا۔ فن معماری کے شوق میں کیا عجب بے روزگاری کے اقتصادی تحفظ کا راز مضمر ہو۔ شہر پناہ تعمیر ہوئی تو ۴۲۱۲ گز طویل فصیل نے ستر ایکڑ رقبے کو محیط کرلیا۔ گیارہ مینارے سر اٹھا کر پاسبانی کرنے لگے اور چار بڑے دروازے آنے جانے والوں کی نگہبانی۔ ادھا دروازہ شالا تالاب کی طرف۔ باغ معتبر خاں سے متصل تھا۔ بندر دروازہ بحری راستے سے آنے والوں کا استقبال کرتا تھا۔ جس کے بالائی حصے پر واقع نوبت خانے میں پنج نوبت بجتی رہتی تھی۔ پنویل دروازہ اور دکن دروازہ جسے گنیش دروازہ بھی کہتے ہیں ان مقامات کی گذرگاہوں کی نشان دہی کرتے ہیں شہر پناہ کی تکمیل تعمیر ایک سنگی کتبے کی رو سے (جو اب نہ معلوم کہاں ہے) ۱۰۹۳ھ / ۱۶۹۲ء میں ہوئی۔ درگاڑی قلعہ فصیل سے باہر تھا جہاں ایک مقبرہ اور عید گاہ کا وجود اس خطہ ارضی میں مسلم اثرات کا ثبوت بنا ہوا تھا یہیں ایک مختصر سی مسجد بھی تھی جو مسلمان محافظ دستہ کی عبادت کے لیے وقف تھا (کیونکہ سپاہی اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے تھے)

فصیل کے اندر اور خندق کے اوپر نواب کا دیوان محل تھا جس کے پہلو میں ایک عالیشان حویلی بھی تھی۔ جو نواب کی فرودگاہ تھی اس سے متصل ایک کشادہ ایوان اور بارہ دری تھا جہاں بیٹھ کر نواب حاجت مندوں کے مسائل کی عقدہ کشائی کرتا تھا۔ سطوت و ثروت کی حسن عبودیت سے آہنگ کرنے کے لیے خان نے اس کے جوار میں مسجد بارگاہ تعمیر کرائی۔ ایک ایوان عام بھی تھا جس کے احاطہ میں ترکی حمام اور ایک باغ تھا اس کے درمیان ایک مسقف کے نیچے حوض اور ایک فوارہ تھا۔ ہر یا گاؤں میں نواب نے ایک قلعے کے علاوہ ایک ایوان عام بھی تعمیر کرایا تھا۔ جو عام تقریبات کے موقع پر استعمال ہوتا تھا۔ جب اس کی چھپن سالہ چہیتی بیگم کا انتقال ہوگیا تو معتبر خاں نے اس کی یادگار میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

(اور آج جب کہ وقت اور تاریخ کے جبر ون نے تمام عمارتوں کو ملبوہ میں تبدیل کردیا ہے اب بھی مسمار شدہ مدفن رہ گیا جو اپنے شکستہ وجود پر سسکیاں لیتا نظر آتا ہے) وہ شاہجہاں نہیں تھا اور نہ کسی ملک کا تاجدار اس کے وسائل شہنشاہ کے مقابلے میں بے حد حقیر تھے مگر تخیل اور حوصلے بلند تھے حسن آفریں ذہن رکھتا تھا اور محبت بھرا دل۔ لاکھوں روپے کی لاگت سے تاج تو نہیں بنا سکا مگر تراشیدہ سلوں کے سنگین سینوں میں محبت کے جذبات اس طرح کندہ کر کے بکھیر دیے کہ آج بھی اس شکستہ مزار کو دیکھ کر محبت کی آواز دال قدردل کا سنگین احساس ابھر آتا ہے۔ یہ مغل طرز تعمیر کا نادر نمونہ نظر آتا ہے جس پر

تاج محل کے محبت آفریں ماحول کا گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ مقبرہ باغ معتبر خاں کے وسیع احاطے میں تعمیر کیا گیا تھا جنوب میں ایک بڑے دروازے سے گذرتے ہی مقبرے کے سارے خطوط کھنچ کر سامنے آجاتے تھے ایک سبزہ پوش روش کا قطعہ سنرادی کی طرح باب الداخلہ اور مقبرہ کو ملاتا تھا۔ مقبرے کے مغربی پہلو میں ایک مختصر سی عبادت گاہ بھی تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک حوض اور ایک فوارہ تھا۔

باب الداخلہ پر ایک ایک مرمریں کتبے کی آیۃ کریمہ "ادخلی جنتی" مادہ تاریخ بنا ہے۔ گویہ مقبرہ بیگم معتبر خاں کی یادگار میں تعمیر کرایا گیا تھا لیکن اس نے بانی مقبرہ کے نام سے شہرت پائی۔

معتبر خاں کی شہرت اس کی جائداد املاک کی طرح کوکن اور دکن میں پھیلی ہوئی تھی۔ خجستہ بنیاد اورنگ آباد میں محلہ فاضل پورہ میں "حویلی معتبر خاں" کئی محل سراؤں پر مشتمل تھی ان میں دیوان خانہ، خلوت گاہ حمام اور شاگرد پیشہ کے علاوہ سواریوں کے لیے آخور بھی تھا۔ صحن میں چوب بانکوں کے سائبانوں تلے حوض تھے اسی طرح زیب و زینت کے لیے کھپریل کے جھجر دل کے نیچے فوارے نواب کے دولوں اور امنگوں کی طرح ابلتے رہتے تھے۔

نواب لاولد تھا اپنے رشتہ داروں میں سے ایک عزیز کو ابنیت میں لے لیا تھا۔"[1]

"اسی طرح گومنت کے ایک سلاہار راجہ کا مصاحب موسیٰ نام کا ایک عرب تھا۔"[2]

لاریس سلاہار راجہ انت پال دیو کا وزیر ایک عرب ابوالسعود تھا۔

---

[1] منقول از تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۱۳۳م تا ۲۴۴م بحوالہ تذکرہ حضرت دیوان شاہ

... ۳۸۰ ۔ [2] عرب و ... ۔

ہندو مسلم تعلقات

عرب مسلمانوں کا حسن اخلاق، معاملہ کی صفائی، ان کی سادگی، ان کا ہمدردانہ سلوک و برتاؤ، ان کی رواداری نے یہاں کے ہندؤں کے دلوں کو موہ لیا تھا چنانچہ اصطخری جو ۳۴۰ھ میں ہندستان آیا تھا لکھتا ہے:۔

"ملتان کا امیر ہاتھی پر سوار ہو کر جمعہ کی نماز کے لیے جامع مسجد جاتا تھا۔ یہ خالص ہندو راجاؤں کی شان و شکوہ سواری گویا عرب امیروں کو پسند آچکی تھی۔ پھر کہتا ہے "کہ ملتان کے لوگ پائجامہ پہنتے ہیں اور اکثر لوگ سندھی اور فارسی بولتے ہیں۔" غرض ہندو راجاؤں اور مسلمانوں میں لباس اور زبان کی یکسانی بھی پیدا ہو چکی تھی" لہ

ابن حوقل ۳۶۰ھ میں ہند آیا تھا اس زمانے کے ہندو مسلمانوں کے طرز لباس کے متعلق لکھتا ہے "یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہی طرح کا ہے۔ اور بالوں کو چھوڑنے کا بھی وہی ایک طریقہ ہے اور اسی طرح ملتان والوں کی وضع ہے اور منصورہ اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہے اور مکران والوں کی بولی فارسی اور مکرانی ہے اور کرتوں کا لباس نمایاں ہے مگر تاجر لوگ قمیص اور چادر استعمال کرتے ہیں جس طرح عراق اور فارس کے لوگ۔" ٹہ

۳۷۵ھ میں بشاری سیاح ہندستان آیا تھا۔ اس نے اس زمانے کے اخلاق و تمدن کا ایک بہت ہی اچھا نقشہ کھینچا ہے۔

"ملتان منصورہ سے چھوٹا ہے مگر اس سے زیادہ آباد ہے پھل گو زیادہ سستے نہیں مگر زیادہ نہیں اور عراق کی بندرگاہ سیراف کی طرح ساگ کی لکڑی کے کئی کئی منزل کے مکانات ہیں۔ یہاں بدکاری اور شراب خواری نہیں اور جو اس جرم میں پکڑے جاتے ہیں ان کو قتل کیا جاتا ہے یا کوئی سخت سزا دی جاتی ہے۔ خرید و فروخت میں نہ جھوٹ بولتے ہیں اور نہ کم تولتے ہیں۔ مسافروں کی خاطر کرتے ہیں۔ اکثر باشندے عرب ہیں۔ نہر کا پانی پیتے ہیں۔ سرسبزی اور دولت ہے۔ بیوپار کی حالت بہت

لہ سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ بحوالہ عرب و ہند ص ۳۲۱

ٹہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ بحوالہ عرب و ہند ص ۳۲۲

اچھاہے۔ تکلف اور تنعم نمایاں ہے۔ حکومت منصفانہ ہے۔ بازار میں کوئی عورت بناؤ سنگار کیے نہیں ملے گی اور نہ کوئی اس سے راستہ میں علانیہ بات کرتا ہے۔ پانی اچھا۔ زندگی عیش و مسرت کی۔ اور خوش دلی اور مروت ہے۔ فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔ تجارت کا نفع خاصہ ہے جسم میں تندرستی ہے۔ مکانات تنگ ہیں۔ ہوا خشک اور گرم ہے۔ رنگ گندم گوں اور سیاہ ہے۔"[1]

ایک گجراتی ہندو راجہ کا عدل وانصاف کا بے مثال نمونہ

چھٹی صدی ہجری میں دہلی میں سلطان شمس الدین التمش کے دور حکومت میں بخارا کا ایک فاضل محمد عوفی ہندستان آیا تھا اس نے ہندستان کی مختلف بندرگاہوں کی سیاحت کی تھی وہ اس سلسلہ میں کھمبایت میں پہونچا تھا۔ محمد عوفی نے۔ "در ذکر ملوک طوایف و احوال ایشاں" میں ایک عجیب و غریب واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کیسے اچھے اور خوش گوار تھے اور ہندو راجہ اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ کس طرح انصاف سے پیش آتے تھے۔ محمد عوفی کا یہ سفر ۶۲۵ھ سے پہلے ہوا تھا اور جو واقعہ اس نے لکھا ہے وہ یقیناً اس سے پہلے کا ہے۔ جب کہ گجرات میں اسلامی حکومت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل مولانا سید سلیمان ندوی اس طرح لکھتے ہیں۔

"محمد عوفی لکھتا ہے کہ مجھے ایک دفعہ کھمبایت جانے کا اتفاق ہوا جو سمندر کے کنارے ایک شہر ہے اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے۔ جو مسلمانوں کی خوب خاطر تواضع کرتے ہیں اور یہ شہر نہروالہ (احمد آباد) کے قریب کی سلطنت میں ہے اور یہاں کچھ مسلمان اور کچھ ان کے مخالفوں کی آبادی ہے میں جس زمانہ میں یہاں آیا ایک قصہ سنا جو نوشیرواں کے اوپر والے واقعہ سے ملتا جلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ راجہ جنک کے راج کے زمانہ میں یہاں ایک مسجد تھی اور جس میں منارہ تھا اور اس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیتے تھے پارسیوں نے ہندوؤں کو بھڑکایا مسلمانوں سے لڑا دیا۔ ہندوؤں نے منارہ توڑ دیا اور مسجد کو مع اسّی مسلمانوں کے تہ تیغ کر ڈالا۔ مسجد کا امام اور خطیب جس کا نام علی تھا۔ یہاں سے بھاگ کر نہروالہ چلا گیا اور وہاں جاکر راجہ کے درباریوں اور افسروں سے مل کر فریاد کی مگر کسی نے توجہ نہ کی۔ امام نے یہ حال دیکھ کر تدبیر یہ کی کہ ہندی (غالباً گجراتی) میں پورا واقعہ ایک قصیدہ میں نظم کیا اور خبر رکھی کہ راجہ شکار کو کب جاتا ہے؟ جب شکار کا دن آیا تو امام وہ قصیدہ لے کر راستہ میں ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا جب راجہ ادھر سے گذرا تو امام فریادی بن کر سامنے آگیا اور ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اس کا یہ قصیدہ

[1] احسن التقاسیم بشاری صفحہ ۱۹۸ بحوالہ عرب و ہند صفحہ ۳۳۲

سُن لیا جائے۔ راجہ نے ہاتھی روک کر اس کی منظوم عرضداشت سنی اور بہت متاثر ہوا اور قصیدے کو اس کے ہاتھ سے لے کر ایک اپنے مصیر کو دیا کہ فرصت کے وقت مجھے یہ پھر دکھایا جائے۔ راجہ اسی وقت شکار سے واپس آگیا اور وزیر کو بلوا کر کہا کہ میں تین دن تک محل میں رہوں گا اور آرام کروں گا اس تین دن کے اندر کسی کام کے لیے مجھے تکلیف نہ دینا۔ سب کام تم بطور خود انجام دینا۔ یہ کہہ کر راجہ محل میں چلا گیا اور رات کو ایک تیز سانڈنی میں بیٹھ کر تن تنہا کھمبایت کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہروالہ سے کھمبائت چالیس فرسنگ ہے مگر راجہ نے ایک دن رات میں اس راستہ کو طے کیا اور وہاں بھیس بدل کر ایک سوداگر کی صورت میں اترا اور گلی، کوچہ، بازار میں ہر جگہ پھر کر تحقیق کی اور راستہ چلتوں کی باتیں سنیں۔ ہر ایک کی زبان سے یہی سنا کہ بیچارے مسلمانوں کو بے گناہ مارا گیا اور ان پر بڑا ظلم ہوا راجہ ہر طرح واقعہ کی تحقیق کر کے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھر کر اور اس کا منہ بند کر کے اپنے ساتھ لیا اور پھر اسی طرح چوبیس گھنٹے میں سانڈنی پر اپنی راجدھانی کو واپس آگیا۔ صبح کو راجہ نے دربار منعقد کیا۔ مقدمات سنے اور اس سانحہ مسجد کے امام کو یاد کیا۔ جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو راجہ نے اس کو حکم دیا تم اپنی عرضداشت کو پڑھ کر سناؤ۔ امام نے جب اس کو پڑھا تو ہندو درباریوں نے کہا یہ مقدمہ جھوٹا ہے اور یہ دعوےٰ سرے سے غلط ہے۔ راجہ نے آبدار کے ہاتھ سے وہ لوٹا منگوایا اور سب کو اس کا تھوڑا تھوڑا پانی پلایا جس نے پیا وہ اس کو گھونٹ نہ سکا اور کہا یہ تو سمندر کا کھاری پانی ہے۔ راجہ نے کہا کہ مجھ کو اس معاملہ میں کسی دوسرے پر بھروسہ نہ تھا۔ کہ "اختلاف دین درمیان بود" کہ یہ مذہبی اختلاف کا معاملہ تھا۔ اسلیے میں نے خود جا کر اس کی تفتیش کی اور مجھ پر ثابت ہو گیا کہ یہ مسلمان بے شک مظلوم ہیں اور ان پر ظلم ہوا ہے میرے راج میں کسی جماعت پر جو میرے سایہ میں ہو ایسا ظلم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد حکم دیا۔ برہمنوں اور پارسیوں میں جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں دو دو کو سزا ایک دی جائے اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوترا (گجراتی سکہ) تاوان دلوایا تاکہ وہ اس سے وہ مسجد اور منارہ بنوالیں اور امام کو خلعت وانعام دیا۔ چنانچہ وہ مسجد بنی اور یہ انعامات اسی میں یادگار کے طور پر رکھے گئے۔ چنانچہ ہر سال عید کے دن ان کو نکال کر سب کو دکھایا جاتا ہے"

محمد عوفی آگے لکھتا ہے کہ :-

"آج تک ۶۲۵ھ سے وہاں یہ چیزیں رکھی ہیں اور وہ پرانی مسجد اور منارہ بھی باقی تھے"

مگر کچھ دن ہوئے بالو (بالوا) کی فوج نے گجرات پر حملہ کیا اور اس مسجد کو ویران کر دیا اب سعید بن عشرف نے (کسی عرب تاجر نے) اپنے سرمایہ سے اس کو دوبارہ بنوایا ہے اور اس کے چاروں

طرف چار سنہرے گنبد بنوائے ہیں اور اسلام کی یہ یادگار اس ہندو ملک میں آج تک قائم ہے"[1]

پنجاب یا سرحد کے ایک راجہ کا اسلام

بلاذری جو تیسری صدی ہجری میں (نویں صدی عیسوی) کے آخر کا مورخ ہے بیان کرتا ہے کہ کشمیر، کابل، ملتان کے بیچ میں ایک شہر عسیفان (آسیوان) نام تھا۔ "راجہ کا ایک لاڈلا بیٹا بہت سخت بیمار ہوا۔ راجہ نے مندر کے پجاریوں کو بلا کر کہا کہ اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ پجاریوں نے دوسرے دن آکر کہا کہ دعائیں مانگی گئیں اور دیوتاؤں نے اس کے جیتے رہنے دیے جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اتفاق یہ کہ وہ لڑکا اس کے تھوڑی دیر بعد مر گیا راجہ کو بہت سخت صدمہ ہوا اسی وقت جا کر مندر کو ڈھا دیا۔ پجاریوں کی گردنیں مار دیں پھر شہر میں جو مسلمان سوداگر تھے ان کو بلوا کر ان کے مذہب کا حال دریافت کیا انھوں نے اسلام کے عقائد بیان کیے راجہ مسلمان ہو گیا بلاذری کہتا ہے یہ واقعہ خلیفہ معتصم باللہ کے زمانے میں پیش آیا۔ معتصم باللہ کا زمانہ ۲۱۸ سے ۲۲۷ تک ہے"[2]

ہندو اور مسجد

عربوں کی رواداری کا اثر ہندوؤں پر بہت اچھا پڑا چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ایک مقام پر سے جب عربوں کی حکومت اٹھ گئی اور ہندو قابض ہو گئے تو انھوں نے مسلمانوں کی مسجد کو ہاتھ نہیں لگایا مسلمان برابر اس میں نماز پڑھتے جمعہ ادا کرتے اور جمعہ میں بدستور اپنے خلیفہ کا نام لیتے رہے"[3]

اس کے علاوہ چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح اصطخری اور ابن حوقل بیان کرتے ہیں کہ کھمبائت سے صیمور تک کے علاقے گو مختلف راجاؤں کی عملداری میں تھے۔ ہر جگہ مسلمان آباد ہیں اور ان کی مسجدیں ہیں جہاں مسلمان با جماعت نماز پڑھتے ہیں۔

عرب فاتحوں کے نزدیک ہندو مشابہ اہلِ کتاب تھے

سندھ کو فتح کرتے ہوئے جب عرب سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ کے مشہور شہر الوور (الور)

---

[1] محمد عوفی بحوالہ عرب و ہند تعلقات صفحہ ۲۵۵، ۲۴۶ ۔ [3] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۳۶

[2] فتوح البلدان بلاذری بحوالہ عرب و ہند تعلقات ۔

بہونچا تو شہر والوں نے کئی مہینہ تک حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ پھر صلح کی، اور دو شرطیں پیش کیں اول یہ کہ "شہر کا کوئی آدمی قتل نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بت خانوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ محمد بن قاسم جس وقت ان شرطوں کو قبول کیا تو یہ الفاظ کہے "ما البد الا کنائیس النصاریٰ والیھود وبیوت النیران المجوس"[1]

ترجمہ سندستان کا بت خانہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مجوس کے آتش کدوں ہی کی طرح ہے۔ سندھ کی سب سے قدیم عربی تاریخ کے عربی ترجمہ چچ نامہ میں واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

"محمد بن قاسم برہمن آباد (سندھ) کے لوگوں کی درخواست قبول کی اور ان کو اجازت دی کہ سندھ کی اس اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت سے رہیں جس حیثیت میں عراق اور شام کے یہودی، عیسائی اور پارسی رہتے ہیں"[2]

ایک عرب فاتح کی زبان کی یہ وہ اہم تصریح ہے کہ اس نے ہندوؤں کو وہی حیثیت دی جو بظن غالب کسی آسمانی تعلیم کے پیروؤں کی اسلامی قانون میں ہے اور ان کے بت خانوں کو بھی وہی درجہ دیا جو اہل کتاب یا مشابہ اہل کتاب کے معبدوں اور عبادت گاہوں کا اسلام میں ہے سندھ کے فتوحات کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ عرب فاتحوں نے اپنے شرائط کا پوری طرح لحاظ رکھا ایک بودھ مت کے پیرو نے ایک موقع پر ایک ہندو راجہ کو مشورہ دیا۔

"ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا فرمان ہے کہ جو امان چاہے اس کو امان دو اس لیے ہم کو یقین ہے کہ آپ اس کو مناسب سمجھیں گے کہ ہم اس سے صلح کرلیں کیونکہ عرب ایمان دار اور اپنے معاہدوں کے پابند ہیں"[3]

دیبل سندھ کا پہلا مقام ہے جہاں عربوں نے حملہ کیا وہاں سب سے بلند عمارت بودھوں کا بت خانہ تھا۔ محمد بن قاسم نے قلعہ والوں کو شہر کا دروازہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے بت خانے کے بلند منارہ پر جو سب سے اونچا اور باہر سے نظر آتا تھا توپ کا گولہ پھینکا۔ لیکن جب شہر کا پھاٹک کھل گیا تو اس بت خانہ کو برباد نہیں کیا۔ چنانچہ بودھوں کے فنا ہو جانے کے بعد بھی تیسری صدی ہجری تک یہ عمارت موجود تھی۔ خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں ۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ میں اس کا ایک

---

[1] بلاذری صفحہ ۴۳۹

[2] چچ نامہ تاریخ الیٹ صفحہ ۱۸۶

[3] چچ نامہ جلد اول صفحہ ۱۰۹ بحوالہ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۱۹۶

حصہ جیل خانے کے کام میں لایا گیا[۱]

محمد بن قاسم نے خود اس شہر میں اپنی مسجد الگ بنائی[۲]

اسی طرح جب نیرون فتح کیا تو مندر کے سامنے اپنی مسجد الگ قائم کی"[۳]

اسی طرح ملتان کے عظیم الشان شہر کے فتح ہونے کے بعد بھی اس کا بت خانہ صحیح و سالم رہا بلکہ عربوں کی تین سو برس کی حکومت میں بھی وہ بعینہٖ (ملتان کا بت خانہ) صحیح و سالم اور قائم رہا اور تین صدیوں تک برابر وہ عرب سیاحوں کی دلچسپیوں کا مرکز رہا۔ اخیر شخص جس نے اس کا حال بیان کیا ہے (بشاری) وہ ۳۷۵ھ کے قریب میں اس کو دیکھ گیا ہے۔

اہل عرب نے اس بت خانہ کے وجود سے سیاسی اور مالی دونوں فائدہ اٹھائے۔ سیاسی یہ کہ جب کوئی راجہ ملتان پر حملہ کی تیاری کرتا تو عرب امیر اس کو یہ کہہ کر ڈراتا کہ اگر تم نے ادھر کا قصد کیا تو ہم اس مندر کو خاک میں ملا دیں گے۔ یہ سن کر حملہ آور رک جاتے اور مالی فائدہ یہ اٹھایا کہ تمام ہندوستان سے اس مندر کے جاترے کو لوگ آتے تھے۔ اور وہاں جا کر نذر پیش کیا کرتے تھے۔ عرب امیر اس رقم کو خزانہ میں داخل کرتے تھے اور اسی سے اس مندر کے مصارف اور یہاں کے پجاریوں کی تنخواہیں ادا کرتے تھے[۴]

عرب کے سیاحوں نے ملتان کے اس بت خانہ کی پوری کیفیت بیان کی ہے۔ اس مندر میں افراط سے سونا چاندی تھی دور دور سے اشرفیوں کا عود یہاں جلانے کے لیے آتے تھے جن کو پجاری عرب تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔[۵]

یہ مجسمہ خود بھی اتنا ہی قیمتی تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں کی جگہ پر بیش قیمت پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس پر سونے کا تاج تھا[۶]

الغرض ۳۷۵ہجری کے قریب تک بت خانہ عرب امیروں کے زیر حکومت قائم رہا اور نہ صرف قائم بلکہ پوری رونق پر تھا۔ مگر جب ابوریحان بیرونی سنہ ۴۰۰ھ کے بعد یہاں آیا ہے تو اس نے اس کو بت خانہ کے بجائے جامع مسجد پایا اس تغیر کی وجہ اس نے یہ لکھی ہے۔ "محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تو اس کی آبادی اور دولت مندی کا سبب اسی بت خانہ کو پایا تو اس نے اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا اور اس کے گلے میں گائے کی ہڈی باندھ کر یہ ثابت کیا کہ دوسری وجہ بت کی تقدیس

---

۱ بلاذری صفحہ ۲۷ ۔ ۲ بلاذری ۔ ۳ چچ نامہ صفحہ ۲۰۸

۴ معجم البلدان یاقوت بحوالہ اصطخری جلد ۸ ص ۱۰۹ ۔ ۵ سفرنامہ ابوزید سیرافی صفحہ ۱۴۰

۶ سفرنامہ بشاری احسن التقاسیم صفحہ ۱۰۳

کی وجہ سے نہیں چھوڑ رہا ہے۔ اور اس نے مسلمانوں کے لیے جامع مسجد الگ بنائی پھر جب ملتان پر ملحد فرقہ (شیعہ لوگوں کا ایک گمراہ فرقہ) حکمراں ہو گئے تو جلیم بن شیبان نے اس بت خانہ کو توڑ دیا اور پجاریوں کو قتل کر دیا۔ اس کی عمارت کو جو اینٹ کی تھی اور اونچی جگہ پر تھی جامع مسجد بنایا۔ اور پہلی (محمد بن قاسم والی) جامع مسجد میں قفل لگا دیا کہ وہ بنی امیہ کی یادگار تھی اور ان سے ان کو دشمنی تھی۔ پھر جب سلطان محمود نے ملتان کو فتح کیا تو قرمطیوں کو مٹا دیا تو جامع مسجد کو بند کر کے محمد بن قاسم والی اصلی جامع مسجد کو کھلوا دی۔ اور اب اس بت خانہ کی جگہ صرف میدان ہے: لہ

اس سلسلہ کے تیسری صدی کے سیاح بلاذری نے ایک عجیب و غریب بات یہ لکھی ہے کہ "لوگ اس بت کو حضرت ایوب کا مجسمہ گمان کرتے ہیں"

حقوق و اعزاز

سندھ کے فتح ہونے کے بعد برہمنوں کا ایک وفد محمد بن قاسم کے پاس آیا۔ محمد بن قاسم نے اس کی عزت کی۔ برہمنوں نے اس کے سامنے اپنا یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہندو دستور کے مطابق ہمارا نوکری درجہ دوسری ذاتوں سے اونچا رکھا جائے۔ محمد بن قاسم تحقیق کے بعد ان کے اس مطالبہ کو پیش کیا اور ان کو تمام عہدوں پر سرفراز کیا۔ برہمنوں نے اس کا خاص شکریہ ادا کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اپنے حاکموں کے گن گائے اور جو حقوق ان کو ملے تھے اس کی ہر جگہ تعریفیں کیں۔ ۲ہ

جزیہ

جب امیر نے عام اعلان کرا دیا جو چاہے مسلمان ہو کر ہمارا بھائی بن جائے اور جو چاہے جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہے چنانچہ بعضوں نے اسلام قبول کر لیا اور بعض اپنے پرانے مذہب پر قائم رہے۔

چنانچہ چچ نامہ لکھتا ہے:۔

"ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ غلامی اور جزیہ وغیرہ سے آزاد رہے اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے تین درجے قائم کئے گئے۔ اعلیٰ طبقہ کے دولتمندوں سے ۴۸ درہم متوسط لوگوں سے ۲۴

لہ کتاب الہند بیرونی ۲ہ کتاب الہند بلاذری صفحہ ۴۴ ۳ہ چچ نامہ ایلیٹ بحوالہ عرب و سندھ صفحہ ۲۰۱

درہم اور نیچے کے طبقہ سے ۱۲ درہم لیے گئے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا وہ اس سے معاف کیے گئے اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے انھوں نے جزیہ دیا لیکن ان کی زمینیں اور جائدادیں ان سے نہیں لی گئیں بلکہ علی حالہا انھیں کے قبضہ میں رہنے دی گئیں[1]

اس کی تصریح میں عرب و ہند کے فاضل مؤلف لکھتے ہیں

"موجودہ حساب سے ایک درہم زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین آنہ کے برابر ہے اس لحاظ سے یہ محصول دولتمندوں سے دس روپے، متوسطوں سے پانچ روپے اور غریبوں سے ڈھائی روپیہ سالانہ کے حساب سے وصول ہوا ہوگا۔" اور حسب قاعدہ عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی عہدہ دار اور پجاری اور معذور لوگ جو کماتے نہیں اس سے مستثنیٰ رہے ہوں گے اور مسلمانوں سے جزیہ کے بجائے ڈھائی روپیہ سیکڑہ زکواۃ اور زمین کی پیداوار میں مسلمانوں سے دسواں حصہ اور غیر مسلمان سے خراج وصول کیا گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اہل عرب کے کسی سلطنت میں کوئی اور ٹیکس نہ تھا۔"[5]

ہندو مذہب کی تحقیق کا میلان

ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور آپس کے میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کو ہندوؤں کے مذہبی تحقیق کا شوق ابھر آیا۔ یحییٰ برمکی کے زمانہ میں جو ۱۷۰ھ سے ۱۹۰ھ تک تھا ایک قابل شخص کو خاص طور سے ہندستان اس لیے بھیجا گیا کہ وہ یہاں کے مذہبوں اور دوائیوں کی تحقیق کرے اور اس کی تفصیل لکھ لائے اس وقت بغداد میں عقلیت اور فلسفہ پسند امیروں کا زور تھا اور دنیا کے مختلف مذہبوں کا ایک اکھاڑہ بن گیا تھا ہفتہ میں ایک دن خاص طور پر مذہبی مباحثوں اور مناظروں کے لیے مقرر تھا جس میں شاہی دربار میں ایسی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں ہر مذہب والے کو اپنے اپنے مذہب کی دلیلیں پیش کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ یہاں تک مذہب اسلام پر اعتراض اٹھائے جاتے اور مدعیان اسلام کی طرف سے اس کے جوابات دیئے جاتے تھے ان مناظرانہ مجلسوں میں مسلمانوں کا متکلمین کا طبقہ بہت نمایاں رہتا تھا۔ کیونکہ برمکی خاندان انھیں کو پسند کرتے تھے۔ غالباً انھیں دنوں ہندو دھرم اور ان کے مذہب کی حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔

جو شخص ہندو مذہب کی تحقیق کے لیے ہندوستان آیا تھا اس تفصیل کا پتہ نہیں چلتا لیکن عرب و ہند کے تعلقات کے مؤلف نے ابن ندیم کے حوالہ سے جس نے اس واقعہ کے ستر اسّی سال کے بعد

---

[1] بلاذری ص ۴۳۹ [2] چچ نامہ تاریخ الہند ص ۱۵۲ [3] چچ نامہ جلد اول صفحہ ۱۰۹ بحوالہ عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۹۶

جو کتاب لکھی ہے اس میں وہ ایک تحریر کا حوالہ دیتا ہے جو مشہور عرب فلاسفر یعقوب بن اسحاق کندی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس پر ۲۴۹ھ کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ اس میں یحییٰ برمکی کے ایک شخص کو ہندوستان کے مذاہب کی تحقیق کی غرض سے ہندوستان بھیجے جانے کی خبر درج تھی اور اس پر "ہندوستان کے مذاہب اور اعتقادات" کا سرنامہ اور اس کے نیچے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ اسی شخص کی روداد کا خلاصہ ہے "

اس تحریر میں پہلے گجرات کے راجہ دلبھ رائے کے دارالسلطنت جہانگر کے بت خانہ کا حال لکھا ہے کہ اس میں سونے چاندی، لوہے، پیتل، ہاتھی، دانت اور ہر قسم کے بیش قیمت جواہرات کے بیس ہزار بت ہیں اور اس میں سونے کا ایک بت ۱۲ ہاتھ اونچا ہے اور وہ سونے کے تخت پر بیٹھا ہے۔ یہ تخت ایک سونے کے گنبد نما کمرے میں ہے یہ کمرہ سفید موتیوں اور سرخ، سفید، سبز، زرد اور آسمانی رنگ کے جواہرات سے مرصع ہے۔ سال میں ایک دفعہ اس کا میلہ ہوتا ہے راجہ خود پیادہ وہاں جاتا ہے اور آتا ہے اس کے آگے سال میں ایک دن قربانی کی جاتی ہے اور لوگ اپنی جان بھی اس پر قربان کرتے ہیں پھر موتستان (ملتان) کے بت کا حال لکھا ہے پھر دوسرے بتوں کا احوال ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے چند فرقوں اور ان کے بتوں کا حال بیان کیا ہے۔

۳۵۵ھ کے قریب البدء والتاریخ کا مولف مطہر جو ایک مورخ اور متکلم بھی تھا اس نے اپنی کتاب میں ہندوستان کے مذہبوں کے بارے میں کچھ تفصیلی حالات لکھے ہیں وہ لکھتا ہے:۔

"ہندوستان میں ۹۰۰ سو فرقے ہیں لیکن ان میں صرف ننانوے کا حال معلوم ہے اور یہ سب بیالیس مذہب کے اندر محدود ہیں اور ان کی اصل موٹی تقسیم دو ہے سمنی (بدھ) اور برہمنی۔ سمنی یا تو خدا کے قائل نہیں یا ایسے خدا کے قائل ہیں جو بے اختیار ہے۔

برہمنی مذہب والوں میں تین فرقے ہیں ایک توحید اور سزا اور جزا کے قائل ہیں مگر رسالت کا نہیں۔ دوسرا تناسخ کے اصول پر سزا وجزا کو مانتا ہے لیکن نہ توحید کا قائل ہے اور نہ رسالت کا۔" یہی مصنف ہندوستان کی اس وقت کی علمی حیثیت اور اس زمانہ کے مقدمات میں دعوؤں کی شہادت کے ان کے پرانے طریقوں کا ذکر کرتا ہوا آگے لکھتا ہے "

"مسلمان ان کے نزدیک ناپاک ہیں وہ ان کو اور جس چیز کو وہ چھو دیں اس کو نہیں چھوتے اور گائے ان کے نزدیک اس کی طرح معزز و محترم ہے اس کی جان لینے کی سزا ان کے یہاں قتل ہے اور غیر عورت سے ہمبستری کرنا بے بیوی والوں کے لیے ان کے یہاں جائز ہے تاکہ نسل گم نہ ہو جائے اور بیوی والا اگر یہ کام کرے تو اس کی سزا قتل ہے اور جب ان میں سے کوئی مسلمانوں کے ہاتھوں پڑ کر پھر ان کے ہاں واپس جاتا ہے تو اس کو مارتے نہیں بلکہ اس کے بدن کے تمام

بال مونڈھ کر اس کو پرانچت کرتے ہیں اور اس کا وہی طریقہ لکھا ہے جو اب بھی ہندوستان میں جاری ہے یعنی گائے کی چند چیزوں کو ملا کر پلانا، قرابت میں وہ نکاح نہیں کرتے۔ برہمنوں کے نزدیک شراب حرام ہے۔"[1]

پیغمبر اسلام کے ساتھ ایک ہندو راجہ کا احترام

منصور عباسی کے دور ۱۴۷ھ ہجری میں علوی سادات کے چند باہمت افراد نے علوی حکومت کے قیام کا ارادہ کیا تو سندھ میں بھی علویوں کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں لیکن کچھ اسباب ایسے پیش آئے جن سے یہ ساری کارروائی ابھر نہ سکیں اور دب کر رہ گئیں اور اس وقت ان سادات کے لیے ایک ایسی جگہ کی تلاش کی ضرورت پیش آئی جہاں انھیں پناہ مل سکے۔ اس وقت سادات کے ایک ہمدرد نے انھیں یہ نیک مشورہ دیا کہ آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں ایک راجہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی عزت کرتا ہے آپ لوگ اس کے ہاں چلے جائیں چنانچہ وہ چلے گئے۔ راجہ نے بڑے تزک و احتشام سے ان کا استقبال کیا اور وہ بڑے احترام سے وہاں رہنے لگے۔[2]

بہادر شاہ بیگڑا

گجرات کا بہادر شاہ بیگڑا ادھار کھائے بیٹھا تھا کیونکہ ۱۵۰۸ء میں پرتگیزوں نے تھانہ کے ہندو رائے کو شہ دے کر شاہ گجرات کے خلاف سرکشی پر آمادہ کر لیا تھا مگر بمبئی اور ورستی پر مظفر شاہی دھاک بیٹھ جانے سے تھانہ کا راجہ بھی چپکا بیٹھا رہا۔ پرتگیزوں کی سیاسی شرارت سے چڑھ کر شاہ گجرات نے کالی کٹ زمورن راجہ اور سلطان مصر سے معاہدہ کر لیا مصری جنگی بیڑے کے لیے دستک سے کوکن کے جنگلوں کے شہتیر مکہ معظمہ بھیجے جانے لگے اور جب بیڑا تیار ہو گیا تو ناصر منصور الغوری نے اس سال حسین کردی۔ حاکم جدہ کو امیر البحر بنا کر فرنگیوں کے خلاف بھیجا۔ گجراتی حکومت کا امیر البحر ملک ایاز جو ڈیو میں متعین تھا اپنے جنگی بیڑے کو لے کر نظام شاہی سلطنت کی واحد بندرگاہ چیول پہونچا۔ دیوال کا بحریہ بھی آن ملا۔ نظام الملک جو ایک معاہدہ کی رو سے پرتگیزوں

---

[1] البدایہ والتاریخ صفحہ ۹ - ۱۹ - جلد چہارم مسظہر۔ [2] ماخوذ از عرب و سندھ کے تعلقات صفحہ ۲۰۸ - ۲۰۹
[3] کامل ابن کثیر واقعات ۱۴۷ھ بحوالہ تاریخ عرب و ہند صفحہ ۲۱۶۔

کا دست تھا جب ساڑھے بیٹھا رہا حالانکہ ابھی ابھی پرتگیز غارت گر چیول بندرگاہ میں نوایطی تاجروں کے جہازوں سے گھوڑے اور مال غنیمت لوٹ کر گوا لوٹے تھے۔ جہاں انجدیو کے جزیرے میں گوا کا پہلا وائسرائے ڈوم فرانسس ڈالمیڈا مورچہ سنبھال چکا تھا بائیس جنگی جہازوں کے بیڑے اور پندرہ سو تربیت یافتہ بحری فوجوں کی طاقت پر اسے گھمنڈ تھا اور سب سے زیادہ ناز اپنے نوجوان جاں باز بیٹے ڈوم لارینسو ڈالمیڈا پر تھا جو کینیا نور اور چیول کی مہموں سے فتحیاب ہو کر آچکا تھا اور اب اس کا جنگی بیڑا چیول کے دہانے پر کھڑا اور اس کے سپاہی بندرگاہ میں مورچہ سنبھالے اتحادی بیڑوں کے منتظر تھے چیول کا تجارتی موسم آچکا تھا اور اندرون ملک سے بیوپاری اپنا تجارتی اسباب باربردار بیلوں پر لاد کر لا رہے تھے۔ بندرگاہ کی طرف سے جنگ کی خبریں آنے لگیں۔ چیول میں یہ ہندستان کی پہلی صلیبی جنگ تھی پانی میں آگ لگ چکی تھی۔ تین دن دھوئیں کے بادلوں نے جاڑے کے کہر آلود سورج کو اور دھندلا بنا دیا تھا اور دو رات سربلند مستولوں۔ ساگوانی تختوں ناریل کے بل کھاتے ہوئے رسوں اور اطلسی بادبانوں کے جلنے کی وجہ سے دور دور تک چراغاں ہوتا رہا۔ مگر مسلمانوں اور دشمنوں کے ہزاروں چراغ بجھ گئے۔ فرشتہ کا اندازہ ہے چار سو ترکوں نے جام شہادت نوش کیا اور چار ہزار فرنگی جہنم رسید ہوئے ان میں لارینسو بھی تھا جو جرأت و شجاعت کی اعلیٰ مثال قائم کر کے جنگ میں گرا۔ مگر پرتگیزی استعماریت کی بنیاد کھڑی کرتا گیا وہ اپنے ملک کا مایہ ناز فرزند شمار ہونے لگا۔

پرتگیزی رزمیہ ناموں کا وہ رستم بن گیا۔ پرتگیزوں کی یہ پہلی شکست تھی اور ہندستانی مسلمانوں کی پہلی اور غالباً آخری شاندار فتح اس فتح نے ہنگامی طور پر سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ دی۔ اس لیے کہ یہ نوآبادی نظام کی پہلی شکست تھی۔ ہر زبان میں امیر حسن کا نام تھا اور ملک ایاز کی تعریف تھی۔ جنھوں نے فرنگیوں کے دیو پیکر جہازوں کو نذر آتش کر دیا تھا۔ ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ مگر ڈوم فرانسس ڈالمیڈا کا بوڑھا دل اپنے بیٹے کی جواں مرگی سے ماتم کدہ بنا ہوا تھا وہ کئی دنوں تک سوگ مناتا رہا مگر بوڑھے فرانسس کا سوگوار دل اپنے بیٹے کی موت تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا گو افواہوں میں اس کا اقرار تھا دل نے نہ مانا تو ایک یوگی کو کھمبایت بھیجا جہاں پرتگیزی قیدی رکھے گئے تھے اس واسطے کہ شاید اس کا بیٹا ان کے ساتھ زنداں میں ابھی تک زندہ ہو مگر اس کا پتہ کسی کو نہ تھا۔ کف آلود لہروں نے اس کی لاش کو نہ جانے کس ٹھکانے لگا دیا تھا۔ [۱]

---

[۱] فرشتہ صفحہ ۵، مہاراشٹر پردیس گزیٹر (رتناگیری)، گزیٹر ضلع تھانہ وغیرہ بحوالہ تاریخ کوکن صفحہ ۲۴۶

بوڑھے فرانسس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جس کے شعلوں میں سارا مغربی ساحل جلنے لگا۔ سب سے پہلے دابھول پر فرنگیوں کا قہر ٹوٹا۔

دابھول ندی کے کنارے پہاڑی کے دامن میں آباد دابھول جس کے ارد گرد مغربی طرز کی حصار بندی تھی جس سے چھ میل دور رہتے ہوئے سمندر کی لہریں کنارے کی پانی سے مل کر بھرتی کے وقت سر ٹکراتی رہتی تھیں۔ بمبئی، مہاتم اور تھانہ کی طرح نوائطی سوداگروں کا شہر تھا۔ یہاں کھپریل کی پوشش والی شاندار حویلیاں قدیم عالیشان مسجدیں اور ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہیں تھیں۔ گھاٹ سے لے کر ندی کے کنارے دور تک خوبصورت پختہ مکانات پھیلے ہوئے تھے یہاں کے قلعہ میں چھ ہزار محافظ فوج رہتی تھی جس میں پانچ سو ترکوں کا دستہ تھا۔

سنہ ۱۵۷۱ء آخر میں دابھول میں جب کہ تجارت کا بازار گرم تھا مختلف ملکوں سے اسباب تجارت سے لدی ہوئی کشتیاں ندی کے کنارے دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ عرب سوداگر، مکہ، عدن سے اپنے تجارتی جہازوں سے اور ہرمز کے ایرانی تانبا، پارہ، چاندی اور زنگرف کے تھیلے اتار رہے تھے اور گھوڑوں کو ہنکا کر گھاٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔

ملباری مچھلی، موتی کپڑوں کے گٹھے، گیہوں اور سبزیوں کے لوڈ سے اور لوکر وانی جا رہے تھے ہر طرف زندگی ہی زندگی ابھر رہی تھی۔ عرض خوب چہل پہل تھی۔ اور خرید و فروخت کا بازار بھی بڑا ہی دگر ما گرمی تھی۔ نوابطی زرا اپنی خوبصورت سجی ہوئی کشتیوں میں بیٹھے سیر و سیاحت میں مزے لوٹ رہے تھے ایک طرف مسجد کے شمالی جانب ملحقہ حجروں میں مسلمان مسافر آپس میں چیول کی فتح پر اظہار خیال میں مصروف تھے تو دوسری طرف اعظم خاں پیر کی درگاہ میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں کہ فرنگیوں کی آمد کا شور اٹھا ان کی بے قرار نگاہوں نے فرنگی جہازوں کے بیڑے کو گھاٹ کی طرف حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور مٹھا تیرہ سو پرتگیزی اور چار سو ملباری فوجیوں نے شہر پناہ کو تین طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا اور آگے بڑھ کر مورچہ سنبھال لیا آگے کیا ہوا اس کی تفصیل ڈاکٹر مومن محی الدین قلم حقیقت رقم سے سن لیجئے۔

لکھتے ہیں :-

"محصورین کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کیا مگر گولے اتنے اونچے جا رہے تھے کہ پالا میں آگ لگ رہی تھی محصورین فصیل کے نیچے پہونچ کر لاشوں کو پشتوں سے ایک دوسرا حصار بنا چکے تھے۔ محافظ فوجی اب خود محفوظ نہ تھے مردوں کی فصلیں کٹ کر فصیلیں بن گئیں برہنہ تنگی ہو کر ناچنے لگی۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو مسجدوں میں بھی پناہ نہ ملی۔ انتقام کے زہر

زہر میں بجھی ہوئی تلواریں لوائطیوں کے خون سے پیاس بجھا رہی تھیں اور جب لاشوں سے گلیاں بھر گئے تو آگ لگا دی گئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر جل کر خاکستر بن گیا۔ پرتگیزی درندگی اور بہیمیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ برسوں تک بد دعا دیتے وقت یہی کہاوت کہتے تھے کہ " خدا کرے فرنگیوں کا قہر تم پر لوٹے ایسا ہی ٹوٹے جیسا کہ داجھول پر نازل ہوا تھا[لہ]

مصطفیٰ خاں عادل خانی صوبیدار داجھول کے تباہ شدہ ویرانے سے دور سنگمیشور کو اپنا صدر مقام بنالیا اور اس دروں اور کھاؤں سے آباد مقام میں ایک نیا شہر بنالیا۔ ۱۵۱۳ء میں جب باربوسا یہاں سنگمیشور آیا تو یہ عادل شاہی مملکت عادل آباد ترقی پر تھا۔ یہاں دکن اور ملیبار سے تجارت ہوتی تھی اور دیبو، عدن اور ہرمز کی کشتیاں ٹھہرتی تھیں۔ سنگمیشور میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم ہو چکا تھا اس سے قریب جے گڈھ ابھی تک قزاقوں کا گڈھ بنا ہوا تھا۔ لیکن سنگمیشور اور باندہ کی تجارتی ترقی سے داجھول کی رونق کچھ متاثر نہ ہوئی اور وہ اجڑ اجڑ کر آباد ہوتی رہی ۔

داجھول ۱۵۷۰ء تک پرتگیزی غارت گروں کا مشق ظلم و ستم رہا۔ لیکن نوائطی تاجروں اور ہندوؤں اور بنیا بیوپاریوں نے اس کی تجارتی آن و شان کو بدستور قائم رکھا اور اس کی بندرگاہ پر دنیا بھر کے لوگوں کے ہجوم سے اس کی رونق اور ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۵۲۷ء میں اس کی مسلم آبادی چار ہزار کی تھی ۔

اب پرتگیزوں کا رخ گجرات کی طرف تھا جن کے خیال میں شاہ گجرات ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ داجھول کی تباہی کے ایک ہفتہ بعد بوڑھے فرانسس کا بیڑہ بمبئی کی کھاڑی کی بندرگاہ (باندرہ) سامان رسد لوٹنے کے لیے پہونچا۔ راستے میں ایک گجراتی بیڑہ کو لوٹ کر بھی اس کی ہل من مزید کی آگ نہ بجھی ۔

ماہم ۔ کا راجہ رانے ان کی آمد کی خبر سن کر ہی ڈالا کی پہاڑیوں کی طرف فرار ہوا اور تعاقب سے اپنی جان بچانے کے لیے چاول کے بورے اور بکریاں پرتگیزی بھیڑیوں کی نذر کیا اور وہ اس سے شکم سیر ہو کر آگے بڑھے ۔ راستے میں بمبئی پڑتا تھا اور وہ اب تک ان کے حملوں سے محفوظ رہا تھا۔ اس حسین شہر میں پرتگالیوں کے دشمن اہل نوائط ایک بڑی تعداد میں آباد تھے اور اپنی تجارت کی بدولت خوشحال زندگی گذار رہے تھے۔ یہاں مختلف ملکوں کی کشتیاں آکر ٹھہرتی تھیں۔ ملیباری بگلے اور بوتیں یہاں گرم مسالے کی تجارت کے لیے آتے رہتے تھے

اس وقت اس پر مظفر شاہی اقتدار تھا۔

۱۵۰۹ء میں فرانسس دیو بیر پہنچا ملک ایاز کے ساتھ اس کا جو معاہدہ ہوا اس نے ملک ایاز کی حکومت کو اس کی ماتحتی پر مجبور کر دیا۔ نظام الملک کو اپنے ان سارے ہنگاموں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کی پاداش میں اسے بھی پرتگال کا باجگذار بننا پڑا۔

۱۵۱۶ء گوا کے نئے وائسرائے توبو سوارس برہان نظام شاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھا کر ایک تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح نوآبادیاتی نظام کا پہلا سنگ بنیاد سرزمین کوکن میں رکھا گیا۔ چنول جس کو اب پرتگیزی چاؤل کہنے لگے تھے۔ فرنگی نوآبادکاروں سے آباد ہو گیا بندرگاہ چاؤل کا اقتدار حاصل ہوتے ہی پرتگیزوں کو اپنی تجارت کو آزادی کے ساتھ فروغ دینے کی خاطر خواہ وسائل حاصل ہو گئے۔ اور اسی بندرگاہ کے حصول سے پرتگیزی استعماریت کے لیے بڑی تقویت کا باعث بن گئے۔ تجارتی، سیاسی اور مذہبی مفادات ان کے ہاتھ آ گئے۔

جنوبی ہند میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد

(آغاز اور عروج و زوال)

تیرہویں صدی عیسوی کے خاتمہ اور چودھویں صدی کا آغاز ہند کی تاریخ میں ایک نیا انقلاب مسلمانوں کی سیاسی حیثیت سے ہندوستان میں آنے اور ان کے فاتحانہ حملے سے ہوتا ہے گزشتہ صفحات میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ جنوبی ہند کے مختلف مقامات میں عربوں کی آمد کا سلسلہ قائم تھا اور مسلم عرب تاجر ایک مدت سے یہاں آ کر بسنے لگے تھے۔ لیکن انھیں کوئی سیاسی استحکام حاصل نہیں تھا لیکن اب سلطان علاء الدین خلجی کے حملے کے بعد انھیں کچھ سیاسی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ عرب مسلمان یہاں وقتاً فوقتاً آتے رہے اور رفتہ رفتہ جنوبی ہند کے مختلف شہروں میں پھیلتے چلے گئے۔ اور سلطان علاء الدین خلجی کے پہلے حملہ سے بیشتر یہاں عربوں کی اچھی خاصی آبادی قائم ہو چکی تھی۔

چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

اہل عرب کو اسلام قبول کرنے کے بعد قدرتی طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ کا خیال پیدا ہوا چنانچہ ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ایک مہم بھیجی لیکن ان مہموں کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا حملہ جو ہندوستان کی تاریخ میں بلحاظ کامیابی پہلا حملہ کہا جاتا ہے وہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے میں ہوا۔ اس فوج کی کمان

حجاج کے بھتیجے محمد بن قاسم کے ہاتھوں یہ بھی مسلمانوں کا یہ حملہ واقعی ایک کامیاب حملہ تھا جس کے نتیجے کے طور پر تمام ملک سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا لیکن حجاج کی وفات پر محمد بن قاسم کو دمشق بلالیا گیا اور فتوحات رک گئیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ان فتوحات کا رک جانا ایک نقصان عظیم تھا اگر یہ فتوحات جاری رہتیں تو یقیناً آج ہندستان کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ بنو امیہ کے بعد بنی عباس نے بھی ہندستان پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ پھر جو کامیاب حملہ ہندستان پر ہوا وہ سلطان محمود غزنوی کا حملہ تھا اس نے پنجاب یعنی ہندوستان کے دروازہ پر قبضہ کرلیا۔ غزنی خاندان کے بعد غوری خاندان نے ان فتوحات کو اور وسیع کردیا۔ دہلی۔ اجمیر اور قنوج کی راجدھانیاں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں۔

غوری خاندان کے بعد خاندان غلاماں برسر حکومت ہوا۔ اور دہلی پایہ تخت بنی اس طرح اب مسلمان بجائے افغانستان میں بیٹھے ہوئے حکومت کرنے کے اب خاص ہندستان میں آکر ہندستانی بن گئے اور ان کی فتوحات روز بروز وسیع ہوتی رہیں۔ خاندان غلامان کی حکومت کم و بیش ۸۰ سال تک رہی۔ اس کے بعد خلجی خاندان نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر فوج کشی کی۔ اس حملہ کا حال مورخ ہیگ نے اپنی کتاب "ہسٹارک لینڈ مارکس آف دی دکن" اس طرح لکھا ہے۔ HISTORIES LAND MARK OF THE DECCAN. اسلامی فوج کی کمان سلطان جلال الدین فیروز کے بھتیجے علاء الدین خلجی کے قبضہ میں تھی۔

علاء الدین اس وقت کڑہ کا گورنر تھا۔ جلال آباد سے ۴۲ میل شمال مشرق دریائے گنگا پر واقع ہے شہر بھلیسا کی فتح کے وقت اس نے دیوگیری کی شان و شوکت اور یہاں کی دولت و خزائن کا حال سنا۔ اس نے اسی وقت ارادہ کرلیا کہ اپنی فتوحات کو جنوب کی طرف وسیع کرے۔ کڑہ (مانک پور) آکر علاء الدین خلجی فوج کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اور جس وقت تیاری مکمل ہوچکی تو ۱۲۹۴ء میں کڑہ سے نکل کر جنوب میں چندیری ہوتا ہوا ایلچ پور پہنچا جو موجودہ وقت میں ضلع برار میں ہے اس کے سپاہیوں اور افسروں تک کو معلوم نہیں تھا کہ علاء الدین کس مقصد اور کس ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایلچ پور پہنچ کر علاء الدین نے فوج کو آرام دیا۔ اور یہاں مشہور کردیا کہ وہ سلطنت دہلی کا ایک افسر ہے اور شہنشاہ سے ناراض ہوکر جنوب میں تلنگانہ کے راجہ کے پاس ملازمت کے لیے جارہا ہے۔ چند دن ستانے کے بعد یکایک شب میں علاء الدین نے اپنی فوج کو ایلچ پور چھوڑ کر جنوب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دیوگری سے بارہ میل کے فاصلہ پر مقام لہسورہ پر آکر ٹھہرا جس وقت

جس وقت یہ خبر دیوگری میں پہونچی تو راجہ رام دیو نے مدافعت کے خیال سے ایک فوج بھیجدی جس کو علاء الدین نے آسانی سے شکست دی اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے دیوگیری کا محاصرہ کرلیا۔ اس نے یہاں مشہور کردیا کہ شہنشاہ دہلی کی فوج پیچھے پیچھے آرہی ہے اور جو فوج اس کی کمان میں ہے صرف ایک ہراولی دستہ ہے اس خبر سے گھبرا کر راجہ نے صلح کرلی۔ راجہ نے علاء الدین کو پچاس من سونا ایک من موتی چالیس ہاتھی اور گھوڑے دینا قبول کرلیا۔ علاء الدین نے اس کو غنیمت سمجھا اس وقت اس کو یہ احساس ہوا تھا کہ وہ کس خطرے میں ہے۔ دیوگیری میں جو ہندو فوج تھی وہ کچھ تھوڑی سی تھی۔ فوج کا بڑا حصہ کسی اور جنگ میں مصروف تھا اگر وہ فوج واپس آجائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ اگر وہ واپس ہونا بھی چاہے تو خاندیس۔ مالوہ اور گونڈواڑا کی ہندو سلطنتیں ان کا راستہ روک دیں گی۔ صلح کی شرائط ابھی طے ہو رہی تھیں کہ بیچ بیچ دیوگیری کی فوج اپنی مغربی سرحد سے واپس آگئی۔ راجہ کا بیٹا اس فوج کی کمان خود کر رہا تھا۔ راجہ نے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ صلح ہو چکی ہے اس لیے مسلمانوں پر حملہ نہ کیا جائے۔ لیکن شنکر دیو نے جس کی فوج اس سے کئی حصہ بڑھ کر تھی علاء الدین کو کہلا بھیجا کہ اب تک جو کچھ حاصل کیا گیا ہے چھوڑ کر واپس ہو جائے۔ علاء الدین نے اس کو اپنی توہین سمجھی اس نے دیوگیری کے محاصرہ پر ایک ہزار فوج چھوڑ کر باقی فوج سے شنکر دیو پر حملہ آور ہوا۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ جنگ میں ہندو فوج کو بری طرح شکست ہوئی اور شنکر دیو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ علاء الدین نے پلٹ کر دیوگیری کا سختی کے ساتھ محاصرہ کرلیا۔

رام دیو اس تمام عرصہ میں امید وبیم کی حالت میں بسر کر رہا تھا مگر شنکر دیو کی شکست کا حال سن کر اس کی ہمت پست ہوگئی اور نئے سرے سے صلح کا طالب ہوا۔ علاء الدین نے اب شرائط صلح کو ذرا سخت کردیا۔ وہ خیر بڑی مشکل سے صلح کی شرائط طے ہوئیں۔ راجہ نے علاء الدین کو چھ سو من سونا سات من موتی، دو من ہیرے جواہر، ایک ہزار من چاندی چار سو تھان ریشم اسی وقت دے دیا اور آئندہ کے لیے ہر سال ایلچ پور کے محاصل بطور خراج دینا منظور کرلیا۔

علاء الدین خلجی نے اپنی جانب سے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کی فوج جو پیچھے آرہی ہے وہ دیوگیری پر حملہ نہیں کرے گی۔ محاصرہ اٹھا کر علاء الدین واپس پلٹ گیا لیکن اس کے اس حملے نے جنوبی ہند پر مسلمانوں کے آئندہ حملوں کی بنیاد رکھ دی۔"

اس طرح یہ جنوب کی جانب مسلمانوں کا اولین فاتحانہ اقدام تھا۔

جنوب کی طرف دوسرا حملہ

دیوگیری کا راجہ کم وبیش بارہ سال تک اپنے عہد کے مطابق خراج دہلی کو ادا کرتا رہا تھا اس کے

بعد اس نے اس کو روک لیا یہ وہ زمانہ تھا کہ علاءالدین اب گورنر نہیں بلکہ دہلی کا بادشاہ بن چکا تھا اور اس کو امور سلطنت پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ ہر چیز اس کی نظر میں رہتی تھی۔

جب دیوگیری کا خراج بند ہوا تو اس کی سرکوبی کے لیے ملک کافور کو بھیجا۔ ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں جنگ ہوئی اور اب بھی رام دیو کو شکست ہوئی۔ ملک کافور نے راجہ کو قید کر کے دہلی بھیج دیا جہاں سلطان اس کے ساتھ نہایت قدر و عزت اور حسن سلوک سے پیش آیا اور انتہائی لطف مدارات سے کام لیتے ہوئے اس کی ریاست اس کو عطا کر دی اور بقول مورخ فرشتہ بادشاہ نے رام دیو کو رائے رایاں کے خطاب سے بھی نوازا اور سفید چتر بر کرنے کی اجازت بھی دی اور انہیں عنایات شاہی کی بدولت رام دیو تا زندگی یار وفادار رہا اور اس کا ایک واضح نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند پر آئندہ حملوں کے لیے دیوگیری مسلمانوں کا اپنے موقع کا ایک اچھا اڈہ بن گیا۔

جنوب کی طرف تیسرا حملہ

گذشتہ جنگ کے دو سال بعد ۱۳۰۹ء میں ملک کافور سلطان علاءالدین کے حکم سے تلنگانہ کی فتح کے لیے دوسری بار پھر دکن آیا۔ اس وقت دیوگیری کا راجہ رام دیو نے بھی مسلمانوں کی حمایت کی ملک کافور نے اندور (نظام آباد) پر قبضہ کر کے ورنگل پر چڑھائی کی اور اس کا محاصرہ کر دیا گیا قریب تھا کہ ورنگل فتح ہو جاتا لیکن ملک کافور کو سلطان کی طرف سے جو ہدایتیں تھیں ان میں ایک یہ کہ جو راجہ اطاعت قبول کرے تو صلح کر لی جائے اس لیے حسب ہدایت رودر دیو نے صلح کی درخواست کی اور اس کے ساتھ بہت سا زر و جواہر ایک سو ہاتھی اور سات ہزار گھوڑے لے کر دہلی واپس آیا۔

دکن میں دوسرے حملے کے محرک اسباب میں مورخین ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ ہے دیول دیوی کا واقعہ جس کو ہم مورخ ہیگ کی کتاب سے نقل کرتے ہیں۔ مورخ ہیگ لکھتا ہے۔

"علاءالدین نے جس وقت گجرات پر چڑھائی کی تھی تو وہاں کے راجہ رائے کرن کی خوبصورت رانی کملا دیوی اس کے ہاتھ آگئی تھی رانی نے اپنی خوشی سے دہلی کے شاہی محلات میں بطور حرم رہنا منظور کر لیا لیکن اس کو اپنی بیٹیوں کی یاد ہمیشہ مغموم رکھتی تھی۔ ایک تو فوت ہو چکی تھی اور دوسری جس کا نام دیول دیوی تھا اپنے باپ رائے کرن کے پاس گجرات میں تھی۔ اس لڑکی کی منگنی دیوگیری کے راجہ رام دیو کے بیٹے شنکر دیو سے ہونے والی تھی۔ شنکر دیو مرہٹہ تھا اور رائے کرن

ایک اور ذات کا ہندو۔ وہ اس شادی کا اس لیے مخالف تھا کہ اس بیرا اور مرہٹوں میں شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن دیوگیری والوں نے جنگ میں یہ شرط بہ جبر منوائی تھی۔

علاء الدین نے رائے کرن کو لکھا کہ دیول دیوی کو دہلی بھیج دیا جائے جب یہ فرمان گجرات میں پہونچا تو رائے کرن بھی مناسب سمجھا کہ بیٹی کو مسلمانوں کے حوالے کرنے سے بہتر یہ ہے کہ مرہٹوں کو دے دی جائے۔ اس نے بیٹی کو دیوگیری بھیجدیا لیکن یہ ابھی راستے ہی میں تھی کہ علاء الدین کے سپہ سالار الغ خاں نے گجرات پر حملہ کر دیا رائے کرن کو شکست ہوئی لیکن محلات میں دیول دیوی کا پتہ نہیں ملا۔ اتفاقاً ایک دن جب اسلامی فوج دریائے گوجا کے کنارے کیمپ ڈالے ہوئے تھی تو چند سپاہی غار ہائے ایلورہ دیکھنے کے لیے نکلے۔ ان غاروں کے قریب میدانوں میں جب وہ پھر رہے تھے تو انھیں ایک مختصر سی ہندو فوج نظر آئی۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ دیوگیری کی فوج رائے کرن کی مدد کو آرہی ہے اس لیے انھوں نے مجتمع ہو کر اس فوج پر حملہ کر دیا۔ ہندوؤں کی شکست ہوئی اور وہ گھوڑا جس پر دیول دیوی سوار تھی زخمی ہو کر بیٹھ گیا اس وقت مسلمان سپاہی مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے بڑھے۔ محافظوں نے کہا کہ یہ راجہ رائے کرن کی بیٹی ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ انھوں نے دیول دیوی کو الغ خاں کے پاس پہونچا دیا جہاں سے وہ دہلی پہونچا دی گئی اور وہیں اس کی شادی خضر خاں سے ہوگئی۔" لہ

اس لحاظ سے جنوب کی طرف یہ پہلا فاتحانہ قدم تھا۔

جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ سنہ ۱۳۱۱ء

دکن پر تیسرے حملے کے ایک سال بعد سلطان علاء الدین خلجی نے ملک کافور کو جنوبی ہند پر حملہ کرنے کا حکم دیا اس حملے کے علل و اسباب وغیرہ پر مورخین نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"اس زمانے میں سرحد کابل سے لے کر انتہائے بنگالہ تک اور گجرات اور دکن کے سب قلعے و صوبجات بادشاہ علاء الدین کے زیر فرمان رہے اور تمام رجواڑوں میں بھی اس کا سکہ اور خطبہ رائج ہوا۔ کہیں دس بیگھہ ایسی زمین نہ تھی جہاں اس کا حکم نافذ نہ ہو۔ تب اس نے چاہا کہ راس کماری، حدود دوار سمندر، سواحل ہند و لنکا کو مسخر کرے لہذا ملک نائب و حاجی خواجہ کو منتخب کیا

لہ کتاب بیگ صفحہ ۲۲ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۶۵

لشکر عظیم کے ساتھ روانہ فرمایا اور مشہور تھا کہ وہاں کے بت خانے زر و جواہر نفیسہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب پردھان دیوگڈھ پہونچے تو معلوم ہوا کہ رام دیو کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے بیٹے کو باپ کے مواثیق مخلص نہ پایا۔ لہذا ایک سردار کو مع فوج حاضرہ کے قریب جو دکن کی گنگا کے کنارے واقع ہے چھوڑ کر آگے بڑھتے اور کفار کندہ کے قتل میں زیادہ اہتمام کیا اور اس ہیبت و سیاست سے تین ماہ بعد ان مقامات میں پہونچے اور وہاں راجہ کرناٹک کو گرفتار کر کے تمام ولایت کو غارت کیا اور بت خانوں کو توڑ کر مرصع بتوں پر قبضہ کر لیا اور آخر میں ایک مسجد مختصر سی بنائی اور وہاں خطبہ سلطان علاء الدین کا پڑھا۔ وہ مسجد دابشر ابد مستور باقی ہے اور اس کو مسجد علائی کہتے ہیں۔"

ملک نائب نے سب احوال با تحریر دیدہ اور معبر کی طرف کوچ کیا جو لنکا کا پل مشہور ہے اور وہاں سے بعض ہزار دل بہر سا کے توڑنے لیے اور صحیح سلامت کوچ پر کوچ روانہ ہو کر سنہ ۷۱۱ھ میں دہلی پہونچا اور تین سو بارہ ہاتھی اور بیس ہزار گھوڑے اور دو کروڑ اشرفیاں طلائی صندوق اور موتی و جواہرات کے صندوق جو شمار سے باہر تھے ہزار ستون کے سامنے بادشاہ کے روبرو پیش کیے۔" [۱]

مورخین نے ملک نائب کے فتوحات کے ذکر میں سوائے طلا کے چاندی کا ذکر نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں اس قدر سونے کی کثرت تھی کہ چاندی شمار میں نہ لاتے تھے۔ اور اس زمانے میں بھی وہاں کا چلن اکثر سونے کے عوض ہے اور وہاں کے فقیروں کو چاندی کے زیور سے شرم آتی ہے۔ مالداروں کا کیا ذکر۔ وہاں کے اوسط درجہ والے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔" [۲]

امیر خسرو کی تاریخ علائی میں کچھ زیادہ تفصیل ہے لیکن وہ بھی بہت کچھ تشنہ ہے امیر خسرو لکھتے ہیں کہ :-

"دیوگیری اور ورنگل کی فتوحات کے بعد ہندستان میں صرف دو سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں ایک دوار سمندر کی اور دوسری معبر کی۔ ملک کافور اب انھیں فتح کرنے کے لیے نکلا ۲۴ جمادی الآخر ۷۱۰ھ میں فوج دہلی سے نکلی جب ملک کافور اب انھیں بانڈری (برندھابور) میں مقیم تھا اس کو اطلاع ملی کہ معبر میں دو بھائی ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تخت کے لیے لڑ رہے ہیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دوار سمندر کا راجہ بلال دیو سوم ان کے ملک پر حملہ آور ہوا ہے لیکن مسلمانوں کے ہونے والے حملہ کا حال سن کر اپنے پایہ تخت واپس ہوا ہے۔ انواد ۲۲ ر

---

[۱] تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۱۷ مطبوعہ نول کشور ایضاً تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۶۹ ۔ [۲] ایضاً ایضاً

رمضان المبارک کے دن ملک کافور نے امرائے فوج سے مشورہ کیا اور سوار فوج کا ایک منتخب دستہ لے کر بارہ دن کی مسافت کے بعد دوار سمندر کے آگے پہونچا یہاں اس نے راجہ کے سامنے تین شرطیں پیش کیں۔

۱۔ اسلام قبول کیا جائے یا (۲) ذمی بن کر جزیہ دینا قبول کرے۔ یا (۳) جنگ پر آمادہ ہو جائے۔

حالات کا اندازہ کرتے ہوئے راجہ ہلال دیو سوم نے صلح کرنی چاہی اگرچہ کہ راجہ ویرپانڈیا اس کی تائید کے لیے فوج بھیجدی تھی صلح ہوگئی۔ راجہ نے اپنا تمام خزانہ، ہاتھی اور گھوڑے ملک کافور کی نذر کر دیا۔ ملک کافور نے اس نذرانے کے ساتھ ہلال دیو کو بھی شہنشاہ کے پاس بھیجدیا۔

اس پر جنوبی ہند کا مصنف محمود لکھتا ہے۔

"ان تحریروں سے ظاہر ہے کہ امیر خسرو اور فرشتہ نے اسباب و علل کو چھوڑ کر صرف نتائج کو قلمبند کر دیا ہے اور انھیں روایات کو لے کر عام طور پر انگریزی مورخین نے لکھا ہے کہ :۔

"اس حملے کا سبب بھی وہی ہے جو پہلے حملوں کا تھا مسلمانوں کو مال و زر اور ہاتھیوں کی ضرورت تھی جو معبر یعنی جنوبی ہند میں کثرت سے تھے۔

چنانچہ رئیس اپنی تاریخ میسور میں لکھتا ہے۔

" ۱۳۱۰ء میں علاء الدین کے جنرل ملک کافور نے ہوئے سالا کی اس مملکت پر حملہ کیا جس کا پایہ تخت دوار سمندرم میں تھا ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد بلالا سوم کو شکست ہوئی اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوا فاتحین نے دوار سمندرم کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ دشمن کے ہاتھ بے شمار زر و جواہر ہاتھ آئے۔ ملک کافور نے اس فتح کے بعد جنوب میں مدورا کو فتح کر لیا۔ اور یہاں سے رامیسورم تک بڑھا جہاں اس نے ایک مسجد تعمیر کی۔

لیکن وہان اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"جنوبی ہند میں اس وقت قابل ذکر دو سلطنتیں تھیں جن میں ایک میسور کی ہوئے سالا حکومت تھی جس کا پایہ تخت دوار سمندرم تھا اور دوسری مدورا کی پانڈیا حکومت تھی۔ ہوئے سالا حکومت دریائے کرشنا سے نیچے ملبار تک اور بحیرہ عرب سے لے کر ساحل کارومنڈل تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں پانڈیا خاندان تمام ملک کرناٹک پر راس کماری تک حکومت کر رہا تھا۔ ملیبار اور ٹراونکور وغیرہ اسی کے ماتحت تھے اس زمانے میں جب دہلی میں شہنشاہ علاء الدین برسر حکومت تھا

---

۵۵ ایضاً

تو مدورا کے تخت کے لیے دو بھائیوں میں جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا لڑائی ہوئی ویرا پانڈے نے سندرا پانڈے کو مدورہ سے نکال دیا اور اس نے علاء الدین خلجی سے تائید مانگی۔"

مورخ ایلیٹ نے بھی وصاف کی اس روایت کی تائید کی ہے۔

مدورا کے ڈسٹرکٹ گزیٹر کا مصنف بھی کتبوں اور مقامی روایتوں سے نتیجہ نکالتے ہوئے۔

"مدورا کے تخت کے لیے وارثوں میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے سلطان علاء الدین سے مدد مانگی اور اس نے اپنے جنرل ملک کافور کو جنوب میں بھیجدیا۔"

سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویدرس کا مصنف ڈاکٹر ایس کرشنا سوامی اینگار لکھتا ہے:۔

"مدورا کے راجہ کے دو بیٹے تھے جن کا نام ویرا پانڈے اور سندرا پانڈے تھا۔ باپ بڑے بیٹے کو بہت عزیز رکھتا تھا اس لیے اس نے اس کو ولی عہد بنایا۔ باپ کی اس کارروائی سے چھوٹا بیٹا سندرا پانڈے ناراض تھا اور موقع ملنے پر اس نے سلطان علاء الدین سے مدد چاہی۔ [1]

مذکرہ بالا روایات سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہی ناکہ ہندوؤں میں آپس میں اختلاف تھا اور اس اختلاف نے وہاں کے عوام کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا اور اس نااتفاقی کی وجہ سے ہندوؤں ہی کے ایک فریق نے مسلمانوں کو جنوب میں آنے کی دعوت دی اور ان کے لیے مداخلت یا حملہ کرنے کا موقع فراہم کردیا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت جنوبی ہند میں خانہ جنگی اور باہمی کشمکش کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مدورا کی راج دھانی دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک حصہ بڑے بھائی ویرا پانڈے کا طرفدار تھا تو دوسرا حصہ چھوٹے بھائی سندرا پانڈے کی حمایت میں۔ دونوں بھائیوں میں باپ کے گذرنے کے بعد گذشتہ چند برسوں سے مسلسل جنگ اور لڑائیاں ہوتی رہی تھیں۔ آخر تنگ آکر بڑے بھائی ویرا پانڈے نے اپنی پڑوسی سلطنت دوارسمندرم کے راجہ سے امداد طلب کی تو چھوٹے بھائی سندرا پانڈے کو اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑا اور اس نے اپنے ایک سفیر کو دہلی بھیجا اور مسلمانوں سے امداد طلب کی۔ علاء الدین نے اس کی درخواست منظور کرلی۔ اور اپنے جنرل ملک کافور کو مدورا پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا یہاں پر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ پھر دوارسمندرم پر حملہ کیوں کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جنوبی ہند کے جغرافیہ دیکھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ دوارسمندرم کی حکومت جنوبی ہند کے شمالی حصہ تک پھیلی ہوئی تھی اور بغیر اس کے حدود سے گزرے مدورا تک پہنچنا ممکن نہ تھا اس کے ساتھ ملک کافور نے اپنی جنگی فراست اور بالغ نظری سے یہ سمجھ لیا تھا اگر دوارسمندرم پر حملہ کیا جائے گا تو راجہ بلالا اپنے پایہ تخت کو بچانے کے لیے مدورا سے واپس ہوجائے گا اس طرح سے

---

[1] سدرن انڈیا اینڈ ہر محمڈن انویدرس انگریزی۔

سندر پانڈے کو وہاں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ مہلت مل جائے گی اس کے ساتھ ملک کافور کے سامنے یہ بات بھی تھی اگر بغیر دوار سمندرم پر حملہ کرنے کے وہ مدورا کی طرف پیش قدمی کرے تو یہ عین ممکن تھا کہ بلال سوم اس کی واپسی کا راستہ ہی روک دے ان جنگی امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے کافور نے دوار سمندرم پر حملہ کو ترجیح دی۔ اس موقع پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے۔

"اور اب رہی اس حملہ کی نوعیت۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کا یہ حملہ برقی سرعت سے ہوا اور ملک کافور ایک تجربہ کار جنرل تھا وہ اپنے دشمن کو اس قدر مہلت دینا ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ طاقت جمع کر سکے۔ کافور بندھار پور سے نکل کر بارہ دن کے عرصہ میں دوار سمندرم پہنچ گیا۔[۱]

ملک کافور بلال سوم کو دہلی صرف اس لیے بھیجدیا کہ بلال سوم اس مرتبہ پھر اس کی واپسی کا راستہ مسدود نہ کر دے یہ ایک نہایت ضروری جنگی احتیاط تھی جو کافور نے اختیار کی اس کے بعد مسلمانوں کے لیے مدورا تک راستہ صاف تھا اور ان کو یہ بھی اطمینان تھا کہ واپسی کا راستہ سلامت اور بے خطر ہے[۲]

جنوبی ہند میں اہل نوائط کی آبادی

ان اہل نوائط کے علاوہ جو ملیبار بعبر (کارومنڈل) اور کرناٹک کے بعض مقامات بھٹکل، ہنور (ہانیمن) مرڈیشور، منکی وغیرہ میں پہلے سے اپنی مستقل نوآبادیاں قائم کر چکے تھے اس کے بعد قوم نوائط کی ایک بہت بڑی جماعت اپنے مختلف خاندانوں کے ساتھ ۱۶۲۵ء تا ۱۶۶۷ء کے درمیان جنوب کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔

چنانچہ تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے:۔

"اس طرح ایک سال کے اندر اندر جنوبی ہندوستان کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور ان کی نوآبادیاں یہاں قائم ہو گئیں۔ بلاری۔ اننت پور۔ میسور اور پائیں گھاٹ میں ضلع جنوبی ارکاٹ تک جس قدر مسلمان آبادی پائی جاتی ہے وہ سب کے سب بیجاپور سے آئے ہوئے مسلمان کی ہے اور انھیں مسلمانوں میں ملے جلے اہل نوائط بھی جنوبی ہند میں آئے ان سے پہلے اہل نوائط مرہواڑی اور کوکن کے ساحل پر آباد تھے۔ اور ان کے بہت سے نام ملتے ہیں۔ اہل نوایط جب جنوبی ہند میں آئے تو ان کی کثیر تعداد ضلع جنوبی ارکاٹ یعنی جنجی۔ ویلور کے قرب وجوار میں آباد ہو گئی[۳]

---

۱ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۵۰ ۲ ایضاً ۳ تاریخ جنوبی صفحہ ۲۵۶

اسلامی تعلقات کی ابتداء

جناب مولانا سید حکیم عبدالحیؒ یاد ایام میں لکھتے ہیں :۔
" مشہور رہے کہ سب سے پہلے اسلامی تعلقات ہندوستان میں ملک سندھ سے وابستہ ہوئے جو ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے ریگستان سندھ کو طے کرکے جو عرب کے ساتھ خصائص قدیم کے لحاظ سے بہت سی باتوں میں مشابہت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کی جس کے حدود ایک طرف راجپوتانہ اور دوسری جانب وادی کشمیر تھے اور یہ سلطنت کم و بیش بارہ سو برس تک مسلمانوں کے زیر حکومت و اختیار میں رہتی آئی تھی۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ زرزمین گجرات کے سرسبز پہاڑوں پر پڑی تھی۔ اور ان کا یہ مطمح نظر اس وقت تک قائم رہا جب تک وہ گجرات پر قابض و متصرف نہ ہو گئے۔

مسلمانوں کا پہلا حملہ

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ ۱۵ھ میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرمانے کے صرف پانچ برس ہی میں) فاروق اعظمؓ نے بحرین و عمان کی حکومت پر عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کو نامزد فرمایا جن کا شمار صحابہ کرام میں تھا انھوں نے عمان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کی حکومت پر نامزد کر کے حکم دیا کہ وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں۔ حکم نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت منزلیں طے کیں اور اپنی فوج کو لیے ہوئے سب سے پہلے سواحل گجرات پر قدم رکھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے گجرات کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس خدائے یکتا پر ایمان لانے والوں کا ایک ہستی کو وحدہ لاشریک لہٗ جاننے اور اس کو قادر مطلق اور مصرف الامور ماننے والوں کا پاک قدم پہلے اس سرزمین میں پڑا اور اسی سرزمین کے دشت و جبل ہندوستان میں سب سے پہلے اللہ اکبر کے نعروں سے گونجے اس حملہ میں جن سعادت مندوں کو مرتبہ شہادت نصیب ہوا ان میں غالباً وہ انفاس قدسیہ بھی تھے جنھوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھا تھا اور آپ کی پاکیزہ صحبت اور روحانی تعلیم سے بھی مستفید ہو چکے تھے۔ ان فدائیان اسلام کی قدسی صورتیں اس سرزمین کی آغوش محبت میں گنج بے رنج کی طرح مدفون ہوئیں اگرچہ ہم کو اس کنز مخفی کا پتہ نہیں ہے مگر یہ یقینی ہے کہ بلی اور بھروچ کے

کے گرد ونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا۔ اس زمانے میں بمبئی کا نام ونشان بھی نہ تھا اور آج جہاں آپ کو چہل پہل اور گرم بازاری نظر آتی ہے وہاں جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ایک غیر آباد ٹاپو تھا۔ گرد ہی کے پاس تھانہ جس کو عربی کتابوں میں تانہ لکھتے ہیں اور جو اب ضلع تھانہ کا صدر مقام ہے بہت بارونق اور آباد بندر تھا۔ اسی پر سب سے پہلے مسلمانوں کا حملہ ہوا تھا۔[1]

دوسرا حملہ

اس کے بعد دوسرا حملہ حکم بن ابی العاص نے بھروچ پر کیا جس کو عربی کتابوں میں بروچ یا بروص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو اس زمانہ میں نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا بڑا پُر رونق اور آباد بندر تھا۔[2] ان دونوں حملوں میں حکم کو اچھی خاصی کامیابی ہوئی مگر چونکہ فاروق اعظمؓ کی رائے دریائی سفر کے خلاف تھی اس واسطے مدت تک مسلمانوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔[3]

تیسرا حملہ

سنہ ۹۳ھ میں ملک سندھ مسلمانوں کے قبضہ و تسلط میں آیا اور سنہ ۱۰۷ھ میں ہشام بن عبد الملک خلیفہ دمشق نے جنید بن عبد الرحمٰن مری کو سندھ کی حکومت تفویض کی۔ جنید من چلا آدمی تھا اس نے چند روز میں اپنے زیر حکومت علاقہ کا مناسب بندوبست کرکے گجرات کی طرف توجہ کی اور اپنی طرف سے لوگوں کو عربی فوجوں کے ساتھ کچھ پر روانہ کیا جس کو عربی کتابوں میں قصہ لکھتے ہیں۔ یہ فوجیں بھروچ کو تہ و بالا کرتی ہوئی مالوہ میں گھس آئیں اور ہر طرف جا جا کر پہونچ کر انھوں نے فتوحات حاصل کیں۔ دشمنوں کو ہر جگہ پسپا کیا اور غنیمتیں پائیں۔[4]

چوتھا حملہ اور پہلا مسلمان مصنف

کچھ دنوں بعد المہدی باللہ العباسی خلیفہ بغداد نے عبد الملک بن شہاب المسمعی کو سنہ ۱۵۹ھ میں کافی ساز و سامان کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ کیا اس کے ہمراہ فوج مطوعہ (والینٹیر) بھی تھی اور ان میں ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری بھی تھے جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا اور یہ پہلے شخص

---

[1] فتوح البلدان بلاذری [2] معجم البلدان حموی بحوالہ یادِ ایام صفحہ ۴۔ [3] فتوح البلدان بلاذری
[4] فتوح البلدان ۱۲ بحوالہ یادِ ایام صفحہ ۵۔

ہیں جنھوں نے حدیث شریف میں کتاب تصنیف کی تھی۔

فاضل چلپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے ھو اوّل من صنّف فی الاسلام[۱] یہ فوج کثیر ۱۶۰ھ میں باربد پہونچی[۲] اور اس نے فتوحات عظیم حاصل کیں۔ وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا اترنے کے انتظار میں عبدالملک نے کچھ دنوں وہاں قیام کرنا مناسب سمجھا۔ یہ اسی انتظار میں تھا کہ دفعتًا ہوا میں عفونت پیدا ہوئی اور ایک ہزار آدمی وبا کا شکار ہو گئے۔ ربیع بن صبیح کا بھی اسی بیماری میں انجام بخیر ہو گیا اور وہ بھی اس سرزمین میں پیوند خاک ہو گئے۔[۳]

یہ دوسرا شرف اس سرزمین کو حاصل ہے کہ ایسا شخص اس کی آغوش میں سو رہا ہے جو فن حدیث کا پہلا مصنف ہے بلکہ صاحب کشف الظنون کی رائے میں مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے کتاب تصنیف کی ہے۔

سلطان محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ

اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کو گجرات کا خیال ہوا تھا۔ اور وہ تیس ہزار فوج کے ساتھ ۴۱۶ھ میں ملتان آیا اور وہاں سے گجرات کا ارادہ کر دیا۔ راستہ نہایت دشوار گذار تھا اور پانی کمیاب مگر عزم ملوکانہ کے سامنے کوئی دشواری پیش رفت نہیں ہوئی وہ ریگستانوں کو طے کرتا ہوا انہلواڑہ پہنچا جو اس زمانہ میں راجہ بھیم کا دارالحکومت تھا اسی کو عربی تاریخوں میں نہروالہ لکھا ہے اور زمانہ مابعد میں پٹن اور عرب فتن کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ سلطان محمود انہلواڑہ کو زیر و زبر کرتا ہوا آگے بڑھتا اور "دیلواڑہ" کو جو اس زمانے میں دوسرے راجہ کا شہر تھا فتح کر کے سومنات کا قصد کیا جو کہ ساحل گجرات پر ہندوؤں کا نہایت مشہور تیرتھ گاہ تھا اور اب جوناگڈھ کے حدود حکومت میں داخل ہے۔ سومنات میں محمود غزنوی کو سخت دشواریاں پیش آئیں مگر آخرکار وہ تمام دشواریوں پر غالب آیا اور بے شمار مال و دولت لے کر بخیر و خوبی غزنی واپس گیا۔[۴]

---

[۱] مسلمانوں میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب تصنیف کی۔ [۲] خدا جانے کہ یہ باربد کہاں پر واقع ہے اس کے بارے میں مولانا حکیم سید عبدالحیٔ یاد ایام کے حاشیہ پر لکھتے ہیں مجھ کو اب تک یقینی طور پر معلوم نہیں کہ باربد کس نام کا معرب ہے اور یہ کہاں پر تھا عربی تاریخوں میں بتایا ہے کہ یہ شہر سندھ کا کوئی شہر ہے مگر مجھ کو اس کا یقین نہیں۔ عرب مورخوں کا دستور رہے کہ وہ ہندوستان کے ہر شہر کو سندھ بتا دیتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ مقام کنبایہ (کھمبایت) ہے (کامل ابن الاثیر بحوالہ یاد ایام صفحہ ۷)

[۳] کامل ابن اثیر بحوالہ یاد ایام۔

شہاب الدین غوری کے متعدد حملے

پھر ۵۷۴ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے اسی ملتان کی راہ سے گجرات پر دھاوا کیا اس زمانے میں جو راجہ گجرات پر برسر حکومت تھا اس کا نام بھی راجہ بھیم دیو تھا اس سے سخت لڑائی ہوئی اور شہاب الدین کو شکست اٹھانی پڑی اس شکست سے مسلمانوں کی ہمتیں لوٹ گئیں مگر چند روز میں خدا نے لاہور اور دہلی کی فتوحات عظیم سے اس کا نعم البدل کر دیا۔

۵۹۱ھ میں اجمیر فتح ہونے کے بعد قطب الدین ایبک غالباً اپنے آقا شہاب الدین غوری کی اجازت سے گجرات پر دوبارہ حملہ کیا اور نہر والہ تک پہونچ کر بھیم دیو کو میدان جنگ میں شکست فاش دی اور اس سے خرچہ جنگ وصول کر کے دہلی کو بخیر و خوبی معاودت کی۔ مگر اس فتح عظیم سے شہاب الدین غوری کے حوصلہ مندول کو تسکین نہیں ہوئی اس نے ۵۹۳ھ میں پھر قطب الدین ایبک کو گجرات کی مہم پر روانہ کیا اور اس مرتبہ قطب الدین نے بھیم دیو کو شکست دے کر نہر والہ پر قبضہ کر لیا۔ بھیم دیو تو وہاں سے ہٹ کر محفوظ مقاموں میں پناہ گزین ہو گیا۔ سلطان شہاب الدین کو جب یہ خبر پہونچی تو اس نے خیال کیا کہ جب تک وہ خود یا قطب الدین ایبک گجرات میں قیام نہ کریں گے ملک کا قرار واقعی بندوبست نہیں ہو سکتا اس واسطے اس نے قطب الدین کو حکم دیا کہ وہ بھیم دیو سے سالانہ خراج پر مصالحت کر کے واپس آئے اس نے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی اور دہلی واپس آگیا۔

سلطان علاء الدین خلجی کا حملہ اور گجرات پر مسلمانوں کا تسلط

اس کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے فاتح اور مقنن سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۶ھ میں الغ خاں کو معقول ساز و سامان کے ساتھ تسخیر گجرات کے واسطے روانہ کیا۔ اس زمانے میں گجرات کے سب سے اخیر فرماں روا راجہ کرن کے ہاتھ میں عنان حکومت تھی اس نے جان توڑ مدافعت کی اور اپنا سارا زور خرچ کر چکے بعد دیو گڑھ چاندہ میں پناہ گزین ہو گیا اور اس کے ہاتھی گھوڑے خزانہ اور تمام سامان تجمل الغ خاں کے ہاتھ آیا۔ قیدیوں میں رانیاں اور راجہ کی بیٹی دیول دیوی کا رانی بھی ہاتھ آئی[1]۔ ان سب کو الغ خاں نے دہلی روانہ کر دیا اور نہر والہ کو مرکز

---

[1] دیول دیوی کا قصہ گذشتہ اوراق میں ہم لکھ آئے ہیں

حکومت قرار دے کر خاص ہنرد الرمیں جامع مسجد کی تعمیر شروع کردی[2] جو غالباً گجرات کی سب سے پہلی مسجد تھی اسی الپ خاں کو اہل گجرات الپ خاں اور الف خاں کے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب جناب ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب سے ابتدا میں عرب مسلمانوں کی ہند میں آمد کے متعلق کچھ اور تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔ تاریخ کوکن کے مصنف "کوکن نئے دین کی دہلیز پر" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں :۔

"ظہور اسلام کے بعد جب نئے دین کے علمبردار شام و عراق کے مالک بن گئے تو شہنشاہ ایران یزد جرد ساسانی کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ اور ایوان کسریٰ کے کنگرے گرنے لگے۔ نئے دین کی نئی قدروں کی تجلی سے اہورمزدہ کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اور آتش کدوں کی بھڑکتی آگ سرد پڑنے لگی۔ ایران کی فتوحات کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۵ھ ۶۳۶ء میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو بحرین اور عمان کی ولایت پر بھیجا۔ انھوں نے اپنے بھائی الحکم بن ابی العاص بن بشیر الثقفی کو بحرینا میں اپنا نائب مقرر کیا۔ الحکم نے خلیفۃ المسلمین کی رضامندی کے بغیر ایک بحری بیڑہ تانہ کی مہم پر بھیجا یہ مہم ناکام ثابت ہوئی۔

تھانہ کا افتخار

تھانہ کی بندرگاہ کو ساتویں دور میں بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ عربوں کو کوکن کی بندرگاہوں، تجارتی فتوحات اور اقتصادی مہم کا علم تاریخ کے پچھلے کئی دور سے تھا نئی مسلم مقبوضات میں بصرہ کی نئی بندرگاہ تجارتی منڈی سے تھانہ کا براہ راست رابطہ نئی اسلامی مملکت کے لیے مزید اقتصادی اور سیاسی فتوحات کا سلسلہ بن سکتا تھا۔ اس ایک مہم سے تھانہ کی جغرافیائی عسکری اور تجارتی اہمیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس عہد ۳۰ھ میں سوریا اور چالوکیہ سامراجیہ میں کوکن کی بندرگاہ پر اقتدار جمانے کی کوشش بروئے کار تھی۔ چالوکیہ راج پل کیشی دوم کے پیروں کے جال میں یہ ساری سونے کی مچھلیاں پھنس چکی تھیں مگر عرب ملاحوں کے بیڑے بھی بروص (بھڑوچ) اور دیبل کی بندرگاہوں کے گرد منڈلانے لگے تھے جو المغیرہ جو عثمان بن ابی العاص کے بھائی تھے بروص اور دیبل کی مہمات کے سربراہ تھے[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ [2] البلاذری فتوح البلدان ص ۴۳۳ بحوالہ ص کوکن۔ [3] سیرۃ الصحابہ: دار المصنفین میں تذکرہ تو موجود ہے مگر ان کے ہندوستان میں آنے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ دیکھئے دیبھی۔ انگریزی ترجمہ طلیع بیگ کراچی ۱۹۶۵ء ۵۸-۵۹۔

حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت ۳۹ھ میں ایک عرب رئیس حارث بن مرۃ عبدی کا ان بندرگاہوں کا باقاعدہ نگرانی کرنے لگا تھا یہ عرب سردار دو سال بعد مارا گیا (اس کا بحری گشت کے نئی اور بھی دستے تھے) ہندستان کے مغربی ساحل کو گجرات سے لے کر ملیبار تک اور کوکن میں بالخصوص تھانہ کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اسی دھرتی نے صحابہ کرام اور نہ جانے کتنے تابعین کی قدم بوسی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے پانچ سال بعد سے عرب مسلمان ملابار کے ساحلی علاقے میں کبرالانک آنے جانے لگے تھے۔ موخرالذکر خطہ میں چند قبروں کی انتہائی قدامت سے یہ کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ثقہ روایت کے مطابق جن اصحاب کرام نے ہندستان کی سرزمین کو نوازا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔
عاصم ابن عدی۔ الحکم ابن ابی العاص۔ عبداللہ بن عتبان۔ عبداللہ بن معمر التیمی (یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت لڑکے تھے) ان کے فرزند عمر بن عبیداللہ التیمی (کابل کی مہم میں شریک ہوئے) عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں سجستان اور کابل کی مہم میں شریک ہوئے۔ بصرہ میں ۵۰ھ میں وفات پائی اور سنان ابن سلمہ ابن المحبق الھذلی ۴۸ھ میں ہندستان کی مہم میں شریک تھے[1]

ساتویں صدی میں ابوالقیس قبیلہ کی بحری قزاقی دیوانگی بن چکی تھی۔ خلیج فارس میں بحرین کا جزیرہ ان غارت گردوں کا مسکن تھا اور یہی خلیج فارس میں تجارتی جہازوں کے لیے گذرگاہ کا کام دیتا تھی۔ قادسیہ اور نہاوند کی فیصلہ کن جنگوں ۶۳۷ء-۶۴۲ء میں ایرانی مدنیت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ زرتشتی مہاجرین ہندستان کے ساحلی علاقوں میں پناہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ یہاں سوپارہ اور کلیان میں ان کے ہم وطن نسطوری عرصۂ دراز سے آباد تھے ان کا پہلا مہاجر قافلہ اسی عہد میں سنجان پہنچا اس نئے ملک میں یہ پردیسی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ اس لئے اور بھی محسوس کرتے تھے کیونکہ راجاؤں کے سیاسی تعلقات معاصر چالوکیوں سے عہد ناموں اور سفارتوں کے ذریعہ مستحکم ہو چکے تھے۔ عربوں کو اندیشہ تھا کہ ان کی طرف سے کوئی فوجی کمک ایران میں دم توڑتے کو تنکے کا سہارا نہ بن جائے اس بحری گشت اور نگرانی سے عرب تاجروں اور داعیان اسلام کی حفاظت بھی مقصود تھی جو تجارتی اسباب کے علاوہ اپنے نئے دین کی تعلیمات کے جواہر پارے بھی ساتھ لاتے تھے[2]

آگے تاریخ کوکن کا مصنف "دو گنگا اور دجلہ کا ملاپ" عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں:۔
"خلفائے عباسیہ کے سنہری دور میں جب عجمی ثقافت اور مدنیت کے زیر اثر تمدن، تمدن کے

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (مطبوعہ حیدرآباد دکن) ۱۳۱۹ھ اس کتاب میں مذکورہ بالا کئی نام نہیں ملتے لیکن دوسری معتبر کتابوں میں یہ نام درج ہیں۔ [2] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۰۷ بحوالہ تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۱۰۱

کے حریم ناز میں انگڑائیاں لینے لگا تو اسباب معاشرت اور کاروبار زندگی پر بھی نیا رنگ، روغن چڑھنے لگا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دولت کی فراوانی تھی جس کے نتیجے میں لوازمات عیش کی ارزانی تھی۔ عراق کے معاشرہ میں نو دولتیوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آچکا تھا جو سونے چاندی میں لوٹتا تھا۔ ان امراء کی زندگیاں بغداد کی راتوں کی طرح رنگین اور ہوش ربا تھیں اور جن کے خزانوں کی داستانیں الف لیلہ کے ایک ہزار افسانوں سے زیادہ طلسم انگیز تھیں ان الف لیلوی کرداروں میں بغداد کے ابن الجصاص جیسے پونجی پتی جوہری تھے اور سیراف، بصرہ اور دوسری تجارتی منڈیوں کے تجار اور جہازوں کے مالکان تھے انہیں کی بدولت دولت کا دریا ہندستان اور دور دراز چین اور جاوا سے بہہ کر دجلہ اور فرات میں آرہا تھا جس کے ساتھ ساتھ ہندستان کی قدیم تہذیب اور علوم کے موتی مرجان بھی پہونچ رہے تھے طب کے قرابادین۔ نجوم کے زائچے۔ ریاضی کی گتھیاں۔ ادب اور ساہتیہ کی چاشنی اور اخلاق کے نکات کتابوں اور دانشوروں کے توسط سے عباسی دربار میں باریاب حاصل کر رہے تھے۔

سدھانتا۔ پنچ منترا اور چرک سمھتا۔ کی کتابیں قبول عام کی خلعتیں پا چکی تھیں ہندستانی نجومیوں کی قسمتوں کے ستارے عہد عباسیہ کے قلمی افق پر چمک اٹھے تھے۔ بغداد کے مرمریں محلوں میں ہند کا شطرنج اور چوسر کی بساطیں بچھنے لگی تھیں۔

ہندستانی مصنوعات کے عرب طلبگار لمبی عباؤں کے نیچے کمر سے دینار و درہم کی تھیلیاں باندھے بصرہ اور سیراف کی منڈیوں اور بغداد کے چھت دار بازاروں میں "بانانیہ" (بنیا) بیوپاریوں سے سودا بازی کرتے نظر آتے تھے۔ عرب تاجران کی دعوتیں کر کے اپنی قومی روایت کو خوب نبھاتے تھے [1]

عرب مدنیت اور ادبیات ہندستانی ناموں اور کرداروں میں تقلید اور تشبیہہ کی راہیں ڈھونڈھنے لگ گئی تھیں بانس جسے عربی میں خیزران کہتے ہیں نزاکت حسن اور قامت محبوب کا معیار قرار پایا تھا اور بغداد کے عشرت کدوں میں نازک اندام حسیناؤں کو خیزران سے تشبیہہ دیتے تھے [2]

اور یہی نام مہذب سوسائٹی کی خواتین میں بھی مقبول تھا۔ خلیفہ مہدی کی ملکہ یعنی ہارون رشید کی والدہ کا نام خیزران تھا۔ سیراف اور بصرہ کے شارع عام، سوق اور محلے ہندستانی بنیوں اور ملاحوں کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے انکے ہم وطن اور ہم پیشہ کیش اور خلیج فارس کے شہروں میں برسوں سے رہتے چلے آ رہے تھے۔

سلاہاردراج کے عہد میں جب بزرگ بن شہریار ناخدا اپنے جہاز لے کر تھانہ اور مضافاتی بندرگاہوں میں آتا تھا تو بعض دفعہ ہزار سے زیادہ بنیا نیہ مسافر ہوتے تھے۔

---

[1] عرب اور ہند کے تعلقات صفحہ ۸۴ (ابو زید کا بیان)

ابن خردازیہ سنہ ۲۵۰ھ جیسے عرب سیاح اور مصنف جو نارجیل اور ساگوان والے ملک کی زیارت سے محروم تھے وہ اپنے ہم وطن تاجروں اور جہاز رانوں سے اس کی داستانیں بڑے غور سے سنتے رہتے تھے ابن خردازیہ کی جغرافیہ پر کتاب المسالک الممالک میں سب سے پہلے کوکن کی بندرگاہوں کا ذکر کیا گیا تھا۔

جناب عبدالواسع عمری نے اپنی کتاب "قلندر برحق" میں عرب تاجروں اور بزرگوں کے ہند میں آنے کے بارے میں جو تفصیل لکھی ہے ان کا اقتباس ہم یہاں انھیں کے قلم سے پیش کرتے ہیں۔ مؤلف موصوف نے اپنی کتاب کے شروع میں جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان میں سے بعض تاریخی اعتبار سے نہایت معتبر اور مستند تسلیم کی گئی ہیں۔

"بزرگان کرام کی ہندوستان میں آمد" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں۔

"عرب تاجروں اور بزرگوں کی آمد کا سلسلہ ہندوستان میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے ہند کے مغربی ساحل کو اپنا مسکن بنایا اور اسلام کی کرنیں ساحل مالابار سے جلوہ گر ہونے لگیں۔ پہلی جماعت جو ہندوستان میں آئی وہ حضرت وہب بن ابی کبشہ کی تھی آپ سنہ ۶ھ مطابق سنہ ۶۲۸ء میں ہندوستان آئے اور ہندوستان سے چین پہونچے۔ آرنالڈ اپنی کتاب دعوت اسلام میں کہتا ہے۔

"حضرت وہب کے بعد بہت سے تاجر چین میں بس گئے تھے۔ اسی تجارت نے ان کو ساحل مالابار، کارومنڈل، لنکا، سماترا، جاوا میں پہونچایا تھا۔ کیانٹن میں عرب کی تجارت کثرت سے نظر آتی اور چین کی پیداوار بھی انہیں عرب تاجروں کے ذریعہ دکن اور یورپ میں آتی تھیں۔ سماترا، جاوا کی آبادی تقریباً تمام مسلمان ہے۔ یہی تاجروں نے یہاں اسلام کی اشاعت کی تھی ایک عربی مبلغ جن کا نام "جہاں شاہ" تھا یہاں پہونچے تھے۔ بہتوں کو مسلمان بنا کر انھوں نے یہاں اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور اپنا نام سری پارک سلطان رکھ لیا۔" آج بھی حضرت وہب کا مزار کیانٹن میں موجود ہے۔

دوسری جماعت حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم کے عہد میں والیٔ عمان نے سنہ ۱۵ھ مطابق سنہ ۶۳۶ء میں ہندوستان بھیجا تھا۔ اس وقت عراق فتح ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ نے سنہ ۱۴ھ میں یہاں کی بندرگاہ ابلہ پر قبضہ پاکر اس کو مسلمانوں کی تجارت گاہ بنا دیا تھا یہ نوٹی زیادہ تر عالموں، فقیہوں اور تاجروں پر مشتمل تھی۔ اس زمانہ میں حضرت عمرؓ نے ایک عربی سیاح سے ہندوستان کے متعلق دریافت فرمایا تو اس سیاح نے جس بلیغ انداز میں ہندوستان کی تعریف کی ہے وہ قابل تحسین و آفرین ہے۔ ملاحظہ ہو:

بَحْرُهَا دُرٌّ وَجَبَلُهَا يَاقُوتٌ وَشَجَرُهَا عِطْرٌ "

سنہ ۲۴ھ حضرت عثمان غنیؓ تخت خلافت پر جلوہ افروز تھے۔ اس وقت سندھ کا راجہ

سماہ میں تھا۔ سندھی فوجیں ملک گیری کی خاطر اسلامی ممالک پر بھی قبضہ کرنے کے لیئے آگے بڑھ رہی تھیں عبدالرحمان بن سمرہ نے ان فوجوں کا مقابلہ کرکے انہیں پسپا کر دیا تھا۔

تیسری جماعت خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کے عہد میں حضرت حارث کی ہمراہی میں سندھ پہونچی۔ چوتھی جماعت مہلب بن سفرکی سرکردگی میں سنہ ۴۴ھ میں ملتان پہونچے۔ پانچواں گروہ حضرت عکاشہ کی معیت میں سنہ ۴۳ھ میں ملیبار پہونچا۔ پھر سنہ ۶۵ھ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں بہت سے عرب تاجر جزیرہ سیلون آکر آباد ہو چکے تھے۔ جنوبی ہند کے راجاؤں نے عربوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کے لیے انھیں ہر قسم کی مراعات دے رکھی تھیں۔ عربوں کی تجارت پورے ساحلی علاقے پر پھیل چکی تھی۔ عربوں کا رسوخ، سرکار دربار اور عوام میں بڑھ رہا تھا۔ انھوں نے محض صداقت و اخلاص رواداری اور ہمدردی بنی نوع انسان کا اچھا خاصا مظاہرہ کیا تھا اور ان کی تجارت کا دارومدار صرف انھیں اخلاقی پہلو پر تھا۔ اسی بنا پر اگر کوئی عرب کبھی جھوٹ کہہ دیتا تو کہا جاتا تھا کہ تم مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔ یہی وہ اخلاقی پہلو تھا جو یہاں کے باشندوں کو مسلمانوں کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے اخلاق رواداری سے متاثر ہوکر بہت سے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے اس وقت ان کی تعلیم و تربیت کے لیے باقاعدہ کوئی خانقاہیں نہیں تھیں جو ان کی روحانی تربیت کر سکے اور نہ ہی کوئی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ تھا۔

تاریخ ملیبار میں لکھا ہے :۔

"اسلام کی سچائی ہی تھی کہ دوسری قوموں کو مذہب اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ عرب کے مسلمان تاجر تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ مذہب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ ان تاجروں کے اخلاق۔ پاکبازی مساوات، رواداری، یہاں کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھیں اور یہی چیزیں جنوب میں اسلام کی ترقی کا باعث ہوئیں"

ان دنوں یہ اسلام انھیں لوگوں میں پھیلا جو عرب تاجروں کے زیر اثر تھے۔ انھوں نے اگر اسلام قبول کر لیا تھا تو صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے سماج کی زبردستیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ آگے لکھتے ہیں۔

"اس وقت جنوبی ہند میں جینیوں کا بہت زور تھا۔ ان کی طاقت کا ڈنکا ہر جگہ بج رہا تھا جگہ جگہ ان کی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ جین اور بدھ میں ہمیشہ تصادم ہوتا رہتا تھا۔

پنڈت جیم سین ظفر نامہ شنکراچاریہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"جب آریوں، بودھوں اور جینیوں کے درمیان مباحثہ ہوا۔ تو اس وقت کے مشہور آچاریہ جنیو دھنوا کے تمام شاگرد رنجیدہ ہو گئے اور وہ ویدک دھرمی بن گیا اس کے بعد اس نے اپنے ملازمین

کو مخالفین وید کے مارنے کا تاکیدی حکم دیا۔ ہمالیہ سے لے کر سینو بندر ایشور تک جینیوں کے جس قدر بچے بوڑھے جوان ملے ان سب کو مار ڈالو اگر کوئی میرا ملازم جینیوں کا ناش نہ کرے گا تو ایسی حالت میں بھی اس کو سزائے موت دی جائے گی۔"

اس وقت کے سماج کی کیا حالت تھی ملاحظہ ہو۔

"سلیمان تاجر جو عرب کا بڑا سیاح تھا اپنی کتاب التواریخ میں لکھتا ہے:۔

"جب ایک دوسرے پر کوئی دعوا کرتا ہے تو ملزم کے سامنے لوہا گرم کر کے رکھا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ پر پان کے سات پتے رکھ کر لوہا رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کو لے کر آگے پیچھے چلتا ہے پھر وہ اس لوہے کو گرا دیتا ہے اور اس کے ہاتھ کو کھال کی ایک تھیلی میں رکھ کر بادشاہی مہر اس پر کر دی جاتی ہے تین دن کے بعد دھان لاکر اس کو دیئے جاتے ہیں کہ وہ ان کو چھیل کر چاول نکالے۔ اگر اس کے ہاتھ پر اثر نہیں ہوتا تو وہ سچا سمجھا جاتا ہے اور مدعی پر جرمانہ کر کے خزانہ شاہی میں داخل کیا جاتا ہے۔ تمام ہند میں بدکاری کی سزا دونوں ملزموں کا قتل ہے۔ اسی طرح چوری کی سزا بھی قتل ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ چور کو ایک نوکیلی مخروطی لکڑی پر بٹھاتے ہیں اور وہ لکڑی نیچے سے حلق تک چلی جاتی ہے جب کوئی قید کیا جاتا ہے تو سات دن تک اس کو کھانا پانی نہیں دیتے۔ جانور کو ذبح نہیں کرتے بلکہ اس کو کسی چیز سے مار کر کھاتے ہیں۔"

ابو زید حسن سیرانی لکھتا ہے:۔

"ہندستان اور چین دونوں جگہ تناسخ کا اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ لوگ جان دے دینا معمولی کام سمجھتے ہیں۔ یہاں کے بھکشو ننگے بدن سر اور بدن کے بال بڑھائے اور ناخن بڑھائے گلے میں انسانی کھوپڑیوں کی مالا پہنے دیس پردیس پھرتے رہتے ہیں۔ یہاں کے راجہ کانوں میں سونے کے بالے جن میں قیمتی موتی ہوتے ہیں پہنتے ہیں۔

مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے کہ:۔

"سارا جنوبی ہند جہالت کی تاریکی میں گھرا ہوا تھا۔ مخلوق خدا کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو کھایا جاتا تھا۔ ہر کمزور پر ظلم کا پہاڑ بے دریغ چلایا جاتا تھا۔ خدائے واحد کا نام تو کجا ہر جگہ بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔ اللہ کا نام لیوا کوئی نہ تھا۔ عورتوں کی قدر نہ تھی۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی ان سے بیویوں کا کام لیا جاتا تھا۔ جابجا خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ رحم و کرم نام کو نہ تھا۔ دیوتاؤں پر انسانوں کو بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔

اس وقت برہمنوں نے جو طوفان بدتمیزی کا برپا کی تھی اس کی نظیر سوامی بدھانند جی مہاستھور کی زبانی سنیے وہ اپنی کتاب بھارت کے مول نواسی صفحہ ۱۳۰ میں فرماتے ہیں۔

جینیوں کو پہاڑ سے دھکیلتے، ان کی کھالیں کھینچتے اور ان کی حاملہ عورتوں کو مار ڈالتے تھے وہ ان کے قلعوں اور شہروں کو برباد کرتے اور انہیں جلا دیتے تھے یہ سب برہمنوں کے کرتوت کے روشن ثبوت تھے۔

پھر جین دھرم کے مٹانے کے خاطر جو کارروائی کی گئی۔ مہارشی شیو بھرت لال کی زبانی سنیے وہ اپنی کتاب جین دھرم میں لکھتے ہیں:۔

"ان کو کھولتے ہوئے تیل کے گڑھوں میں ڈال کر جلا دیا گیا۔ ان کی کتابیں چھین کر دریا میں غرق کر دی گئیں۔ معصوم انسانی بے دردی نذر آتش کر کے خشک ایندھن کی طرح خشک کر دیئے گئے"۔

ایسے روح فرسا دور میں مسلمانوں کا پہنچنا اور سکونت اختیار کر کے باقاعدہ تبلیغ کا کام کرنا بہت دشوار تھا"۔

اور پھر مسلمانوں کی یہاں باقاعدہ کوئی حکومت نہ تھی کہ وقت ضرورت مدد و معاون ہو۔ ایسے وحشت خیز خطے میں جہاں بربریت ننگی ہو چکی تھی"۔ لہ

اس کے بعد ۱۸ھ حضرت مالک بن دینار۔ شرف بن مالک۔ مالک بن حبیب تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ "آئینہ حقیقت نما" جلد اول میں اس کے مصنف اکبر شاہ خاں صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"ان تجارتی تعلقات کی بناء پر مالک بن حبیب کا خاندان اور عرب کے قبائل جنوبی سند میں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ان کی اقامت نے جنوبی ہند میں رشتہ داریاں پیدا کیں۔ عربوں نے یہاں کی عورتوں سے شادیاں کیں آج جنوبی ہند میں مسلمانوں میں مختلف جماعتیں، مختلف ناموں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اسی اختلاط کا نتیجہ ہیں" ۲ہ

بعض مورخین ابن بطوطہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

اس وقت کی تین مسجدیں جو مختلف مقاموں میں بنائی گئی ہیں۔ اپنی قدامت اور مضبوطی میں ثانی نہیں رکھتیں، ایک بیرگور کی مسجد، دوسری ہاسپٹن اور تیسری دھنگل کی ہے۔ ۳ہ

"مالک بن دینار، شرف بن مالک اور مالک بن حبیب نے ملیبار کے مختلف مقامات پر جو مسجدیں تعمیر کی تھیں، ان میں ایک مسجد ملیبار کے سرحدی مقام پر واقع کا سرگوڈ کی تھی ہے اس کی تعمیر ۱۲۵ھ میں

لہ قلندر برحق صفحہ ۷۹، ۸۰۔ ۲ہ آئینہ حقیقت نما جلد اول مصنف اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔
۳ہ ابن بطوطہ بحوالہ قلندر برحق ص ۸۲۔ راقم کی نظر سے سفرنامہ ابن بطوطہ میں کہیں مساجد کی تفصیل نہیں گذری ممکن ہے کہ قلندر برحق کی یہ تفصیل کسی قدیم نسخہ میں موجود ہو۔

موجودہ جو اب تک اپنی قدامت کے ساتھ موجود ہے اور اس مسجد سے متصل ایک مزار ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شرف بن مالک کا مزار ہے۔ اسی طرح ابو زید سیرافی اور دوسرے مورخین کا ذکر کرتا ہے وہ لکھتا ہے :-

"دوسری صدی ہجری کی ابتدا میں مسلمان مالدیپ اور ملیبار میں پھیل چکے تھے چنانچہ شرف بن مالک، مالک بن دینار اور مالک بن حبیب نے راجہ زامورن کو اسلام کی دعوت دی تھی اور مسلمانوں کو اس راجہ کی بہت حمایت حاصل تھی۔ مالک بن دینار اور مالک بن حبیب نے کدنگلور اور کالی کٹ میں مسجد بنائی تھی۔

ہجرت کی تاریخ پر ایک نظر

اکثر مورخین اس قوم کے خروج و ہجرت کی وجہ عام طور حجاج بن یوسف کے ظلم و استبداد اور اس کے دور کے پر تشدد حالات قرار دیتے ہیں لیکن تاریخی لحاظ سے اس میں کچھ شبہات اور اعتراضات پیدا ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ حضرت سید اسماعیل ابن جعفر الصادق کی ولادت سنہ ۸۳ھ میں اور وفات سنہ ۱۳۳ھ میں ہوئی بقیں اور حجاج بن یوسف سنہ ۹۵ھ میں اپنی عمر کے چون سال میں فوت ہو گیا تھا۔ اس کے مرنے کے وقت حضرت سید اسماعیل کی عمر زیادہ سے زیادہ بارہ سال کی رہی ہو۔ اس کم سنی میں ان کے ساتھ حجاج کے ظلم و تشدد کی داستان کچھ عجیب اور بے جوڑ سی نظر آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہجرت کا واقعہ درحقیقت حضرت سید اسماعیل کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے پوتے سید عبداللہ الواثکلی کے ساتھ پیش آیا تھا جو حجاج کے گذرنے کے کئی سال بعد پیدا ہوئے تھے تو ان کی ہجرت حجاج کے مظالم کی بنا پر ہوئی تھی۔ سن اور روایات کے اعتبار سے مطابقت نہیں کرتا۔ پہلی ہجرت سنہ ۶۱ھ میں بتائی گئی ہے اور یہ حضرت امام حسین کی شہادت کا سن ہے اور یہ دور مسلمانوں کے لیے عموماً اور اہل بیت کرام و سادات عظام کے لیے خصوصاً کرب و اضطراب، پریشانی و بے اطمینانی اور حد تک آزمائش و بے امنی کا

دور تھا حکومت وقت ان سے کافی بدظن تھی اور وہ انھیں اکثر مشتبہ اور ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ عبدالملک یزید کے بعد بنی امیہ کا تیسرا خلیفہ تھا اور وہ ۶۵ھ میں مروان کی رحلت کے بعد دمشق میں تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا تھا۔ اور عبدالملک کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہی حجاج کی قسمت کا ستارہ چمکا اور وہ عراق و عرب کا گورنر بنا۔ اس بنا پر ۶۲ھ کی ہجرت حجاج کے ظلم و ستم اور اس کی سخت گیری سے ہوئی تھی ثابت نہیں ہوتا کیونکہ وہ ان سنوں میں اقتدار پر پہونچا ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے سن غلط دیا گیا ہو یا ان پر ظلم و تشدد کسی اور کی طرف سے کیا گیا ہو۔ اور نام اس کے بجائے ایک مشہور اور بدنام ظالم کا لیا گیا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حجاج اپنے وقت کا ایک نہایت سنگ دل اور سخت گیر حاکم تھا جس نے اللہ کے بندوں پر ظلم و ستم ڈھایا بے گناہوں کو ستایا۔ بے شمار انسانوں کو ان کی زندگیوں سے محروم کیا۔ اس کی نسبت مورخین لکھتے ہیں کہ :۔

اس نے ایک لاکھ بیس ہزار کا ناحق خون کیا تھا۔ علاوہ ان لوگوں کے جو لڑائی میں مارے گئے اور اپنے مرتے وقت پچاس ہزار قیدی جیل میں چھوڑ گیا۔ [۱]

حضرت سعید بن جبیرؓ جو ایک متقی اور پاکباز تابعی تھے اور ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کے شاگرد رشید تھے وہ بھی اس کے دست بیداد کے نذر ہو گئے چنانچہ شیخ ابوالفرح لکھتے ہیں :۔

"سعید ابن جبیر کی شہادت ۹۲ھ میں ہوئی اس وقت سے اس کے حواس میں فتور آگیا تھا۔ اس نے ایک منجم سے پوچھا آج کی کوئی سردار مرے گا یا نہیں؟ اس نے کہا ہاں ایک سردار جس کا نام کلب ہے مرنے کے قریب ہے۔ حجاج نے کہا یہ تو میرا نام ہے کیونکہ لڑکپن میں میری ماں اسی نام سے مجھے پکارتی تھی۔ پھر حجاج نے پوچھا کہ تم کو اپنی پیشن گوئی کا یقین ہے اس نے کہا ہاں یقین ہے حجاج نے کہا ہم تم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے یہ کہکر اس نے منجم کو قتل کر دیا۔ [۲]

آگے شیخ ابوالفرح لکھتے ہیں :۔

"حجاج مرتے وقت کپچھ ڈکارتا تھا" [۳]

بہر حال حجاج کا دور بنی امیہ کی تاریخ کا ایک تاریک قتل و غارت گری کا ایک ہولناک آمریت و مطلق العنانی کا ایک بدترین دور تھا جب بے قیمتی جانیں کٹ کٹ کر اس طرح گریں کہ پھر نہ اٹھیں۔

جفا کے ہاتھ سے گردن وفا شعاروں کی　　کٹی ہے برسر میدان مگر جھکی تو نہیں

---

[۱] تذکرۃ الکرام صفحہ ۲۳۲　[۲] تذکرۃ الکرام صفحہ ۲۳۳۔　[۳] ایضاً

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ۸۳ھ میں اس قوم کے اکابرین اولین کی ہجرت حجاج کے مظالم سے جوڑنے کا ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔

اب رہا دوسری بات ۱۵۲ھ ہجری کی ہجرت۔ یہ تو عباسی حکومت کا دور تھا اور اس وقت خلیفہ منصور کی فرماں روائی تھی اور حجاج کو گذرے تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ جب ان دونوں سنوں میں سرے سے حجاج کا وجود ہی پایا نہیں جاتا تو بزرگان نوایط کا خروج اس کے ظلم و تشدد کی بنا پر کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے جہاں اس نے اپنے دور اقتدار میں دوسروں پر ظلم و ستم ڈھائے وہاں اس وقت کے موجود بزرگان نوائط پر اس کی طرف سے دست درازیاں اور ستم ظریفیاں ہوئی ہوں۔ چنانچہ تاریخ النوائط کے مصنف کو آخر چل کر یہ لکھنا پڑا۔

اس قوم کی ہجرت مدینہ مطہرہ سے مختلف زمانوں میں واقع ہوئی پہلا زمانہ ۸۳ھ کا تھا اور وہ سلسلہ اول و دوم سے مخصوص ہوتا ہے اور دوسرا زمانہ ۱۵۲ھ کا ممکن ہے تینوں سلسلوں کے افراد سے متعلق ہو پس اہل تاریخ نے فاش غلطی کی ہے جو بالعموم واقعہ ہجرت کو حجاج بن یوسف کے زمانہ حکومت سے مخصوص کیا ہے۔ بڑا تعجب اس پر ہوتا ہے جب مصنف نے قوم نایط کی نسبت کا سلسلہ حضرت جعفر صادق رض کے ساتھ لایا ہے اور جس نے ہجرت کا واقعہ ۱۵۲ھ سے متعلق کہا ہے۔ دونوں نے مظالم حجاج اور اس کی حکومت کو ہجرت کا باعث قرار دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قوم کے دو سلسلوں میں عبداللہ اور جعفر کے نام کے اتحاد سے مصنفین کے خیال کو دھوکا ہوا اور مطابقت زمانی کی طرف توجہ نہیں کی۔[۱]

اسی طرح دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"شیخ علامہ (جلال الدین سیوطیؒ) نے ہجرت کے جن واقعات کو خلیفہ وقت کے مظالم سے متعلق فرمایا ہے۔ اس میں اہل تاریخ کو کسی قدر دھوکا ہوا ہے بقول شیخ یہ امر مسلم ہے کہ یہ تمام واقعات قوم نایط کے اس گروہ سے متعلق ہیں جو اسماعیل بن جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولادیں ہیں ہرگاہ جعفر صادق رض کا میلاد ۸۳ ہجری میں ثابت ہے اور آپ کی وفات ۱۴۸ھ میں تو اس گروہ کے واقع ہجرت اولین کا وجود حجاج بن یوسف کے عہد میں نہیں مانا جا سکتا اس لیے کہ حجاج خلیفہ نہ تھا اور اس کی حکومت کا زمانہ حضرت جعفر الصادق رض کی ولادت سے پہلے گذر چکا تھا۔[۲]

اسی بحث کے ضمن میں تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

اور یہی حالت دوسرے سنہ یعنی ۱۵۲ھ کی ہے یہ زمانہ خلافت عباسیہ کا ہے

---

[۱] تاریخ النوایط عزیز جنگ صفحہ ۴۲   [۲] تاریخ النوائط صفحہ ۳۸

اس وقت دوسرا خلیفہ عباسی منصور رواد حکومت دے رہا تھا اس لیے حجاج کے ظلم و ستم کی روایات خصوصاً اس معاملہ میں صحیح نہیں ٹھہرتیں۔ چونکہ حجاج اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے بدنام ہے اس لیے نوایط کی ہجرت کو اس کے ظلم سے منسوب کر دینا اگرچہ سہل ہے مگر تاریخ سے ثابت کرنا دشوار ہے لہ

عبدالملک بن مروان نے اپنے دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف ثقفی کے علاوہ ایک اور زور آور شدید القوۃ شخص کو کوفہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اس کا نام ہے مختار بن ابی عبیدہ ثقفی۔ اس نے انتقام حسین کی ایسی آگ بھڑکائی کہ سارا کوفہ شعلہ زار اور میدان کارزار بن گیا۔ اس نے چن چن کر نہ صرف قاتلان حسین کو ٹھکانے لگا دیا بلکہ جنھوں نے حضرت امام حسین کے خلاف صف آرائی میں کسی طرح کا حصہ لیا تھا یا ان کے کسی قسم کی بے حرمتی اور گستاخی کا ارتکاب کیا تھا وہ بھی اپنے کیے کی سزا بھگت کر رہے۔ المختار ثقفی نے ان سب سے بھرپور انتقام لیا اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ چند اور اقدامات ایسے بھی کیے جن سے اس کا شمار بھی ایک جابر و ظالم حاکم کے زمرے میں ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالملک نے اس کے خلاف کوفہ پر قبضہ کے لیے ابن زیاد کی ماتحتی میں ایک زبردست فوجی مہم بھیجی۔ المختار نے اس فوج کے مقابلہ کے لیے کوفیوں کی ایک پرجوش و پرزور فوج ابراہیم الاشتر کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ کوفیوں کی اس فوج کے ساتھ ایک خچر پر چادر سے ڈھکا ہوا ایک تابوت بھی تھا تاکہ اس کو دیکھ کر اہل کوفہ کے انتقامی جوش و جرأت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ دونوں لشکروں کا باہم مقابلہ ہوا۔ المختار کی فوج انتقام حسین کے نعروں کے ساتھ حملہ آور ہوئی سخت خوں ریز لڑائی کے بعد شامی فوج جو تعداد میں بہت زیادہ تھی شکست فاش اٹھائی ابن زیاد بہادری کے ساتھ لڑ کر مارا گیا۔ اس کی فوج کا بڑا حصہ وہیں ڈھیر ہو گیا باقی فرار ہو گئے۔

اس موقع پر تاریخ خلفائے عرب و اسلام کا مصنف لکھتا ہے

"یہ کامیابی تابوت سے کہی جاتی ہے جس کو مابعد میں بت پرستی سمجھا گیا اور تعزیہ داری کی اصل بھی یہیں سے معلوم ہوتی ہے۔"

آگے لکھتے ہیں :۔

"ابراہیم نے ابن زیاد کی لاش جلا دی اور اس کا سر المختار ثقفی کے پاس بھیجا۔ المختار اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔" ؎

لیکن یہ کامیابی المختار کے لیے محض عارضی ثابت ہوئی۔ چنانچہ مورخ ابو الفدا لکھتے ہیں :۔

لہ تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۶۸ ۔ ؎ تذکرۃ الکرام تاریخ خلفائے عرب و اسلام مصنفہ سید شاہ محمد کبیر ص ۳۱۵

اللہ نے شہادت حسین کا بدلہ ابن زیاد سے لیا۔ المختار کی یہ کامیابی حقیقتاً ترحم کے لیے تھے۔ اس نے ظلوم
طبع آدمیوں پر حکومت کی اور سختی کی اس نے جب کو امام حسین کا طرفدار بنا دیا۔ اور اس پر یہ بھی الزام
ہے کہ غلاموں کو سرداروں سے باغی کرایا۔ اس کے برخلاف ایک اجماع ہوا۔ [1]

اس اجماع کا نتیجہ یہ نکلا حضرت مصعب، جو خلیفہ ابن زبیر کے بھائی تھے اور ان کی طرف سے بصرہ میں حاکم تھے ان سے کوفیوں نے المختار کے خلاف مدد طلب کی۔ انھوں نے اس کو منظور کیا اور فارس کے حاکم مہلب کو لکھا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ فوراً موقع پر پہونچ جائے تاکہ دو طرفہ حملے سے المختار کا محاصرہ کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

المختار نے مقابلہ کیا سخت خوں ریز لڑائی ہوئی آخر اس کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور قلعہ بند ہو کر دیر تک کے ساتھ مدافعت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس پر کاری ضربیں پڑیں اور وہ زخموں کی تاب نہ لاکر موت کی آغوش میں پہونچ گیا۔ اس لڑائی میں تقریباً سات ہزار آدمی مارے گئے۔

اسی طرح مختار ثقفی اپنی عمر کے تریسٹھ برس میں مارا گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین خلفا کو شکست دی اور صرف اپنی تلوار کی قوت سے باستان کا حاکم ہوا۔ اس نے اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کیا اور انتقام حسین میں پچاس ہزار آدمی مار ڈالا۔ [2]

المختار ثقفی کے اس مختصر سے تذکرے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ دور حاکمیت میں بھی کوفہ اور اس کے ملحقہ علاقوں میں فتنہ و فساد برپا تھا۔ دار و گیر کا بازار گرم تھا اور سخت بدامنی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی اہل کوفہ کثرت سے ترک وطن کر رہے تھے اور نسبتاً زیادہ امن کے مقام کی طرف پہونچ رہے تھے۔

اور کم و بیش یہی حال عبدالملک بن مروان کا مکہ معظمہ میں ابن زبیر کے خلاف حملے کے دوران تھا۔ پیدا۔ اس کے علاوہ دیگر واقعات و حالات کے ہونے ہوئے قوم نوایط کے خروج کے بارے میں صرف حجاج بن یوسف کا نام لیا جانا جب کہ اس میں مطابقت زمانی بھی نہیں پائی جاتی جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ بہت ہی افسوس ناک تاریخی فروگذاشت نظر آتی ہے۔

نایطی القاب

اس قوم کا ہر خاندان الگ الگ القاب سے منسوب یا موسوم ہے لقب سے مراد وہ ہے جس سے موسوم کی مدح یا ذم کا اظہار ہو۔ یا وہ مدح و ذم پر دلالت کرتا ہو یا وہ نام کسی خاص حقیقت یا کسی

---

[1] تذکرۃ الکرام سید محمد شاہ محمد کبیر ص ۔ [2] تذکرۃ الکرام سید محمد شاہ محمد کبیر ص ۳۱۶

حصول اعزاز کی بنا پر پڑ گیا ہو۔

قوم نوایط کے عام طور پر جو القاب مروج ہیں وہ عجیب و غریب ہونے کے علاوہ بعض ایسے بھی ہیں جن سے مدح کے بجائے ذم کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

مروجہ القاب کے بنیادی اسباب

۱۔ جن کی نسبت اپنے مورث اعلیٰ جد بزرگوار یا کسی معروف قبیلے یا خاندان سے رہی ہو۔

۲۔ کسی کسب و پیشہ یا شغل معاش سے کسی طرح کا تعلق رہا ہو۔ اور اسی سے وہ اور ان کا خاندان منسوب اور مشہور ہوا ہو۔

۳۔ کسی شہر سے ابتداءً یا بعد میں ان کی سکونت رہی ہو اور اسی ملک و مقام سے انہیں منسوب کیا گیا ہو۔

۴: ان کے مورث اعلیٰ یا خاندانی بزرگوار کو حکومت یا عوام کی طرف سے کوئی اعزاز، خطاب یا منصب پایا تھا۔ یا ان سے کوئی مذہبی خدمت متعلق رہی ہو اور بعد میں ان کے متخلفین نے اسی کو بطور لقب کے اختیار کیا ہو۔

۵۔ جس خاندان کے مورث اعلیٰ کسی خاص صفت یا امتیازی کمال سے متصف رہے ہوں اور وہی ان کے اخلاف کا لقب بن گیا ہو۔

۶۔ جنھوں نے غیر قوموں سے شادی بیاہ کا رشتہ جوڑا اور کفو کے حدود کو ملحوظ نہیں رکھا تو برائے شناسائی و امتیاز انھیں اسی رشتہ سے متعلق نام دیا گیا اور اسی سے وہ ملقب ہو گئے ہوں۔

جہاں تک مروجہ القاب کا تعلق ہے وہ کم و بیش انہیں اسباب کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں اس میں تعجب نہیں ان میں سے بعض القاب معنوی اعتبار سے اپنی مقصدیت کا حق ادا نہیں اور بعض القاب کو تو مرور زمانہ نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ نہ تو ان سے ان کے قدیم اصل خاندان کا پتہ ملتا ہے نہ عربیت ہی سے اس کا سلسلہ جڑتا ہے بلکہ ان میں زیادہ تر تو دیسی بھاشا کی پیداوار اور مقامی اصطلاح کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں لکھتے ہیں :۔

"برائے شناسائی ہر فرقہ را باندک ملابست با چیزے نسبت یا بچیز لقب ساختند غریب لقبہا درین گروہ شائع است"

کوکن کے مختلف اضلاع کے گزیٹر کے حوالے سے "تاریخ کوکن" میں کوکن کے اہل نوائط کی ایک سو گیارہ القاب کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جو ۱۸۸۶ء (سن طباعت گزیٹر) میں رائج تھے۔

ان میں چند ایسے قبیلوں کی اصلیت اور قدامت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً مقبہ۔ قریشی مقری، قاضی، خطیب، شریف۔ مغربی۔ فقیہہ وغیرہ باقی تمام مقامی بالخصوص مرہٹی زبان کے ساختہ پرداختہ ہیں جیسے جلالی۔ نلیانی۔ کھتیتھے۔ مرگھے۔ کھوٹے۔ ڈمٹکر۔ پالوبہ۔ گھٹے۔ پلوارے، کھوٹے کنگلے۔ جینکر باندھے۔ دہوگلے۔ کرتے۔ ہانڈے۔ چوگلے۔ موبجے وغیرہ۔

اس سلسلہ میں تاریخ النوائط کے مصنف لکھتے ہیں۔

"الغرض خاندان کے القاب تعجب خیز نہیں اس لیے کہ ہندستان کے مختلف مقامات، مختلف زبانیں اور مختلف اقوام کے لحاظ سے القاب کے بعض الفاظ رکیک یا محاورہ اردو کے برخلاف ہونا۔ اسی اختلاف کا نتیجہ ہے۔ [1]

آگے لکھتے ہیں کہ :۔

"معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اہل تصانیف اور خود قوم کے افراد کو ان الفاظ کی وجہ تسمیہ اور ان کے تعریفات کی اطلاع بہت کم ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان الفاظ کا نام القاب قوم رکھا گیا ہے بعض اہل تصنیف نے القاب کے چند الفاظ بھی لکھے ہیں اور ان کی وجہ تسمیہ پر بھی طبع آزمائی کرنا چاہا ہے۔"

اکرم خاں شاہجہاں آبادی نے اپنے ایک مختصر رسالہ احوال لقوم میں القاب کی تعریف و تعبیر میں زور قلم مارا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ القاب کی اصل حقیقت اور صحیح مفہوم تک انھیں رسائی نہیں ہو پائی تھی۔ اس لیے انھیں زیادہ تر ظن و قیاس کی پرپیچ وادیوں سے گذرنا پڑا۔ اور وہ بعض القاب کی اصل حقیقت اور صحیح مفہوم کی پردہ کشائی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم اس سلسلہ کی ان کی کوشش ہر چند قابل داد ہے۔ اسی طرح تاریخ النوائط کے مصنف،، القاب کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض القاب تاریخ کوکن اور ان میں مشترک ہیں مگر تاریخ النوائط کا زیادہ تر حصہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔ مدراس ارناٹک وغیرہ جنوب کے القاب کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان میں چند یہ ہیں۔

آگ لادے۔ باجنتری۔ برادر۔ بدری۔ چیدہ چودھری۔ حبدی۔ مہکری۔ ہزاری ادی۔ نائل۔ عنبر خانی۔ کتاب خوانی۔ ناموس۔ کھاڈ۔ غریب وغیرہ۔

ان کے مقابلہ میں بھٹکل اور اس کے اطراف میں قدیم اہل نوائط کے جو القاب مروج ہیں وہ صرف اپنے قبائل کی اصلیت کی نشان دہی کرتے ہیں بلکہ مقامی، لسانی آلائش سے بڑی حد تک دبے غبار نظر آتے ہیں ان میں قدامت کے ساتھ عربیت کا رنگ ابھر رہا ہے۔ مثلاً صدیقی (احمودی)، رکن الدینی، محتشمی، شاہ بندری، اکرمی۔ سعدی۔ فقیہہ۔ قاضی۔ خطیبی۔ علی اکبری۔

---

[1] تاریخ النوائط صفحہ ۱۸۱

مصباح، نائطی۔ عکبری۔ خلیفہ، عیدروسی۔ فقوی، معلمی، منیری، شریفی۔ عسکری۔ افریقی۔ محمد حبیبی، حاجب، (ہیجب) مولوی۔ طاہری۔ ملا، سکری۔ وغیرہ۔

بعض القاب ایسے بھی ہیں جن میں نام کے ساتھ مقامی چھاپ بھی لگ گئی ہے۔ جیسے علی بجاؤ، علی بابا محمد وجیوبا۔ چو پاپو، جوکاکو۔ جو سیدی۔ سیدی باپا وغیرہ۔

اسی طرح جہاں کسی زمانہ میں ان کی تجارت گاہیں تھیں اس کی نسبت سے وہ ان کا سرنام ہو گیا۔ جیسے برناور، اڈر باڈر، ہیلاور، انگری، سنگوٹی، کھوری، گوالی وغیرہ

ان میں چند القاب کی وضاحت ملاحظہ فرمائیں۔

القاب کی وضاحت

صدیقی:۔ جہاں تک صدیقی لقب کا تعلق ہے وہ اپنے جدی لحاظ سے دو الگ الگ خاندانوں پر منقسم ہیں۔ ان میں ایک خاندان کی جدی نسبت خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے اور دوسرے خاندان کا سلسلہ ان کے جد اعلیٰ صدیق بن عمر سے ہے۔ چنانچہ تاریخ النوایط میں لکھا گیا ہے۔

"اس لقب کے مورث اعلیٰ صدیق بن عمر تھے جو ۵۳۳ھ میں بصرہ سے ہند و ستان کے بندر دابل پر اترے۔ نائطیاں عموماً تاجر ہیں۔"[1] اول الذکر صدیقیوں کا شجرہ نسب یہ ہے:۔

ھذا النسب الشریف مخدومنا الشیخ اسماعیل السکری الصدیقی ابن شیخ ابراہیم سکری ابن شیخ عبد اللہ ابن شیخ عبد الرحمٰن سکری ابن شیخ محمد ابن شیخ احمد ابن شیخ قاسم ابن شیخ عبد الکریم ابن شیخ عبد الرحیم ابن شیخ زین الدین ابن شیخ عبد الوہاب ابن شیخ موسیٰ ابن شیخ شجاع الدین۔ ابن شیخ علاء الدین صدیق ابن ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہم۔[2]

سکری:۔ اس کی توجیہہ میں مختلف رائیں ہیں۔ تاریخ النوایط میں لکھا گیا ہے:۔

"اگرچہ یہ لفظ بالضم مشہور ہے لیکن فی الحقیقت اس کا صحیح تلفظ بالفتح ہے سکر ہندی زبان میں شکر کو کہتے ہیں۔ بیوپاریوں میں شکر کے لیے یہی لفظ بولا جاتا ہے جن افراد قوم نے شکر کی تجارت میں

---

[1] تاریخ النوایط صفحہ ۴۴۰   [2] واضح رہے کہ ہم نے سلسلہ نسب کا آغاز قوم کے ایک مسلمہ برگزیدہ بزرگ حضرت مخدوم فقیہہ اسماعیل سکری صدیقی سے کیا ہے۔

فروغ پایا وہ سکری مشہور ہوئے۔"

آگے اس لقب کے ایک بزرگ سے اپنی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان کا خیال ہے قاضی حمید اللہ مخدوم جن کی سکونت کوکن میں تھی ہر جمعہ کو جامع مسجد میں زبانوں میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ عوام کا مجمع کثیر صحن مسجد میں رہا کرتا تھا۔ آپ کے وعظ کی شہرت اس قدر ہوئی کہ جمعہ کے دن حوالی کوکن سے بھی لوگ جمع ہونے لگے کاروبار تجارت پر اس قدر اثر پڑا کہ اس دن اکثر کاروبار ملتوی رہا کرتے تھے۔ بدین وجہ جمعہ کو بندری زبان میں سکر وار کہتے ہیں مخلوق نے آپ کو سکری سے ملقب کیا۔ اسی لقب کا سلسلہ آج تک ان کے بعد کی نسلوں میں چلا آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں فقیہ مخدوم اسماعیل سکری اس خاندان کے جد اعلیٰ ہیں اور وہ مقام سکر کے رہنے والے تھے۔ [1]

افریقی

یہ خاندان شروع میں عرب سے ہجرت کر کے افریقہ چلا گیا تھا غالباً وہاں کے حالات یا آب وہوا انھیں راس نہیں آئی چونکہ ان کے بعض افراد کوکن کی اقامت اختیار کر چکے تھے اس لیے غالباً ان کی کشش انھیں کوکن کھینچ لائی ان میں سے کچھ افراد مختلف حالات واسباب کی بنا پر یہاں بھٹکل آکر آباد ہوگئے۔

افریقہ میں وہ تجارت میں امتیازی مقام رکھتے تھے اور یہی سلسلہ ان کے ساتھ کوکن میں بھی تھا اور جزا بنک ان کے ساتھ کم دبیش قائم ہے خیال ہوتا ہے یہ اپنے اصلی خاندان وقبیلے کے لحاظ سے مختلف ہیں اور عجب نہیں کہ ان کا الگ لقب بھی رہا ہو۔ لیکن افریقہ کی نسبت ان کے اصل القاب پر غالب آگئی اور وہ اسی سے منسوب ہوگئے۔ واللہ اعلم۔

شاہ بندری

اس لقب کے بارے میں تاریخ النوائط کے مولف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس

حاشیہ:۔ راقم الحروف سے ایک بزرگ نے اس بحث کے دوران بیان کیا تھا کہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ شیخ عبدالرحمٰن ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ یاد خدا میں ہمیشہ ان پر ایک سکر وارفتگی کی کیفیت طاری رہتی تھی وہ اسی کیفیت وحالت کی وجہ سے سکری کہلائے۔ ان کے بعد ان کی اولاد اسی لقب سے منسوب وملقب ہوگئی واللہ اعلم بالصواب [1] منقول خاندانی قدیم بیاض از نوشت حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ کے تیسرے بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن سے سکری لقب چل پڑا اس سے پہلے ان کا لقب صدیقی تھا۔

لقب کے مورث اعلیٰ گوا میں گذرے ہیں جن کو بادشاہی دربار سے کروڑی گیری کی خدمت تفویض تھی پھر کروڑگیری کی تعریف و توضیح کے لیے آگے لکھتے ہیں۔

"اس لقب کے مورث اعلیٰ کو بادشاہی مہر عطا کی گئی تھی جس پر "عاقبت محمود باد" کے الفاظ کندہ تھے۔

ایک حصہ نے ان کو عاقبت محمود خاں سے موسوم کیا۔ ہندوؤں کے گروہ میں شاہ مندری سے پکارے گئے۔ مندری لفظ اول زبان ہندی میں مہر شاہی کو کہتے ہیں۔ بدین وجہ کہ تفتیشِ محصول درآمد برآمد کے بعد بطریق علامت تصفیہ یہ اپنے عہدہ کی مہر تجارتی نسبتوں اور پارچہ پر شنجر سے لگاتے تھے۔ تاجرین ہنود میں ان کا نام شاہ مندری سے مشہور ہوا۔ شاہ مندری کا لقب متعدد گھرانوں میں اب تک جاری ہے۔ [۱]

راقم سطور تاریخ النوائط کی اس توجیہہ سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ انھوں نے محض سنی سنائی روایت کا سہارا لے کر ایک سیدھے سادے لفظ کو ایک نئے اور عجیب روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ بر خلاف اس کے ہمارا خیال یہ ہے کہ ان کا ابتدائی تعلق خلیج فارس کی ایک معروف بندرگاہ شاہ بندر سے تھا اور وہ وہاں سے سلسلہ تجارت ہندوستان آئے اور مختلف مقامات میں آباد ہو گئے اور وہ اپنی تجارت میں عروج و کامیابی سے نہایت ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ چونکہ وہ ابتدا میں شاہ بندر سے آئے تھے اس لیے وہ اسی نسبت سے منسوب و ملقب ہو گئے۔

جس کی تصدیق ابن بطوطہ کے درج ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ہم فالبقوط (کالی کٹ) میں پہونچے۔ ملیبار میں یہ بہت بڑا بندر ہے۔ چین جاوا اور سیلان اور مالدیپ اور یمن اور فارس کے سوداگر یہاں آتے ہیں بلکہ تمام دنیا کے تاجر یہاں جمع ہوتے ہیں اور اس بندرگاہ کا دنیا کے بڑے بڑے بندروں میں شمار ہے یہاں کا راجہ ہندو ہے جس کو سامری کہتے ہیں۔ عمر میں زیادہ ہے اور اسی طرح داڑھی منڈواتا ہے جیسے فرنگی امیر التجار کا نام ابراہیم شاہ بندر ہے۔ وہ بحرین کا باشندہ ہے بڑا عالم اور سخی ہے اور ہر طرف کے سوداگر جمع ہو کر اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔"

پھر آگے لکھتا ہے۔

"جب ہم اس شہر کے پاس پہونچے تو شیخ شہاب الدین اور ابراہیم شاہ بندر اور بڑے بڑے سوداگر اور راجہ کا نائب جس کو فلاج کہتے ہیں استقبال کے لیے آئے۔ [۲]

[۱] تاریخ النوائط صفحہ ۲۲۶۔ [۲] سفرنامہ ابن بطوطہ مترجم جعفری مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۱۰۱

یہی سیاح ملیبار کے ایک اور مشہور شہر کولم پہونچتا ہے تو اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

"مسلمان سوداگر بھی اس شہر میں بہت ہیں ان میں سب سے بڑا علاء الدین آوجی شہر آوہ کا رہنے والا ہے وہ رافضی ہے اور اس کے ہمراہی بھی اسی طریقہ کے ہیں یہ لوگ تقیہ نہیں کرتے۔ شہر کا قاضی قزوین کا ایک فاضل ہے مسلمانوں میں بہت بڑا آدمی محمد شاہ بندر ہے۔ اس کا بھائی تقی الدین بڑا فاضل ہے۔" الخ۔ [له]

اسی طرح شاہ بندر کا ذکر کوکن، گوا وغیرہ مختلف تاریخوں میں ایک ممتاز اور سربرآوردہ تاجر کی حیثیت سے ملتا ہے اور بعض قدیم آثار و حالات اس بات کا اشارہ کرتے ہیں یہ نائط خاندان مہاجرین اولین میں سے تھا اور بھٹکل سے اترنے سے پہلے ہی سے بھٹکل اور دوسرے کئی قصبوں میں مستقل سکونت رکھتا تھا۔ گو اب اس خاندان کی مختلف شاخیں مختلف گھرانوں میں بٹ گئی ہیں تاہم وہ اپنے آبائی سوداگری پیشہ میں اور بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

محتشم

یہ عرب کا ایک معروف خاندان ہے اور ان کا تعلق اولین مہاجر نوائط سے ہے۔ وہ سنہ ؟ میں کوکن میں اترے اور تجارت میں خوب فروغ حاصل کیا۔ بعض تاریخی قدیم بیانوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ چھٹی صدی کے نصف اول میں بھٹکل آئے۔ ان کے بارے میں تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے کہ اس لقب کے جد اعلیٰ محمد بن محتشم گذرے ہیں جو کوکن میں بڑے مالدار تاجر تھے۔" [٢ـه]

رکن الدین

اس خاندان کا کوئی تاریخی معتبر ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔ خیال ہوتا ہے کہ مفتی رکن الدین بن حسام الدین ایک جید عالم اور نہروالہ کے مفتی تھے۔ ان کے متعلق مولانا حکیم سید عبدالحئی اپنی کتاب "یاد ایام" میں لکھتے ہیں:۔

"فقہ اور اصول فقہ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ قاضی القضاۃ جلال الدین بن محمد اکرم گجراتی کی فرمائش سے فتاویٰ حمادیہ تصنیف کی۔ آخر میں لکھتے ہیں:۔

[له] سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ جعفری مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۱۹۱۔

[٢ـه] تاریخ النوائط ص ۱۱ بھٹکل کی مشہور مسجد دراصل محتشم مسجد ہے اس کی تعمیر و انتظام میں ان کے ایک مورث اعلیٰ نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔

"ایسے جلیل القدر مصنف کے حالات تاریکی میں ہیں اور سن وفات بھی ان کا معلوم نہ ہو سکا"۔[1]

اکرم خاں شاہجہاں پوری لکھتے ہیں :۔

"مخدوم رکن الدین کی اولاد میں ان کے دو فرزند کوکن میں اقامت اختیار کر لی تھی ان کی اولاد امجاد نے اپنا لقب اپنے مشہور جد بزرگوار کے نام سے مخدوم منسوب رکھا اور یہی قرین قیاس ہے۔

بعد میں یہ خاندان اپنے علمی شغف کے ساتھ تجارت میں لگ گیا۔ اور اس میں نہایت عروج و فروغ حاصل کیا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ حسن ابن محی الدین کوکنی ایک بڑے تاجر کی حیثیت سے ابھرے تھے۔ ان کے بارے میں تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے کہ :۔

"رکن الدین حسن نائطی ابن محی الدین کوکنی تجار مشاہیر قوم سے ہیں۔ بمبئی پریسیڈنسی کے مستقر تعلقہ بھٹکل آپ کی تجارت کا دارالصدر رہے۔ انڈے کی تجارت میں آپ کا فروغ ملکوں پر مشہور ہے تجار معاصر آپ کو کامیاب تاجر کہتے ہیں۔ آپ کی علمی قابلیت گو کم ہے لیکن اپنے فن کا عملی تجربہ بخوبی حاصل ہے۔ مؤلف نے آپ کے بعض ہم جنسوں سے ملاقات کی جو بالاتفاق آپ کی خوش معاملگی اور نیک نفس کے مداح ہیں"۔[2]

یہ خاندان کوکن کے علاوہ یہاں بھٹکل میں بھی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہے۔ گو بعد میں اس خاندان میں کئی شاخیں نکل پڑیں۔ رکن الدین کبیر۔ رکن الدین صغیر۔ رکن الدین شکرے۔ رکن الدین کاڈلی۔ رکن الدین موتیا وغیرہ۔

علمی میدان میں اپنے بزرگوں کے مقابلے نسبتاً پسماندہ لیکن کاروبار تجارت کی طرف ان کا میلان اور جھکاؤ زیادہ ہے لیکن اخلاقی و مذہبی اعتبار سے وہ اپنا ایک خاص اور امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

سعدا یا سعدی

اس خاندان کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں ایک بزرگ جن کا تعلق اس خاندان سے تھا اپنی تجارت کے ساتھ دینی و علمی مذاق بھی رکھتے تھے راقم سطور کے استفسار پر کہا تھا کہ ان کا نسبی قبیلہ بنو سعد سے ہے۔ وہ ۲۸۰ھ میں یمن سے ہندستان آئے اور کوکن میں مقیم رہے بیا لقویں صدی ہجری کے نصف اول میں بھٹکل پہنچے اور اس کو اپنا مسکن بنایا۔[3]

---

[1] یادایام ص۲۵ [2] احوال اکرم ص۲۳ [3] تاریخ النوائط ص۲۳۶ [4] یہ تھے سعد احمد حسن مرحوم وغیرہ بانی جناب شمس الدین سعد جو کئی مختلف کتابوں کے مصنف ہیں حسن موصوف نے یہ بیان کیا تھا کہ ان کے پاس ان کے خاندان کا بیان تھا ان کے دادا شمس الدین کے قلم سے لکھا ہوا دستاویز مشہور ہے۔

اسی طرح اس خاندان کے ایک اور بزرگ جو بیدر کے باشندے تھے، بتایا کہ ان کے خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ ٹیپو سلطان کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنے حسنِ انتظام و خدمت کی بنا پر بہت اچھی نام آوری اور عزت حاصل کی تھی۔ سلطنت خداداد کی طرف سے انھیں بیدر میں ایک بڑے اہم عہدے پر مامور کیا گیا تھا۔ زوال سلطنت کے بعد یہاں چلے آئے۔ انھوں نے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ باتیں انھیں اپنے بزرگوں سے معلوم ہوئی تھیں۔ چنانچہ راقم سطور کو تاریخ النوائط میں کافی تلاش کے بعد یہ نام ملا جو تقریباً ان کے بیان کے مطابق ہے۔ تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے:۔

"سعد محمد خاں نائطی مشاہیر قوم سے گزرے ہیں۔ ٹیپو سلطان والیٔ میسور کے زمانے میں آپ کو فوج کی سرگردگی تفویض تھی۔"

ریورنڈ جی یو پوپ نے اپنی تالیف ٹکسٹ بک آف انڈین ہسٹری میں آپ کو صاحب حکومت لکھا ہے اور بر سبیل اختصار آپ کا ذکر فرمایا ہے۔[1]

اکرم خاں شاہجہاں آبادی نے اس لقب کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی سعد الدین لکھا ہے، جن کا علمی پایہ بہت بلند تھا اور انھوں نے ان کا تعلق حیدرآباد دکن سے بیان کیا ہے لیکن اس کے متعلق تاریخ النوائط کے مولف لکھتے ہیں: "ممکن ہو کہ ایسا ہو لیکن حیدرآباد کی تاریخ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔"[2]

عجب نہیں کہ ان کے خاندان کا ابتدائی تعلق عرب کے ایک مشہور قبیلہ بنو سعد سے ہو اور بقول شاہجہان آبادی قاضی سعد الدین نامی بزرگ سلطنت خداداد کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہوں۔ یہ خاندان اپنے لقب کے ساتھ کافی مماثلت رکھتا ہے۔ دینداری کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ خاندان جامع مسجد کے قریب ایک مکان میں رہتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی نسل مختلف گھروں میں پھیل گئی۔ عام طور پر ان کا پیشہ تجارت ہے۔

اکرمی

ان کے خاندانی شجرہ اور نسب نامہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دراصل صدیقی ہیں۔ کافی عرصہ تک وہ اسی نسبت سے ملقب رہے پھر اس سلسلہ کے ایک بزرگوار شیخ عبدالرحمٰن سکری کے بعد وہ سکری کہلانے لگے (نوٹ: اس کی تفصیل سکری لقب کے ذیل میں لکھی گئی ہے)

پھر قاضی محمد اکرم نسبت سے اکرمی سے منسوب ہوگئے۔ شجرہ نسب بہت طویل ہے (یہاں ایک نام اصل شجرہ میں اضافہ ہے)۔

---

[1] تاریخ النوائط ص ۲۱۱۔ [2] تاریخ النوائط ص ۱۹۶

قاضی محمد امین ابن حاجی احمد ابن قاضی ابوبکر ابن احمد ابن قاضی محمد اکرم ابن قاضی محمد سکری ابن قاضی علی عتیق اللہ ابن قاضی اسماعیل ابن قاضی محمود ابن قاضی سعید علی ابن فقیہ احمد اخ الحرم فقیہ مخدوم اسماعیل سکری صمدی حق قدس سرہٗ۔

قاضی فقیہ احمد حضرت مخدوم موصوف کے حقیقی بھائی تھے۔ اس لیے یہاں سے آگے کا سلسلہ دونوں کا مل جاتا ہے۔ [1]

مختلف قلمی ذخیروں اور قدیم کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں علماء فقہاء اور قضاۃ گذرے ہیں۔ ابن بطوطہ اپنے دوران سفر میں ہو سیٹن میں جن بزرگوں کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں قاضی علی بھی ایک تھے جو اسی خاندان کے ایک بزرگ تھے جو سعید علی کے نام سے شجرہ کی نویں پشت پر گزرے ہیں۔ اس لقب کے بارے میں تاریخ النوائط کے مولف سے بھی کچھ سن لیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس لقب کے مورث اعلیٰ محمد اکرم نائطی تھے جن کی تجارت نمک کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ ان کا خاندان بہت وسیع تھا۔ موجودہ زمانہ میں اس لقب کے افراد کثرت سے ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ گذشتہ زمانہ میں محمد اکرم نام والے متعدد افراد گذرے ہیں۔ جن کا شمار مشاہیر قوم میں تھا سب کے سب بڑے مالدار تھے آج کل بھی اس لقب کے افراد متمول اور لکھ پتی تاجر ہیں اکثر مویشیوں کی تجارت کرتے ہیں اور بعض اناج کی۔ جن بزرگ سے مولف کی ملاقات کا اتفاق ہوا۔ ان کے جد اعلیٰ دو سو برس پہلے سورت میں قاضی اکرم کے نام سے مشہور رہتے۔ [2]

تاریخ النوائط کے مولف کو جن بزرگوار سے یہ حالات معلوم ہوئے اور اس پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے خیال میں وہ بڑی حد تک مبالغہ آمیزی کے سرحد تک پہونچ گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس لقب کے مورث اعلیٰ کا تعلق تجارت نمک سے کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ "گذشتہ زمانہ میں محمد اکرم نام والے متعدد افراد گذرے ہیں جن کا شمار مشاہیر قوم سے تھا۔ سب کے سب مالدار تھے آج کل بھی اس لقب کے افراد متمول اور لکھ پتی تاجر ہیں۔ اکثر مویشیوں کی تجارت کرتے ہیں۔ اور بعض اناج کی"

ہمارے خیال میں متذکرہ بالا بیان صحت و صداقت سے کما حقہ مطابقت نہیں رکھتا اس میں صرف اتنا حصہ مبنی بر حقیقت ہے۔

"ان کے خاندان کی ایک شاخ بیندور نامی ایک قصبہ میں آباد ہو گئی تھی ان میں ایک بزرگ

[1] آگے کا سلسلہ سکری لقب کے ذیل میں درج ہے۔ یہ شجرہ خاندانی بیاض سے بعینہٖ نقل کیا گیا ہے۔
[2] کتابوں میں ان کے نام کی مہر دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کنیت ابو سعید تھی اور نام علی تھا۔

عبدالقادر صاحب اکرمی ملیبار میں ایک بہت بڑے تاجر کے روپ میں ابھرے تھے۔ بعد میں ان کے فرزندوں نے کولمبو میں اپنی تجارت میں نہایت فروغ و ترقی حاصل کی تھی اور انہیں کی طرف سے مدراس میں موتیوں کی تجارت کا ایک صیغہ قائم تھا۔

اسی طرح اس خاندان کے بعض دیگر بزرگوں کا تعلق تجارت ہی سے رہا تھا۔ لیکن جہاں تک اکرمی خاندان کی اہم شاخ کا تعلق ہے ان کا غالب حصہ مذہبی، تعلیمی علمی اور تصنیفی خدمات ہی ان کی زندگی کا محبوب و مشغول مشغلہ رہا تھا۔

سوم یہ کہ دو سو برس پہلے جن محمد اکرم نامی بزرگ کا ذکر کیا گیا ہے وہ گجرات گئے تاجر نہیں بلکہ قاضی القضاۃ تھے ان کا ذکر ضمناً کسی دوسری جگہ کیا گیا ہے ان کا تعلق کسی دوسرے خاندان اور نسب سے تھا۔ بھٹکل کے اکرمی خاندان سے ہمنامی کے سوا کسی مناسبت یا تعلق کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

قاضی

قضاعت کا تعلق منصب قضارت سے تھا اسی نسبت سے ان کا خاندان منسوب اور ملقب ہوا۔ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں نوائطیوں کو اعزاز و اکرام کا نہایت بلند مقام حاصل ہو گیا تھا وہ فی الواقع ان کے عروج و اقبال کا زمانہ تھا۔ بنا رتیخ کوکن کے مصنف لکھتے ہیں:۔

مجموعی طور سے تمام نوائتی مسلمان اپنی دینداری، فضائل علمی، دینی مناقب اور بحری طاقت کے لیے مشہور تھے جیسا کہ ابن بطوطہ کے بیانات سے پتہ چلتا ہے۔ بادشاہ وقت کے فرمان سے دیندار عالم نوائطیوں کا تقرر قاضی و خطیب کے عہدوں پر کیا جاتا تھا۔ فقہی علوم پر دسترس رکھنے والوں کو فقیہہ شہر کا رتبہ دیا جاتا تھا۔ تغلقوں کے عہد میں فقیہہ شہر کو عموماً نووارد علما اور مشائخین کی شایعت و پیشوائی کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ قحط کے زمانے میں جب رشوت اور معاشی استحصال کے امکانات پیدا ہو جاتے تھے تو قاضی اور فقیہہ شہر ہی کو سرکاری گودام سے اناج کی تقسیم کی نگرانی سپرد کی جاتی تھی۔ قاضی عدلیہ اور شرعیہ کے محکموں کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور اس کے دیگر فرائض کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سب سے بڑا نگران ہوتا تھا۔ خطیب جمعہ و عیدین کی نمازوں کی خطبہ خوانی و امامت کرتا تھا۔ قاضی و خطیب عیدین کے موقعوں پر جلوس کی صورت میں اور نوبت و نقاروں کے ساتھ عیدگاہ تک بجو بجائے جاتے تھے جلوس کے آگے سبز ہلال پر حرم لہرا تار ہتا تھا ابن بطوطہ نے ملیبار اور کوکن کے ساحلی شہروں میں متعدد فقیہوں، خطیبوں اور دیگر مذہبی پیشواؤں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ سارے فقیہہ فقہ شافعی کے مقلد تھے۔

سندابور پر جب وجیانگر کا قبضہ ہو گیا تو نوائتی گھرانے گوا اور ہند و علاقوں سے

نکل کر کوکن کے دوسرے محفوظ شہروں میں جاکر بس گئے۔ ؎۱

جہاں تک مقامی قاضی خاندان کا تعلق ہے وہ دراصل صدیقی ہیں قضارت کا منصب اختیار کرنے کے بعد وہ عام طور پر قاضی کہلانے لگے۔ اور یہی ان کا لقب ہوگیا۔ کوکن اور بیجاپور سے لے کر بھٹکل تک صدیوں اب سے نصف صدی پہلے تک ان کے خاندان کی ایک شاخ میں قضارت کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ قاضی عمر ابن عتیق اللہ مرحوم کے بعد سے قضارت اس گھرانہ سے رخصت ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود اس نامور خاندان کے اکثر افراد کا پیشہ زمانہ دراز سے تجارت ہی رہا۔ اور اسی میں وہ اب بھی بہت نمایاں اور کامیاب ہے۔ اس کے ساتھ اس خاندان کا دینی رنگ کافی پختہ، علم و تعلیم سے آراستہ اور قومی و جماعتی خدمات سے وابستہ ہے۔

خطیبی

اس خاندان کے متعلق حالات کا کچھ حصہ سطور بالا میں آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ جہاں تک بھٹکل کے قدیم خطیبی خاندان کا تعلق ہے ان کی نسبت شاہی زمانے کے خطیبوں سے ہے اور ان کا تعلق اولین مہاجرین سے ہے اور یہ خاندان کوکن، دکن وغیرہ مختلف ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔ کوکن سے اس خاندان کے کچھ افراد گوا چلے گئے اور تجارت میں لگ گئے اور اس میں معتدبہ فروغ حاصل ہوا۔ اصل کی۔ لیکن گو واپر وجیانگر کے تسلط کے بعد وہاں سے نکل گئے کچھ واپس کوکن چلے گئے اور کچھ ادھر بھٹکل میں آکر پناہ لی۔ خطابت سے پہلے اس خاندان کا لقب کیا تھا اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

بھٹکل کے خطیبوں میں ایک خاندان مقامی عہدہ خطابت کی بنا پر خطیبیت سے ملقب ہو گیا ؎۲ انھیں قدیم خطیبی گھرانہ سے کوئی نسبت نہیں۔

بہر حال خطیبی عموماً ایک دیندار، نیکی شعار، پاکیزہ کردار خاندان ہے علمی و دینی اوصاف سے متصف اور تجارت کے میدان میں بھی راہ ترقی پر گامزن ہے۔

داموددی

اس لقب کے متعلق تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے کہ:۔

"بعض افراد قوم نے اس کا صحیح لفظ دان دا کہا لیکن دونوں کی وجہ تسمیہ سے وہ محض ناواقف ہیں۔ اس خاندان کے تاریخی واقعات سے اس قدر پتہ ملتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ بندر گوا میں

؎۲ تاریخ النوائط

؎۱ تاریخ کوکن صفحہ ۱۱۱ ڈاکٹر روشن محی الدین۔

بستی شہر میں بڑے مالدار کروڑ پتی تاجر گذرے ہیں۔ ہر ایک قسم کی تجارت کو ان کے پاس فروغ تھا۔ مساکین و غربا کی امداد میں ان کا نام ملکوں میں مشہور تھا وہ ان ناموں سے پکارے جاتے تھے یہ الفاظ زبان ہندی کے ہیں جن کے معنی نیاشا دریادل لکھ لٹ، لکھ بخش کے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہیں الفاظ کا ... احترام دیا دان و عوام کی زبان پر رہ گیا ہو۔ ان کے بعد کی نسلوں نے اسی لفظ کو اپنے لقب کے طور پر استعمال کیا ہو۔[۱]

تاریخ النوائط کی اس توجیہہ عجیب سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جو اوصاف انہوں نے بیان کیے ہیں اول تو اس کا کوئی نمونہ ان کے حال کے افراد میں نہیں پایا جاتا۔ اور ان میں عام طور پر کفایت اور اقتصاد کا وسطی میدان نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تاریخی تحقیق کے مطابق ان کا تعلق مہاجرین اولین سے ہے اور یہ لقب شروع ہی سے اس خاندان کے ساتھ برابر آچکا ہے۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ان کا تعلق دراصل عرب کے ایک مشہور خاندان عمودی سے ہے جو بعد میں بگڑ کر اعمودی ہو گیا۔ اکرم خاں شاہجہاں آبادی شیخ عبیدالدین کے تذکرے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا جوڑ اس خاندان سے کسی طرح نہیں ملتا۔ بعض ثقہ احباب کی زبانی پتہ چلا ہے کہ عربوں میں یہ لقب اب بھی اسی طرح پایا جاتا ہے لیکن جہاں تک آثار و قرائن کا تعلق ہے۔ تاریخی روشنی میں راقم سطور کا خیال ہے کہ دمودیمن میں واقع ایک زرخیز قصبہ کا نام ہے وہ ساتویں صدی کے نصف آخر میں وہاں سے بسلسلۂ تجارت کوکن پہونچے تھے اس کے بعد حسب حالات و تجارت اغراض سے گوا وغیرہ مختلف شہروں میں رہے اور ہوسیٹن کے دور حکومت میں یہاں چلے آئے۔ ہوسیٹن کی سلطنت وجیانگر کے ملکوں بربادی کے بعد انہوں نے بھٹکل ہی میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

یہ خاندان عام طور پر تجارت پیشہ ہے، طبعاً شریف اور اخلاقی لحاظ سے ممتاز اور علمی و تعلیمی اور قومی میدان میں نمایاں اور پیش پیش ہے۔[۲]

۱۱ فقیہہ

بھٹکل میں اس لقب کے مختلف اور الگ الگ خاندان پائے جاتے ہیں۔ داد فقیہہ حاجی فقیہہ، فقیہہ احمد۔ نتی بھاؤ، فقیہہ علی۔

ان فقیہان قوم کا مختصر خلاصہ: یہ سنین ماضیہ میں فرماں روایان وقت کی طرف سے جن کو

---

[۱] تاریخ النوائط۔ [۲] قبائل عرب میں جس شخص کو قانون گوئی کی خدمت تفویض ہوتی تھی وہ خطیب کہلاتا تھا۔ نیز مساجد کے خطبہ خواں بھی خطیب کے نام سے مشہور تھے۔

فقیہہ کا منصب دیا جاتا تھا انہیں کو فقیہہ کہا جاتا تھا یہ منصب قضارت کے ہم پلہ ہوتا تھا۔ شرعی قوانین و احکام کا نفاذ و اجرا انھیں کے ذمہ رہتا تھا۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا اختیار نہیں رہتا تھا۔

فقیہہ لقب کے بارے میں تاریخ النوائط کے مؤلف لکھتے ہیں:

اس لقب کے مورث اعلیٰ فقیہہ مخدوم اسماعیل سکری یہاں ہوئے ہیں جو حضرت امام الدین مولانا محمد حسین شہید نائطی کے جد اعلیٰ تھے۔ بعض بزرگان قوم نے کہا ہے کہ آپ سکری لقب فرماتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ لاثانی فقیہہ گزرے ہیں۔ بعض اہل تاریخ نے آپ کا حال لکھا ہے۔[1]

تاریخ النوائط کا یہ لکھنا درست نہیں کہ حضرت مخدوم اسماعیل یقیناً فقیہہ تھے۔ آپ کا لقب سکری الصدیقی تھا۔ چونکہ آپ ایک بہت بڑے عالم ہونے کے ساتھ اپنے وقت کے ایک بلند پایہ فقیہہ بھی تھے آپ کے فتاویٰ مستند اور معتبر سمجھے جاتے تھے اس لیے آپ کو عام طور پر فقیہہ کہا جاتا تھا یہ ایک علمی اور فنی فضیلت تھی۔ جس کا لقب سے کوئی تعلق نہ تھا۔

الحاصل دادا خاندان کے ایک جد اعلیٰ کو حکومت وقت کی طرف سے فقیہہ کا منصب سپرد ہوا تھا اس لیے اخلاف نسلاً برائے امتیاز و تخصیص اپنے لقب دادا کے ساتھ فقیہہ جوڑ لیا اور دادا فقیہہ کہلانے لگے لیکن در اصل وہ یقیناً داودی ہی تھے۔[3]

اسی طرح حاجی فقیہہ کے متعلق اس خاندان کے ایک بزرگ جناب محی الدین حاجی فقیہہ مرحوم نے ایک مجلس میں اپنے خاندان کے متعلق بیان کیا تھا۔ ان کے جد امجد (جس کا اسم گرامی مجھے یاد نہیں رہا) کوکن میں اناج کے ایک بہت بڑے تاجر تھے اس کے ساتھ ایک بڑے پایہ کے عالم تھے۔ صبح کو درس و تدریس کی مجلسیں گرم ہوتیں تھی اور رات کو وعظ بیان فرماتے تھے۔ ان کے وعظ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ اس میں کثرت سے ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ ان کے فتاوی معتبر سمجھے جاتے تھے ان کی قابلیت اور مقبولیت کو دیکھ کر مرتضیٰ نظام شاہ نے ۱۰۰۶ھ میں شہر کا فقیہہ مقرر کیا اس سے پہلے وہ محض حاجی کے نام سے مشہور تھے فقیہہ ہونے کے بعد انھیں حاجی فقیہہ کہا جانے

[1] غالب خیال یہ ہے کہ ان کی نسبت اپنے مقام سے ہے۔ نہ معلوم کہاں واقع ہے اس کا ثبوت نہ مل سکا۔ عربی نقشہ میں بھی اس شہر کا پتہ نہ چلا۔ خیال یہ ہے کہ وہ یمن کے شہر صنعا سے قریب کوئی موضع ہو اور مرور زمانہ سے اب وہ نام بدل گیا ہو

[2] تاریخ النوائط صفحہ

[3] جناب دادا محمد میراں صاحب مرحوم نے سن تو یاد نہیں رہا راقم سطور کے والد مرحوم کو اپنے پرانے بستے میں سے کچھ کاغذات دکھائے تھے ان میں شاہی فرمان بھی تھا جو بوسیدہ اور کرم خوردہ تھا بعض حروف بالکل مٹ گئے تھے وہ فارسی میں تھا والد مرحوم نے بمشکل کچھ پڑھ لیا تھا اور وہ بتاتے تھے کہ وہ ان کے ایک خاندانی بزرگ کے نام شاہی حکمنامہ تھا۔

لگا اور یہی ان کا لقب ہو گیا جب کوکن میں سیاسی انقلاب آیا تو ہم یہاں چلے آئے۔ یہ وہ کہتے تھے کہ ان کے پاس بعض قدیم مخطوطات اب تک محفوظ ہیں واللہ اعلم۔ یہ خاندان اب دو حصوں میں منقسم ہے ایک تجارت میں مشغول اور دوسرا طبابت میں ممتاز۔ دینی رنگ غالب اور اخلاق نفیس ہیں۔

فقیہ احمدی یا فقیہ احمدا

اس خاندان کے بارے میں راقم سطور کو کچھ معلومات فراہم نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے کہ احمد نامی اس خاندان کے ایک پیش رو بزرگ کو فقیہی منصب حاصل ہوا ہو اور وہی ان کا سر نام ہو گیا ہو۔ اس خاندان کے بعض بزرگ ہمارے سامنے ہی گذرے ہیں ان کی وضع قطع اور گفتگو سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بلا شبہ اپنے نامور اسلاف کے واقعی اخلاف ہیں۔

فقیہ بھاؤ

ان کا تعلق قدیم اہل نوائط سے ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ باندہ عادل آباد (دکن) میں بہمنی دور کے فقیہ گذرے ہیں۔ بھاؤ نوائط قوم میں ایک جانا ہوا نام خطاب تھا۔ تاریخ النوائط لکھتا ہے :-

"گذشتہ زمانہ میں بعض کا خطاب بھاؤ تھا جس کے معنی برادر کے ہیں مولف نے اپنے والد ماجد سے بارہا سنا ہے کہ افراد قوم سے ایک صاحب علاء الدین نام کے تھے جن کا عرف اپنی برادری میں بھاؤ تھا۔[1]

اس کے علاوہ اکرم شاہجہاں آبادی نے اپنی تصنیف میں مختلف مقامات پر بھاؤ کا ذکر کیا ہے ان کے بیان کے مطابق اس کی نوعیت بھی ایک معزز خطاب کی سی تھی۔"

بھاؤ کے خاندان کے بعض شاخوں نے بھاؤ کے بجائے برادر کا لقب اختیار کیا لیکن یہاں بھٹکل میں بدستور بھاؤ ہی برقرار رہا۔ مندرجہ بالا فقیہان قوم میں عہدوں کی مناسبت کے علاوہ اور کوئی مناسبت ثابت نہیں ہے اور یہ مختلف خاندان اپنے الگ الگ القاب سے معروف ہیں۔

فقیہ علی

اسی طرح فقیہ علی بھی اپنے پیشرو بزرگ سے منسوب و ملقب رہے اب نہ ان کی فقیہت رہی اور نہ ہی ان کا وہ مقام اب یہ شجر بھی اپنے برگ و بار سے تہی ہوا جا رہا ہے۔

---

[1] تاریخ النوائط صفحہ ۲۲۱

۱۲- ایکری

تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے کہ :۔

بعض افراد قوم نے اس کا صحیح لفظ اعزی کہا۔ اعز زبان عربی کا لفظ ہے بمعنی شریف۔ مشہور رشید بعض افراد قوم نے فرمایا۔ ایکری لقب وہ لقب ہے جن کے مورثین اعلیٰ کو بادشاہان وقت کی طرف سے جاگیرات برد معاشی عطا ہوتے تھے۔ بالبعد الذکر معنوں میں اس کا صحیح املا ایقاری ہونا چاہیئے۔ زبان عربی میں ایقار کے معنی معافی خراج کے ساتھ زمین عطا ہونے کے ہیں۔ زمانہ حال میں افراد ایکری لقب تجارت پیشہ ہیں جن کے پاس زمینداری بھی ہے۔ [1]

راقم سطور کو تاریخ النوائط کی مندرجہ بالا تشریح سے اتفاق نہیں۔ وہ دراصل بحرین سے قریب ایک موضع عکیری کے باشندے تھے اور سلطان جمال الدین ہنوری والی ریاست سوسیٹن عکیری کے اشندے تھے۔ یہ ساتویں صدی کے نصف آخر میں گوا سے باسیٹن آئے اور باسیٹن کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد بھٹکل کی اقامت اختیار کی لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حال کے تمام اینکیری لقب افراد عکیری کی نسبت سے وابستہ نہیں کیے جا سکتے۔ ان میں ایک دوسرا خاندان اتحاد لفظی کی بنا پر ہم لقب بن گیا ہے در اصل ایک موضع اینکری کے تاجر تھے یہ خاندان عموماً تجارت پیشہ ہے۔

مصبا

یہ مصبا نہیں بلکہ در حقیقت بالکسر میم مصباح ہے۔ ان کا تعلق عرب کے ایک سر برآوردہ اور نامور شیخ صباح حمیری سے ہے تاریخ کی بعض تصانیف میں اس خاندان کا ذکر ملتا ہے اس کے علاوہ یہ لقب بعض عرب خاندانوں میں اب بھی مروج ہے اس خاندان میں ماضی میں بڑے پایہ کے عالم اور شیوخ گذرے ہیں جس میں جعفر بن اسماعیل، حسین بن ابی الفلاح، طاہر بن یحییٰ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ حسین بن محمد بن مصباح کی نسبت سے یہ مصباح کہلائے۔ "احوال القوم" میں بزرگان مصباح کا کچھ مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ کہ وہ عادل شاہی دور میں اہم مناسب پر فائز تھے۔ اس کے بعد دکن میں ان کے عروج کا ستارہ مدتوں روشن رہا۔ اس کے بعد سیاسی تغیرات وحالات نے ان کا رخ تجارت کی طرف موڑ دیا اور وہ گوا اور منگلور میں ایک کامیاب تاجر کے روپ میں ابھرے۔ "تذکرہ قوم کوکن" سے کوکن میں بھی اس خاندان کے عروج وفروغ کا سراغ ملتا ہے۔

---

[1] تاریخ النوائط صفحہ ۲۲۹

یہ خاندان شروع میں کہاں سے آیا تھا اس کا پتہ نہ چلا۔ عجب نہیں کہ وہ ۱۵۲ھ ہجری میں آنے والے اہل نوائط کے ساتھ آئے ہوں۔ اور بھٹکل میں مستقلاً آباد ہو گئے ہیں ان کی ایک شاخ جو دکن اور بیلگام کی طرف نکل گئی تھی اس کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔ یہ خاندان اب بھی تجارت میں بہت ممتاز و نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ دیندار بھی ہے۔ علم و تعلیم کا شائق اور قومی مسائل و معاملات میں فراخ دلی اور اخلاص کے ساتھ حصہ لیتا ہے۔

گوائی

یہ اہل نوائط سے ہیں لیکن اس بات کی تحقیق نہ ہو سکی کہ وہ کس سنہ اور کس قافلہ کے ساتھ اور کہاں سے آئے تھے۔ اور ان کے قدیم القاب کیا تھے؟ ان کے متعلق تمام تاریخی حقائق گوا سے نسبت کی بنا پر گوائی کے پردۂ تاریک میں چھپ کر رہ گئے۔ تاریخ النوائط میں بھی نہایت مختصر ذکر ملتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"یہ لقب ان افراد قوم کا ہے جن کے مورثین اعلیٰ کی تجارت گوا میں قائم تھی مولف نے اس لقب کے اکثر افراد سے ملاقات کی ہے الی الآن وہ اپنی آبائی تجارت میں کامیاب ہیں۔"[1]

کوکن کی ایک قدیم تاریخ میں بعض مشاہیر کے تذکرے میں عبد الرحمن سلیم عنوانی۔ احمد علی گوائی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ در اصل وہ گوائی ہی ہے لیکن گ کی جگہ غ سے معرب بنایا گیا ہے لیکن تاریخ النوائط کے مصنف عنوانی کے بحث کے دوران ایک نئی تحقیق اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اس لقب کی حقیقت ان افراد قوم سے بھی کچھ نہ معلوم ہو سکی جن کا خود یہ لقب تھا یوگ عموماً تجارت پیشہ ہیں ایک بزرگ قوم نے اپنے خاندان کا شجرہ دکھلایا جس میں بعض ناموں کے ساتھ عنوانی لقب لکھا تھا اور بعض اسماء پر عنزی۔ یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ناواقفِ حقیقت نے عنزی کو عنوانی لکھا ہو۔ عنزہ بالفتح ملک عجم کا ایک مقام ہے۔ جہاں کے رہنے والے عنزی کہلاتے ہیں۔"[2]

"ہمارے نزدیک یہ نسبت کچھ بے جوڑ سی ہے اور بعید از قیاس بھی۔ ہمارے خیال میں ان کا تعلق عجم سے نہیں بلکہ عرب ہی سے ہے۔

چونکہ انھوں نے گوا کی مستقل سکونت اختیار کی اور اس کی شہریت اور نسبت ہی کو اس زمانے

---

[1] ،[2] تاریخ النوائط ص ۲۲۹

کے حالات و اسباب کی بنا پر صلیت مجبور(؟) یہ اکثر ا نے اپنے ناموں کے ساتھ گوائی لکھنا شروع کیا جس کی بنا پر ان کی شہرت اسی لقب سے ہو گئی۔ عجب نہیں کہ دراصل ان کا لقب کچھ اور رہا ہو۔ خیال ہوتا ہے کہ ان تمام گوائیوں کا تعلق کسی ایک خاندان سے نہیں بلکہ وہ اپنی اصلیت میں الگ الگ ہیں ان میں مشترک ما بینہم صرف گوائی نسبت ہے واللہ اعلم۔

ملّا

اب سے نصف صدی پہلے تک اہل علم و فضل اور دین کے خدمت گاروں کو عام طور پر ملّا کہا جاتا تھا۔ اور یہ لقب بہت ہی باعزت اور باوقار کہا جاتا تھا۔ مولوی اور مولانا تو بعد کے القاب ہیں۔

مختلف تاریخی حالات سے خیال ہوتا ہے کہ گلبرگہ کے ملّا لقب خاندان کے جد امجد ملّا اسماعیل نائطی تھے ان کے بارے میں تاریخ النوائط کے مؤلف لکھتے ہیں۔

ملّا اسماعیل نائطی مشاہیر قوم سے گذرے ہیں جو سلطان محمد شاہ بہمنی کے درباری امراء سے تھے۔ تخت فیروزہ اور اس کے واقعات کو مورخین نے محمد شاہ بہمنی کے احوال میں لکھا ہے جس کی قیمت تقریباً ایک کرور ہون بیان ہوئی ہے۔ اس تخت فیروزہ کی حفاظت ملّا اسماعیل نوائیتہ کے آبا و اجداد سے متعلق تھی جس کی تصدیق مصنف تاریخ فرشتہ نے کی ہے اور ملّا محمد اسماعیل کو نوائیتہ تسلیم کیا ہے۔ اس سے زیادہ ان کا احوال مؤلف کا نہ مل سکا۔ [له]

اسی خاندان کے ایک بڑے پایہ کے عالم ملّا محمد زبیر گذرے ہیں جو امام المدرسین حضرت مولانا محمد حسین شہید بیدری کے اساتذہ میں گذرے ہیں۔ ایک اور بزرگ ملّا احمد نائتہ ان کے بارے میں ماثر الامراء کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"آپ شرفاء عرب سے ہیں علم و دانش، فضل و کمال سے متصف۔ علی عادل شاہ والی بیجاپور کے التفات خاص سے مدار المہام سلطنت مقرر ہوئے۔ شہنشاہ عالمگیر نے آپ کو کمال اعزاز کے ساتھ طلب کیا تھا الخ"

یہ گلبرگہ میں کس زمانہ میں آئے اس کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔

یہ خاندان نسبتاً ملّا ضرور ہے لیکن موجودہ اصطلاحی ملائیت سے انھیں کوئی تعلق نہیں یہ زیادہ عام طور پر تجارت پیشہ ہیں، دیندار ہیں اور قوم کے خدمت گذار بھی۔

له تاریخ النوائط صـ ۲۵۱

اسرمتا

تاریخ النوائط کے مولف لکھتے ہیں کہ "یہ عربی زبان کا لفظ ہے حرم کے معنی بوست کے ہیں احرام اس کی جمع ہے۔ جن تاجروں نے چمڑے کی تجارت اختیار کر رکھا تھا۔ ان کو قوم نے اسرمتا کے لقب سے پکارا اگرچہ فی زمانہ اس لقب کے اختیار کرنے والے افراد چاول اور ساگوان چوبینہ کی تجارت کرتے ہیں لیکن اپنے مورث اعلیٰ کے کاروبار کے لحاظ سے اسی ابتدائی لقب سے مشہور ہیں۔ ان کو اس لفظ کی حقیقت سے بھی بہت کم واقفیت ہے۔ ؎

تاریخ النوائط کی یہ توجیہہ کچھ عجیب اور بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے اگر حرم کی جمع احرام تسلیم کی جائے تو مقامی بولی میں نسبت کی اصطلاح کے مطابق الف کی نسبت کے ساتھ احرما ہونا چاہیئے یہ حرف "ت" جو اس میں ابھرا ہوا ہے اس کی کیا توجیہہ کی جائے گی۔

ہمارے خیال میں اسرمت عرب کے کسی اس ضلع یا شہر کا نام رہا ہو اور اسی نسبت سے یہ اسرمتا کہلائے گئے ہوں اس کے علاوہ ان کے چاول اور ساگوانی چوبینہ کی تجارت کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا ہماری معلومات کے مطابق ان کی تجارت پارچہ فروشی کی رہی تھی۔ واللہ اعلم

معلّم

اس لقب کے اختیار کیے جانے کی اصل وجہ کا علم نہ ہو سکا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے جد اعلیٰ کا کسی زمانے میں معلمی پیشہ رہا ہو۔ یا وہ جہاز کے معلم رہے ہوں۔ کیوں کہ معلم خاص طور پر جہاز کے رئیس یا کپتان کے لیے بولا جاتا ہے۔ تاریخ النوائط اور احوال القوم میں اس لقب کی وجہ جہاز کی معلمی بیان کی گئی ہے گو جہاز کی ناخدائی بھی ایک معزز عہدہ اور شریف پیشہ ہے تاہم میرا ذاتی رجحان اس سے اتفاق نہیں کرتا کیونکہ راقم سطور کو ان معلمی لقب کے بعض بزرگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے اور ان کے کچھ اوصاف بھی اس کی نظر سے گذرے ہیں۔ فن خطاطی اور حسن کتابت میں) یہ خاندان سب سے ممتاز اور نمایاں مقام رکھتا تھا۔ دین سے ان کا تعلق کافی راسخ اور گہرا تھا۔ علم و تعلیم کی طرف ان کا میلان بہت غالب نظر آتا تھا۔ ان اوصاف کی بناء پر خیال یہ ہے کہ ان کے جد اعلیٰ کا تعلق معلمی سے ضرور رہا ہوگا اور اسی نسبت سے ان کے اخلاف معلم کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ لیکن یہ بھی اب معلمی اپنے بجز لقب کے انہیں کوئی نسبت نہیں رہی۔ اور وہ اپنی معاش کے لیے مختلف وسائل پر گامزن ہیں۔

؎ تاریخ النوائط ص ۲۲۸

مولوی

بہمنی دور میں مولوی فوجی افسر کو کہا جاتا تھا۔ آج کل کی طرح اہل علم کے لیے اس کے استعمال کا رواج نہیں تھا۔ بہمنی دور میں عرب داخل ہوتے گئے لیے زیادہ تر یہ منصب تفویض ہوتا تھا۔ جو بڑی ذمہ داری اور اعتماد کا منصب سمجھا جاتا تھا۔ ان منصب داروں کی کوئی شاخ بعد میں یہاں بمشکل نیا آباد ہو گئی ہو گی۔ اب سے نصف صدی پہلے تک یہ خاندان اسی لقب کے ساتھ چل رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کے تصرف نے اب اس لقب کو مونیا کے پردے میں چھپاتا جارہا ہے۔

جب فوج ہی نہیں رہی تو محض افسری کو لے کر کیا کرتے ؟

بہر حال یہ لوگ شریف، دیندار، باہمت، وضعدار ہیں اور مختلف قسم کی تجارت سے معاش پیدا کرتے ہیں۔

۱۹- فکر دے

ان کے بارے میں تاریخ النوائط کے مؤلف لکھتے ہیں کہ :-

"خود افراد قوم سے ایک بزرگ نے فرمایا اس کا صحیح املا فقوی ہے۔ جس کو عام لوگ سہولت تحفظ کے لیے فقر دی کہنے لگے بعض تصانیف سے اس کا پتہ چلتا ہے ملک عربیہ میں فقو ایک مقام کا نام تھا یہ لقب ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ مکی یا جدی کا لقب۔ [۱]

اگر نسبت فقو مقام سے تھی تو فقوی ہونا چاہیئے نہ کہ فکر دے، اتنی بڑی تبدیلی کی وجہ بظاہر کوئی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس خاندان کے کوئی بیش رو بزرگ کا نام فخرالدین تھا ان کے متعلقین اسی نام سے منسوب رہے اور فخر اربنے کی جگہ بعد میں بگڑ گیا اور فکر دے ہو گیا یہ محض ایک خیال ہے جس کے ثبوت میں ہم کوئی حوالہ پیش نہیں کر سکتے۔

اب اگر فقوی کو تسلیم کیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مروجہ لقب کے آخری حروف "کر دے" کیسے جڑ گئے۔ بہر حال یہ بھی اہل نوائط سے ہیں اور انہیں نوائط برادری میں معاشرتی لحاظ سے مشترک و مساوی مقام حاصل رہا ہے۔ یہ گھرانہ بھی تاجروں کا ہے۔ اور اسی میں فروغ اور ترقی پارہا ہے۔

عبد الروسی :- اس خاندان کے ایک بزرگ نے بیان کیا تھا کہ :- "ہمارے جد امجد

---

[۱] تاریخ النوائط ص ۲۳۵

شیخ حسن بن اسماعیل بن احمد عبید روس یا تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں بحرین سے ہندوستان آئے تھے ان کے بعد وہ کہاں رہے ان کا پیشہ کیا تھا اس کی تفصیل وہ نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق شیخ احمد عبید روس کی اولاد سے ہو۔ لیکن ان کا بحرین سے آنا قابل تسلیم نہیں کیونکہ شیخ احمد عبید روس بصری تھے اور اپنے وقت کے ایک سر برآوردہ بزرگ تھے۔ بہر حال دور میں عید روس خاندان کو بہت عروج حاصل تھی۔ اس کے بعد ان کی اولاد مختلف مقامات میں پھیل گئی غالباً دکن کے کسی انقلابی دور میں اس خاندان کی ایک شاخ بھٹکل چلی آئی۔ یہ خاندان کچھ زیادہ وسیع نہیں ہے پھر بھی وہ اپنی قدیم نسبت کی باقیات کے طور پر زندہ اور موجود ہے نہ انھیں ماضی میں تجارت میں کچھ زیادہ فروغ تھا۔ اور نہ انھیں آج کوئی قابل لحاظ مقام حاصل ہے۔ اس لقب کا ایک اور خاندان یہاں پایا جاتا ہے اور وہ عبدالرحمن بن عثمان بن عبید روس کی اولاد ہے جو جناب مولوی محی الدین صاحب مرحوم مشہور تکیہ خلفو کے جد امجد تھے۔ جناب تکیہ خلفو موصوف کے بعد اب اس سلسلہ کو موقوف سمجھنا چاہیے۔

شینگھٹی

ایسا معلوم ہوتا ہے مرور ایام کے ساتھ ان کا تلفظ کچھ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا لقب ابتدا میں کچھ اور رہا ہو۔ دراصل ان کا تجارتی تعلق کسی زمانہ میں شہر سند ھوٹ سے رہا تھا۔ ملائی تقسیم کے لحاظ سے بالا گھاٹ حیدرآباد کے قریب ایک مشہور شہر سند ھوٹ بھی تھا۔ یہ نوایط خاندان کافی عرصہ تک سلسلۂ تجارت وہاں قیام رکھتا تھا۔ ۱۰۴۶ھ / ۱۶۳۷ء میں عالمگیر کے حکم سے رن دولہ خاں کے حملے کے دوران وہ وہاں سے نکل آئے اور یہاں بھٹکل، مرڈیشور میں آباد ہو گئے۔ سند ھوٹ سے نسبت کی بنا پر سند ھوٹی کہلائے جو بعد میں بگڑ کر سینگھٹی بن گیا۔ یہ خاندان شرفائے اہل نوائط سے ہے۔

یہ خاندان زیادہ تر مرڈیشور میں آباد ہے۔ اس خاندان کی صرف ایک شاخ یہاں بھٹکل میں رہ گئی ہے۔

چامنڈی

اس لقب کے متعلق بزرگوں سے سنا گیا ہے وہ دراصل صدیقی ہیں یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان کا تعلق سلسلہ صدیقی کے کس سلسلہ سے ہے۔ اول سے یاد دم سے لیکن ان کا ثانی لقب چامنڈی کیسے بنا اور اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے اس کا کوئی معقول اور تشفی بخش جواب نہ مل سکا اس خاندان کے ایک بزرگ کا بالواسطہ یہ بیان نقل کیا گیا ہے۔ ان کے ایک بزرگ کی بہترین کارکردگی کی بنا پر حاکم وقت کی طرف سے بطور انعام انھیں ایک زرخیز زمین بخشی گئی تھی۔ اس زمین کا نام چامنڈی تھا اور اسکو نسبت

سے وہ چانڈی کہلائے واللہ اعلم۔

بہرحال وہ اصلاً صدیقی ہیں اور تجارت و کاروباری زندگی رکھتے ہیں ان میں علی بھاؤ کے نام سے ایک اور شاخ نکل آئی جن کا شمار اپنے وقت کے بڑے زمینداروں میں ہوتا تھا اب یہ شاخ اپنی تر و تازگی کھو کر خشکی مائل نظر آ رہی ہے۔

جوکاکو

یہ خاندان بھی اصلاً صدیقی وسط میں سکری اور بارہویں صدی کے نصف اول سے جوکاکو سے منسوب ہے وہی مشہور ہو گیا ہے۔

جناب محمد اکرم کے والد بزرگوار محمد سکری کے ایک برادر حقیقی محمد حبیب تھے ان کے فرزند عبدالقادر ایک باخدا باکباز بزرگ تھے۔ عربی اور فارسی میں کافی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ آخر میں دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مقامی لوگوں کا جب ان کی طرف ہجوم ہونے لگا تھا تو وہ اس سے اکتا کر کہیں غائب ہو گئے کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ وہ برگور میں ایک پہاڑی پر عزلت گزین ہیں۔ انہیں بہ اصرار یہاں لایا گیا۔ شعر و شاعری کا مذاق تو انھیں شروع ہی سے تھا لیکن برگور سے آنے کے بعد ان کی شاعری کا رخ ایک خاص رنگ اختیار کیا گیا۔ انھوں نے اپنا تخلص اپنے مذاق و احوال کے مطابق جوکاکو رکھا ان کا کلام بوذ ابھی قدیم بیاضوں میں موجود ہے اور پرانے بزرگوں کی زبانوں پر محفوظ تھا۔ ان کے گھرانہ کو اسی تخلص سے شہرت ہو گئی اور یہی مابعد میں ان کا لقب بن گیا۔

ان میں ایک شاخ اپنے جد بزرگوار کے نقش قدم پر دینی علمی تعلیمی راہ اپنائی اور دیگر شاخیں تجارتی کاروباری اور تعلیم عصری سے بہرہ ور ہو کر سیاسی سطح سے بھی ابھر رہی ہے۔ اخلاقی لحاظ سے کافی ممتاز مذہبی جذبات و میلان رکھتے ہیں اور قومی خدمات سے اپنے لقب اور خاندان کے نام اور مقام کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔

منیرا، منیری

تاریخ النوائط میں لکھا گیا ہے کہ:۔

منیر الدین کوکنی کی اولاد نے منیرا کا لقب اختیار کیا ان کو قضاۃ کا عہدہ تفویض تھا لیکن آخر زمانہ میں ان کو تجارت میں بڑی کامیابی ہوئی۔ یہ متمول موضع کے زمیندار بھی تھے۔ ۵۰

لہ اس میں زیادہ تر حصہ جناب مولوی شمس الدین مرحوم ابن محی الدین جوکاکو مرحوم خلیفہ کے زبانی بیان کا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تحریری بیاضوں سے نقل کیا گیا ہے۔

اس کے خلاف جناب مولانا اسماعیل منیری نور اللہ مرقدہٗ جو اس قوم کے ایک بڑے پایہ کے صاحب تصانیف اور مسلم بزرگ تھے، بغیں سلسلہ بیدرو بیہ قادریہ کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت سید شیخ محمد جعفری نے ۱۳۱۱ھ میں ایک کتاب ہدیہ فرمایا تھا اس کتاب میں خود اپنے قلم سے اپنا سلسلہ اس طرح لکھتے ہیں۔ اسماعیل بن محی الدین بن محمد منیر صدیقی وسکری۔

محمد منیر کے نام کی نسبت سے وہ منیری سے منسوب و ملقب ہوئے۔ محمد منیر کے والد بزرگوار کا نام اسماعیل بن احمد سکری تھا۔ اس خاندان میں بعض علماء و شیوخ اور شعرا بھی گذرے ہیں۔ حضرت مولانا اسمٰعیل بھی اسی خاندان کے ایک مشہور اور ممتاز فاضل اور شیخ طریقت بھی تھے۔ حضرت بیدل جن کا کلام زبان زد عوام ہے اور کافی مقبول وہ اسی خاندان کے ایک بزرگ تھے۔ اس کے علاوہ شیخ حسین منیری دو بزرگ تھے جن پر مجذوب کا سا حال اکثر طاری رہتا تھا۔

بہرحال یہ خاندان قدیم اپنے نوائطہ سے ہے اور اپنے ساتھ ایک روشن اور تابناک ماضی رکھتا ہے اب اس خاندان کی ایک اہم شاخ اپنے لقب اور نام کو زندہ اور قائم رکھے ہوئے ہے۔

نایطے

نایطے بھی ایک خاندان ایسا ہے جو اپنے اصلی لقب کے ساتھ قائم ہے۔

بقول مولانا باقر آگاہ النایط جد القبیلہ بن نضر بن کنانہ و بقیۃ النسب الشریف معروفۃ۔

وہ اپنے جد اعلیٰ نایط بن نضر بن کنانہ سے ہی منسوب رہے، اور اپنے قدیم لقب ہی کو ہر طرح محفوظ و برقرار رکھا یہ عربی ممالک سے مختلف مختلف اوقات میں ہند میں آئے۔ وہ کب اور کہاں سے آئے اس کا کوئی واضح ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔ مختلف تاریخی حالات کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے وہ منزدع میں افریقہ کی طرف گئے اور اس کے بعد ۱۵۲ھ ہجری میں کوکن بیجاپور ہوتے ہوئے یہاں پہونچے وہ دوسری تجارت کے علاوہ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اس زمانہ میں یہاں عربی گھوڑوں کی بہت مانگ تھی اور قدر تھی جن کو یہاں کے راجہ اور درباری مالک بڑھ چڑھ کر خریدتے تھے اس کے بعد کے حالات کے نتیجہ کے طور پر انھیں اس تجارت کو ترک کرنا پڑا۔ بہرحال یہ بہت قدیم نسبت ہے جس کو اس خاندان نے قائم رکھا اس خاندان کی بعض شاخیں دکن اور کوکن میں موجود ہیں لیکن ان کے پیشوں، سرکار دربار کی وجہ سے ان کے القاب بدل گئے ہیں۔ لیکن مشکل کا یہ نائطی خاندان اپنے قدیم لقب پر قائم ہے اور

وہ عموماً تجارت پیشہ ہیں گو اب ان کی تجارت کو کچھ نمایاں فروغ حاصل نہیں رہا۔

کولیا

یہ خاندان اہل نوائط سے ہے ان کا لقب دراصل طاہری تھا۔ محمد شاہ طاہر نایطی شاہان عبیدہ کی اولاد سے تھے تاریخ الافکار کے مصنف ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ بعد از ہیں پیدا ہوئے سن شعور کے ساتھ مدت قلیل میں وہ جملہ علوم متداولہ سے فراغت اور کمال استعداد حاصل کی اس زمانہ میں شاہ اسماعیل صفوی بہت مشہور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے فیوض علمی سے مستفیض ہوئے اور ان کے بعد ان کی درس و تدریس کی جگہ پر مامور ہوئے کسی وجہ سے سلطان وقت ان سے ناراض ہوگئے اور انھیں جلاوطن کر دیا اور وہ عجلت سے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہندوستان دارالامان میں آکر پناہ لی۔ دکن کے ایک ساحل پر اقامت اختیار کی۔ برہان نظام شاہ کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی اور وہ انھیں احمد نگر بلا لیا اور نہایت عزت و احترام سے پیش آیا اور انھیں اپنے مقربان خاص میں شامل کر لیا۔

اس کے بعد ان کے کچھ اور حالات لکھتے ہیں جو ہماری بحث سے خارج ہیں۔ اس لقب کے بعض افراد دکن چلے گئے اور وہاں مختلف قسم کے اعزازات اور مناصب سے سرفراز ہوئے۔ ان خاندان کے ایک بزرگ عبدالقادر طاہری نایطی بھی گذرے ہیں۔ ان کے متعلق تاریخ النوائط کے مصنف لکھتے ہیں :۔

"مولوی عبدالقادر نایطی طاہر لقب، بن مولوی محمد عبدالعلی طاہر بن مولوی محمد حمزہ طاہر شافعی المذہب مشاہیر قوم و نام آور ان حیدرآباد سے ہیں۔ آپ کے جدامجد کو سرکار میسور میں افتارکی خدمت تفویض تھی۔ آپ مقام دارالسلطنت میسور میں متولد ہوئے ابتدائی تعلیم اسی مقام پر ہوئی۔ عربی اور فارسی کے کتب متداولہ سے فراغ حاصل کیا اور قانون کی جانب متوجہ ہوئے۔ ریاست میسور میں سر رشتہ منصب داروں سے آپ کا تعلق ہوا۔ جب آپ کے ماموں مولوی سید محی الدین علوی نایطی کو سرسالار جنگ وزیر اعظم حیدرآباد دکن نے طلب فرمایا تو آپ بھی ان کے ساتھ حیدرآباد آئے وہ نہایت بیدار مغز اور لائق عہدہ دار ہیں اور ہر ایک سوختہ کام کو بہت قابلیت سے ادا فرماتے ہیں۔"[1]

اس کے علاوہ اور بھی اس لقب کے افراد کوکن۔ میسور وغیرہ مقامات میں پائے جاتے ہیں۔

[1] تاریخ النوائط صفحہ ۲۳۸

ان میں سے ایک گھرانہ ادھر بھٹکل میں بھی آکر آباد ہو گیا۔ یہاں آکر اپنے طاہر جیسے پاک و صاف لقب کو کویا ہی کب کیوں اور کس لیے بدل دیا۔ اور کویا لقب اختیار کر لیا۔ اس کا ثبوت فراہم نہ ہو سکا۔

کوکن کی ایک پرانی تاریخ میں ایک جگہ اشارہ ملتا ہے کہ بعض قبائل عرب جو خلیج فارس کی طرف سے آکر کوکن میں آباد ہو گئے انھوں نے یہاں کی کولی عورتوں سے شادی بیاہ کا رشتہ رچایا۔ تو عام طور پر لوگوں نے برائے شناسائی انہیں کویا کہا۔ اور اسی نام سے منسوب ہو گئے لیکن ان قبائل میں طاہر لقب والے بھی شامل تھے اس کی تصدیق و توثیق نہ ہو سکی۔ عرب سے آنے والے اکثر افراد کا مقامی عورتوں سے شادی بیاہ کا رواج اس وقت عام تھا۔ گو اعلیٰ طبقوں میں وہ زیادہ پسندیدہ نہ تھا۔ تاہم اسے معیوب اور مذموم بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

لیبار، کارومنڈل، گجرات، کوکن میں ایسے رشتے بلا امتیاز مذہب و قوم بکثرت عمل میں آئے تھے جس کی ضروری تفصیل گذشتہ صفحات میں ہم لکھ آئے ہیں یہاں بحث صرف ایک گھرانہ کا محض نسبت کی بنا پر اس رشتے کے قومی نام کو اختیار کرنے سے ہے۔ چونکہ اس لقب کے اختیار کرنے کی اصلی وجہ پر تاریکی چھائی ہوئی ہے اس لیے ہم اس کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے۔

مسلمانوں اور مقامی باشندوں کی شادیوں کا معاملہ کسی ایک خاندان تک مخصوص نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس زمرے میں سیکڑوں خاندان اور ان کے القاب آسکتے ہیں۔

ہمیں کھانہ گزیٹر اور دیگر گزیٹرس اور تاریخ کوکن کے القاب کی طویل فہرست میں کویا کا لقب کہیں نظر نہیں آیا۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ لقب یہاں آنے کے بعد اختیار کیا گیا ہو۔ کیونکہ کولی کے بعد الف نسبتی محض لسانی اصطلاح ہے جیسے صدیقا، محتشما۔ داملا وغیرہ اور وہ اپنا لقب کویا ہی لکھتے آئے ہیں۔ واللہ اعلم من حقیقتہ۔

بہر حال ہماری تحقیق کی حد تک یہ خاندان اصلاً طاہر کہلاتے ہے نہایت شریف معاملہ فہم اور پیشہ کے اعتبار سے صدیوں سے تجارت ہی سے گہرا رابطہ و تعلق رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ چند اور القاب بھی اس قوم میں مروج ہیں اور ان کا تعلق ان کے کسی جد بزرگوار کے نام سے ہے۔ مثلاً محمود جیوپا۔ سیدی بابا۔ محمد حسینا، ابو حسینا۔ علی بابا۔ علی بابو۔ جمو بابو، علی کو۔ کاک محی الدین۔ علی اکبرا۔ حافظ کا۔ بایزیدا۔ شریفا۔ چاند خاں۔ محمد صدیقا۔ خلیفہ محمد حبیبا، جمو سیدی۔ جدآ۔ شریف احمد وغیرہ

ہو سکتا ہے ان کے اصلی القاب اور رہے ہوں لیکن وہ اپنے ایک نامور جد اعلیٰ سے منسوب ہو گئے اور وہی ان کا لقب بنا۔

محمود جیوپا: - خاندان کے ایک بزرگ کا نام محمود تھا جیوپا ان کا عرف رہا ہو گا ان کی اولاد نہیں

سے منسوب محمود جیو یا کہلائے۔ باپا مقامی بولی میں عزت و بزرگی اور پیار و محبت کے لیے بولا جاتا ہے
جیسے اردو میں بھائی جان۔ ابا جان۔ آپا جان اور باجی کا۔ اور دکن میں صاحب جی، صاحب جان
بابا جان کا عام رواج ہے۔ اسی طرح بھٹکل میں جیو بابا۔ سیدی بابا اور جو سیدی باپا نیز کا چلن
عام تھا، جیو باپو۔ علی باپو بھی اسی زمرے میں آسکتے ہیں۔ محمد جینا۔ ابو جینا اور اس طرح کے بیشتر القاب
گویا ظاہر ہے کہ ان کی نسبت اپنے بزرگوں سے ہے۔

حافظکا ان کا لقب دراصل علی اکبر تھا۔ ان کے دادا پشتوں سے پہلے ایک حافظ جی الدین گزرے ہیں اور کا کا لفظ اسی لئے لقب کی طرح عزت اور پیار کے موقعوں پر استعمال ہوتا تھا۔ جیسے اردو میں حافظ قرآن کو حافظ جی کہتے ہیں۔ دیگر [illegible] مقامی اصطلاح میں حافظکا کہا گیا اور یہی بعد میں ان کے خاندان کا لقب بن گیا۔

[illegible] تاجر اپنا اثاثہ لادی میں چھپا کر ادمار بن گئے۔

چاندخاں :۔ اپنی چاندی کی روشنی سے الگ کر چید خان بن گئے۔ شاہی دربار کا حاجب اپنی وردی اتار کر بجب بن گیا۔

مہالخے :۔ اپنی عزت اور شان کے خطاب سے دست بردار ہو کر بے معنی ہو گیا ہے۔

گتھدار :۔ دفتر اکثر اپنے کاروبار گتھ داری چھوڑ کر گو برگار بن بیٹھا۔

خلیفہ :۔ اپنی خاندانی خلافت اور معرفت دینی خدمت کی گدی چھوڑ کر اپنی شان رفتہ کی یادگار میں محض لقب پر اکتفا کر لیا۔

شریفا :۔ اپنی شرافت کے دامن کو بچاتے رہے کہ کہیں وہ داغدار نہ ہو جائے۔

شریف احمدل :۔ اپنے [illegible] بزرگ شریف احمد سے نامزد ہوئے۔ اور زمیندار بنے اور جب وہ ہو نا سکنے لگی تو اپنے پرانے پیشہ تجارت نے [illegible] اختیار کر لیا۔

جدا :۔ کہا جاتا ہے حضرت مخدوم فقیہہ اسماعیل قدس سرہ کی ہمشیرہ طاہرہ جس گھر میں رہتی تھیں اس کو عوام احتراماً جدہ گھر کہنے لگے اور اسی نسبت سے وہ جدہ لقب بن گئے۔

عسکری :۔ جن کا تعلق عادل شاہی طور میں عسکریت کی کسی اہم خدمت سے رہا۔ فوجی وردی اتار دی ان کے لیے سرمایہ عزت و افتخار بنا اور اب وہ اپنے مورثین اعلیٰ کے باقیات الصالحات کے طور پر محض عسکری ہو کر رہ گئے۔

درگا

یہ لقب کچھ عجیب سا لگتا ہے جیسا کہ بقول ان کے اس کے بارے میں کچھ گریز کرتا رہا کیونکہ تاریخ

النوائط کی عجیب و غریب توضیح غیر تشفی بخش تھی اور ناقابل فہم تھی وہ لکھتے ہیں :۔ یہ لقب، عجیب بیت صنم ازل سے مشہور ہے مؤلف نے افراد درگا لقب سے ملاقات کی ہے اور وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے۔

سنسکرت میں درگا کالی دیوی کو کہتے ہیں۔ ہندی میں یہ لفظ محض سیاہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے عجیب اتفاق ہے جو افراد اس مولف کے مؤلف کی نظر سے گذرے وہ شکل لبوں جسثہ رنگ کے سیاہ فام تھے برخلاف اہل نوائط کے جو نہایت سرخ و سفید ہوتے ہیں۔ جس طرح اسی قوم کے ایک سیہ فام فرد "افریقا" لقب کرتا ہے۔ اسی طرح درگاہ لقب کی وجہ تسمیہ کو سیاہ فامی کی علامت خیال کرنا چاہیئے۔[۱]

راقم سطور کو مندرجہ بالا تاریخ النوائط کی وضاحت سے اتفاق نہیں ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان کا تعلق کسی زمانے میں درگاپور میں تجارت کے سلسلہ میں رہا ہو اور اسی نسبت سے وہ درگاہ سے مشہور ہوئے ہوں۔ لیکن بعد میں تلاش و جستجو میں پتہ چلا کہ نواب قلی خاں حاکم سرا کا خاندانی لقب درگاہ تھا اس کا صحیح تلفظ دراصل بالفتح دال اور آخر میں ہائے مختفی کے ساتھ درگاہ ہے۔

چنانچہ وہی تاریخ النوائط کے مؤلف ٹیپو سلطان کے دادا محمد فتح کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

"نواب سعد ورج (یعنی سعادت اللہ خان) کی وفات کے بعد آپ نے راجائے میسور کی ملازمت اختیار کی اور پھر کچھ روز وہ صحبت سے ناراض ہو کر قطع تعلق کیا اور "نواب درگاہ قلی خان حاکم سرا" کے پاس چار سو پیادہ سوار اور سو سوار کے افسر مقرر ہو کر بالاپور کے قلعہ دار قرار پائے۔[۲]

اسی طرح دیگر مورخین نے بھی درگاہ خاندان کا ذکر کیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ بھٹکل میں جو درگی کہلاتے ہیں ان کا تعلق نواب درگاہ قلی خاں یا ان کے خاندان کا ذکر کیا ہے اس کے علاوہ رنگیں یہ بھی معروف لقب درگاہ سے نسبی و معنوی کسی بھی لحاظ سے کوئی بھی مناسبت ثابت نہیں ہوتی ان کا گورا رنگ ان کا حسن و جمال ان کا طور طریقہ صاف بتلاتا ہے کہ ان کا تعلق کسی شریف اعلیٰ خاندان سے ہے اور عجب نہیں کہ ان کی نسبت نواب درگاہ قلی خاں یا ان کے خاندان سے ملتا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

---

[۱] تاریخ النوائط عزیز جنگ بہادر صفحہ ۲۲۳

[۲] تاریخ النوائط صفحہ ۲۷۸

سادات کرام

سادات کے متعلق کچھ حالات گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ یہاں ہمارا موضوع ہندوستان میں مختلف اوقات وحالات اور مختلف ملکوں سے تشریف لانے والے تمام سادات کرام سے نہیں بلکہ سنہ ۵۲ھ ہجری میں ہندمیں ورود فرمانے والے سادات نالطہ سے ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے حضرات سادات کی تشریف آوری کا ذکر تاریخی کتابوں سے ثابت ہے بعض مورخین لکھتے ہیں۔ "سادات کا پہلا مسکن مدینہ منورہ ہے چونکہ یہ اہل بیت کی اولاد ہیں اس لیے ہر جگہ عوام میں ان کی بڑی قدر ومنزلت اور عزت وحرمت تھی ان کے فضائل وخصائل کے لحاظ سے بھی سادات کو بڑا دخل رہا ہے۔ کسی زمانے میں زمین کی کاشت اور سائنس کی ترقی میں جو حضرات سادات بہت نمایاں تھے۔ اسی بناپر حجاز میں بھی یہ باعزت وممتاز تھے اور حضرت امام زین العابدین کی اولاد نے اس مقام سے ترقی اور عروج حاصل کیا تھا۔

لیکن سنہ ۵۲ھ ہجری میں آنے والے سید عبداللہ ابن سید محمد ابن سید محمد ابن سید اسماعیل ابن امام زین العابدین کی بعض اولاد اور ان کے قبیلہ کے سادات تھے یہ قافلہ سات یا آٹھ کشتیوں کے ذریعہ ہندوستان پہونچا ان کے ساتھ غیر سادات اہل نوائط بھی تھے۔ تاریخی کتابوں کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کشتیاں کسی ایک مقام پر نہیں بلکہ مختلف بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوئیں پھر وہاں سے حسب ضرورت وحالات دکن، بیجاپور، گجرات اور پھر دہلی میں پہونچ کر اقامت گزیں ہوگئیں۔

زین العابدینؒ

آپ کو علی اوسط بن حسین بن علی کرم اللہ وجہہٗ بھی کہتے ہیں۔
آپ کو زین العابدین بہ سبب کثرت عبادت کے کہتے ہیں۔ آپ کے مقامات لاتعداد تھے

(تذکرۃ الکرام صفحہ ۳۵۶)

آپ کے آٹھ فرزند تھے جن کے نام یہ ہیں :۔ محمد، زید، عمر الاشرف ۔ عبدالرحمٰن سلیمان ۔ عبداللہ ۔ علی ۔ حسن۔ حضرت امام حسنؑ کو بہت اولاد ہوئی لیکن جن سے نسل کا اجرا ہوا وہ حسن مثنیٰ اور زید ہیں۔

(تذکرۃ الکرام صفحہ ۲۷۰)

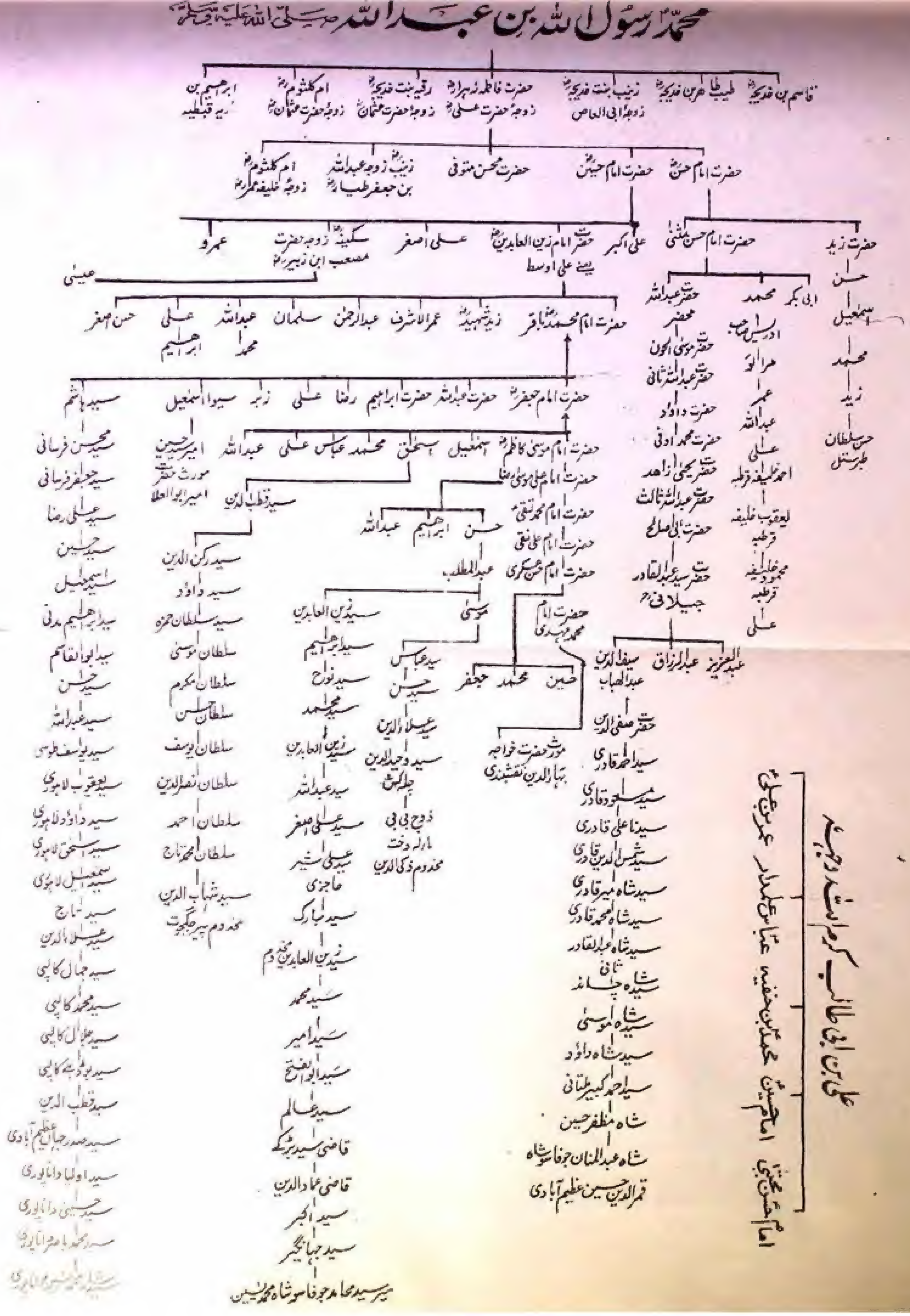

محمد رسول اللہ بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قاسم بن خدیجہؓ
طیب طاہر بن خدیجہؓ
زینب بنت خدیجہؓ زوجۂ ابی العاص
حضرت فاطمہ زہراؓ زوجۂ حضرت علیؓ
رقیہ بنت خدیجہؓ زوجۂ حضرت عثمانؓ
ام کلثومؓ زوجۂ حضرت عثمانؓ
ابراہیم بن ماریہ قبطیہ
حضرت امام حسنؓ
حضرت امام حسینؓ
حضرت محسن متوفی
زینبؓ زوجہ عبداللہ بن جعفر طیارؓ
ام کلثومؓ زوجۂ خلیفہ عمرؓ
حضرت زید
حضرت امام حسن مثنیٰ
علی اکبر
حضرت امام زین العابدینؓ یعنے علی اوسط
علی اصغر
سکینہؓ زوجہ حضرت مصعب ابن زبیرؓ
عمرو
عیسیٰ
حسن
اسمٰعیل
محمد
زید
حسن سلطان طبرستان
ابی بکر
محمد
ادریس صاحب
ادریس
عمر
عبداللہ
علی
احمد خلیفہ قرطبہ
یعقوب خلیفہ قرطبہ
محمود خلیفہ قرطبہ
علی
حضرت عبداللہ محض
حضرت موسیٰ الجون
حضرت عبداللہ ثانی
حضرت داؤد
حضرت محمد ادنی
حضرت یحییٰ زاہد
حضرت عبداللہ ثالث
حضرت ابی صالح
حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ
عبدالعزیز
عبدالرزاق
سیف الدین عبدالوہاب
حضرت صفی الدین
سید احمد قادری
سید مسعود قادری
سید علی قادری
سید شمس الدین قادری
سید شاہ میر قادری
سید شاہ محمد قادری
سید شاہ عبدالقادر ثانی
سید شاہ چاند
سید شاہ موسیٰ
سید شاہ داؤد
سید احمد کبیر ملتانی
شاہ مظفر حسین
شاہ عبدالمنان جوفاسو شاہ
قمر الدین حسین عظیم آبادی
حضرت امام محمد باقرؓ
زید شہیدؒ
عمر الاشرف
عبدالرحمن
سلیمان
عبداللہ
محمد
علی
ابراہیم
حسن اصغر
حضرت امام جعفرؓ
حضرت عبداللہ
حضرت ابراہیم
رضا
علی
زید
سید اسمٰعیل
سید ہاشم
حضرت امام موسیٰ کاظمؓ
اسمٰعیل
اسحٰق
محمد
عباس
علی
عبداللہ
امیر حسین مورث حضرت امیر ابوالعلا
سید قطب الدین
حضرت امام علی موسیٰ رضاؓ
حضرت امام محمد تقیؓ
حضرت امام علی نقی
حضرت امام حسن عسکری
حضرت امام محمد مہدی
حسن
ابراہیم
عبداللہ
عبدالمطلب
موسیٰ
سید زین العابدین
حسین
محمد
جعفر
مورث حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی
سید عباس
سید حسن
سید علاء الدین
سید وحید الدین
چلکش
ذوج بی بی مارلہ دخت مخدوم ذکی الدین
سید ابراہیم
سید نوح
سید محمد
سید زین العابدین
سید عبداللہ
سید علی اصغر
سید علی شیر
حاجزی
سید مبارک
سید زین العابدین مخدوم
سید محمد
سید امیر
سید ابوالفتح
سید عالم
قاضی سید برکت
قاضی عماد الدین
سید اکبر
سید جہانگیر
پیر سید محامد جوفاسو شاہ محمد یٰسین
سید رکن الدین
سید داؤد
سید سلطان حمزہ
سلطان موسیٰ
سلطان مکرم
سلطان حسن
سلطان یوسف
سلطان نصر الدین
سلطان احمد
سلطان محمد تاج
سید شہاب الدین
مخدوم پیر جگجوت
سید محسن فرمانی
سید جعفر فرمانی
سید علی رضا
سید حسین
سید اسمٰعیل
سید ابراہیم مدنی
سید ابوالقاسم
سید حسن
سید عبداللہ
سید یوسف طوسی
سید یعقوب لاہوری
سید داؤد لاہوری
سید اسحٰق لاہوری
سید اسمٰعیل لاہوری
سید تاج
سید علاء الدین
سید جمال کالپی
سید محمد کالپی
سید جلال کالپی
سید بڈھے کالپی
سید قطب الدین
سید صدر جہاں عظیم آبادی
سید اولیا دانا پوری
سید حسینی دانا پوری
سید محمد باقر دانا پوری
سید علی حسین دانا پوری
علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ
امام حسنؓ
امام حسینؓ
محمد بن حنفیہ
عباس
علمدار
عمر
عون

سادات نوائط

سادات نوائط کا سلسلہ کافی وسیع ہے ان سب کا تذکرہ کرنا اور ان کے مختلف خاندانوں اور گھرانوں کو ان کے صحیح نسب نامہ کی روشنی میں سمیٹنا ہمالیہ جیسی چوٹی کو سر کرنے سے کم دشوار نہ ہوگا کیونکہ سادات کی شاخیں اس کثرت سے نکل گئی ہیں جن کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ ان میں وہ خاندان بھی ہیں جن کا تعلق حقیقتاً نسل و نسب کے اعتبار سے سادات کرام سے ہے اور چند اس کے برخلاف حقیقت کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

جہاں تک نایطی سادات کا تعلق ہے ان کا قافلہ سنہ۵۲ھ میں بصرہ سے ہندستان آیا اور مستقلاً یہاں کی اقامت اختیار کی اس سے پہلے سادات نوایط کا یہاں مستقل قیام یا ادھر آنے کا کچھ ثبوت نہیں ملتا اور بصرہ سے جو سادات آئے ان کی نسبت سید اسماعیل ابن سید جعفر الصادقؒ کی اولاد سے تھی اور سادات میں مدینہ سے سب سے پہلے ہجرت کرنے والے سید عبداللہ النوایطی تھے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکی اور سید عبداللہ سید اسماعیل کے پوتے تھے۔ یعنی سید عبداللہ بن سید محمد بن سید اسماعیل بن حضرت سید جعفر الصادقؒ ابن سید باقرؒ ابن امام زین العابدینؓ۔

سید عبداللہ کے فرزند سید عبدالرحمٰن تھے جن کی وفات سنہ۵۲ھ میں بصرہ میں ہوئی ان کی وفات سے سادات کے مرکزی قیادت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور ان کی اولاد امجاد مختلف ملکوں میں پھیل گئی اور انہیں سادات کا ایک قافلہ چند کشتیوں کے ذریعہ ادھر ہندوستان پہونچ کر کوکن میں اتر پڑا اور پھر وہاں سے مختلف حالات میں امن اور تجارتی سہولتوں کے مدنظر مختلف مقامات میں آباد ہو گیا۔ جیسا کہ نواب شاہنواز خاں مآثر الامراء میں لکھتے ہیں۔

"در سواحل بحر منار متعلق بولایت دکن کہ بہ موسوم بہ کوکن است فرود آمد توطن گزیدند و مرور ایام و دہور بحوال کثرت تشعب و تفرق راہ یافتہ اماکن و مواضع آں ناحیہ را از نو گرفتند"

اس قافلے کے ساتھ آنے والے نوایطی سادات سید عبداللہ النوایطی کی اولاد یا ان کے خاندان کے متعلقین و لواحقین تھے جیسا کہ شیخ احمد طرطوسی تاریخ طرطوسی میں لکھتے ہیں۔

"بنو النوایط سید عبداللہ النوایط کی اولاد پر مشتمل ایک قوم ہے جو سید اسماعیل بن

بیدجعفر اور دقیہ رضی اللہ عنہما کے فرزند تھے "

جہاں تک مقامی سادات نوائط کا تعلق ہے وہ اپنے جدی نسبت اور سلسلوں کے لحاظ سے مختلف اور الگ الگ خانوادوں میں منقسم نظر آتے ہیں مثلاً سید محی الدینی القاب کا گھرانہ ان کے شجرۂ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے جدِ بزرگ سید علی بن سید ابراہیم بغدادی تھے ان کے صرف دو فرزندوں کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک سید محی الدین اور دوسرے سید حسن۔ ان کے سوا ان کی اولاد تھی یا نہیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ان دو بزرگوں کی اولاد انہی کے ناموں سے منسوب و ملقب ہو گئی۔ ان کا شجرہ نسب، سید علی[1]، بن سید ابراہیم بغدادی[2]، ابن سید محمد[3]، ابن سید جمال الدین[4]، ابن سید عید روس[5]، بن سید اسماعیل[6]، ابن سید علی[7]، ابن سید اسماعیل[8]، ابن سید ابراہیم[9]، ابن سید جمال الدین[10]، ابن سید شریف محمد[11]، ابن سید انور محمد[12]، ابن سید حاطم[13]، ابن سید علی[14]، ابن سید ابراہیم[15]، ابن سید احمد[16]، ابن سید علی[17]، ابن سید محمد[18]، ابن سید شمس الدین[19]، ابن سید ثابت[20]، ابن سید عظیم[21]، ابن سید محمد[22]، ابن سید موسیٰ کاظم[23]، ابن سید جعفر الصادق[24]، ابن سید باقر[25]، ابن امام زین العابدین[26]، ابن امام حسن[27]، ابن سیدنا حضرت علی بن ابی طالب[28] کرم اللہ وجہہ۔

نمبر ا بزرگ خاندان سید علی صاحب کے دوسرے بیٹے سید حسن مرحوم ان کے متعلق آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوکن سے بیجاپور چلے گئے اور وہاں سے گو ایہو پہنچے تو انھیں وجیا نگر کے حملوں کے دوران کافی نقصان اٹھانا پڑا اور وہ آخر بمشکل چلے آئے اس طرح ان کا خاندان یہاں بس گیا۔ ہمارے سامنے جو شجرہ ہے اس کے مطابق نمبر ایک بزرگ سید علی کے بڑے بیٹے سید محی الدین تھے اور ان کے فرزند کا نام بھی سید محی الدین تھا اور انھیں کے اسمی انتساب سے اس نامور خاندان کا سلسلہ چل پڑا اور وہی انکا لقب بھی بنا۔ اس خاندان کے شجرہ اصلی سے جتنی شاخیں نکلی ہیں ان سب کی تفصیل کی طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک شاخ کا نسب نامہ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جناب ایس۔ ایم سید محمد صاحب مرحوم ایس ایم ایل المتوفی کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

سید محمد[1] بن سید فقیہہ[2] بن سید عبدالرحیم[3]، بن سید فقیہہ[4]، ابن سید محمد الدین[5]، بن سید محی الدین[6] بن سید علی[7]، بن سید ابراہیم بغدادی[8]، اور سید ابراہیم بغدادی کے آگے کا سلسلہ ہم سطور بالا میں لکھ آئے ہیں۔

دیگر شاخیں اپنے سلسلوں کو اسی طرح اپنے جد امجد سے جوڑ سکتی ہیں۔

اس پورے شجرہ نسب کو بغور دیکھنے سے یہ بات کچھ کھٹکتی ہے۔ یہی ہے کہ اس نسب نامہ میں نہ سید اسماعیل کا کوئی وجود ملتا ہے اور نہ سید عبداللہ النوائطی کا نام اور نہ ہی سید عبدالرحمٰن کا

ذکر۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ان کا تعلق عراق و بصرہ سے ۵۲۰ھ میں آنے والے بزرگوں سے نہیں تھا بلکہ ان کے جد اعلیٰ سید ابراہیم کے نام کے ساتھ بغدادی کی نسبت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بغداد سے آئے تھے اور ان کا تعلق سید اسماعیل ابن سید جعفر الصادق رضی اللہ عنہما کی اولاد سے نہیں تھا۔ بہرحال عراق اور بغداد میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سادات کی ایک شاخ عراق سے بغداد چلی گئی ہو کیونکہ وہ زمانہ مسلمانوں اور خاص کر اہل سنت والجماعت کے لیے نہایت ابتلا اور سخت بدامنی کا رہا تھا۔ ۷۳۶ھ سے ۷۵۶ھ تک عراق اور اس کے ملحقہ علاقوں پر تاتاریوں کا غلبہ و اقتدار قائم ہو گیا تھا اور سلطان ابوسعید خدابندہ کی فرماں روائی میں اس کا ایک پھوپھی زاد بھائی حسن بن حسین بن بیتجا بن ایلکان کے ہاتھ میں عراق کی امارت و نظامت تھی اور تاتاری شیعہ مذہب اختیار کر لیے تھے اور ان کی خواہش اور پوری کوشش تھی کہ دوسرے مسلمان بھی شیعی مذہب اختیار کر لیں تو خیال ہوتا ہے کہ ان سادات کرام کے ساتھ حکومت کی طرف سے دست درازیاں اور ستم رسانیاں ہونے لگیں تو انھیں مجبوراً ان سے بچنے کے لیے ہندوستان کا رخ کرنا پڑا اس طرح سید ابراہیم اور ان کی اولاد ۷۵۶ھ سے ۸۰۰ھ تک کسی وقت ہندوستان پہونچ گئے ہوں گے۔ اس کا کوئی ثبوت فراہم نہ ہو سکا کہ وہ کوکن سے کب اور کن حالات میں یہاں بھٹکل پہونچے تھے کوکن سے براہ راست آئے تھے یا بیجاپور سے اور گوا سے گذرتے ہوئے آئے تھے۔ بہرحال ان کے نسب نامہ کے آخری ناموں پر غور کرنے اور اس خاندان کی مختلف پھیلی ہوئی شاخوں کے تتبع سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ساتویں صدی کے نصف آخر ہی میں بھٹکل آئے تھے واللہ اعلم۔

یہ خاندان اپنے علمی ذوق اور تعلیمی رجحان کے ساتھ تجارتی میدان میں سربلند بہت نمایاں تر اور قابل فخر مقام رکھتا ہے۔ اور یہی ان کا موروثی خاندانی سلسلہ بسلسلہ روایتی طرۂ امتیاز رہا ہے، قومی تعمیر و ترقی اور ملت کی فلاح و بہبودی اور ہمدردی سے ان کا بہت گہرا اور نہایت وسیع تعلق ہے اور ہر طرح قابل تحسین ہے۔

سید حسن

کہا جاتا ہے کہ سید حسن، سید محی الدین اول کے حقیقی بھائی تھے لیکن اس گھرانے کا کوئی نسب نامہ کافی تحقیق و جستجو کے باوجود ہماری نظر سے نہیں گذرا لیکن اس عام طور پر چلی ہوئی روایت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ سید محی الدین اول کے حقیقی بھائی تھے تو متذکرہ خاندان سید فقیہ کے نسب نامہ کی رو سے ساتویں پیڑھی کے بزرگ۔ پر سید علی ہی ان کے بھی جد امجد قرار

پائیں گے اور اس طرح ان کے آگے کا سلسلہ مل کر باہم یکائی میں ضم ہو جائے گا۔ آخری پانچ یا چھ بزرگوں کے ناموں کا سلسلہ جوڑنے سے ان کا نسب نامہ بھی مرتب و مکمل ہو سکتا ہے یہ خاندان بھی سید محی الدین کی طرح اپنے جدِ بزرگوار کے نام سے سید حسینا منسوب و ملقب ہے یہ خاندان کچھ زیادہ پھیلا نہیں۔ یہاں ان کے گنتی کے چند شاخیں پھلی پھولی نظر آتی ہیں ان کا بھی عمومی پیشہ تجارت ہی ہے۔

سیرت و اخلاق کے لحاظ سے وہ اپنے بزرگوں کے اوصاف کریمانہ سے زیادہ قریب اور مماثل نظر آتے ہیں۔

سید جمال الدین

ان کا نسبی تعلق سید جمال الدین بن سید عیدروس بن سید اسماعیل بن سید ابرھیم بن سید جمال الدین کی اولاد امجاد سے ہے اور وہ اسی نام سے منسوب و ملقب ہیں۔

یہ خاندان بھی اب ایک دو گھر تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ عام طور پر تجارت ہی ان کا ذریعہ معاش ہے آج سے نصف صدی پہلے اس خاندان میں سید جمال الدین نام کے ایک بزرگ گذرے ہیں۔ کتب بینی اور مطالعہ کے بہت شائق اور اسی میں اکثر مشغول رہتے تھے گو وہ رسمی عالم نہیں تھے مگر معلومات کافی وسیع اور گہرے تھے۔ حق مغفرت کرے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

سید محمد صاحب الجیلین

عام روایت آپ کے بارے میں یہ ہے کہ ان کا نسبی تعلق خاندان سید محی الدین سے تھا جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے وہ سید محی الدین ثانی کے خلف الرشید تھے۔ بچپن ہی سے ان کا طبعی رجحان دین ہی کی طرف رہا تھا۔ شریعت کے پابند تھے ذکر و فکر اور زہد و ریاضت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ علم ظاہری سے بہرہ ور اور علم تصوف کے شناور تھے ایک بزرگ کی روایت کے مطابق وہ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی کے مسترشد اور انہیں کی بیعت و اجازت سے مستفیض تھے شروع میں موجودہ عونیہ مسجد کے قریب ان کی رہائش گاہ تھی بعد میں اپنے مشاغل و وظائف خصوصی کے لئے شہر کے قریب ایک سنسان غیر آباد پہاڑی کے وسطی دامن کے ایک بالکل مختصر حصہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔

عوام ان کی پاکبازی، تقویٰ شعاری، ان کا تعلق مع اللہ اور ان کے عرفانی مقام و

منزلت کی بنا پر آپ کے بہت معتقد اور گرویدہ تھے اور اکثر اس پہاڑی میں جاکر آپ کی گراں قدر صحبتوں، آپ کے ملفوظات اور عمدہ نصیحتوں اور ایمانی و روحانی برکتوں سے مالا مال ہوتے تھے۔

لوگوں کا ہجوم تھا کہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ کہا جاتا ہے کسی بداندیش نے حکومت وقت (غالباً وجیانگر) تک مخبری کردی کہ "یہاں تبلیغ حق کے پردے میں حکومت کے خلاف تحریک چلائی جارہی ہے"۔

حکومت کی طرف سے ان کی گرفتاری کے لیے پولس فورس حرکت میں آگئی اور پہاڑی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے آخر انھیں ناکام واپس آنا پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے کہیں کھسکے نہیں تھے۔ اپنی جگہ برابر جمے اور ڈٹے ہوئے تھے شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور حکومت کے کارندے ان تک رسائی نہ پاسکے۔

ہفتہ بھر میں صرف جمعہ کی نماز کے لیے وہ نیچے اترتے تھے۔ وہ بڑے خدا ترس حلیم الطبع رحمدل قناعت پسند، ریاضت کوش، نیک سیرت اور عمدہ خلق و مروت کے بزرگ تھے۔

متاہل تھے ان کی اولاد کا کچھ نشان و پتہ نہیں ملا۔ وثوق کے ساتھ یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی وفات کب ہوئی۔ مختلف روایات و حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے گیارہویں صدی نصف آخر میں آپ کی رحلت ہوئی۔ اور وہیں پر ان کی تدفین ہوئی۔ اسی نسبت سے انھیں صاحب الجبلین کہا جاتا ہے۔ برد اللہ مضجعہٗ۔

برمادر

ان میں ایک قابل لحاظ شاخ برمادر کے ایک نئے لقب کے ساتھ نمودار ہوگئی۔ ان سادات کرام کی تجارت قصبہ برمادر میں کافی شہرت اور کامیابی سے قائم تھی۔ اسی نسبت سے وہ مشہور ہوئے اور وہی ان کا سرنام یا اضافی لقب اختیار کیا گیا۔ دراصل ان کا تعلق سادات حسنی کے ذریات طیبات سے ہے اور وہ اسی کی ایک شاخ کے چشم و چراغ ہیں۔

برمادر سے تجارتی تعلق منقطع ہونے کے باوجود اس کے نام کی نسبت ان کے ساتھ برابر چپکی ہوئی آرہی ہے اس خاندان کے ایک بزرگ جناب سید احمد صاحب مرحوم کو ٹیپو سلطان کی بارگاہ میں بہت کافی اثر و رسوخ حاصل تھا جس کا ثبوت سلطان ٹیپو کے اس فرمان سے ہو سکتا ہے۔

مسجد سلطانی کے متعلق ٹیپو سلطان کے فرمان کا اقتباس

منشور فیض گنجور ظل اللہ الملک المنان ٹیپو سلطان غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
بنام عاملان و قلعہ داران حال و استقبال تعلقہ نگر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ تحریر می یابد
دریں ولا سید احمد را برائے احداث مسجد سلطانی تاکید فرمودہ تا ایکہزار روپیہ
نقد جہت تیاری آں زمین دکھید ہون حیدری بطریق انعام خرچ مسجد موصوف
از سرکار حضور عنایت شدہ است ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ سنگ مرقوم و بابت
سیادت پناہ سید احمد دادہ شدہ است ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ تا اہل اسلام
باتفاق فراہم آمدہ در مسجد موصوف نماز پنجگانہ و عیدین بخوانند و برائی
۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ دین متین احمدی و ترقیات دولت خداداد استدعا
نمایند ۔ و آئندہ بہیچ وجہ متعرض حال مشار الیہ و زمین انعام مسجد سلطانی
نباید شد دریں باب تاکید بلیغ و قدغن مزید انگارند ۔ [1]

مرقوم بست و ششم ماہ خسروی سال سحر ۱۲۲۱ھ محرر خط حامد سعید [1]

سادات کی سیاسی سیادت

ڈاکٹر تارا چند بعنوان دہلی کی بادشاہت لکھتے ہیں ۔

" سیدوں اور لودی خاندان ۱۴۱۳ تا ۱۴۵۱ء اور ۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء تک

سیدوں کا خاندان ۱۴۱۳ء تا ۱۴۵۱ء جب تغلق خاندان برباد ہو گیا تو خضر خاں نے جو تیمور کے حملے کے وقت ملتان کا حاکم تھا اور جسے تیمور نے لاہور کا حاکم مقرر کیا تھا دہلی پر قبضہ کر لیا مگر اس کا اقتدار دہلی کے قریب و جوار سے آگے نہیں بڑھا اس کا عہد حکومت زیادہ تر اپنے بر سر پیکار رہنے والے امیروں سے لڑنے میں گذارا ۔ اس کے لڑکے مبارک شاہ نے ۱۴۲۱ء سے ۱۴۳۳ء تک حکومت کی آخر وہ اپنے وزیر کی سازش سے قتل کر دیا گیا اس کے بعد خضر خاں کا پوتا شہزادہ محمد تخت پر بٹھایا گیا ۔ مگر اس کا اقتدار اس کے پیش روؤں کے اقتدار سے بھی کم تھا کیونکہ اس کے بہت سے امیر اس سے منحرف ہو گئے تھے اس کے مرنے پر بہلول لودھی نے جو لاہور کا حاکم تھا ۱۴۵۱ء میں دہلی کے تخت کو اس کے نا قابل بیٹے کے ہاتھ سے چھین کر سیدوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا ۔ [2]

---

[1] اصل نقل خط ہمارے پاس محفوظ ہے جو بوسیدہ اور کرم خوردہ ہے جس سے اس کے بعض حروف کٹ اور پھٹ گئے ہیں ۔ اس کا اصل نشان ساسا خاندان کی ایک شاخ جناب برادر سید محی الدین صاحب مرحوم کے پاس موجود تھی جس کو راقم سطور نے دیکھا تھا

[2] تاریخ اہل ہند ج اول ص باب ۱۵ صفحہ ۱۶۲

سید خاندان
ملک سلیمان

(۱) خضر خاں

(۲) فرید — معز الدین مبارک

(۳) محمد

(۴) علاء الدین عالم شاہ

سیدوں کا ایک اور دور

شاہ عالم بہادر شاہ اول متوفی سنہ ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۲ء) کے بعد اس کا بیٹا جہاندار شاہ دہلی میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ لیکن اس پر حکومت کرتے ایک سال بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ اس کے بھتیجے فرخ سیر نے لڑکر اس سے تاج و تخت چھین لیا۔ فرخ سیر کی یہ کامیابی سیدوں کی زبردست کارگذاریوں کا نتیجہ تھی اور انھیں کی بدولت فرخ سیر نے تخت شاہی حاصل کی ان میں ایک سید عبد اللہ اور دوسرے سید حسین تاریخ میں وہ دونوں بھائی بادشاہ گر سید کے نام سے مشہور ہیں اور نمایاں ہیں۔ درحقیقت وہ اس وقت سلطنت کے اقتدار پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے ان دو بھائیوں اور رشتہ داروں کا ہر طرف زور دار غلبہ نظر آتا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک بھتیجے کو دکن کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ فرخ سیر ان کے اس بڑھتے ہوئے زور سے دل برداشتہ اور ناراض رہنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سیدوں نے فرخ سیر کو قید کرکے قتل کرادیا۔ اور مغلیہ خاندان کے ایک اور شہزادہ کو زینت تخت و تاج بنایا! اس پر چند ہی مہینے گذرنے پائے تھے نہ وہ رہا اور نہ اس کی شاہی رہی۔

آخران سیدوں نے شہزادہ اختر کو جس کی تاریخ میں محمد شاہ کے نام یاد کیا جاتا ہے تخت شاہی پر بٹھایا گیا یہ واقعات سنہ ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) کے ہیں ان سیدوں کو بادشاہ گر اسی لیے کہا گیا ہے کہ انھوں نے چند ہی سال میں کئی بادشاہ بنائے تھے۔

سیدوں کے اقتدار سے امرائے سلطنت و ارکین حکومت بگڑ گئے تھے ہی لیکن خود بادشاہ

محمد شاہ بھی ان کا سخت مخالف ہو گیا تھا۔ ان حالات میں محمد شاہ کی والدہ نے مالوے کے صوبیدار نواب نظام الملک کو ایک خفیہ خط لکھا "خدا کے لیے تم بادشاہ کی عزت بچانے کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اس کو سیدوں کے آہنی پنجہ سے رہا کرا دو"۔

اس خط پر نواب نظام الملک سیدوں سے مقابلہ کیلئے کمربستہ ہو گیا اور اس نے مالوے سے دکن کا رخ کیا جہاں سید حسین اور سید عبداللہ کا بھتیجا سید عالم علی صوبیدار تھا بالا پور (برار) میں نظام الملک اور سید عالم علی میں سخت جنگ ہوئی اور آخر نظام الملک کو فتح ہوئی۔ اور دکن پر نظام الملک قابض ہو گیا۔ سید عالم علی مارا گیا اور اس کی صوبیداری کا خاتمہ ہو گیا ابھی دنوں ایک دشمن کے ہاتھ سے سید حسین کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔ اب رہے سید عبداللہ وہ آخر دم تک لڑتے رہے اور انجام کار گرفتار ہو گئے اس طرح بادشاہ گر سیدوں کا زور ٹوٹ گیا اور ۱۱۳۲ھ / ۱۷۲۰ء میں مغل بادشاہ کی آزادی و خودمختاری بحال ہو گئی۔

شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی

شروع میں ہندوستان آنے والے سادات کرام میں ایک جلیل القدر بزرگ شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی کی ذات گرامی تھی۔ آپ کا سلسلہ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما پر منتہی ہوتا ہے اور وہ اس طرح ہے۔

امیر قطب الدین محمد بن رشید الدین احمد بن یوسف بن عیسیٰ بن حسن بن حسین بن جعفر بن قاسم بن عبداللہ بن حسین النقیب الکوفہ بن محمد نفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن حسن مجتبیٰ بن علی المرتضیٰ بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔ اور حسن مثنیٰ کی بیوی ان کی عم زادی فاطمہ صغریٰ تھی جو امام حسین علیہ السلام کی چھوٹی بیٹی تھی اس بنا پر اس خاندان کے ذریات طیبات کو حسنی اور حسینی کہا جاتا ہے۔ امیر قطب الدین محمد، حضرت شیخ المشائخ سید عبدالقادر جیلانی کے خواہرزادے اور ان کے مسترشد تھے۔

امام محمد نفس الزکیہ کی شہادت کے بعد ان کی اولاد امجاد اور بنی اعمام مختلف بلاد عرب، عراق اور افریقہ وغیرہ مختلف مقامات میں جہاں انھیں نسبتاً امن ملا جا کر بس گئے تھے۔ [1]

---

[1] یہ ہمارے جناب مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء کے جد امجد تھے آپ کا سلسلہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت امیر قطب الدین محمد المدنی ایک بڑے پایہ کے عارف اور اولیائے واصلین میں سے تھے وہ اپنے ماموں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی جیتے جی تک ان کے دامن رشد و ہدایت سے وابستہ رہے آپ کی وفات کے بعد حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ کی فیضان تربیت سے محروم ہوئے۔ اور ان کے بزرگ ترین خلفاء میں شمار کیے گئے۔ آپ کے بے شمار مریدان باصفا میں سلطان قطب الدین ایبک بھی آپ کا ایک مرید و معتقد تھا۔

روایات صادقہ میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ہدایت حضرت امیر قطب الدین محمد مدنی چھٹی صدی کے شروع میں اپنے ہزاروں مریدین و متعلقین کے ساتھ اس سرزمین ہند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ یہاں کے غیر مسلم کسی مسلمان کو اپنی سرزمین میں دیکھنا تک گوارا نہ کرتے تھے تو وہ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت کا آنا کب برداشت کر سکتے تھے چنانچہ ان کی طرف سے پوری شد و مد کے ساتھ مزاحمت ہوئی اور اس کی مدافعت میں حضرت قطب الدین اور ان کے رفقائے کار کو جہاد کرنا پڑا۔ اس طرح مانک پور اور کڑہ کے ظلمت کدہ کو اسلام کی نور ان شمعوں سے روشن کر دیا اور کڑہ ہی کی سرزمین میں آسودۂ خاک ہو گئے آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

حضرت امیر قطب الدین کی اولاد میں یکے بعد دیگرے جتنے اولیاء اللہ، صلحائے امت اور علما و فضلائے ملت پیدا ہوئے اس کی نظیر کسی اور خاندان میں کم ہی ملتی ہے۔ جن میں حضرت سید احمد پالتی پوری حضرت سید محمد صالح فتحپوری حضرت سید فضل اللہ گوشائیں حضرت سید محمد نقی درویش بے ریا۔ ولایت و صالحیت کے نہایت ہی بلند اور ممتاز مقام پر فائز رہے تھے ان کے علاوہ قاضی سید رکن الدین نصیر آبادی اور قاضی سید احمد بھی بڑے پایہ کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ قاضی سید احمد کے پوتے حضرت سید محمد فضیل بھی اپنی زہد و ریاضت اور اتباع سنت کی بنا پر بڑے پاکباز بزرگوں میں تھے۔

بعد میں وہ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور وہیں رحلت پائی اور آپ کے دوسرے پوتے حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) امیر قطب الدین تک اس طرح پہونچتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بن مولانا سید عبد الحئی بن فخر الدین بن عبد العلی بن علی محمد بن اکبر شاہ بن محمد شاہ بن محمد تقی بن عبد الرحیم بن ہدایت اللہ بن محمد اسحاق بن محمد معظم بن قاضی احمد بن قاضی محمود بن قاضی ... رکن بن امیر قطب ... ثانی بن صدر الدین بن زین الدین بن احمد بن علی بن قیام الدین بن صدر الدین بن قاضی رکن الدین بن امیر نظام الدین بن شیخ الاسلام امیر قطب الدین محمد المدنی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

نوٹ:۔ اس سے آگے کا سلسلہ سطور بالا میں لکھا گیا ہے یہ سلسلۃ الذہبیہ یاد ایام کے دیباچہ سے نقل کیا گیا ہے جس کو حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی مرحوم نے تحریر فرمایا تھا۔

سید محمد اسحاق بھی ایک بڑے پایہ کے عارف کامل تھے۔

آپ کے صاحبزادے حضرت خواجہ احمد دیوان اپنے وقت کے ایک متبحر عالم اور شیخ طریقت بھی تھے آپ نے اس زمانہ میں عام طور پر مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بہت ساری برائیوں اور بدعتوں کو مٹا کر انھیں اسلامی شریعت کا پابند بنانے میں نہایت نمایاں کردار انجام دیا تھا۔

حضرت سید شاہ علم اللہ بھی ایک جلیل القدر بزرگ تھے اور وہ حضرت سید محمد نفیل کے خلف الرشید تھے۔ جو حضرت سید آدم بنوری کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ شاہ پیر محمد لکھنوی۔ ملا جیون امیٹھوی، عبدالشکور شاہ مجذوب حضرت غلام مصطفیٰ جائسی اور دیگر علماء و مشائخین بھی آپ سے ارادت و عقیدت کا رابطہ رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب ممدوح کی اولاد امجاد میں یکے بعد دیگرے اکابر اولیاء اور نامور علماء گذرے ہیں جن میں سے بعض مشاہیر کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت سید محمد جی۔ حضرت سید محمد عدل عرف شاہ لعل صاحب۔ حضرت سید محمد ضیا حضرت سید محمد ثنا، حضرت شاہ محمد صابر شاہ ابوسعید شاہ محمد واضح حضرت سید قطب الہدیٰ حضرت سید محمد طاہر، حضرت شاہ ضیاء النبی، حضرت سید مصطفیٰ، حضرت سید محمد اسحاق اور عہد شناس کرامت تا زمرد مجاہد مصلح اعظم شیخ الکبیر حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

حضرت مولانا سید احمد شہید کی زندگی کے حالات ان کی گراں بہا خدمات اور ان کے روشن تزین کارناموں پر مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہم یہاں ان کے متعلق خود کچھ مزید لکھنے کے بجائے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ آپ کے ایک مشہور و معروف معاصر سرسید احمد خاں مرحوم نے جو ان کو دیکھا تھا انھوں نے آپ کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں خود انھیں کے قلم سے بجنسہ نقل کرتے ہیں۔ سرسید احمد خاں مرحوم اپنی کتاب آثار الصنادید جو سید صاحب کی شہادت کے پندرہ سال بعد لکھی گئی تھی لکھتے ہیں:۔

جناب ہدایت انتساب زبدۂ واصلان درگاہ سید احمد صاحب طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ، سادات عظام و مشائخ کرام سے تھے۔ آپ کا وطن اصلی بریلی (رائے بریلی) اوائل حال میں شوق طلب علمی میں وطن سے وارد شاہ جہاں آباد ہو کر حضرت بابرکت مولانا سید عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت سراسر افادت میں حاضر ہو کر مسجد اکبرآبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سوادہ حاصل کیا۔ از بسکہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں بڑی ہوئی تھی اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردین و صادر دلیشان پاک طینت کی جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر صاحب مغفور و موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے دل سرگرم ہوتے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے۔ اور اکثر اوقات میں کبھی اپنے اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا جو ذاکر صرف

اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ گزین تھے ان سے بھی اس طرح خاطر مجموع اور حضور قلب سے ظہور میسر نہ آتے تھے۔

اکثر مولانا مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منش ترقی مدارج علیا کا قابل نظر آتا ہے۔ اسی اثنا میں سرگروہ علماء و نام طبقات عظام جامع کمالات صوری و معنوی خادم حدیث شریف نبوی مورد او بالفضل اولانا مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا ارادہ کیا جب ان کی خدمت میں گئے مولانا ممدوح نے جو ان کے حالات سے واقف تھے فرمایا۔ اگرچہ حق جل و علی نے اس صاف باطن کو اختیار طریقہ رشد و ہدایت کے باب میں واسطے کا محتاج نہیں کیا اور وسیلہ کا نیاز مند نہیں کیا۔ لیکن اہل ظاہر کے نزدیک ہر چند کہ یہ ایک سبب ضروری ہے رفع حجت عوام کے واسطے کچھ مضائقہ نہیں پھر آپ نے مولانا موصوف سے بیعت کی۔ بعد چند مدت سفر اختیار کیا اور اطراف و جوانب میں خدا شناسان پاک باطن سے فیض حاصل کرنے میں سرگرم رہے۔ از بس کہ مقامات عالی روز بروز کھلتے جاتے تھے۔ اور مراتب علیا آناً فاناً ترقی میں تھے اس دولت بے زوال سے اہل ظاہر کو آگاہی ہوئی اور ہر طرف سے لوگوں نے ہجوم کیا۔ اور کسی نے بیعت اور کسی نے روائے حاجات سے سوال کرنا شروع کردیا۔ چونکہ حفاظت حالات اور ستر احوال منظور تھا خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس میں ملبس ہو کر علم باطن کی تحصیل کی جائے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں خلل انداز نہ ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی طرف تشریف لے گئے اور نواب امیر خاں کی رفاقت میں بسر کی اور از بس کہ شجاعت اور جوانمردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے اس اثنا میں فتوحات عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے اور باوجود اس کے تلاش اہل باطن ...... تھی اور اکثر لوگوں کی ہدایت کی راہ بھی آپ سے حاصل ہوئی جب اس عرصہ میں جمیع مراتب کی تکمیل ہو گئی آپ ترک دنیا کر کے پھر شاہجہان آباد دہلی تشریف لائے اور مسجد اکبرآبادی میں وارد ہوئے اس اثنا میں مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور مولوی محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ تمام علوم رسمیہ کے درس و تدریس میں مصروف تھے اور اہل باطن کی طرف چنداں ملتفت نہ ہوتے تھے جب اس دفعہ آپ کے تشریف لانے سے مرحوم شہر میں ایک غلغلہ برپا تھا اور طالب فیض باطن کے کثرت سے رجوع کرنے لگے ایک روز دونوں صاحب بہ اتفاق مولوی عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کی خدمت میں جا کر عرض کیا ہم کو نماز حضور قلب سے کبھی میسر نہیں ہوئی۔ اگر آپ کی ہدایت سے یہ امر حاصل ہو جائے تو عین مدعا ہے۔ حضرت نے کشف باطن سے معلوم کیا کہ یہ بطریق امتحان اس طرح کہتے ہیں۔ تبسم کیا اور فرمایا کہ مولانا آج شب

کو اس حجرہ میں تشریف لاؤ شاید یہ بات ظہور میں آجائے ان کو زیادہ استعجاب ہوا اور شب کو دونوں صاحب تشریف لے گئے اور آپ نے اپنے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا اور جب نماز پڑھ چکے تو فرمایا اب جدا جدا نیت باندھ کر دو دو رکعت علیحدہ پڑھو جب کھڑے ہوئے تو اس طرح کا استغراق ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کو انہیں دو رکعت میں شب بسر ہو گئی جب یہ فیض باطن مشاہدہ کیا صبح کو دونوں صاحبوں نے بیعت کی اور یہاں تک آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے تھے اور چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الٰہی یوں ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی اور تتمیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو ان کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ کا سفر کیا اور اس راہ میں قریب ایک ہزار آدمی کے اپنے ہمراہ لے کر حج ادا کیا اور وہاں سے پھر ہندوستان کی طرف تشریف لائے اور ترویج امور شرعیہ اور امر بالمعروف بہت کرتے منہیات کا رواج ان کی برکت سے اکثر اطراف سے اٹھ گیا۔ طرفہ یہ ہے کہ شہر کلکتہ میں جب تک قدم شریف رکھی۔ شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکھوکھ سے گذر گئی اور آپ کے اکثر خلفاء کو قطب اور اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا اور چونکہ ازروئے کشف باطن کے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کو اکثر مع مریدین با اعتقاد کے سعادت شہادت حاصل ہونے والی ہے۔

مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندوستان میں وعظ کہو اور بیشتر جہاد اور فضیلت شہادت بیان کرو ہر چند اس کا منشا نہ جانتے تھے لیکن مرید با اخلاص تھے اور فرمان بجا لائے ان کے وعظ سے لکھوکھ مردم شاہراہ ہدایت پر آئے اور شوق ماہو الحق دل میں جم گیا اور جہاد کی فضیلت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر جان و مال راہ الٰہی میں صرف ہو تو عین سعادت ہے۔

بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت نے لکھا اب ہمارے پاس چلے آؤ یہ تو جاں نثار تھے یہ بمجرد حکم کے مشتاق کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت ان کو ان کو ہمراہ لے کر کوہستان چلے گئے اور ہنوز اس کے منشا سے واقف نہیں ... قوم افغان ... حضرت کے ایسے معتقد ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور عہد کیا گیا کہ حضرت جہاد کریں تو ہم سر فروشی کو حاضر ہیں آپ نے سکھوں کی قوم پر جہاد قائم کیا مردم ہندوستان اس خبر کو سننے سے اطراف و جوانب سے راہی ہوئے اور سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستان اس لاکھ آدمی کے قریب جمع ہوئے اور خطبہ آپ کے نام پڑھا گیا اور روز روزہ امام ہو گیا چند منزل عشر جو طریقہ اسلام میں ایک نوع خراج کی ہے آپ کے پاس آنکلا

لگا۔ پشاور اور بعض کو ان سکھ کی عملداری سے نکل کر غازیان اسلام کے تصرف میں آ گئے اسکھوں کے باوجود اس شان و شوکت ظاہری آپ کا ایسا رعب دل میں بیٹھ گیا کہ کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے سچ ہے۔

"ہیبت حق است ایں خلق نیست"

لیکن حضرت کو ترویج و ترقی اسلام منظور تھی قبول نہ کیا کئی سال یہی سلسلہ یوں ہی چلا گیا اور مولوی مولانا عبدالحئی علیہ الرحمہ نے بیماری بدنی سے سفر آخرت اختیار کیا۔ بعد اس کے جو کہ قوم افاغنہ بندۂ زر اور نہایت طامع ہیں سکھوں کے طریقوں سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغا کی از بس کہ مشیت الٰہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی۔ قریب بالاکوٹ کے حضرت نے مع مولوی اسماعیل اور اکثر مومنین صاف باطن کے شہادت پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت کی شہادت کو چودہ پندرہ برس کا عرصہ گذرتا ہے [۱]

آپ کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں۔

"حضرت شاہ سید احمدؒ اس زمانہ کے نہایت مشہور اور عظیم المرتبت بزرگ تھے ان کے فیضان صحبت اور ارشاد و ہدایت سے ہزاروں نے استفادہ کیا۔ مولوی یعقوب فرمایا کرتے تھے کہ شاہ عبدالعزیز کی توجہ کی تاثیر مثل ملکے سے مینھ کے ہوتی ہے جس کی چھوٹی بوندیں ہوتی ہیں۔ اور سید صاحب کی تاثیر مثل موسلا دھار بارش کی جھکی کے اثر کرتی ہے۔ جو فوارہ کی طرح قلب پر پڑتی ہے ان کی تلقین و ارشاد نے مجاہدوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کے دل احیائے ملت کے لیے بے چین و بے قرار رہتے تھے۔ [۲]

سادات کرام میں شاہ عالم بخاری

سادات کرام میں شاہ عالم بخاری کی اولاد اپنے فضل و کمال کی بنا پر ایک ممتاز اور مایہ ناز مقام کی حامل رہی ہے ان میں سید محمد رضوی۔ سید جلال۔ سید جعفر۔ سید علی بڑے پایہ کے بزرگان کرام گزرے ہیں۔

سید محمد رضوی کے بارے میں یادِ ایام کے مصنف لکھتے ہیں:۔

---

[۱] آثار الصنادید ص ۲۷،۲۶-۲۴

[۲] تاریخی مقالات پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۲۳۵

"وہ اپنے اسلاف کرام کی بجا یادگار سمجھے جاتے تھے انھوں نے شاہی خدمت کبھی قبول نہیں کی مگر بادشاہوں کو ان کے ساتھ حسن عقیدت تھی ان سے ملتے اور بزرگ داشت کرتے تھے جہانگیر بادشاہ جس زمانے میں گجرات آیا ہوا تھا ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور فرمائش کی کہ فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ کریں۔ [۱]

شاہجہاں ایک بار ایام شاہزادگی میں اور دوسری بار بادشاہ ہو جانے پر ان سے ملنے کو گیا اور ہر مرتبہ ان کی عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۰۴۵ھ میں وفات پائی اور اپنے جد بزرگوار کے پاس مدفون ہوئے۔ [۲]

سید جلال

میر سید محمد رضوی کے خلف الرشید اور فضل و کمال میں اپنے باپ کے قدم بقدم تھے۔ ۱۰۳۶ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی اجازت سے آگرہ تشریف لے گئے۔ شاہجہاں نے دو ہزار روپیہ بطور انعام کے عنایت کیا۔ ۱۰۳۹ھ میں خلعت و فیل تین ہزار روپیہ نقد ۱۰۴۷ھ میں دس ہزار روپیہ اور ان کے لڑکے کو فوجی دستوں اور شایان عنایت ہوئیں اور چھ سو اشرفیاں ان کو دی گئیں کہ گجرات کے زاویہ نشینوں میں تقسیم کریں ۱۰۴۸ھ میں پھر یہ طلب کیے گئے اور پانچ ہزار روپے دیا گیا۔ ۱۰۵۱ھ میں پھر طلب کیے گئے اور پانچ ہزار روپیہ عنایت ہوا۔ اور ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ ملازمت شاہی اختیار کریں۔ آخر کار انھوں نے اپنے بڑے بیٹے سید جعفر کو اپنا قائم مقام درویشی دے کر صدارت عظمیٰ کا خلعت حاصل کیا۔ چار ہزاری ذات و ہفت صدی سوار کا منصب ملا ۱۰۵۵ھ ششہزاری ذات، ایک ہزار پانصدی سواروں کا اور اضافہ ہوا۔ شاہجہاں ان کے فضل و کمال کا بہت معتقد تھا اگر یہ چند دنوں اور زندہ رہتے تو ان کو اور زیادہ ترقی ہوتی اور کیا عجب ہے کہ علامہ سعد اللہ خاں کے بعد یہ وزیر اعظم کردیے جاتے مگر ۱۰۵۷ھ میں انھوں نے رحلت فرمائی۔ اور نعش ان کی لاہور سے گجرات بھیجی گئی اور اپنے بزرگوں کے پاس دفن ہوئے۔ [۳]

---

[۱] یاد ایام مولفہ مولانا حکیم سید عبدالحئی۔

[۲] ماثر الامرا میں شاہ نواز خاں نے لکھا ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کا فارسی میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا تھا۔ آپ کی زندگی کے حالات پر منور کرامیں لکھی گئیں یہاں اختصار پر اکتفا کیا گیا۔ [۳] یاد ایام صفحہ ۷۵

سید جعفر

سید جلال رضوی کے بڑے بیٹے اور فضل وکمال میں اپنے جد و پدر سے بڑھے ہوئے تھے عبدالحمید مورخ شاہجہانی نے بادشاہ نامہ میں لکھا گیا ہے کہ یہ مہارت علمی وکثرت درس وافادہ و واقفیت مصطلحات والتزام طریقہ مشائخ میں اپنے جد و پدر سے بڑھ کر تھے ۱۰۵۷ھ میں سجادۂ آبائی پر رونق افروز ہوئے۔

۱۰۵۷ھ میں جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو شاہجہاں نے خواہش کی کہ منصب پدری کو قبول کریں مگر انھوں نے منظور نہیں کیا اور ۱۰۶۰ھ میں خلعت و فیل و دس ہزار روپیہ نقد ان کو اور خلعت و فیل و ایک ہزار نقد ان کے بیٹے سید محمد کو عنایت کیا ۱۰۸۵ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ (یاد ایام صفحہ ۶۴)

سیّد علی

سید جلال کے دوسرے بیٹے تھے باپ کے مرنے کے بعد ایک ہزاری منصب پایا ۱۰۶۰ھ میں جواہر خانہ کے دارو غہ مقرر ہوئے اور مع اصل و اضافہ کے ایک ہزار پانصدی ذات و چہار صدی سوار کے منصب پر فائز ہوئے ۱۰۶۲ھ میں رضوی خاں خطاب مع خلعت خاصہ کے عنایت ہوا اور دو ہزار پانصد سوار کے منصب پر ترقی کی اور ملک گجرات کے بخشی گری و وقائع نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے اور ۱۰۶۶ھ میں گجرات سے بلا لیے گئے۔ عرض و وقائع نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۰۷۰ھ میں خدمات شاہی سے مستعفی ہو کر گوشہ نشین ہوئے عالم گیر نے بارہ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کر دی۔ ۱۰۷۳ھ میں پھر دو ہزار پانصدی سوار ذات و چہار صدی منصب سوار کا منصب مع خلعت و جمدھر ٹیپا کار کے عنایت ہوا ۱۰۷۴ھ میں منصب میں سو سواروں کا اضافہ ہوا اور بیگم صاحبہ کی سرکار دیا دیوانی کی خدمت ملی ۱۰۸۹ھ میں سہ ہزاری کیے گئے اور صدارت عظمیٰ کے موروثی عہدہ پر ترقی پائی۔ ۱۰۹۱ھ میں وفات پا کر دنیا کے دھندوں سے چھوٹے۔ [1]

---

[1] شاہی عنایتیں ان کے حال پر ہمیشہ مبذول رہیں ۱۰۶۳ھ میں بطلب آئے اور پانچ ہزار روپیہ بطور انعام کے عنایت ہوا اور رخصت کے وقت خلعت و فیل و پانچ ہزار روپیہ نقد پھر مرحمت ہوا ۱۰۶۵ھ میں دو ہزار سوار ان کو بھیجی گئیں ۱۰۶۶ھ میں عالمگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد خلعت روانہ کیا۔

عربی النسل مختلف طبقات اور ان کے ناموں کا تعارف

ملیبار :- ملیبار کے مسلمان دو حصوں میں منقسم ہیں۔ نایط اور موپلے

نایط کے متعلق ضروری تفصیل گذشتہ اوراق میں آپ کی نظر سے گذر چکا ہے اب ملیبار کے متعلق اور موپلے کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کچھ وضاحت پیش کی جاتی ہے:-

موپلے عربوں اور ہندوؤں کی مخلوط النسل یادگار ہے۔ عرب مسلم تاجر جب ملیبار کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے تو انھوں نے ہندو عورتوں سے رشتے جوڑے یہ رشتے زیادہ تر شادیوں کے ذریعہ اور بعض کنیزوں کی صورت میں قائم ہوئے تھے اس بنا پر مابلے ان تاجر عورتوں ہی کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں عربی جھلکیت اور ان کی وضع قطع اور رسم و رواج میں عربی معاشرت کا رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے ان کی مادری زبان گو ملیالم ہے اس کے باوجود انہیں عربی سے اچھا خاصا لگاؤ پایا جاتا ہے عربی سے ان کی گہری دلچسپی کا ثبوت اس بات سے ہوتا ہے کہ ان کے یہاں عربی تعلیم کا نہایت وسیع اور منظم انتظام ہے اور جا بجا عربی کی درس گاہیں اور کالج قائم ہیں ان کی ملیالم زبان میں بھی عربی زبان موجود ہے ۔ ان کا دینی مذاق کافی گہرا اور مذہبی رجحان بہت نمایاں ہے وہ محنتی اور جفاکش بھی ہیں۔ زراعت و تجارت ان کا عام پیشہ اور ذریعہ معاش ہے عصری تعلیم کے حصول میں نواب برابر ترقی کر رہے ہیں۔

مابلا کی تصریح پدمانابھ مینن اپنی کتاب تاریخ ملیبار میں لکھتا ہے۔ مابلا اصل میں مہا پلا تھا۔ جو بگڑ کر مابلا ہو گیا مہا کے معنی بڑے اور محترم کے ہیں عرب تاجر غیر ہندوستانی کی حیثیت سے مہا کہلاتے تھے ان کی اولاد مہا پلے کہلائی پلے کی معنی بیٹے کے ہیں۔ [1]

مابلا نام کے متعلق مورخ لوبیس مور لکھتا ہے :-

مَتّو بلا کے معنی نوشاہ یا داماد کے ہیں یہ نام اس لیے دیا گیا کہ عرب تاجر جب اس ملک

---

[1] تاریخ ملیبار صفحہ ۲۸۔

میں آئے تو نہایت معزز ملنے جاتے تھے انھوں نے جب یہاں شادیاں کیں تو ملکیوں کے داماد بن گئے اور موپلاؤں کے نام سے پکارے جانے لگے اور اسی طرح یہ نام آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے پڑ گیا۔ [1]

تاریخ مدورا کا مصنف لکھتا ہے:۔

"مدورا کی کلن قوم نے ہی پہلے پہل مسلمانوں کو یہ نام دیا اس لیے کہ عرب تاجروں نے اس قوم کی عورتوں سے شادی کی تھی۔ اس کے برخلاف بول اور برتن، انڈین انڈ بینا انٹی کوئٹز (ANDIAN Antiquities) میں لکھتا ہے۔" ماپلا کے معنی داماد کے ہیں ضلع تنجاور میں یہ نام ابھی تک باقی ہے یعنی راجہ کی بیٹی سے جس کی شادی ہوتی ہے اس کا نام موپلے صاحب رکھا جاتا ہے۔

بوگن مورخ موپلا کی وضاحت اس طرح کرتا ہے:۔

"ممکن ہے لفظ ما محمد سے ہو، محمد سے مراد عام مسلمانوں سے ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی اولاد اس ملک میں موپلا کہلائی۔ ملیالم زبان میں پلا کے معنے بیٹا کے ہیں، بچہ اور اولاد کے ہیں۔

مورخ ڈے اپنی تاریخ میں رقمطراز ہے:۔

"ما کے معنی ماں کے ہیں اور پلا بچہ کو کہتے ہیں عربوں نے دیسی عورتوں سے شادیاں کیں اس لیے بجائے باپ سے منسوب ہونے کے ماں سے منسوب ہوئے۔

ولسن نے بھی اپنی تاریخ میں مورخ ڈے ہی کی روایت نقل کی ہے۔

لیکن ڈنکن ایک عجیب اور انوکھی بات لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "کسی شخص نے ایک قاضی کو دشنام دینے کے لیے ماں کا بچہ کہا اور اس وقت سے یہ نام یہاں کے مسلمانوں کا پڑ گیا۔"

کتاب ایشیاٹک ریسرچ میں لکھا گیا ہے کہ:۔

"لفظ مہا مکن ہے لفظ موحا کے بگڑے ہوئے تلفظ ہیں پلا کے معنی بچہ کے ہیں، چونکہ اگلے مسلمان موخار ملک عرب سے ہجرت کرکے آئے تھے اس لیے انھیں موپلا کہا گیا یعنی عربوں کی اولاد۔"

برادن لکھتا ہے موپلا لفظ معبر کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ معبر کے معانی پانی پر کے ہیں۔ عرب سمندر کے ذریعہ آئے تھے اس لیے انھیں موپلا کہا گیا۔ اب ذرا ایک اور مورخ کی یہ تحقیق بھی ملاحظہ فرمایئے:

---

[1] تاریخ لوگس مورنجوالہ تاریخ جنوبی ہند۔

"موپلا کے متعلق اب تک جس قدر روایتیں مروج ہیں میرے نزدیک قرین قیاس نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لفظ موپلا مفلح کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مفلح لفظ فلاح سے بنا ہے جس کے معنی کاشتکاری یا زراعت کے ہیں۔ عرب اس ملک میں آئے تو انھوں نے زراعت اختیار کر لی۔ اور ان کا نام بلحاظ پیشہ مفلح تھا جو بگڑتے بگڑتے موپلا بن گیا۔

اس بارے میں ملیبار کے کسی مسلم مورخ کی کوئی معتبر روایت ہماری نظر سے نہیں گذری۔ [1]

ان مورخین کے اقتباسات سے دو باتیں خاص طور سے سامنے آتی ہیں (۱) موپلے کی وجہ تسمیہ اور اس کے متعلق ان کی اپنی تحقیق (۲) موپلے فی الاصل عربوں کی اولاد ہیں انھوں نے اس ملک کی عورتوں سے شادیاں کیں۔

ان میں ان مسلموں کا شامل ہونا خارج از امکان نہیں جو بعد میں داخل اسلام ہوئے تھے آج ملیبار کے موپلوں میں اپنا اس پرانی رسم کے مطابق گھر داماد کا سلسلہ بدستور مروج ہے۔

ہمارے خیال میں بد ماشی کی تاریخ ملیبار اور مورخ نوئیس کی رائیں جو تقریباً ملتی جلتی ہیں زیادہ قابل قیاس نظر آتی ہیں۔

لبے اور مرکیار

لبا بین اور مرکیار :۔ ان عرب تاجروں کی اولاد اور ان کے اپنے آبائی پیشہ تجارت کی یادگار ہیں لیکن یہ امر ناممکن نہیں کہ ان میں سے بعض خاندان ایسے بھی ہوں جو عربی النسل سے نہ ہوں اور وہ بعد میں اسلام لاکر ان میں اس طرح خلط ملط ہو گئے ہوں کہ ان میں اصلی اور نسلی کا امتیاز نہ رہا ہو۔ بہرحال لبے کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف مورخین کے اقوال کا خلاصہ۔

تاریخ میسور کا مورخ لکھتا ہے۔

"حجاج بن یوسف کے ظلم سے بنی ہاشم کے لوگوں نے عرب سے بھاگ کر ہندستان میں پناہ لی تھی ان میں ساحل کوکن پر جو اترے وہ نوایط کہلائے اور راس کماری اور مشرقی ساحل

---

[1] ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند۔

کورومنڈل پر جا اترے وہ لبّے کہلائے۔ لبّے لفظ لبیک سے نکلا ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب یہ لوگ اس ملک میں آئے تو نہایت غریب تھے یہاں کے لوگ جب انھیں مخاطب کرتے تھے تو وہ جواب میں لبیک کہتے تھے جس کے معنی "حاضر ہوں" کے ہیں لفظ لبے کی ایک اور تشریح بھی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شروع میں ان لوگوں کی تعداد بالکل قلیل تھی یہاں کے ملکی حاکموں نے جب انھیں ستانا شروع کیا تو انھوں نے لبیک کہا یعنی ہم آپ کے فرمانبردار و تابعدار ہیں۔[1]

خدا معلوم کرنل ولکس نے یہ دوسری تشریح کہاں سے اٹھالائے۔ جس کمزور روایت کے سہارے یہ بات لکھی گئی ہے اس کی حیثیت ایک من گھڑت فسانے سے زیادہ نہیں جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے اور جس کو بعض معتبر مورخین نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب وہ شروع میں یہاں آئے تو وہ عربی کے سوا اور کوئی ملکی زبان جانتے نہ تھے وہ اکثر اپنا مدعا اشاروں کنایوں سے ظاہر کرتے تھے اور جب انھیں مخاطب کیا جاتا تو اسکا جواب اپنے عربی انداز میں لبیک سے دیتے تھے۔ مقامی لوگوں نے انھیں اسی نام سے منسوب کردیا اور رفتہ رفتہ آخری حرف "ک" حذف ہو کر صرف لبّے رہ گیا۔

تاریخ معبر کا مورخ لکھتا ہے:۔

"لبے ان عربوں کی نسل سے ہیں جو گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں کابل پٹن میں جو ساحل کورومنڈل پر ہے تجارت کی غرض سے آئے تھے جب یہاں رہتے ہوئے ان کو ایک عرصہ گزر گیا تو انھوں نے یہاں کی دیسی عورتوں سے شادی کرلی اور لبے انھیں عربوں کی اولاد میں سے ہیں۔"[2]

مدراس سنسر رپورٹ بابت ۱۹۰۱ء میں مرقوم ہے:۔

"لبے مسلمانوں کی ایک قوم ہے جس میں تامل خون ہے یہ قوم، بال، چمڑے اور دوسری اشیاء کی تجارت کرتی ہے یہ مرکیاروں سے بالکل علاحدہ ہے ان کی زبان میں بہ نسبت مرکیاروں کے عربی الفاظ بالکل کم استعمال ہوتے ہیں۔"

مدراس کی ایک اور رپورٹ میں جو ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی تھی اس میں کہا گیا ہے "لبے دراوڈین قوم سے ہیں جن میں عرب قوم کی آمیزش ہو گئی ہے۔ یہ قوم نہایت محنتی اور جفاکش ہے۔ لبے تجارت میں خوب ماہر ہیں۔"

اسی طرح ۱۸۹۱ء کی ایک دوسری رپورٹ میں درج ہے:۔

---

[1] کرنل ولکس تاریخ میسور بحوالہ جنوبی ہند صفحہ ۳۵۰

[2] تاریخ معبر صفحہ ۱۱۹ ایضاً تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۵۷

لبّے :۔ مسلمانوں کی ایک مخلوط قوم ہے یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں مسلمان فاتحین اور ٹیپو سلطان نے مسلمان بنایا تھا۔"

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ ان کے زمانہ میں اسلام لائے ہوں۔ لیکن یہ بالکل غلط اور خلاف حقیقت ہے کہ لبّے سب ان کے زمانے میں اسلام لائے۔

تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

"لبّے حال کی ایجاد ہے ورنہ تامل زبان میں جو قدیم کتابیں ہیں ان کے لیے لفظ سنتوگن لکھا ہوا ہے۔ سنتوگن سے مراد ملک عرب ہے۔ اس لحاظ سے لبّے عربوں اور جنوبی ہند کے باشندوں کی ایک مخلوط نسل ہے یہ قوم جنوبی ہند کے مختلف مقامات بالخصوص مدراس اور اس کے مختلف اضلاع کارومنڈل کا بل پٹن کے علاوہ دیلور، رامپور، وانمباڑی بیل وشارم وغیرہ میں آباد ہے اور تجارت کے سلسلہ میں قریب و دور تک پھیلی ہوئی ہے بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ مذہب اور دین سے ان کا تعلق کافی گہرا ہے۔ علم و تعلیم سے ان کی سعی و سرگرمی ان کی دلچسپی اور ان کا جھکاؤ ونگاؤ قابل تحسین ہے۔ بالخصوص عربی و دینی تعلیم کے لیے بہت نمایاں ہے ان کی عربی کی کئی درسگاہیں ہیں جو بہت مفید خدمات انجام دے رہی ہیں عصری تعلیم سے بھی بڑی حد تک بہرہ ور ہیں۔ وہ بڑے فیاض تجبر بھی ہیں سادہ دل اور سادہ مزاج اور اپنے قدیم وضع و قطع کا ایک زندہ نمونہ۔" [۳۰۲]

مرکیار، نینار، راؤتھر، مرکب یار، ناؤیار اور گھوڑسوار

ان فرقوں کے بارے میں مورخین کی آراء کا خلاصہ :۔

مرکیار :۔ بڑے تاجر ہیں۔ سیلون اور ملایا میں ان کی تجارت ہے۔ دیسی ساخت کے زیادہ تر جہازوں کے مالک ہیں ان کی بڑی تعداد محمود بندر میں پائی جاتی ہے مرکیار مرکب سے مشتق ہے جس کے معنی کشتی کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے ملک عرب میں ظلم و ستم سے تنگ آگئے تو ہندوستان چلے آئے اور یہاں کے ساحل پر اتر پڑے۔ مقامی لوگوں نے جب ان کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے اپنی کشتیاں دکھلائیں جنھیں وہ مرکب کہتے تھے۔

۳۰۲۔ بحوالہ تاریخ جنوبی ہند ایضاً صفحہ ۳۵۷

اس بنا پر ہندوؤں نے ان کا نام مرکیار رکھ دیا۔ وہ اپنے آپ کو لبابین سے برتر مانتے ہیں اس لیے لبابین میں شادی نہیں کرتے۔

مدراس سنسز رپورٹ ۱۹۰۱ء رقمطراز ہے۔

مرکیار مسلمانوں کا ایک قبیلہ ہے جس میں عربوں اور ہندوؤں کے خون کی آمیزش ہے یہ اکثر تاجر پیشہ اور لبابین سے بالکل علاحدہ ہیں۔[1]

نینار :۔ کیاسٹن اینڈ ٹرائبس آف سدرن انڈیا میں لکھا گیا ہے :۔

ہندو قوم میں جو نینار ہیں وہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ایک فرقہ مانا گیا ہے اس پر تاریخ جنوبی ہند کا مصنف لکھتا ہے :۔

"نینار کے معنی بھی وہی ہیں جو نائک کے ہیں یعنی آقا و سردار اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دریویڈین کا یہ طبقہ کبھی اس ملک میں حکمراں یا کم از کم اعلیٰ فوجی ملازمت میں تھا۔ مدراس کی تاریخ میں بہت سے ایسے نام پائے جاتے ہیں ہندوؤں کی اس قوم سے جو لوگ مسلمان ہوئے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اس ملکی و فوجی اعزاز کو باقی رکھا۔[2]

بعض محققین نے نینار کو نایار سے بگڑ کر نینار ہونا تسلیم کیا ہے اور وہ اسی بات کو دہراتے ہیں جو مرکیاروں کے متعلق منسوب و مشہور ہے وہ یہ کہ عرب سے ناؤ کے ذریعہ ہند آئے اور ناؤیار کہلائے اس پر مورخ "تاریخ جنوبی ہند لکھتا ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے اس لیے کہ جنوبی ہند کی ہندو قوموں میں نینار پہلے سے موجود تھے اور ان میں جو مسلمان ہوئے انھوں نے اپنے قدیم لقب کو اپنے نام کے ساتھ باقی رکھا۔[3]

راؤتھر :۔ راؤتھر کے معنی گھوڑ سوار کے ہیں۔ اگلے زمانے میں شاہی فوج کے اسپ سواروں کو راؤتھر کہا جاتا تھا چنانچہ مدراس کا گزیٹر لکھتا ہے کہ :۔

" اگلے دنوں میں ملک کے راجاؤں کے پاس جو اسپ سوار فوج تھی وہ راؤتھر کہلاتی تھی۔ اس لیے راؤتھر ایک جنگی قوم ہے۔ یہ بھی جنوبی ہند میں عمل قوم کا ایک قبیلہ ہے انھوں نے جب اسلام قبول کیا تو اپنے نام کے ساتھ اپنے پرانے لقب کو جوں توں باقی رکھا اس لیے عام طور پر اس فرقہ کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

[1] ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۵۹

[2] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۶۱

[3] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۶۰

اسماعیلی۔ بوہرے اور خوجے

بنی امیہ کے دور میں سندھ اور ملتان اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے تھے اس کے بعد جب قرامطیوں کا فتنہ ابھرا تو ان مقامات کے امیروں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا اور شیعوں پر قرامطی اور اسماعیلی داعیوں کی چھاپ لگ گئی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان داعیوں نے ان شرک آباد مقامات میں اشاعت دین کی سرگرم کوششیں کی تھیں۔ نویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مصر، عراق، بحرین اور بصرہ وغیرہ سے اسماعیلی اور قرامطیوں کے داعیوں کا ہندوستان میں آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ملتان اور منصورہ[1] میں شیعیت نے بہت زور کے ساتھ سر اٹھایا ان کے زوردار پروپیگنڈے کے سامنے سنیت کی روشنی مدھم پڑ گئی اور ان کے قدم نہ جم سکے۔

اسی شیعیت کے غلبے نے محمود غزنوی کو حملہ پر ابھارا لیکن اس کا یہ تسلط محض عارضی تھا جو طوفان کی طرح اٹھا اور فوراً ختم ہو گیا کیونکہ شیخ الجبال حسن بن صباح کے ہزاروں داعی اور فدائی تمام وسطی ایشیا میں اپنی خطرناک خون ریز سرگرمیوں اور سیاہ کرتوتوں کے ساتھ پھیل چکے تھے اور ان کے مجنونانہ قاتلانہ حملوں سے بکثرت قیمتی جانیں اور اہم نامور شخصیتیں زندگیوں سے محروم ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں ملتان اور منصورہ میں ان کی بڑھتی ہوئی قوت آئندہ کے لیے مزید شدید تباہی کا باعث ہو سکتی تھی چنانچہ ۱۱۷۵ء میں سلطان محمود غوری نے دوسری بار ملتان پر حملہ کر کے اس کو اسماعیلیوں کے ہاتھوں سے آزاد کرا دیا لیکن اس کے عوض اس کو ایک فدائی کے ہاتھ سے جان بحق ہونا پڑا۔ لیکن ان مفتوحہ ممالک میں جب تک اسلامی اقتدار قائم رہا اسماعیلیوں کے عروج میں زوال شروع ہو گیا۔ ان کی تبلیغی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور ان کے مبلغین ملتان اور اوچ سے اپنا بستر باندھ کر گجرات اور اس کے اطراف میں کوچ کر گئے۔ اور اس کو اپنا تبلیغی مستقر بنا لیا۔

۱۰۹۴ء میں فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی رحلت کے بعد اسماعیلی دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے المستعلی کی رہنمائی اختیار کی انھیں کو بعد میں بوہرہ کہا گیا اور جو اس کے بھائی نزار میں شامل ہو گئے انھیں خوجہ کہا گیا[2] اس جماعتی اور کچھ عقائد کی تقسیم و تفریق سے ان کے آپس میں کشمکش اور تصادم کی صورت پیدا ہو گئی۔ یہ تصادم زیادہ تر اس بات پر تھا بقول

---

[1] منصورہ جسے آج کل بھکر کہتے ہیں۔ [2] یہ دراصل خواجہ ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت معلوم ہوتی ہے۔

تاریخ کوکن۔ اس جماعتی و عقایدی تفریق سے قبل اولین مبلغین جو شیعیت کی تبلیغ کرتے رہے ان دونوں جماعتوں نے اپنا حق جتلانا شروع کر دیا۔[1]

ہندوستان میں بوہروں کی مذہبی اشاعت کے متعلق دو مختلف روایتیں ہمارے سامنے آئی ہیں سب سے پہلے حضرت عبداللہ یمنی ۱۰۶۷ء میں ہندوستان تشریف لائے اور کھنبایت میں قیام کیا اور انھوں نے سب سے پہلے اس مذہب کی اشاعت کی داغ بیل ڈالی۔

اس کے مقابلے میں دوسرا فریق کہتا ہے کہ ملا محمد علی نامی ایک بزرگ ان کے مذہب کے سب سے پہلے مبلغ تھے وہ ۱۱۳۰ء میں کھمبایت میں رحلت کر گئے اور وہیں ان کا مزار ہے۔ بوہروں کے نزدیک وہ ایک متبرک مقام ہے۔

بوہروں کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے بعض، قدیم حکمرانوں کا تعلق عربی النسل سے ہے اور وہ ابتدا میں یمن سے آئے تھے چونکہ مورخین کے بیان کے مطابق ان کے سب سے پہلے مبلغ اور پیشوا حضرت عبداللہ یمنی تھے اور اسی بنا پر اس جماعت کا خاص تعلق یمن سے رہا ہے۔ اس لیے ان کے قدیم حکمرانوں کا یمن سے آجانے پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:۔

"یہ امر مسلم ہے کہ ۱۰۹۰ء میں شیعہ تاجروں کی بوہرہ برادری کے مذہبی پیشوا یمن سے گجرات آئے اور یہیں آباد ہوگئے۔"

اور نور الدین یا نور ساگر اور ۱۰۹۴ء سے ۱۱۳۳ء تک کنبی۔ کھروہ اور کھولی اقوام کو گجرات میں مسلمان کیا۔[2]

اس نور ست گرو یا نور ستاگر یا نور ساگر کو جنھیں بارہویں صدی میں قلعہ الموت سے گجرات بھیجا گیا تھا۔ بوہرہ روایت اپنے داعی مولائی نور الدین سے خلط ملط کرتی ہے۔[3]

بہرحال ایک مبلغ نور الدین کا پتہ ضرور چلتا ہے جو ۱۰۶۷ء میں کھمبائت آئے اور دکن میں برسوں اشاعت دین کے بعد اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔[4]

آگے ڈاکٹر مومن محی الدین تاریخ کوکن میں لکھتے ہیں۔

"نور ستاگر کے زمانہ حیات کی تصدیق بوہرہ روایت کے علاوہ نوساری میں ایک خواجہ

---

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۲۸۴ تیموری حکومت میں اس کا عام رواج تھا۔ [2] ہندستان کا اسلامی تہذیب پر اثر ڈاکٹر تارا چند بحوالہ تاریخ کوکن صفحہ ۲۸۵ [3] تاریخ کوکن صفحہ ۲۸۵ [4] بوہرہ ایک گجراتی فرقہ (انگریزی) ڈاکٹر مسعود لوکھنڈ STVDIA ISLAMIC مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔

داعی کے مقبرے کے کتبہ سے بھی ہوتی ہے جس میں نورست گرد کا زمانہ وصال ۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء درج ہے۔ اور یہ زمانہ سدھ راج سولنکی (۱۰۹۴-۱۱۴۳ء) کے راج کا تھا جس کی مسلم دوستی اور مذہبی پاسداری کا ذکر محمد عوفی بھی کرتا ہے۔ سولنکی راج سے اسماعیلیوں کا تعلق بہرحال قابل تسلیم حقیقت ہے۔ اس کی نوعیت چاہے اس حد تک مبالغہ آمیز روایت ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو جس کے مطابق سدھ راج جاہے سنگھ سولنکی راجہ اس کا منتری اور کماریال کا چیف گرو تینوں حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔

کاٹھیاواڑ کے بعض بوہرہ گھرانے اپنا سلسلہ نسب بھارمل سے جوڑتے ہیں اس قبیلے میں بوہروں کے تین نامور ولی گذرے ہیں[1]

آگے ڈاکٹر شمعون لکھتے ہیں۔

مظفر شاہی دور میں اہل سنت کو شیعیت پر دوبارہ غلبہ حاصل ہوا تو کئی بوہرہ قبیلوں نے اہل سنت کا مذہب اختیار کر لیا اور ان کے سنت کی طرف رجوع ہونے میں حضرات صوفیائے کرام اور مبلغین اسلام کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ شیعہ اور سنی کے یہ تفریقی مناظر ۱۴۱۱-۱۴۴۳ء احمد شاہ والی گجرات کے عہد میں نمایاں طور پر ابھر آئے اور اس نے سیاسی مصالح اور اقتصادی اسباب کے مدنظر بوہرہ جماعت کو کسب و پیشہ کی بنیادوں پر بانٹ دیا سنی بوہرہ جن میں نومسلموں کی تعداد زیادہ تھی مولائے اسلام کہلاتے تھے یہ زراعت پیشہ تھے مگر ان کی رگوں میں راجپوتی خون دوڑ رہا تھا اس لیے وہ اپنے موروثی پیشہ سپہ گری پر نازاں رہتے تھے۔

شیعہ اسماعیلی دیانند کے بہت سارے راستوں "بہوارہ" یعنی چلتو بیوپار سے بوہرہ بن گیے۔[2]

قلابہ گزیٹیر لکھتا ہے :-

"بہرہ" "وہورا" سے مشتق ہے جس کے معنی بیوپار کے ہیں اور ہند واہل قلم بوہرہ بتلاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے لوہے کا سامان ظروف ٹین کے برتن، لالٹین، آئینے، سن اور سوتی رسیاں تاگے، کپڑے اور کاغذ کے بیوپاری رہے ہیں۔"[3]

تھانہ گزیٹیر لکھتا ہے :-

بھیونڈی اور کلیان میں مٹی کا تیل بیچنے کے علاوہ انھوں نے لوہے کی بالٹیاں اور تیل کے کنستر بنانے شروع کر دیے تھے۔

---

[1] ڈاکٹر شمعون لوکھنڈوالا مقالہ ۱۱۹ گجرات تاریخ کوکن صفحہ ۲۸۹ [2] ڈاکٹر معین محی الدین صفحہ ۲۸۶-۲۸۷
[3] قلابہ گزیٹیر صفحہ ۸۴ [4] تھانہ گزیٹیر جلد ۱۳ صفحہ ۲۴

تھانہ گزیٹر ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔
"داؤدی بوہرہ روح کے تناسخ کے قائل ہیں ان کے عقیدے کے مطابق روح کا محاسبہ اور مجاہدہ کیا جاتا ہے اس کی تہذیب ہوتی ہے اور جب تکمیل تربیت ہو جاتی ہے تو یہ علم الٰہی کے علوم رتبت کو پہونچ جاتی ہے اور پھر کسی داعی یا امام میں حلول کر جاتی ہے۔ بوہرہ میت کے ہاتھ میں دفناتے وقت ایک کاغذی سفارش نامہ تھما دیا جاتا ہے جس میں آنحضرت، حضرت علی رض اہل بیت اسماعیلی اماموں قائم آخر الزماں اور موجودہ داعی و مشائخین کا واسطہ دے کر اس کے لیے استغفار کی جاتی ہے۔"[۱]
چنانچہ ڈاکٹر شمون لکھتے ہیں:۔
"سولہویں صدی سے بوہروں کی جماعتی تقسیم زیادہ واضح ہوگئی ۱۵۳۵ء میں جعفر شیرازی کے حکم سے سنی بوہروں نے اپنی شیعہ برادری سے سماجی تعلقات یکسر منقطع کر لیے عقائدی تفریق کے دباروں نے ان کے درمیان کئی اور خلیجیں حائل کر دیں خود شیعہ بوہروں میں جنگ ہفتاد و دو ملت نے کئی صفیں کھڑی کر دیں۔ پیشوائی کے دعوے نے ان کے درمیان سلیمانی، داؤدی علیہ، ناگوشیہ اوجعفیہ، فرقہ بندیوں کی دیواریں چن دیں۔ مجموعی طور سے یمنی اور ہندوستانی اقتدار کی جنگ تھی۔ گو داؤدی جماعت کے بیشتر داعیان یمنی حسب نسب سے تھے مگر اکیالویں داعی مطلق کے عہد سے ہندوستانی اقتدار مستحکم ہو گیا۔"[۲]
ان میں داؤدی بوہرے۔ داؤد بن قطب شاہ اور سلیمانی۔ سلیمان بن یوسف کی جانشینی کے قائل ہیں سلیمانیوں کے مرشد کا تعلق یمن سے تھا مگر داؤدی جماعت بڑے ملاجی کے پیرو کار رہے۔ اور وہ زیادہ منظم۔ مالدار اور مختلف قسم کی تجارت میں ممتاز مقام رکھتے تھے داعی مطلق دبڑے ملاجی) ان کے تمام معاملات میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی یا مالی وہ ایک قطب کا سا مقام رکھتے ہیں جس کے گرد ان کے متبعین سیاروں کی طرح حرکت کرتے تھے۔ ان مشائخین کا شمار صف اول میں کیا جاتا تھا۔ مشائخین کے لیے ضروری تھا کہ وہ داعی مطلق کا تربیت یافتہ ہو یا جامعۃ السیفیہ کا سند یافتہ ہو۔[۳] اور یہ کہ وہ عربی زبان کا عالم ہو اس کے ساتھ اسماعیلی علوم پر گہری نظر اور کافی دستگاہ رکھتا ہو۔

---

[۱] تھانہ گزیٹر جلد ۱۳ صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۴ منقول از تاریخ کوکن [۲] ڈاکٹر شمون بحوالہ ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۲۸۷

[۳] یہ سورت میں بوہروں کی ایک اعلیٰ درس گاہ ہے۔

عامل۔ جنہیں عام طور پر بھائی صاحب، یا میاں صاحب کہا جاتا ہے انہیں مختلف شہروں اور قصبوں میں جہاں بوہرے کافی تعداد میں رہتے ہوں بھیجا جاتا تھا اور وہ داعی مطلق کا نمائندہ یا قائم مقام اور سربراہ سمجھا جاتا تھا۔ داؤدی بوہرے اجتماعی کام اس کی اجازت سے کرتے اور اسی کے ہاتھوں شادی بیاہ کی ساری رسمیں انجام پاتی تھیں ان کے ذمے اور امور متعلقہ کے علاوہ درس و تدریس کی بھی خدمت رہتی تھی مگر یہ تعلیم عربی زبان اور اسماعیلیہ علوم تک محدود رہتی تھی داعی مطلق کی اجازت کے بغیر وہ اسماعیلیہ کی ائمہ اور مخصوص کتابیں نہ خود پڑھ سکتے تھے اور نہ پڑھا سکتے تھے کیونکہ تقیہ اور رازداری اسماعیلیہ کی تحریک و تنظیم کا ایک بنیادی لازمی اور غیر منفک جزء تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔

جماعتی تنظیم کا ایک اعلیٰ عہدیدار صاحب الدعوت ہوتا تھا جو داعی مطلق کی طرف سے بوہروں سے زکوٰۃ و صدقات فراہم کرتا تھا۔ بوہروں میں نومسلموں کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل ہو گئی تھی اس لیے ان میں قبائلی قدیم رسوم کی کچھ جھلکیاں بھی تقیہ اور تاویلات سے گذرتی ہوئی جواز کے حدود میں داخل ہو گئیں۔ وراثت کے معاملہ میں شرعی پابندی سے گریز کیا جاتا ہے[1] لین دین کے معاملات میں دنیاداری کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ البتہ اپنے طور پر دینی فرائض کی بجا آوری میں وہ بہت ممتاز مقام اور نمایاں مقام رکھتے ہیں، منشیات و مسکرات سے عام طور پر ان کا دامن آلودہ نہیں، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں لیکن ان کے اکیسویں امام طیب ابھی تک غائب ہیں۔ اس لیے ان کی غیبت کی بنا پر جمعہ اور عیدین کے خطبات کو موقوف رکھا گیا ہے اور ان کے بدلے نماز کی دو رکعتوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جب امام ہی نہیں تو خطبہ بھی نہیں۔ اور جب خطبہ نہیں تو منبر کس لیے؟۔

نماز پڑھانے والا عارضی امام اپنے مقتدیوں کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے قبلہ رو ہو کر امام غائب کے حاضر ہونے کی دعائیں کرتا ہے اسی طرح اثنا عشری جماعت کے مغرب کی نماز کی تاخیر کی توجیہہ یہ بیان کی جاتی ہے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق مہدی منتظر قائم آخر الزماں صبح و شام کبھی پردہ غیب سے تشریف فرما ہوں گے ان کے دیدہ و دل کے شادکام فائز المرام فرمائیں گے۔

ان کے یہاں ۱۸ ذی الحجہ کو (یوم شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ) عید غدیر منائی جاتی ہے کیونکہ اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق اسی دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اہل تشیع عام طور پر محرم میں اپنے جماعت خانوں امام باڑوں میں مجالس عزا کا اہتمام و انتظام کرتے ہیں۔

[1] ڈاکٹر شمون صفحہ ۱۴۱

خوجے

سنہ ۱۳۴۲ء میں جب ابن بطوطہ کھمبائت پہونچا تو اس نے خوجوں کی ایک بڑی تعداد وہاں آباد پایا۔ خوجہ اسماعیلیہ کا ایک دوسرا فرقہ ہے۔ مستعلی نے سنہ ۱۰۹۴ء میں اسماعیلیوں سے اپنا رشتہ ناطہ یکسر توڑ کر نزاری بن گیا۔ ہلاکو خاں کی ظلم و بیدادی کیسی ہی ہلاکت خیز اور ہولناک سہی لیکن باطنیوں جیسی زبردست طاقت کو کچلنے اور انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں جو کارنامہ اس کے ہاتھوں انجام پایا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کو اس کے عہد کا ایک عظیم کارنامہ انجام دیا جائے گا وہ ہلاکو ہی تھا جس نے نہ صرف حسن بن صباح کی تعمیر کردہ جنت کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا تھا بلکہ ان کی تنظیمی مرکزی قوت کو منتشر و پراگندہ کر ڈالا تھا اس کے بعد ان اسماعیلیوں نے قم کے قریب کنج میں ابزار کو بنا لیا جہاں سے امام جعفر صادق کے پوتے اسماعیل نے اپنی دعوت و تحریک کا آغاز کیا تھا۔

ہند میں قرامطیوں اور اسماعیلیوں کے تبلیغی اڈے، ملتان، اوچ اور منصورہ میں پہلے ہی سے قائم تھے اسماعیلی گجرات کے ساحلی مقامات میں گیارہویں صدی ہی سے اپنے تبلیغی مسائل میں لگے ہوئے تھے لیکن جہاں تک خوجوں کا تعلق ہے ان کے بعض خاندان ایرانی النسل ہیں۔ لیکن بعد میں خوجوں کے مشہور و معروف پیشوا شیخ صدرالدین کے ہاتھ بہت سارے غیر مسلم اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان نومسلموں کی شمولیت سے خوجوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا۔

پیر صدرالدین کے بارے میں ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں :-

"پیر صدرالدین اپنے فرقے کے طریق تبلیغ کی تقلید میں اپنا نام ہندوانہ رکھا تھا اور چونکہ ہندوؤں کی نچلی جماعتوں سے تھا اس لیے پیر صاحب نے اپنی تعلیمات میں ہندوانہ عقائد کو اس طرح سمو دیا تھا کہ اسماعیلی مذہب ہندو دھرم کا اوتار بن گیا۔ چنانچہ پیر صدرالدین کی کتاب "دس اوتار" خوجہ قوم کی مقدس کتاب تسلیم کی جاتی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برہما، حضرت علی کو وشنو اور حضرت آدم علیہ السلام کو شیو سے تعبیر کیا ہے۔[1]"

خوجہ ایک تجارت پیشہ جماعت ہے ان کی تنظیم لاجواب اور قابل تقلید، مال و دولت

[1] منقول از جیبھ کو کبیر صفحہ ۲۵۶ تھانہ گزیٹیر صفحہ ۴۲۔ قنابہ گزیٹیر صفحہ ۸۵ بحوالہ تاریخ کوکن صفحہ ۱۹۲ جس میں کہا گیا ہے حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار جیسے ہندو نکلنکی سے تعبیر کرتے ہیں۔

کے اعتبار سے بھی انھیں دوسرے کے مقابلہ میں اچھی خاصی برتری حاصل ہے۔ بوہروں کی طرح خوجے بھی اپنی قوم کی فلاح وبہبود کو مقدم اور عزیز رکھتے ہیں۔ قومی مفاد و ہمدردی، ایثار وخلوص اور اپنے فرقہ کی فلاح و خوشحالی کے لیے ممکنہ امداد فراہم کرتے ہیں جو اسماعیلی تحریک کا ایک بنیادی مقصد رہا ہے۔ مگر ان ساری کارروائیوں کے پس پردہ تقیہ ہی کی حکمت عملی کارفرما رہتی تھی۔

خوجوں کی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں ہنوکنبی ہندو جاتی کا ایک فرقہ خوجہ مذہب میں داخل ہو گیا اس نئے فرقے کو مومنہ کے خطاب سے نوازا گیا مگر انھیں اصل خوجوں کا سا مقام حاصل نہیں ہے۔

برطانوی دور حکومت سے خوجوں کے مذہبی پیشوا کو آغا خاں کہا جانے لگا۔

تھانہ گزیٹر کے بیان کے مطابق آغا خاں امام نا مکشوف کا مقام رکھتا ہے اس کی حاضری ہر قسم کی مذہبی اور معاشرتی تقریبات میں موجب خیر و برکت ہے اور انتہا درجہ کی سعادت سمجھی جاتی ہے۔

آغا خاں :۔ کا عہدہ انتخابی نہیں موروثی ہوتا ہے اور چونکہ ان کا سلسلہ نسب اسماعیلیہ کے شروع کے اکابر بزرگوں سے جا ملتا ہے اس لیے وہی خاندان یکے بعد دیگرے اس عہدہ پر فائز چلے آتے ہیں اور اسی مناسبت سے انھیں آغا خان بھی کہتے ہیں[1]

ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں۔

"تقسیم ہند سے پہلے شمالی پنجاب اور چترال میں خوجوں کی ایک دوسری جماعت بھی تھی جو غالباً ملتانی خوجوں اور وسطی ایشیا کے تاجر اسماعیلی خوجوں کے باقیات تھے۔[2]

میمن

دراصل مومن تھا لفظ کی ذرا سی تبدیلی سے میمن بن گیا۔ ان کا اصل تعلق لوہانہ، سندھ اور کچھ کے کاچھیہ ہندو گھرانہ سے تھا۔ حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ایک جلیل القدر بزرگ حضرت سید یوسف الدین بغدادی کے دست مبارک پر ۱۴۲۲ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے اس کے ایک سو بیس برس بعد یہ مومن سندھ سے روانہ ہو کر کچھ پہونچے اور گجرات کے مختلف مقامات میں آباد ہو گئے۔

---

[1] اقتباس از تھانہ گزیٹر صفحہ ۲۴۰   [2] تاریخ کوکن صفحہ ۲۹۳ حاشیہ

میمن دوسری جماعتوں کی طرح جزائر بمبئی مہائم وغیرہ مختلف ساحلی مقامات میں آباد ہو گئے احمد آباد میں مظفر شاہی کا معدلت پرور دور تھا اس کے ظل عاطفت میں تمام جماعتوں کو عروج و ترقی کے یکساں مواقع حاصل رہے تھے۔ میمن بھی اپنے بیشہ آبا تجارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور اسی تجارت سے انھوں نے اپنی قومی عظمت اقتدار، وقار کو خوب روشن و بلند کر دیا۔

ان کی دو جماعتیں بہت مشہور ہیں، کچھی اور ہلائی، جن کی نسبت کچھ سے ہے انہیں کچھی اور جن کا تعلق ہالار اور کاٹھیاواڑ سے ہے۔ انھیں ہلائی کہا جاتا ہے۔

تھانہ گزیٹر لکھتا ہے :۔

"میمن برطانوی عہد میں تھانہ آئے مگر اس سے پہلے یہ ساحلی علاقے میں ضرور آباد ہو چکے ہوں گے۔ قلابہ میں یہ تیل اور پرچون کا دھندہ کرتے تھے مگر تھانہ میں ناریل کا تیل اور سوکھی مچھلیوں کا بیوپار انھیں کے ہاتھوں میں تھا اور یہاں سے سوکھی مچھلیاں گجرات، خاندیش جبلپور، دکن، مالوہ، برار وغیرہ مختلف شہروں میں بھیجی جاتی تھیں۔ سوکھی مچھلیوں کا سب سے بڑا تاجر آبا کچھی بہت مشہور رہا۔ میمن عموماً پابند مذہب ہیں اور بلحاظ سیرت کردار وہ بہت اچھا مقام رکھتے ہیں۔ کچھی اور ہلائی دونوں حنفی فقہ کے مقلد ہیں اس کے علاوہ وہ نہایت بخیر فیاض اور قوم و ملت کے ہمدرد خیر خواہ بھی مختلف مقامات میں ان کی تعمیر کردہ شاندار مساجد اور اس کے ارتاف دین سے غایت درجہ تعلق کا روشن ثبوت اور ان کی مالی ایثار و حسنات جاریہ کی زندہ مثالیں ہیں وہ اپنی تجارت کے سلسلہ میں جہاں کہیں گئے وہاں انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں اور انھیں آباد کیا۔ بمبئی اور اس کے مضافات میں ان کی متعدد مسجدیں اور خدا العلوم اور کہاں کہاں کتنی تعداد میں ہیں۔ لیکن ادھر جنوبی ہند میں بھی مدراس، نیلگیری کوچین ایبتی، تلیچری، منگلور وغیرہ۔ میں ان کی تعمیر کردہ کافی عبادت گاہیں ہیں۔

میمنوں کی زبان کچھی ہے۔ جو گجراتی اور سندھی کا ایک مرکب ہے مگر ان کے لہجے میں سندھیت کا اثر بہت غالب ہے جو ان کے سندھی اصلیت کا ایک نمایاں ثبوت ہے[1]۔

دالدی

دالدیوں کے بارے میں بعض مورخین لکھتے ہیں کہ ان کا ابتدائی نسلی تعلق کوبیوں اور

---

[1] میمنوں سے متعلق کوئی مستند تاریخ ہماری نظر سے نہیں گذری لیکن بعض میمن حضرات کی گجراتی کتابوں سے مہیا کردہ نیز تھانہ گزیٹر اور تاریخ کوکن وغیرہ سے جو معلومات حاصل ہوئیں انھیں پیش کیا گیا ہے۔

ماہی گیروں سے ہے اور ان میں اکثریت نومسلموں کی ہے اس کے اسباب میں ایک اہم سبب معاشرتی تناؤ تھا یہ نومسلم اپنے کسب و پیشہ کی سہولتوں کے مدنظر ساحلی مقامات، سمندر کے کناروں میں رہائش اختیار کی۔

کوکن میں جنھیں دالدی کہا جاتا ہے ان کی ایک بڑی تعداد کو مخلوط النسل قرار دیا گیا ہے اور وہ عام کوکنی مسلمانوں میں خلط ملط بھی ہو گئے ہیں لیکن جماعتی کوکنی انھیں اپنی جماعت سے باہر سمجھتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں:۔

"مخلوط النسل مسلمانوں میں وہ لوگ بھی خلط ملط ہو چکے ہیں اور وہ بھی جو شادی بیاہ کے رشتوں کے سبب ان کی برادری میں آ گئے ہیں۔ بعض کفو کی پابندی نہ کرنے کے سبب اپنی اصلیت کھو کر مقامی قبیلوں کے ساتھ پیوند ہو گئے ہیں۔ یہ معاشرتی تبدیلیاں کوکن کے قدیم عرب و عجمی گھرانوں میں شدت سے رونما ہوئی ہیں جنھوں نے احتیاط اور ضبط معاشرت کو سختی کے ساتھ نہیں برتا۔ کوکن کے دالدی مسلمان اسی لیے جماعتی کوکنی قوم سے خارج ہیں۔ دالدی مسلمانوں میں خاص طور سے کولی، ماہی گیروں کا اختلاط غالب ہے مگر اس تمام میل سے کوکن کے بہت کم قبیلے محفوظ رہ سکے ہیں جس کا ثبوت ان کے ہندوانہ رسوم اور کوکنی بولی سے ملتا ہے جو دالدی اور جماعتی دونوں طبقوں کی گھریلو اور ادبی زبان ہے[۱]۔"

کوکن کے علاوہ دیگر مقامات میں جو دالدی آباد ہیں ان کی نوعیت بالکل جداگانہ معلوم ہوتی ہے۔

بھٹکل، منگلور، کنڈاپور، کمٹہ، ہونالی، انکولہ، کاروار، بیندور، شیرور اور اس کے متعلق دیہات وغیرہ میں جو مقیم ہیں ان کی کوئی تاریخ ہماری نظر سے نہیں گذری کہ ان کی اصلیت کیا ہے؟ اگر وہ غیر مسلم تھے تو وہ اسلام میں کب آئے؟ اور ان کے اسلام لانے کے اسباب کیا ہے نیز وہ اور ان کی سکونت ان مقامات میں کب سے ہے؟ مندرجہ بالا سوالات کے حل کیے بغیر ان کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بہت مشکل ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوکن کے سوا دوسری جگہوں پر دالدی کہلانے والی جو جماعتیں آباد ہیں وہ کشتی رانی کے فن کی شائق و ماہر ہیں وہی ان کا موروثی پیشہ اور دیگر ان کا پیشہ زیادہ تر ذریعہ معاش ہے۔

اس بنا پر کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شروع میں عرب ممالک سے کشتیاں چلاتے ہوئے آئے اور ان بندرگاہوں پر جہاں انھیں اپنے مقصد و کاروبار کے لیے سہولتیں نظر آئیں

---

[۱] تاریخ کوکن صفحہ ۱۰۸

اتر پڑے اور ان میں کی بود و باش اختیار کر کے رہنے سہنے لگے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں ان آنے والے کشتی رانوں کی حیثیت محض ملازمانہ یا خادمانہ رہی ہو اسی وجہ سے انھوں نے اپنے آپ کو دوسرے مہاجرین سے الگ تھلگ رکھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے پست ذات کی ہندو عورتوں سے شادیاں کی ہوں اور اس اختلاط کے کوکھ سے جو نسل پیدا ہوئی انہیں نوالدی کہا گیا ہو۔ یا بقول مصنف تاریخ کوکن ان کا تعلق بعد میں ایمان لانے والے نومسلموں سے رہا ہو جیسا کہ تاریخ کوکن کا مصنف لکھتا ہے:۔

"مخلوط النسل مسلمانوں میں وہ لوگ بھی خلط ملط ہو چکے ہیں جو مقامی نومسلم تھے اور وہ بھی جو شادی بیاہ کے رشتوں کے سبب ان کی برادری میں آ گئے۔ نوالدی مسلمانوں میں (خاص) طور سے کولی ماہی گیروں کا نسلی اختلاط غالب ہے"۔[1]

نوالدی متشرع دیندار اور جفاکش و بڑی محنتی قوم ہے وہ فقہ میں امام شافعی کے مقلد ہیں ان کا عام پیشہ کشتی رانی اور کشتی سازی ہے، ساحل کنارہ، شہروں سے متصل بعض قریوں میں ان کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ اب ان کی تعلیم کی طرف کچھ میلان نظر آتا ہے اور کچھ بیداری بھی۔

دکھنی

گو ہماری کتاب سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے تاہم دکھنی مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی جنوبی ہند میں بستی ہے اس لیے دوسری قوموں کے ساتھ ان کا بھی ذکر کچھ مناسب سمجھا گیا۔ جن مسلمانوں نے دکن میں رہائش اختیار کی انھیں اسی نسبت سے دکھنی کہا گیا۔

دکھنی ان مسلمانوں کی اولاد ہیں جو سلطان علاء الدین خلجی اور شاہ محمد بن تغلق کے زمانے میں شمال سے دکن آئے اور پھر جنوب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ اس کے علاوہ جو بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوج کے ساتھ جنوبی ہند میں آئے ان میں زیادہ تر بیجاپوری مسلمانوں کی تعداد تھی، اضلاع بلاری، اننت پور، ریاست میسور اور مشرق میں ویلور تک ان کی کافی تعداد پائی جاتی ہے اور مشرقی اضلاع میں کرنول، نیلور، مدراس، اور چنگل پٹ میں ان مسلمانوں کی خاص آبادی ہے جو گولکنڈہ سے آئے۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے:۔

دکھنی ان ترک خاندانوں کی اولاد سے تھے جن کی ہجرت کے بعد سے سلطان علاء الدین

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۱۰۶

خلجی کے دیا درے ملک کافور کے یلغاروں اور ترکوں کی ترک تازیوں سے ملے ہوئے تھے اور جو محمد شاہ تغلق کے دور میں دکن میں آکر بس گئے تھے۔ بہمنی دور کے اوائل تک ان کی دو تین پشتیں یہاں گذر چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان ترک خاندانوں میں مقامی نومسلم گھرانوں بھی بیاہ کے بندھنوں کے ساتھ خلط ملط ہو چکے ہوں گے۔ یہ لوگ دکھنی کہلانے لگے اور ان کی زبان دکھنی کہلانے لگی۔ [1]

احمد شاہ بہمنی کے عہد میں دیسی اور پردیسی کا ٹکراؤ اور شیعو سنی کا الجھاؤ، علیحدگی پسندی اور انتشار پیدا کر رہے تھے۔ ترک، عرب، مغل (غالباً تاتاری) اور ایرانی ایک طرف صف آراء تھے تو ان کے مدمقابل حبشی اور دکنی تھے جو آفاقیوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ عدم اعتمادی، حسد اور قومی عصبیت نے دکھنی گروہ کو پردیسیوں کی غریب زبان سے اجتناب کرنا سکھا دیا تھا۔ سوائے بحالت مجبوری یا برائے آداب دربار کی اور کاروبار دفتری، لہذا دکھنی میں بول چال سیاسی چال بھی تھی اور خفیہ گفت و شنید کا چلن بھی تھا اور پھر بہمنی حکمراں اپنی ہند رعایا کا دل جیتنے کے لیے دکھنی کی من موہنی بھاشا کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرتے تھے یہ خود کنڑی اور تلنگی زبانوں میں گونگے نہ تھے۔ [2]

عادل شاہی دور کی پہلی صدی میں غیر ملکیوں کے اثر و اقتدار اور شیعیت کے غلبہ کی وجہ سے ہندی ثقافت کا چراغ جھلملانے لگا اور ہندی بولی کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی تھا۔ ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں:۔

"حالانکہ ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء-۵۷ نے تسنن کی تجدید کی ترویج اور دربار کی ملازمتوں سے آفاقیوں کی تخفیف کی اور ہندوی (دکھنی) کو ترویج دینے کی غرض سے اسے دفتر کی زبان کا درجہ دیا گیا مگر یہ سب تدبیریں عارضی ہو گئیں۔ جب اس کے جانشین نے پیا لٹ دی مگر اس دور کی دوسری صدی ہندستانی تہذیب اور مسلم ثقافت کے لیے بار آور ثابت ثابت ہوئی جب دونوں کی مشترکہ قدروں کی جن کی آبیاری بہمنی دور سے ہو رہی تھی ایک نئے دکھنی کلچر میں نمودار ہوئی۔" [1]

کچھ سیاسی مصلحت کا تقاضا تھا اور کسی حد تک مجبوری تھی جس کے سبب ایرانی اثرات رکاوٹ بننے نہیں پائے بلکہ قند پارسی نے طوطیان ہند کو شکر شکن بنا دیا۔ اور جب ایران کے حسن و جمال کا پرتو دکھنی زبان و ادب پر پڑا تو اس کا حسن بھی زہد شکن بن گیا اور اب

---

[1] تاریخ فرشتہ بحوالہ علیگڈھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۵۷-صفحہ ۹۷ - ۱۹۶

[2] تاریخ دکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۳۰۲

تو "دربہار ناز" کی آنکھوں کی سرمئی تحریروں اور چہرے کے غازے سے بجھے جیسا اظہار بن پایا جھلکتا تھا بلکہ اس کے عشوۂ فکر اور غمزۂ اسلوب میں پختگی آگئی تھی اور اس کے اصناف سخن کے سارے خطوط نمایاں اور تیکھے بن گئے تھے اسے چونکہ سلاطین وقت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے ان کے منھ لگ گئی اور جب ملوک و سلاطین کے منھ سے پھول جھڑنے لگے تو کلام الملوک ملوک الکلام بن گیا۔ محمد قلی قطب شاہ جیسے دکھنی کلچر کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی نے دکن میں ایک کتاب نورس یادگار چھوڑی ہے جو اس کے گیتوں کا مجموعہ ہے نورس پر درباری شاعر ظہوری نے اپنا مشہور دیباچہ تحریر کیا ہے جو فارسی ادبیات میں "انشاء غنائیہ" کا بہترین نمونہ قرار دیا جائے۔[۱]

"ان دکھنیوں میں سید بھی ہیں، شیخ، مغل اور پٹھان بھی ہیں ان مسلمانوں کی مادری زبان دکھنی ہے جس کو اردو سمجھنا چاہیے۔ معاشرت کے لحاظ سے ان میں ابھی تک وہ سب رسم ورواج ہیں جو دکن کے مسلمانوں میں ہیں۔"[۲]

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد وہ دکھنی مسلمان جن کا تعلق فوج سے تھا، بیجاپور، احمد نگر گولکنڈہ وغیرہ ملکوں میں چلے گئے لیکن ۱۶۳۷ء میں جب شاہزادہ عالمگیر اورنگ زیب دکن کا صوبیدار تھا تو اس نے جنوبی ہند کی طرف توجہ کی اور بیجاپور کی اسلامی فوجوں کو اس مہم کو سر کرنے پر مامور کر دیا۔ بیجاپور سے ایک لشکر جرار طوفان کی طرح اٹھا اور پورے جنوبی ہند پر چھا گیا ان میں ایک بہت بڑی تعداد دکھنیوں کی بھی تھی لیکن بعد میں ان کی نسل مختلف شہروں اور قصبوں میں آباد ہو گئی۔ چونکہ ان دکھنیوں کی کوئی مرکزی تنظیم نہیں تھی اس لیے تسبیح کے دانوں کی طرح ادھر ادھر بکھر کر رہ گئے۔ وہ تعلیم میں عام طور پر پسماندہ اور تجارت میں فرو ماندہ تھے اس لیے وہ اپنے شاندار ماضی کے صرف یادگار ہو کر رہ گئے۔

کوکن کے دکھنیوں کے متعلق ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں:۔

"کوکن، جزائر، بمبئی، قلابہ اور تھانہ اضلاع کے دکھنی مسلمان (جو تقریباً نومسلم تھے) مراٹھوں کی حکومت میں سات فرقوں میں منقسم تھے۔

عطار، باغبان۔ دھوبی۔ قصاب، منیار، رنگریز اور تنبولی۔ ان کی زبان دکنی ہندستانی (دکھنی ہندوی) (مراٹھی ہندوی) سے مرکب تھی بعض لباس اور رسوم میں مرہٹوں کی تقلید کرتے تھے

---

[۱] تاریخ کوکن صفحہ ۳۳۱ — [۲] تاریخ جنوبی ہند صفحہ ۳۵۶

قدیم گلبرگہ (حسن آباد) میں مومن پورہ کا قدیم محلہ اپنے آثار باقیہ (مسجد کلاں مومن پورہ) اور نام مومن کے سبب اس مہاجر قبیلے کے قدیم بود و باش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ حسن آباد کی قدیم صنعت پارچہ بافی بھی اس برادری کے آبائی پیشہ نوربافی سے تانے بانے جوڑے ہوئے ہے۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مومن مُنکر شمالی ہند کے نووار دوں اور نو آباد کاروں کے ہمراہ بہار، آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان کے قبول اسلام کا فسانہ بھی تقریباً تاسیس سلطنت دہلی سے مطابقت رکھتا ہے جیسا کہ عہد التمش کے اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح نومسلم نوربافی وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے تھے جنید الملک اس کا وزیر ایک مُنکر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ [1]

عرب قدیم ہندو راجاؤں کے عہد میں

(الف) ملابار دور حکومت میں — ساتویں صدی عیسوی سے — بارہویں صدی تک

(ب) کدمب دور حکومت (کرناٹک کا علاقہ) — چھٹی صدی عیسوی سے — چودہویں صدی تک

(ج) بلوا — تامل علاقہ میں — پانچویں صدی سے — نویں صدی تک

(د) چالوکیہ مہاراشٹر اور کوکن کا علاقہ — چھٹی صدی سے — آٹھویں صدی تک

(ھ) راشٹر کوٹ (کوکن کا علاقہ بھی اس کی حکومت میں تھا) آٹھویں صدی کے وسط سے۔ گیارہویں صدی تک اور پھر دسویں صدی سے بارہویں صدی تک،

(و) ہوسیل۔ مالابار اور دکن — گیارہویں صدی سے — چودہویں صدی تک

(ز) چولا خاندان، ساحل کارومنڈل، ملیبار اور مدراس میں نویں صدی کے آخر سے بارہویں صدی تک یہی وہ ملک تھا جس پر ۱۳۱۱ء میں کافور نے قبضہ کرلیا اور ۱۳۲۱ء میں دوار سمندرم کو فتح کرکے اس کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ یونانی اور دیگر ممالک کے سیاح نیز قدیم کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کے وقت ہندوستان میں چندر گپت موریہ کی حکومت تھی اس خاندان کے بعد ستواہان (آندھرا)، کومبا، مہاڈلی، وبدھیا، بلوا (مالابار) نولمبا۔ گنگا۔ راکشترا کلیچوری، چیرا۔ چولا۔ چالوکیا۔ پانڈیا۔ یدوا اور ہوئے سالا خاندان یکے بعد دیگرے اور کہیں کہیں بیک وقت حکمراں تھے ۱۳۲۶ء میں کرناٹک

[1] تاریخ کوکن، صفحہ ۱۴۸

کا علاقہ وجیانگر راج میں آگیا۔

ان قدیم راجاؤں کے عہد کی چند جھلکیاں: سلیمان تاجر پہلا عرب سیاح ہے جس نے اپنے سفرنامہ سلسلۃ التواریخ ۲۲۵ھ کے بلہرا راج کے دیس ککم (کوکن) کا ذکر کیا ہے جس کا راجہ اور پرجا عربوں سے میل ملاپ رکھتے تھے۔ [1]

بلہرا کی راجدھانی کا نام عرب جغرافیہ نویس مانکیر بتلاتے ہیں جو غالباً مانیکھیٹ یا مالکھیت کی معرب شکل ہے۔

مشہور مورخ ابوالحسن علی المسعودی ۳۰۳ھ ۹۱۵ء میں کھمبایت میں آیا تھا اس کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ بلہرا سارے کبکر (کوکن) کا حکمران راجہ تھا جس کا ایک صوبہ لار تھا جو کھمبایت سے لے کر صیمور (چیول) تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں ان کی پراٹ کا علاقہ ڈرسوپارہ اور تھانہ شامل تھے لار میں لاریہ زبان بولی جاتی تھی۔

مسعودی بھی بلہرا راج کی عرب دوستی کا ذکر کرتا ہے۔ [2]

مسعودی جب کھمبایت سے صیمور آیا تو یہاں کا حاکم جانج تھا جو دراصل جنجہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جنجہ لار دیس کے سلاہار گھرانے کا پانچواں مہامنڈلیشور تھا۔ سلار گھرانے کے تین مختلف سلسلے مہاراشٹر میں مہاسامنت اور مہامنڈلیشور بن کر راج کر رہے تھے۔

۱۔ گودیت یا گومنت کے سلاہار (۷۶۵ء تا ۱۰۲۰ء)
۲۔ کولاپور یا کراڈ کے سلاہار (۹۳۰ء تا ۱۷۱۵ء)
۳۔ لار دیس کے سلاہار (۸۱۰ء تا ۱۲۶۰ء)

جب ان سلاہاروں کے عہد میں عرب سیاحوں اور تاجروں کی آمد و رفت بڑھی تو ان کے کانوں میں سلاہار نام ہی کی گونج سنائی دی۔ جس نام کے گجرات سے لے کر گومنت تک گن گائے جاتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں طافن (دکن)، کے راشٹر کوٹ راج کے وسیع تسلط کا تصور تھا مگر زبان پر کوکن (کبکر۔ کم کم) کے سلاہاروں ہی کا نام تھا طافن کے راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر تمام سیاح کرتے ہیں۔ [3]

مسعودی صنداپور (گوا) کے موسیٰ ابن اسحاق کا ذکر کرتا ہے جس سے وہ ملا تھا

---

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۸۳ - ۳۸۲
[3] " " ۳۸۲ - ۳۸۳

اس وقت صیمور کا ہنرمند ابو سعید معروف بن زکریا تھا بزرگ بن شہریار کے زمانہ قیام میں عباس بن ماہان اسی عہدے پر فائز تھا۔ ؎۱

مورخین مسلمان نوآبادکاروں کے معاملات فیصل کرنے والے ایک منصف (زنج) کا ذکر کرتے ہیں جیسے راجہ انھیں میں سے مقرر کرتا تھا اسے ہنرمن یا ہنرمند کہتے تھے یہ ایک موروثی اور اعزازی عہدہ تھا۔ ؎۲

اسی زمانے سلاہار (راج) میں عرب سوداگر بانکوٹ کی کھاڑی سے عمارتی لکڑیوں کی بدیسی تجارت میں اپنی اجارہ داری کے ستون گاڑ چکے تھے۔

سلاہار خود بھی کوکن کے نہ تھے وہ کنارہ کے تھے اور ان کے منتری اور مہامنتری تیلگو اور کنڑ کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

(پان) تنبول کی خاصیت سے مسعودی بھی واقف تھا۔ یہی مورخ ڈلی (فوفل) کا ذکر کرتا ہے جو یمن سے حجاز، مکہ کے لوگوں کی محفلوں میں بڑے چاؤ سے چبائی جاتی تھی۔ ؎۳

ابوزید بیان کرتا ہے کہ عمان کے تاجر اوزارے کر آتے تھے۔ ناریل کے پیڑوں کو کاٹ کر سکھانے کے لیے ڈال دیتے تھے پھر اس کے تختے تراش کر ناریل ہی کی چھال سے بٹی ہوئی رسی سے انھیں باندھ کر کشتیاں بنا لیتے تھے اس کا تنہ مستول بنا جاتا اور اس کے جھوبچھے کو بن کر بال تیار کرتے تھے پھر انہیں کشتیوں میں ناریل بھر کر عمان لے جاتے تھے اس طرح سونے کے درخت سے (عرب اس کو سونے کا درخت کہتے تھے) سونے کا پھل (روپیہ، زر) پیدا کرتے تھے۔

بحرین کے شہر الخطیف میں بانس کی اتنی بڑی منڈی تھی کہ اسی شہر کی مناسبت سے بانس کو عرب و عجم میں الخطیف ہی کہتے تھے۔ ؎۴

حدود العالم (ادریسی کی تصنیف) میں صیمور کے ساتھ سندان کے بانس کے جنگلوں اور نرسل (نائرہ) کے نیزوں کا ذکر ملتا ہے۔ ؎۵ سنجان، سوپارہ، اور چیمولی میں یہودی تاجر عورتوں اور مرد غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔

؎۱ تاریخ کوکن صفحہ ۴۵ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ ایضاً ایضاً

؎۲ تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۸۰ ایضاً ایضاً صفحہ ۸۴ ایضاً ۵۷ بحوالہ عرب و ہند کے تعلقات ایضاً ۸۵ ایضاً ص ۸۹ ایضاً ص ۹۲ بحوالہ مروج الذہب صفحہ ۱۸۷۔ ابن حوقل۔ ایلیٹ کے صفحہ ۸۵

؎۳ حدود العالم صیمور اور تانہ کا بیان ایضاً تاریخ کوکن ص ۹۳

؎۴ بمبئی کا عروج انگریزی صفحہ ۱۶۔

لاردیس کی یہ راجدھانی (شری الیستھانک یا تھانہ)
عرب جغرافیہ نویس اور گبن کو بے حد پسند رہی تھی۔ یہ خلیج دلدلوں کی کالی چادر پھیلاتی کیمبرے میں آبجور تک پھیلی تھی یہاں پر سمندر سے شیرازی کشتیاں (در عرب بارج (بوارج) پناہ لیتے تھے۔ [1]
ابوالفدا آنہ (تانہ) کے بنے ہوئے کپڑے تنا ہی کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح بہار کر ہنکہ نقلی ریشم سے بنتے تھے اور یہ مصنوعی ریشم بانس گھے پیشوں سے تیار کیا جاتا تھا۔
سلاہاروں کے چار سو سالہ راج میں بحری ڈاکوؤں کا راج چھایا۔ اجن کی سب سے بڑی چھاؤنیاں یہاں کی کھاڑیاں تھیں اور بمبئی کے جزائر تھے اور جن کی پشت پناہی کر کے سلاہار خود اپنی اقتصادی طاقت کی کمر توڑ چکے تھے اور آرتھک استتھی (معاشی حالت) کو بگاڑ چکے تھے۔
لوٹ کھسوٹ سے دولت کا ڈھیر لگایا جا سکتا ہے مگر دیرپا نہیں بنایا جا سکتا۔
سلاہاروں کے بعد پہلی مرتبہ کوکن اور دکن پھر کے علاقے کنڑی بولنے والے حکمرانوں کے حلقہ اثر و اقتدار سے نکل گئے اور یادو راج میں یہ ایک سیاسی وحدت میں ضم ہو گئے اور اس وحدت میں اپنی ایک واحد سانسکرتی اور ایک بھاشا میں ترقیاں ہونے لگیں اس کے بعد یعنی یادو راج کے سنہ ۱۳۱۱ھ کے بعد یہ علاقے خلجی سلطنت میں چلے گئے اسکے بعد تغلق خاندان کے تحت رہے اور سنہ ۱۳۴۷ھ میں وجیانگر سلطنت بن گئی۔ [2]

مسلم عرب سوداگروں کی آمد

بحری تجارت کی لہروں نے مسلم عرب سوداگروں کو مغربی ساحل کے کناروں پر دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ عرب نوآبادکاروں کی بستیاں ظہور اسلام کے بعد جزائر سراندیپ اور مالدیپ کے علاوہ معبر (کارومنڈل) ملیبار، کوکن اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں ظہور میں آچکی تھیں۔ معبر میں ان کی مخلوط اولاد کو لبے، ملیبار میں موپلا، کوکن اور گجرات میں نائت یا نوائط کہلاتے تھے طاقتور (دکن) کے راشٹرکوٹ اور لاردیس کے بلہرا (بلہارا) راجاؤں کی عرب دوستی کا ذکر عرب مصنفین کرتے ہیں۔ [3]
بلہرا راجہ چالیس سے پچاس برس تک راج کرتے تھے اس لیے یہاں کے لوگوں کا عقیدہ

---

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۹۳ [2] تاریخ کوکن صفحہ ۹۳ بحوالہ البلاذری و ابن جوزابہ بحوالہ ایلیٹ
[3] عرب و ہند کے تعلقات تاریخ کوکن صفحہ ۱۲۶۔

تھا کہ ان کے راجاؤں کی لمبی عمروں کی وجہ عرب دوستی ۔ عدل ۔ اور مذہبی رواداری تھی۔ ان کے راج میں مسجدیں آباد تھیں اور مسلم نوآبادیاں نئے شہروں میں تبدیل ہو رہی تھیں بدیسی تجارت کا بازار گرم تھا اور شہری زندگی کے تصورات ہندستانی مدنیت کو نئی وسعتیں دے رہے تھے۔

عربوں اور عجمیوں کا یہ ایک بڑا سماجی کارنامہ اور بدیسی تجارت کا یہ اقتصادی کرشمہ تھا کہ کوکن کے دیار اور راجاؤں کے دربار عربوں کی سرپرستی کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ گوکنت کے ایک سلاہار راجہ کا مصاحب موسیٰ نام کا ایک عرب تھا اور لارڈ بس سلاہار راجہ انت پال دیو کا ایک منتری اسود (اکم) عربی تھا۔

قبائلی اور سماجی زندگی کے آغاز نے تجارتی اور معاشی رشتوں کو استوار کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کی یاد سے پہلے اور دیدزمانوں سے قبل مغربی ساحل کی بندرگاہوں کے تجارتی مواصلات بالخصوص اس زمین سے مستحکم ہو چکے تھے جو بابل اور نینوا کی تہذیبوں کے گہوارے تھے اور جہاں کئی پیغمبر نازل ہونے ہیں جیا، سرپارک، سوپارہ، شری استھانک اور کلیانا کے بحری رابطے، بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے ذریعہ عراق، عجم، مصر و شام اور روم و یونان سے عرصے سے قائم ہو چکے تھے انھیں ملکوں کے ساتھ چپوؤں والی بادبانی منقش کشتیاں یہاں لنگر انداز ہوتی تھیں ان میں اجنبی زبان بولنے والے وجیہہ بدن (یونانی) لمبی عباؤں والے بازار مصر کے سوداگر اور گھنی داڑھیوں اور آہورمزدہ کی پرستش کرنے والے عجمی تاجر آتے تھے ان کے لیے یہ ناریل اور ساگوان کا ملک جس کے دریاؤں میں موتی مونگے رہتے تھے۔ جس کے پہاڑوں میں یاقوت کی کانیں تھیں اور درختوں میں عطر بسا ہوا تھا سونے چاندی کی جھنکاروں اور عود و عنبر کی مہکاروں نے ان کے دلوں اور دماغوں پر ایسا سحر طاری کر دیا کہ مصر کا جادو اور سامری کا طلسم بھی لوٹ کر رہ گیا۔[۱]

ان غیر ممالک کے تاجروں نے آگے چل کر اس علاقہ ہندستان کو ہی اپنا گھر بنا لیا انھوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیے اور یہی اپرانت کے پہلے بدیسی نوآباد کار کہلائے جن کی بستیاں میلاد مسیح کے عہد تک سرپارک، کلیانا اور گوکنت کے علاوہ دیگر ساحلی علاقوں اور مقدس مقاموں میں آباد ہو چکی تھیں۔[۲]

۱؎ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۷۰ - ۲۴۲ - ۲۷۷ - ۲۸۰۔
۲؎ عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۵۰ بحرھا دُر و جبلھا یاقوت و شجرھا عطر"

موریہ اور نل (۵۰۰ء تا ۱۲۶۰ء)

گو بادامی چالوکیہ آٹھویں صدی کے اول نصف تک مہاراشٹر کے ایک بڑے حصے پر راج کرتے تھے مگر قلابہ، تھانہ، جزائر بمبئی اور سشٹی پر موریہ اور نل کے مقامی گھرانے ایک صدی تک حکمرانی کرتے رہے کلیانا مغربی ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں سے ایک ریاست کا صدر مقام تھا کلا چوری عہد کی مرکزی حیثیت اسے اس دور میں بھی حاصل رہی۔ مصری راہب توماس جب ۵۳۰ء میں یہاں آیا تو اسے بین الاقوامی حیثیت کی ایک تجارتی منڈی پایا جہاں سے تانبا، لوہا، آبنوس، اور کپڑے سیلون برآمد کیے جاتے تھے اور وہاں سے ریشم، لونگ اور عود و صندل یہاں آتا تھا اس کے علاوہ بیاو مرنج سونٹھ، مسالے ریشمی اور سوتی کپڑوں کا بیوپار بھی منافع بخش تھا۔ خلیج فارس کے ذریعے کلیان کی بدیسی تجارت کو نہ سے قریب جدہ اور ابلہ کی بندرگاہوں سے عروج پر تھی جہاں بانس اور ساگوان کی بڑی مانگ تھی۔ اسی تجارت کے سلسلہ میں بنی اسرائیلی قبیلے یمن سے ہجرت کرکے شمالی کوکن کی بندرگاہوں میں آباد ہونے لگے تھے۔ چھٹی صدی میں قلابہ میں خصوصاً راجپوری بندر میں ان کی بڑی تعداد وطن اختیار کر چکی تھی۔[1]

کلیان میں آباد ایرانی کے نسطوری خاندان اپنی تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے ایرانی کلیسا کی پیروی کرتے تھے اور وہیں سے احکام حاصل کرتے تھے۔ کلیان کا راہب ایران سے مقرر ہو کر آتا تھا۔[2]

توماس جب کلیان آیا تو یہاں نل گھرانہ راج کرتا تھا۔ نل راجہ کی زبردست عسکری طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پاس پانچ سو سے کر چھ سو تک جنگی ہاتھی تھے۔

اس خاندان کی یادگار کلیان سے قریب ملنگ گڑھ کا مشہور پہاڑی علاقہ (بالا حصار) ہے عہد غزنویہ میں جب حاجی عبدالرحمن نامی ایک عرب مع دیگر متعلقین کے کوکن آئے تو اسی قبیلے کی ایک راجکماری ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔ نل قبیلہ کا موریہ گھرانے سے نسبتی اور قومی تعلق

---

[1] تھانہ گزیٹر ج ۱۳ صفحہ ۲۰۰

[2] " " "

کا ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا ایران میں بھی راشٹرکوٹوں، کلاچوریوں کے جانشین اور بادامی چالوکیوں کے حریف تھے۔ ؎۱

بادامی چالوکیہ راج سنہ ۵۵۱ء تا سنہ ۷۵۷ء

پلکیشن دوم سنہ ۶۴۲ء تا سنہ ۶۱۰ء

کوکن کی بندرگاہوں کا ناخدا اور گومنت سے لے کر شَشٹی تک کے دیہاتوں تک کا نوہ ناخدا بن بیٹھا اس کی شہرت ایوان کسریٰ کی دیواروں سے ٹکرانے لگی۔ سیاسی اور تجارتی استحکام کی غرض سے پارسیوں کا دان (فارس کے لوگ) کے شہنشاہ خسرو پرویز سنہ ۹۰ ہجری ۶۲۸ء نے ایک سفارتی عہد پلکیشن دربار میں بھیجا۔ ایرانی مدنیت اور معاشرت نے ہندوستانی کلاکاروں اور چترکاروں کو اتنا متاثر کردیا تھا کہ تخیل کی تمام پرکاری حقیقت نگاری بن چکی تھی۔ اجنتا کی مصوری میں ایرانی سفارت کی نقاشی کی گئی ہے اور گومنت کی ایک پراچین مورتی گنج لکشمی کی دیودیاں ایرانی پوشاک میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ ؎۲

دنابل یا بادامی کا یہ چالوکیہ راج جیسے کبھی چالوکیہ گھرانہ کہا کہتے ہیں۔ سابتھہ، ودیا بھیشنا اور سانسکرتی اتہاس میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اور سب سے زیادہ اس کی اہمیت ہندوستان تاریخ میں اس وجہ سے بھی ہے کہ اس عہد میں دور عرب کے صحراؤں میں نور الٰہی کی تجلی چمکی جب کوکن اور دکن کے صنم کدوں میں گہرے غار کھودے جارہے تھے۔ غار ثور میں توحید کا کلمہ گونج رہا تھا۔ عرب کے صنم کدوں کے لات و ہبل منہ کے بل گر کر ھواللہ احد کہنے لگے تھے۔ عرب کے بادیہ نشینوں میں ایک کالی کملی والا اٹھا جو چاند بن کر چمکا اور چمن زاروں کی طرح مہکا اور نکہت بیز ہوائیں اسلام کے پیغام حق کی پیامبر بن کر برہما ورت کی طرف چلنے لگیں۔ ؎۳

چودہویں صدی میں جب مراکش کا ابن بطوطہ صندابور آیا تو اس جزیرے کے وسط میں قدیم وجدید دو شہر آباد تھے۔ ایک ہندوؤں کے اتہاس کی جھلکیاں دکھا رہا تھا اور دوسرا مسلمانوں کی تاریخ دہرا رہا تھا۔ یہاں بغداد کے طرز تعمیر کی تقلید میں ایک جامع مسجد تھی جسے ناخدا حسن نے بنائی تھی۔ صندابور کے جزیرے میں چھبیس گاؤں تھے۔ ناخدا حسن کا بیٹا جمال الدین ہنوری اس وقت

؎۱ تاریخ کوکن صفحہ ۱۴۴ ؎۲ تاریخ کوکن صفحہ ۴۴۵ ؎۳ سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ جعفری اکاڈمی کراچی صفحہ ۷۵

یہاں کا سلطان تھا اور ہنور اس کی ریاست کا صدر مقام تھا یہ مسلم تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن چکا تھا۔ یہاں عورتوں اور مردوں کی تعلیم کا بے حد چرچا تھا۔ ابن بطوطہ نے اس شہر میں ۲۳ لڑکوں کے اور ۱۳ لڑکیوں کے مدارس دیکھے تھے۔ فقیہہ، امام، حافظ اور شافعی خانوادوں کی روحانی برکتوں سے ہنور کی فضا معمور تھی۔ یہاں مسلمان مستورات ہندو عورتوں کی طرح ساڑیاں باندھتی تھیں۔ مسلمان فقہ شافعی کے مقلد تھے جس سے ابن بطوطہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ سارے عرب یا ان کی اولاد تھے۔ [۱]

دامیشور مندر کے قریب ایک کنڑی کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیمولی پر مسلم اقتدار سحاب گزراں ثابت ہوا تھا کیونکہ اس پر بہت جلد ۱۳۳۶ء میں وجیانگر کا سایہ پھیل گیا۔ [۲]

بلہرا راج میں۔ مسجدیں آباد تھیں۔ مسلمانوں پر مذہبی رسوم کی ادائیگی میں کوئی پابندی نہیں تھی اور مسلم نو آبادیاں نئے شہروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ عرب اور غیر ملکی تاجروں کا ایک تانتا سا لگا ہوا تھا۔ تجارت کا بازار پورے شباب پر تھا اور بقول ڈاکٹر مومن محی الدین شہری زندگی کے تصورات ہندستانی مدنیت کو نئی وسعتیں دے رہے تھے۔ [۳]

گوا، چندا پور جسے عرب صندا پور کہتے تھے اور ہنور میں عرب قبیلے عرصے سے آباد تھے۔ جے کشی کے دادا مہمان دیو کی جان ایک عرب تاجر صدر نے بچائی تھی۔ جب اس کا جہاز سوراشٹر کی پار اتر جاتے وقت طوفان باد و باراں میں پھنس گیا تھا اس خدمت کے صلہ میں جے کشی نے اس کے بیٹے شدامہ کو (الخ) اپنا وزیر بنا لیا تھا اور جس کے حسن انتظام نے گوا پوری کی نئی راجدھانی کو جداگانہ بخشش دی تھی اور جس کی کہانی ناریل، سپاری اور تاڑ کے گہرے سبز سایوں میں ڈوبے ہوئے خیابانوں میں سفر کرتی ہوئی ہم تک پہونچی ہے۔ [۴]

گوا پوری کی شاہراہیں دن رات ہانپتے ہوئے کہاروں کی ہٹو بچو اور مرصع ساگوانی پالکیوں کی چرچراہٹوں کی آوازیں سناتی رہتی تھیں ان اونچی کھڑکیوں میں بڑے بڑے گیانی پنڈت دھیان میں ڈوبے بیٹھے رہتے تھے اور ان کے کانوں میں سونے کے کنڈل لرزتے رہتے تھے اس خوبصورت بستی میں عیش و نشاط کی فراوانی کہ لوگ اندر لوک کی کہانی بھول بیٹھے تھے۔ [۵]

سیراف کے سیاح ابو زید کو آدمیوں کی گردنوں پر سوار آدمی کو دیکھ کر بڑا ہی تعجب ہوتا تھا۔ بزرگ بن شہریار اس انوکھی سواری کو "ہندول" کہتا ہے جو دراصل ڈولا یا ڈولی تھی ان مرصع ساگوانی پالکیوں میں پونجی بنی اور شریسٹھی مور پنکھ کا جھترہ لگائے الف لیلیٰ کے طلسمی

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ مترجمہ جعفر اکاڈمی کراچی صفحہ ۵ [۲] عرب و ہند تعلقات صفحہ $\frac{۲۸۸}{۲۸۹}$ ماخوذ از تاریخ کوکن صفحہ ۵
[۳] تاریخ کوکن صفحہ ۶۲ [۴] تاریخ کوکن صفحہ ۵۶ بحوالہ گوا کی قدیم عبادت گاہیں صفحہ ۵۶ [۵] ایضاً ایضاً

قالینوں کے دیودار کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ دھوپ سے بچاؤ کے لیے سڑکوں کے دونوں طرف ناریل کے ان گنت پیڑوں کی بنا کھڑی تھی جو برسوں پہلے پوروسمندر سے پرے ملایا کے جنوں سے سنگدیپ کے راستے لائے گئے تھے جیسا کہ ناسک گپھا کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے۔ عرب اسی لیے کوکن کو نارجیل ناریل والا ملک کہتے تھے۔ یہی ناریل دیگر پیداواروں کے ساتھ عراق و عرب بھیجا جاتا تھا۔ ناریل اور تاڑ کے جنگلوں میں ململ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس شہری اور صرف لنگوٹی کسے ہوئے ادیباسی ادریسی اور مسعودی کو اجنبی ضرور لگتے ہیں۔ انتھیورہ کی رانیوں کو بے نقاب دیکھ کر سیراف کے ابو زید کی آنکھوں کے سامنے اپنے وطن کی مستورات کا سخت پردہ پھر جاتا ہوگا۔ ابن مہلہل کو جو شاہ بخارا النصر بن احمد سامانی متوفی ۳۳۱ھ کے دربار سے چینی سفیر کے ساتھ خاقان چین کے دیار کی طرف جارہا تھا۔ صیمور کے باشندے ترکان شیرازی اور چینی گڑیوں سے زیادہ دلکش نظر آتے تھے۔ حدود العالم کے مصنف کو بیاحوں نے بتایا ہوگا کہ ملہرادیس کے باسی لمبے لمبے بال (موئے فرد ہشتم) رکھتے تھے۔ سری استھانک کی راجدھانی میں اتنی سخت گرمی پڑتی تھی کہ اگر کوئی تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں کھڑا ہوجاتا تو گرمی اسے موت کے سامنے لا دھکیل دیتی۔

لار دیس کے شہروں اور شاہراہوں پر عجمی یا عرب سیاحوں سے جب ان کے ہم وطنوں کی بھیڑ ہوجایا کرتی ہوگی تو وہ اپنے وطن کی باتوں میں کھو جاتے ہوں گے۔

بزرگ بن شہریار ناخدا چوتھی صدی میں اپنے جہاز اس طرف لایا کرتا تھا۔ ایسے کئی نو آبادکاروں سے ملا تھا جو برسوں سے کوکن میں رہتے بستے آئے تھے لہ

سیراف کا ایک تاجر محمد بن مسلم سے ملا تھا جو تھانہ میں ۲۰ برسوں سے زیادہ رہا تھا اور ہندستان کے اکثر شہروں کا اس نے سفر کیا تھا۔ شیدہ میں خلیج فارس کے شہر صنا کے ایک سوداگر ابو بکر سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اس شہر میں سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں کے ہزاروں مہاجر اور تاجر آباد تھے۔ سلاہاروں ہی کے کسی دور میں عرب سے حاجی عبدالرحمان نامی ایک مبلغ مع اپنے حواریوں مسلمان اور بجنیارکے کوکن آئے تھے اور مرہٹوں میں اشاعت اسلام کرکے نل تیلے کی ایک راجکماری کو مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ حاجی ملنگ کے نام سے مشہور رہیں۔ کوکن کے اولین مبلغین میں ان کا شمار ہوتا ہے راجپوری میں حبش کے صدی اور یمن کے بنی اسرائیل اب اپنے اصل وطن کو بھول چکے تھے۔ سنجان کے پارسی مہاجر بڑے بڑے جہانگیروں کے

لہ تاریخ کوکن صفحہ ۸۰

مالک بن چکے تھے ان کو دریا سِنی بار بردار جہاز ابولی دیپ تک دوڑنے لگے تھے۔ بدیسی بیوپاریوں اور بردہ فروشوں میں خلیج فارس کے یہودی تاجر لار دیس کے بنیوں (دھنایہ) سے لین دین رکھتے تھے۔

سنئے بدیسی سوداگروں کے تجارتی اسباب کی فروخت کے لیے آڑھت کا بھی کام کرتے تھے یہودی تاجر کئی زبانوں کے ماہر ہوتے تھے اور اگر وہ فارسی، یونانی، لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی اور روسی بول سکتے تھے تو یقیناً وہ ساحلی بولی لار بھی جو بگڑی شدہ بدوہ رکھتے ہوں گے جو مسعودی کے بیان کے مطابق صیمور، سوپارہ، اور تھانہ میں بولی جاتی تھی۔ (و لغۃ ساحلہ مثل صیمور وسوپارہ وتانہ) لہ

پتز ہویں صدی کے آخر میں جب مارکو پولو یہاں آیا تو اسے بھی مقامی بولی سنائی دی لاری بر اصل عربوں کے بانایہ (یعنی بنیا بیوپاریوں کی گجراتی زبان تھی جس میں راجہ کے شاسن (احکام) دردھان، قوانین اور دان پتر لکھے جاتے تھے۔ سے

بغداد کے ابن حوقل کو سلاہار راج کھنبایت سے لے کر صیمور تک پھیلا ہوا نظر آیا تھا اور لار دیس کی وحدت میں چودہ سو دیہاتوں کی اکائی پھیلی ہوئی تھیں جو کھاڑیوں اور ندیوں کے کنارے آباد تھیں یا پھر کسی کنویں یا تالاب کے ارد گرد کسانوں مچھیروں کی جھونپڑیوں کا گاؤں نظر آتا تھا۔ ارتھ شاستر میں جنگلوں کو صاف کر کے نئی بستیاں بسانے کا اپدیش ملتا ہے سلاہار راج کے دان پتروں سے کئی دان پتروں سے کئی پراچین بستیوں کے نام کے ابھرتے ہیں۔ سے

چیمولی

یسوع مسیح سے قبل ...... پانچ ندیوں کے سنجوگ پر ایک راجہ کی راجدھانی جو چیمو دیپ کی ایک سندر نگری اور تجارتی منڈی تھی چیماول کہلاتی تھیں راجہ کی سینا میں سولہ سو ہاتھی ڈیڑھ لاکھ پیادہ فوج اور پانچ ہزار گھوڑ سوار تھے۔ چیماوتی دلدلوں سے گھرا ہوا تھا اور مگرمچھ سے پٹا ہوا تھا۔ چمپک کلیوں کی جب اور کھلی تو چیمولی بن گئی۔ جس کی سوگندھ ویشالی شہر تک پہنچ گئی۔ یہ شہر یونان کے دیس بطلیموس اور چیمور بن کر مہکا اور عربوں کے مالک میں چیمور

لہ مولانا سید سلیمان ندوی عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۰۸۔ سے کتاب المسالک والممالک ابن خرداذبہ صفحہ $\frac{68}{61}$ سے مروج الذہب ج ۱ صفحہ $\frac{95}{86}$

چیمور اور جیمور بن چکا تھا مگر اسے کوئی نام راس نہ آیا اور اب صدیوں کی خلیج پار کر کے جیمور کے
لواح میں لڑا ایسے کا ایک راس اس کی خوشبو اڑا کر چیمبور بن گیا ہے جو آج پڑول کی
بو باس میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناموں کا یہ آوا گون اور تکرار چول کی عظمت اور وسعت کا اقرار
ہے جس کا دامن جزائر بمبئی کے مضافات یا یو حول تک پھیلا ہوا تھا۔ چیمبور کے قریب ماحول کی بستی
کیا عجب کہ عربوں کے اسی ماحول کی یادگار ہو۔[۱]

مسعودی جب سلاہار راجہ جنجہ کے عہد میں صیمور آیا تو یہاں دس ہزار مسلمان آباد تھے جن میں
بڑی تعداد مخلوط النسل مسلمانوں کی تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور ان عربوں اور گجیوں
کی اولاد سے تھے جو یہاں بودوباش اختیار کر چکے تھے۔[۲]

مقامی مسلمانوں کو مسعودی بیاسرہ کہتا ہے چیمبول کے تجارتی رابطے مضافاتی بندرگاہوں
اور شہروں کے ہونے کے سبب سے یہاں تاجروں کی آمد مسلسل رہتی تھی۔ مسعودی صنداپور (گوا)
کے موسیٰ بن اسحاق کا بھی ذکر کرتا ہے جس سے وہ ملا تھا اس وقت صیمور کا ہنرمند ابو سعید معروف
بن ذکریا تھا۔ بزرگ بن شہریار کے زمانہ قیام میں عباس بن ماہان اس عہدے پر فائز تھا۔ ابرادیر
کے ایک داستان میں چیمول کو ساہوکاروں کی بستی کہا گیا ہے۔[۳]

قدیم مسلمان

ظہور اسلام کے بعد گوا کے کدمب اور تھانہ کے سلاہار راج میں عرب و عجمی مسلمان کوکن میں
آباد ہو چکے تھے۔ چیمور اور سوپارہ کے علاوہ دابھول، چپلون، راجاپور اور راجہ پور کی قدیم
بستیوں میں ان کے محلے بس گئے تھے چالوکیہ گھرانے کے راجہ جیہ کیشی (اول) نے مسلمان عربوں کو
بڑی مراعات دے رکھی تھیں۔ گہلادیو (دوم) جو کدمب راج کا ... گھنا اور سالوان ملایہ کا ڈگ
دجیہ تھا۔ اپنے ایک محسن محمد تاجی کو اپنا مشیر بنا لیا تھا۔ جس نے راجہ کو اتنی دولت دی تھی کہ کسی اور
بادشاہ کو نصیب نہ تھی۔ بہمنی دور کے آغاز میں ہنور اور وجیانگر کے علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے
گوا اور بھٹکل کے نواح میں ایک نئی آبادی کی بنیو ڈالنے لگے تھے۔

بلاکے دور) دیہات میں یہ بستی اتنی بڑھی کہ پرتگیز کی عہد میں قدیم گوا کا حصہ بن گئی لیکن جب
زنگی استبداد کی بیاہ کاریاں بڑھیں تو بہت سے قبیلے بھونڈی، کلیان، تاہم اور تھانہ ہجرت کر

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات صفحہ ۲۷۸/۲۸۲ [۲] ۲۸۴ بحوالہ تاریخ کوکن

[۳] تاریخ کوکن صفحہ ۹۴۔

بجاز اور حضرت موت کے سادات اور شیوخ اپنی نسبی فضیلت اور دینی مرتبت کے سبب عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ لہ

عادل شاہی دور میں قفات کے آبائی عہدہ پر سرفراز خاندانوں کی سند قضا صرف ایک احتاج کے طور پر دی گئی یومیہ کی رقم برطانوی عہد تک برقرار رکھی گئی تھی نوائطیوں ہی میں سے ایک لاری سا (عادل شاہی سکہ) یومیہ پر بموجب فرمان ہوتا تھا۔ نظام الملک کے دور میں کئی نوائطی امراء سفارتوں سے متعلق رہ چکے تھے۔"

ہندو مسلم معاشرتی تعلقات

ہندو عقائد و سنسکرتی کی روحانی کشش ایک حد تک مسلم ذہنوں کے لیے بیحد فکر انگیز ثابت ہوئی تھی۔ معاشرتی اختلاط کا سبب سے حادثہ حسین دو دلوں کے اتصال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کی دکھنی شاعری میں کسی ترک شیرازی کی اجنبی اداؤں کی شرح نہیں ملتی بلکہ آندھرا پردیس کے ایک تیکھے نقوش والی ترکی بھاگیہ وتی کی مدرا اداؤں اور نیناؤں کی تفسیر ملتی ہیں غیر مذہب فریقوں میں باہمی شادیاں معاشرے میں بظاہر کسی جذباتی ہیجانی یا سماجی سورش کا سبب نہیں بنتی تھی۔ مگر اس قسم کے رشتے عموماً اعلیٰ اور حکمراں طبقہ میں زیادہ وقوع پذیر ہوئے تھے کیونکہ سلاطین وقت دوسری قوموں میں شادی کرنے کو "دل بدست آورد" کا درجہ دیتے تھے گو اس میں رموز مملکت خویش" اور سیاسی مصلحت تھی مگر علیحدہ پسندی کے بت کے توڑ کے لیے اس قسم کی قومی سالمیت اور جذباتی یکجہتی کی حد درجہ ضرورت تھی سماج اس قسم کی شادیوں کی ہمت افزائی نہیں کرتا تھا مگر قبول ضرور کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ کوکنی مسلمانوں کے قدیم قبیلوں میں غیر مسلم عورتوں سے شادیاں معیوب تصور نہیں کی جاتی تھی۔

ایک مغرب سیاح نے لکھا ہے کہ بسین کے نوائطی مسلمان قاضی "ہندو عورتوں سے بیاہ کرکے آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں"۔ یہ تونگر بھی ہیں اور باسمت سوداگر بھی۔

کوکنی مسلمانوں کے رسم و رواج گو ایک طرف ایران و طوران سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے مگر ان پر نقامی روایت و رسم اور ہندو عقائد کی پرچھائیاں بھی پڑی تھیں ترکوں کی ساچق رسم یہاں بری بن گئی۔ آرسی مصحف جلوہ شب یا شہر گشت اور میلاد خوانی اگر اسلامی رسمیں ہیں تو

لہ مسز فریڈرک کا بیان صفحہ نمبر ۳۴ بحوالہ تاریخ کوکن ڈاکٹر مومن محی الدین صفحہ ۲۸۰

تانجا۔ اٹن، مستی اور سہرا ہندوستان کے سولہ سنگار میں شامل تھے۔ میت کے رسوم میں قبروں کی زیارت، تیجا، دسواں، قرآن خوانی، گلپوشی کا ذکر ابن بطوطہ بھی کرتا ہے۔ (اس لیے اس کے ملک میں اور دیگر ممالک میں جہاں جہاں وہ گیا تھا اس قسم کا دستور نہ تھا۔)

بسم اللہ کی مذہبی رسم جب بچہ یا بچی چار سال چار مہینے اور چار دن کے ہو جاتے ہیں مغلوں کے عہد میں بڑی سختی کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ کوکن کے سنی مسلمان بھی مناتے ہیں۔[1]

رگو چاول کا شمار مغربی سیاحوں کے معیار کے مطابق بڑے شہروں میں نہ ہوتا تھا لیکن اس وقت اس کی منڈی اور بندرگاہ نظام الملکی مملکت میں سب سے عظیم تصور کی جاتی تھی تجارت کا دارومدار موسم پر تھا یہاں خلیج فارس اور عرب ممالک کے تاجر اپنے دہاؤ جہازوں میں گھوڑے اور کھجور لاتے تھے اور اس کے عوض سونے کے پھل (ناریل) لے جاتے تھے۔ ملیباری تاجر اپنے تیر اور ریگلہ جہازوں میں ناریل۔ سپاری۔ مسالے ادویات، تباشیر اور کرنڈ گجراتی بیوپاریوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کے لیے لاتے تھے۔ یہاں سے وہ گیہوں۔ سبزیاں۔ باجرہ، چاول، تل اور تل کا تیل گوا اور کنارہ لے جاتے تھے اور یہی جہاز گوا کا سفر کرتے تو کپڑوں کے تھان چیول لے جاتے تھے۔ کیونکہ دکن کی نفیس ململ ___ اور مقامی سوتی کپڑوں کے ملبوسات کی تجارت بھی انہیں سے دامن گیر تھی۔ مقامی رنگوں پر بنے ہوئے کپڑے کو بیرانی کہتے تھے۔ گجراتی بیوپاری انہیں کپڑوں کو دیو کے راستے عرب دیار لے جاتے تھے۔ پرتگیز اپنے دیو کی تجارتی کوٹھی سے (جسے البوقرق نے ۱۵۱۲ء میں قائم کر لی تھی۔ کہ منظمہ لائے گئے۔ شنگرف، تانبا اور پارہ سونے کے بھاؤ بیچنے کے لیے چیول لاتے تھے۔ تانبا کی مانگ بہت زیادہ تھی کیونکہ اندرون ملک برتن یا سن بنانے اور سکے ڈھالنے کے لیے اس کی بے حد ضرورت پڑتی تھی ان معدنیات کے تبادلے میں ہندوستان کا سونا اور مسالا سمٹ کر پرتگال جا رہا تھا اور جہاں خوشحال زندگی کا سنہری دور شروع ہو چکا تھا۔"[2]

داشٹی (یا انجیویل)

ندی کے کنارے پہاڑی کے دامن میں آباد اطالوی سیاح ورتھیمہ کو اپنے دیس کے ایسے ہی کسی شہر کی یاد دلاتا تھا جس کے اردگرد مغربی طرز کے حصار بندی تھی جس سے کچھ میل دور بہتے ہوئے سمندر کی لہریں کھاڑی کی پانی سے مل کر بھرتی کے وقت سر ٹکراتی رہتی تھیں۔ مصطفیٰ آباد،

---

[1] تاریخ کوکن صفحہ ۲۴۴۔ [2] دسے کہنا صفحہ ۲۳۔ اربوسا کا سفرنامہ کا ترجمہ ہنری اسٹینلی (لندن) صفحہ ۶۹—۷۰
منقول از تاریخ کوکن ڈاکٹر سید محی الدین صفحہ ۳۴۵

یا جعفرآباد، (اب دبھول، مہائم اور تھانہ) کی طرح نوائطی سوداگروں کا شہر تھا۔ یہاں کھپریل کی پوشش والی شاندار حویلیاں، قدیم عالیشان مسجدیں اور مندروں کی قدیم عبادت گاہیں تھیں۔ گھاٹ سے لے کر ندی کے کنارے دور تک خوبصورت پختہ مکانات پھیلے ہوئے تھے یہاں قلعہ بند چھ ہزار کی فوج رہتی تھی جس میں پانچ سو ترکوں کا دستہ تھا۔

سنہ ۱۵ء کی زندگی کے دو دن رہ گئے تھے دیو اور کھمبائت کے بنیے بیوپاری اپنے چار بادبانوں والے ٹیلوں اور کاٹھیا واڑی کوتیا کشتیوں میں بیٹھے پال پال کا حساب کر رہے تھے مکہ، عدن، ہرمز کے ایرانی اور عرب سوداگر اپنے تجارتی داؤ اور دھنگیوں سے تانبا، پارہ، چاندی اور شنگرف کے خروار اتار رہے تھے اور گھوڑوں کو ہنکا کر گھاٹ اتار لے جا رہے تھے ملیباری اپنے ٹنگے اور پتیلے باربردار کشتیوں میں سوتی کپڑے کے گٹھے اور گیہوں اور سبزیوں کے بورے اور ٹوکریاں رکھ رہے تھے۔

ندی کے کنارے کنارے ڈھلوان پہاڑی کی ترائی میں دور تک زندگی پھیلی ہوئی تھی بوجھ اٹھانے والے حبشی غلاموں کے شور و شغب میں گھوڑوں کی کھٹ کھٹ کی آوازیں دب رہی تھیں۔ شوقین نوائطی امرا اپنے سجے ہوئے نفیس حجروں میں کشتی رانی کے درسے لوٹ رہے تھے۔ جس شوق کی خاطر بہمنی بادشاہ دابھول آیا کرتے تھے۔ گھاٹ کے قریب کی مسجد کی شمالی دیوار سے ملحق حجروں میں مسلمان ساز اور درویش چیول کی فتح پر تبصرہ کر رہے تھے اعظم خان پیر کی درگاہ میں دعائیں مانگی جا رہی تھیں کہ فرنگیوں کی آمد کا شور مچ گیا۔ ان کی متوحش آنکھوں نے کرسٹانوں کے انیس جنگی جہازوں کے بیڑے کو گھاٹ کی طرف رینگتے ہوئے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تیرہ سو پرتگیزی اور چار سو ملیباری سپاہیوں نے شہر پناہ کی طرف سے گھیر لیا اور شہر کے تینوں دروازوں کے آگے ڈٹ کر مورچہ سنبھال لیا محصورین کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کر دیا مگر گولے اتنے اونچے جا رہے تھے کہ پانی میں آگ لگ رہی تھی۔ محاصرین نے فصیل کے پیچھے پہنچ کر لاشوں کے پشتوں سے ایک دوسرا حصار بنا چکے تھے محافظ فوجی اب خود محفوظ نہ تھے سروں کی فصلیں کٹ کر فصیلیں بن گئیں بربریت ننگی ہو کر ناچنے لگی۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو مسجدوں میں بھی پناہ نہ ملی۔ انتقام کے زہر میں بجھی ہوئی تلواریں نوزائیدوں کے خون سے پیاس بجھا رہی تھیں اور جب لاشوں کے انبار بھر گئے تو آگ لگا دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر جل کر خاکستر بن گیا۔ پرتگیزی درندگی اور بہیمیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ برسوں تک بددعا دیتے رہے تو یہی کہا کرتے تھے کہ خدا کرے کہ فرنگیوں کا تم پر بھی ایسا ہی قہر ٹوٹے جیسا کہ دابھول پر نازل ہوا تھا۔

عادل خوانی صوبیدار (مصطفیٰ خان) نے دابھول کے جھلسے ہوئے ویرانے اور کھنڈر سے دور

درودوں اور گھاٹوں کے قدیم اور مقدس شہر سنگمیشور کو اپنا صدر مقام بنالیا اور جب بار بوسا سیاح ۱۵۰۳ء میں الکنندہ اور درنہ ندیوں کے سنگم پر آباد سنگوگرا آیا تو یہ مملکت عادل شاہی کا دوسرا شہر عادل آباد یا باندہ (ولایت) اسی طرح ترقی پر تھا۔ یہاں دکن اور ملیبار سے تجارت ہوتی تھیں اور دیو، عدن اور ہرمز کی کشتیاں ٹھیرتی تھیں۔ سنگمیشور میں جہاز سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم ہو چکا تھا (کیونکہ نواحی جنگل کے بہترین شہتیر ہر قسم کے جہاز بنانے کے لیے نہایت موزوں تھے) اس سے قریب جے گڈھ ابھی تک قزاقوں کا گڑھ بنا ہوا تھا لیکن سنگمیشور اور باندہ کی تجارتی ترقی سے دابھول کی رونق پر کبھی اوس نہ پڑی بلکہ ہمیشہ نکھرتی ہی رہی اور یہ اجڑ اجڑ کر بستا رہا۔ گو اگلے پچاس برسوں ۱۵۵۷ء تک پرتگیزی غارت گروں کا نشانہ بنا رہا مگر ہر دفعہ کبھی لٹتی، ہندو اور بنیا بیوپاریوں نے اس کی تجارت کو ترقی دی اور کبھی ایران سے تجارت کی تجدید ہوئی تو دنیا بھر کے لوگوں کا ہجوم اکٹھا رہنے لگا گو اس کی آبادی ۱۵۴۷ء میں صرف چار ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ لہ

دابھول کی بربادی کے ایک ہفتہ بعد فرانس کا بیڑہ بمبئی کی کھاڑی سے بندرہ (باندرہ) میں سامان رسد لوٹنے کے لیے داخل ہوا۔ بیس مسلمانوں پر مشتمل ایک گجراتی بڑاؤ کو لوٹ کر بھی خاطر خواہ سامان خورد و نوش حاصل نہ ہو سکا۔ چند مسلمانوں کو ماہیم کے بندر حاکم کے پاس بھیجا اور ان کے پیچھے پرتگیزوں کو بھی روانہ کیا جنھوں نے قلعے کے پاس سے جو بیس بھیڑوں کو اٹھا کر گھاٹ کی طرف ہنکا دیا۔ (معلوم ہوتا ہے ماہیم باندرہ میں بھیڑ بکریوں کی ریوڑ ہمیشہ سے پائے جاتے تھے)
ماہیم کا راجہ بمبئی کی پہاڑیوں (وڈالا۔ یا سیوڑہ۔ وسیو) کی طرف بھاگ گیا اور پھر سمجھوتہ ہو گیا کیونکہ دابھول کے جلنے کی آنچ جو اب بمبئی تک پہنچ چکی تھی پرتگیزوں کی چھریاں تیز تھیں ماہیم ہی کی شقاوت کے مذبح خانے میں گائیں کاٹی گئیں اور جو بیرے کے کالے انسانوں کو ذبح کر دیا گیا۔ بھگوڑے راجہ نے بارہ بورے چاول اور بارہ بکریاں فرنگی بھیڑیوں کو بھیج کر جان بچائی۔ پرتگیزی بیڑا زیوں کی طرح شکم سیر ہو کر زیوں کی سیر کے لیے چل پڑا۔ راستے میں بسین پڑتا تھا جو ان کی یورش سے اس وقت محفوظ رہا۔ (ابھی پرتگیزی تسلط ہونے کے لیے سترہ سال باقی تھے) اس خوبصورت بستی میں پرتگالیوں کے دشمن نوائطی بڑی تعداد میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ناریل۔ تاڑیل اور جنگل کھجوروں سے پیڑوں کے گہرے سبز جھنڈوں میں چھپی ہوئی اس بندرگاہ میں دیس بدیس کی کشتیاں آکر ٹھہرتی تھیں۔ ملیباری بنگلے اور پٹن یہاں گرم مسالوں کی تجارت کے لیے آتے تھے جس کی یہاں بڑی مانگ تھی۔

لہ گزیٹیر ضلع رتناگیری صفحہ ۳۲۹۔ ماخوذ از تاریخ کوکن صفحہ ۳۲۲

(بستی) گجرات کی مظفر شاہی کے زیر اقتدار تھا۔[1]

گووا کدمب راج کا چندر منڈل یا چندر پور جب زوال کی بدلیوں میں چھپا تو بدرنگ حال بن کر یہاں سارے نئے ابرار اور اسے سنداپور کہنے لگے۔ سلاہار دور سے تک کے دوست اور کدمب کل راج کے گوواپوری میں ہمیشہ مسلمان آباد رہے ہیں مسعودی اور ابن بطوطہ کے بیانات سے واقف ہوتا ہے کہ محمود کا وال تجار عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اکتفاف کر ہند احتساب سے لے کر دانتماسک کے زمانے تک) یہ خطہ کو اکب اعتاقب اسلام سے منور نہیں ہوا تھا؟ حالانکہ نور اسلام کی کرنوں کے ساتھ تجزہ عشق النقر کی شہرت کا نیکٹ کے زمورن راجہ تک پہنچ چکی تھی۔

گھلادیو (دوم) کے عرب محسن کے وزیر بیٹے شدامہ نے گوواپوری کی مسلم بستی میں جو بھی کدی کی جامع مسجد بنوائی تھی۔ وہ اس خطہ کی غالباً پہلی عبادت گاہ تھی جس کی امنگ تاریخ کے ایوانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ ابن بطوطہ نے جمال الدین ہنوری کی تعمیر کی ہوئی جامع مسجد میں بغداد کی فن معماری کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔

ہوناور میں مسلم کتبوں کی خاص تعداد تھی مگر وقت کے استبداد اور تاریخ کی جبر پسندی نے کتبوں اور مسجدوں کو ملبوں میں دفن کر دیا۔ گوا ہمیشہ سے اپنی کشادہ شاہ راہوں اور گنجان آبادی کے سبب شہرت پھیلائے ہوئے تھا۔ قدرت کی نعمتوں سے مالا مال اور حسین مناظر سے مزین اس بستی میں رنگ و نور کی پرچھائیاں ڈولتی رہتی تھیں۔ ناریل، سپاری تاڑ اور کیلے کے پیڑوں کے گہرے سبز سایوں میں چالوکیہ فن تعمیر کی مٹی ہوئی یادگاریں ماضی کی ان گنت داستانیں سرگوشیوں میں سناتی رہتی تھیں کہ کس طرح یہاں کے مندروں اور مہامندیلشوروں کے آخوندوں میں کسی وقت عراقی اور خراسانی گھوڑے اپنے پیر کی دھول کے خاموش تماشائی بنے تھان پر بندھے رہتے تھے گلستانوں اور گلدانوں میں رنگ و بو کی جلوہ آفرینیاں تھیں اور یاتریوں کے کوٹھوں پر حسن و شباب کی فتنہ سامانیاں حشر برپا کرتی تھیں۔ روپہلی نہروں میں جلترنگ بجا کرتا تھا اور سنگین زینہ دار حوض جگہ جگہ ڈبڈبائی آنکھوں سے کدمب راج کی بربیر اور چالوکیہ سنسکرتی کو پاتال میں ڈوبتا دیکھتے رہتے تھے۔ کیونکہ وقت کے گہرے گمبھیر اور بیکراں سمندر کے سینے پر عادل شاہی ثقافت کا مینارہ نور تعمیر ہو چکا تھا۔ عادل شاہی گوا میں اس دور کی یادگاروں میں ایک کھیرپل کی پرشکوہ والی مسجد سے آج بھی خدا کی وحدانیت کا اعلان ہوتا ہے۔ ۱۵۶۰ء میں ابراہیم عادل شاہ نے کھنڈا قلعہ کے اندر ایک

---

[1] گزیٹر شہر بمبئی ج ۸ صفحہ ۲/۲۸ بحوالہ تاریخ دکن صفحہ ۳۴۳

دل افروز تالاب کے کنارے محرابوں سے مزین مسجد صوبہ شاہ پوری تعمیر کرائی تھی اسی دمساد قلعہ میں غازی عبداللہ خان شہید کا مشہد بھی اس کی جوانمردی کی شہادت دے رہا تھا۔ اخراجات درگاہ کے لیے سنبھاجی نے زمینیں وقف کر دی تھیں۔ گلیوں اور کھاڑیوں کے نقرئی پانیوں میں گھرے ہوئے پرانے گوا مسلمانوں کی بستی میں بڑی رونق رہتی تھی۔ سفید رنگت کی نوائطی خواتین اور مقامی مسلمان عورتوں میں پردے کا رواج تھا۔ یہ زیوروں سے لدی ہوئی رہتی تھیں۔ ذمت کے اختلاط میں آموں کا اچار بنائی تھیں جس کی بڑی شہرت تھی۔ اور پھر ایک ایسا دن آیا کہ پان کی بیلوں کی چتریاں اوڑھے اور چنبیلی کی لچکیلی ڈالیوں کی دھانی آنچلیں پہنے دلہنوں کی طرح سمٹی ہوئی حویلیوں کا سہاگ اجڑ گیا۔ گونجتے ہوئے ساحل پر سناٹا موجیں مارنے لگا اور نرم ریگزاروں پر اجنبی قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ سات پہاڑیوں پر آباد گوا ہندوستان میں پرتگالی مقبوضات کا صدر مقام بنا تو یہ ایشیا کا روم بن گیا اور پرانا گوا نیز دکار روم بن گیا جہاں پر مسلمانوں کی جھلسی ہوئی تقدیریں عظمت ماضی کے کھنڈروں اور ویرانوں میں مدتوں تک سلگتی رہیں۔[1]

موسلا دھار بارش کے زمانے میں نوائطی سوداگر کھپریل کی بنی چھاونی ڈالے ہوئے بلند دستار باندھے مکانوں میں محفوظ بیٹھے رہتے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے کرتوں میں ملبوس سر پر ریشمی پٹکا[2] (جسے روسی سیاح افانسی نکیتن پٹکا کہتا ہے[3]) اور کمر میں پٹکا باندھے نباتات سے بنی ہوئی روشنائی اور زکل کے تراشے ہوئے قلم سے فارسی عربی کے کسی مخطوطے کی نقل میں مصروف رہتے یا سعدی کی بوستاں، گلستاں سے گل چینی کرنے میں مگن رہتے تھے۔) ان کی بیویاں سروں پر مقامی کرگھوں پر بنی ہوئی ریشمی اوڑھنی ڈالے اور زیادہ تر ساڑی میں ملبوس گھریلو کام کاج میں مشغول رہتی تھیں) نامی امیروں کے خدمت گزار دوپیٹے کو کاندھوں پر ڈالے اور کمر میں باندھے باندھے ہاتھوں میں ہتھیار لیے ہوئے اونچے اونچے "برجیتے پہرہ داری کیا کرتے تھے۔[4]

جہازوں کی گہما گہمی اور رونق شروع جاڑے میں صرف چار مہینوں کے لیے لوٹ آتی سفر دور ملک سے بنیے، بقال، بزاز، کنجڑے، صراف بیلوں پر بوروں میں بھرے ہوئے تجارتی اسباب لادے قافلوں کی صورت میں جہازوں کی طرف چلا کرتے۔

سمندر پار کے پاس تیس سے لے کر چالیس تک باربردار بیلوں کا قافلہ ہوتا تھا[5]

---

[1] جان موریس کدمب کا انگریزی مطبوعہ بمبئی۔ گوا کی عبادت گاہیں ڈاکٹر جول غزنوید جلد ۲

[2] ذیلا رل [3] زاکتقا صفحہ ۱۸۔ [4] فلابہ گزیٹر۔ جنول کا بیان

[5] زاکتقا صفحہ ۱۸ بحوالہ تاریخ کوکن

آبادی سے بھی ایک میل باہر ایک کھلا میدان میں جو سومیشور درسے سے بڑے کلونتی، جیو واٹیا اور سرکم دیہات کے سرے پر واقع تھا بازار لگ جاتا تھا۔ بدیسی تاجروں کے بھی ٹھٹھ لگ جاتے جس میں خلیج فارس اور عرب کے سوداگر سب سے زیادہ نمایاں رہتے۔ [1]

یہ غالباً سرائے دیہات میں قائم کارواں سراؤں میں ٹھہرتے ہوں گے جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور شاید یہاں کلونتی چہ نارثوں کے خرابوں میں۔ آج خرابوں میں ان کی مدارا بھی ہو جاتی ہوگی جب یہ پیر سید احمد کے مقبرے کے نواح میں واقع حمام خانوں کو دیکھتے ہوں گے۔ تو ان کے گھروں کے "درگاہوں" کی یاد سے ذہنوں میں گرمی خیال پیدا ہو جاتی ہوگی ان حمام خانوں میں دراصل قامت گاہیں بھی تھیں جو چھ محراب دار حجروں پر مشتمل تھیں دو محرابدار غلام گردش سے گزر کر ایک مربع ایوان ملتا تھا جس پر گنبد دار چھت تھی جس کے تین جانب میں گوشوں میں طاق بنے ہوئے تھے جنھیں دیکھ کر تصور میں بھولی بسری یادوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہوں گے۔ ایوان کے شمال مغرب سے ایک پرپیچ گذرگاہ دو حماموں تک پہنچاتی تھی ان میں سرد نہیں نہاتے تھے۔ [2]

مسلمانوں کے پہنچنے ہونے کے احساس سے ابھی تک ذہن صاف نہیں ہو سکے تھے۔ حمام خانہ یا گرمابہ اسی لیے صرف مسلمان مدنیت کا تہذیبی ورثہ تھا۔

دسمبر سے مارچ تک چیول کی منڈی اور بندر میں میلہ سا لگا رہتا تھا جب موافق ہوائیں چلنے لگ جاتیں تو باربردار کشتیوں کے بادبان کھل جاتے اور تجارتی اسباب سے لدے پھندے زنج، اری، شبر، بنگلہ، کوکنیا، کوتل، دوباشی، اور دھنگی دریا اپنے اپنے دیشوں کی دشا پر دوڑنے لگ جاتے اور ارد گرد کے شہروں کے بیوپاری بازار، ہاٹ میں اپنا مال ذبح کر یا بدیسیا بیچ کر دوسرے موسم تک کے لیے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

پرتگیزی ہند کے بحری راستہ سے قطعاً ناواقف تھے۔ انھیں اس کے لیے ایک رہنمائی کی ضرورت تھی جو انھیں ایک مسلمان معلم امیر البحر ماجد کی صورت میں ہاتھ آگیا۔ ماجد کی رہنمائی میں پرتگیزی امیر البحر واسکوڈے گاما ملیبار کی ایک مشہور بندرگاہ کالی کٹ پہنچ گیا۔ اس سلسلہ میں وہ صلیب کی پھانسی" کے عنوان کے ماتحت ڈاکٹر مومن محی الدین لکھتے ہیں:۔

"صلیب کے بہروپیے سوداگر" ہند و مسلم عوام کی وطن دوستی اور حریت پسندی کی آزمائش دار و رسن سے کر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ جس طرح اندلس میں اسلامی سطوت کو کھنڈر بنا دیا

---

[1] وردات یار پوسا بجوا الزنارنج کوکن صفحہ ۴۸۷ [2] وردات یار پوسا بجوا الزنارنج کوکن صفحہ ۴۰۰

گیا تھا اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو مغلوب کر کے صلیبی جنگوں کا بدلہ لیا جائے وہ عرب سوداگر اور نو آبادیاتی تاجروں کے سخت دشمن تھے۔ یہی لوگ بحری تجارت میں فرنگیوں کے حریف تھے اور انھیں کے ہاتھوں میں ساحلی تجارت اور حکومت کی باگیں تھیں اور اس بیرونی تجارت کے ڈانڈے مصر و عرب سے ملے ہوئے تھے۔ پرتگیز تجارت، دولت اور نصرانیت کو اپنے آدرش کی تثلیث بنا کر ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کو قائم رکھنا چاہتے تھے تجارت میں دراصل حصول زر اور سرمایہ کی چاہ تھی اور وہ حرص و طمع کا چمکتا ہوا چہرہ ہندوؤں کو دکھا کر عیسائیت کی طرف راغب کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ یسوع مسیح کی سفید بھیڑیں ہندوستان کے لیے بھیڑیے بن رہی تھیں۔ پرتگیزی مبلغین میں چند لوٹ دلی بھی تھے جو مسیحیت کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور زخمہائے دل کی مسیحائی بھی۔

پرتگیزی استبداد اور استحصال کے پھیلنے اور بڑھنے گرداب نے سب سے پہلے کالی کٹ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تجارتی مراعات کی حکمت عملی شروعات بن گئیں۔ پرتگیزی استبدادیت کا جھونکا بڑھتا رہا مصر و ترکی کے ملوک سلطان کے تجارتی بیڑوں کو بھی چھیڑ کر رہا تھا بحری تجارت کے سب سے بڑے اجارہ دار عرب مسلمان تھے۔ اس حریفانہ میں پرتگیز خدائی فوجدار بن بیٹھے۔

اولیائے کرام و صلحائے عظام

یہ عنوان بہت وسعت رکھتا ہے اور ان کا تذکرہ ایک مستقل کتاب کے بنا ممکن نہیں اس ضمیمہ میں ان سب بزرگوں کے تذکرہ کا حق کما حقہ ادا نہیں ہو سکتا اس لیے ہم یہاں ان چند صالحین امت کے تذکرہ پر اکتفا کریں گے جو عرب سے ہجرت کر کے سرزمین ہند کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف بخشا اور اپنے انفاس قدسیہ، انوار عالیہ سے رشد و ہدایت کا ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا تھا جن سے بے شمار بندگان خدا نے فیض حاصل کیا۔ کفر و ظلمت کی تاریکیوں سے نکل کر رشد و ہدایت کے انوار سے بہرہ ور ہوئے۔ تزکیہ نفس اور تطہیر قلوب سے اپنی روحانی دنیا کو آراستہ کیا۔ ہزاروں بگڑے اور بھٹکے ہوئے انسان ان کی پر نور نظروں اور پاکباز صحبتوں سے کچھ سے کچھ بن گئے۔ اور کچھ ان میں صلاح و تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو کر بہت اونچے مقام تک پہنچ گئے یہی بزرگان کرام تھے جن کی خاموش تبلیغ سے یہاں اسلام کی اشاعت کو فروغ ہوا۔ اور انھیں بزرگوں کے دم قدم سے اس ظلمت کدہ ہند میں توحید کی آواز بل

اور کلمۂ حق کی صدائیں گونجنے لگیں اور انھیں کی مساعی جمیلہ کے بدولت ایک خدا کی عبادت گاہیں وجود میں آئیں اور ان سے حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح کی اذانیں بلند ہونے لگیں اور ان بزرگان دین کی بدولت آج طول وعرض کشور ہند میں کروڑوں مسلمان اپنا سر عبودیت جھکائے ہوئے آباد ہیں۔

حاجی ملنگ

عرب کے ایک مبلغ اسلام حاجی عبدالرحمٰن جو عام طور سے حاجی ملنگ کے نام سے مشہور رہیں سالار اول کے دور میں اپنے چند رفیقوں سلطان اور جھپائرہ کے ساتھ کوکن تشریف لائے اور مرہٹوں میں اشاعت اسلام کی ان کی اشاعت حق کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ نل قبیلے کی ایک راجکماری مسلمان ہوگئی۔
ان کا شمار کوکن میں اسلام کے اولین مبلغین میں ہوتا ہے چنانچہ تاریخ کوکن کا مصنف لکھتا ہے:
"قوم حبس جب کلیان آیا تو یہاں نل گھرانہ راج کرتا تھا۔ نل راجہ کی زبردست عسکری طاقت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پاس پانچ سو سے لے کر چھ سو تک جنگی ہاتھی تھے اس خاندان کی یادگار کلیان سے قریب ملنگ گڑھ کا مشہور پہاڑی قلعہ (بالا حصار) ہے عہد غزنویہ میں جب حاجی عبدالرحمٰن نامی ایک عرب مع دیگر متعلقین کے کوکن آئے تو اسی قبیلے کی ایک راجکماری ان کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئی تھی۔" ؎

مظہر ولی

ان کا اصلی نام خواجہ مظہرالدین تھا وہ جنوب ہند میں خاص تبلیغ کی غرض سے آئے تھے ان کی دست حق پر ہزاروں مشرف بہ اسلام ہوئے اور مسلمان عام طور پر ان کی تعلیم و تربیت سے بہت ہی مستفیض ہوئے آپ کا انتقال ترچناپلی میں ہوا۔ اور وہیں آپ کا مزار ہے جو مرجع خاص و عام ہے آپ کے خلفاء میں حضرت بابا فخرالدین علیہ الرحمۃ پلگنڈہ بہت مشہور رہا۔

شیخ عبدالعزیز معروف بہ داداحیات قلندر

آپ پہلے عیسوی مذہب پر تھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ نے دین اسلام قبول کیا ہے مورخین لکھتے ہیں کہ:۔ اصحاب صفہ میں آپ داخل تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ شریفہ کی دربانی کی خدمت مدت تک انجام دی۔ حضرت دادا علیہ الرحمۃ

میں کہا گیا ہے کہ وہ سفر و حضر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گزار رہے تھے اور بنا بر حضور نے آپ کو علمبردار کا لقب بخشا تھا۔ حضرت شیخ عبدالعزیز کی عمر کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں لیکن عام رجحان یہ ہے کہ آپ نے چھ سو سال کی عمر پائی تھی۔

کہا گیا ہے کہ آپ حسب فرمان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند رفقاء کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور منگلور کے ساحل پر پہنچے۔

ریاست کرناٹک میں میسور کے قریب ایک پہاڑ ہے اس میں بلیں گری پہاڑ کی چوٹی ریاست بھر میں سب سے اونچی ہے جو بابا بڈھن کے پہاڑ کے نام سے مشہور ہے ہندو مورخین اس پہاڑ کو چندر دروناپربت کہتے ہیں۔

قلندر پربت نامی مؤلف لکھتے ہیں:۔

اس زمانے میں یہاں بربت زوروں پر تھی مسلمان عرب تاجروں کی زندگیاں دوبھر ہوگئیں تھیں۔ قدم قدم پر انہیں خطرہ لاحق ہوگیا تھا چھوت چھات کے مسئلے نے انہیں پانی کی ایک بوند سے ترسا دیا تھا اس وقت بحر رحمت میں جوش آیا روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام کائنات کے لیے رحمت بن کر آئی تھی آگ کی طرح بھڑک اٹھی اور ایک ایسی برگزیدہ ہستی کو چھانٹ لیا جو ظاہر ہیں اپنے اسرار دکشف باطنی اور جلال قلندرانہ سے انہیں ڈرا دے اور ان کے شیطانی کرتوت کو دور کر سکے انسانی نزاکتوں سے آگاہ کرسکے حضور اکرم کی نظر انتخاب حضرت شیخ عبدالعزیز معروف بہ علمبردار قلندر دولہ پر پڑی۔ آپ نے حضرت عبدالعزیز مکی کو مدینہ منورہ طلب فرمایا حضرت عبدالعزیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بموجب بہ نفس نفیس حاضر ہوئے۔ حضور اکرم نے فرمایا:

اسے علمبردار تمہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب دیا جاتا ہے، تم اپنے جلال قلندری سے چندر دروناپربت کا پتہ لگاؤ وہاں شرک ختم کرکے اسلام کا علم بلند کرو۔[1]

بہر حال راستے کی پر مشقت صعوبتوں سے گزرتے ہوئے آپ اس اونچے پہاڑ پر پہونچے اس زمانہ میں جنوبی ہند مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا لیکن دو ریاستیں اپنی وسعت اور طاقت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں اور مشہور تھیں ایک کدمبا اور دوسری ہالل۔ بلال کا پایہ تخت پہلے بلسنڈ تھا اور بابا بڈھن گیری بھی اس کے ماتحت تھے یہ مقام جہاں اپنے قدرتی مناظر سے نہایت حسین اور دلکش تھا اور قسم قسم کے درختوں اور جڑی بوٹیوں کی دولت سے مالا مال تھا لیکن وہاں بعض اوقات صفت دشمنان نما شیطان لوگوں نے اپنا اڈا جما کر وہاں کے امن و سکون کو غارت کر دیا تھا۔ ان کے

---

[1] قلندر پربت مؤلفہ عبدالرحیم قادری صفحہ ۹۲

سیاہ کرتوتوں، گندی حرکتوں، بے رحمانہ قتل و خونریزی نے چند روز دوں پربت کو جہنم بنا دیا تھا انسانی جانور بڑی بے دردی کے ساتھ دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی خون انسانی سے ہولی کھیلنا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہاں ان کا ایک مندر بھی تھا اس میں ایک بہت بڑا بت نصب تھا جس کے تین سر اور بھی مختلف شکلیں تھیں جو برہما، وشنو اور مہیش دیوتا کا روپ ظاہر کرتی تھیں اگر کوئی بدقسمت بھولا بھٹکا مسافر اس طرف نکل آتا تو اس کی جان کی خیر نہ تھی ان کے سفاک ہاتھوں سے اس کا بچ نکلنا ممکن نہ تھا اور اگر کوئی مسلمان ان کے ہاتھوں پڑ جاتا تو اس کو نہایت بے دردی سے ستا ستا کر مار ڈالا جاتا تھا چنانچہ قلندر برحق کے مصنف لکھتے ہیں۔

" جب مسلمان تاجروں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا اور کسی بندہ خدا کو ان ظالموں کے پنجوں سے چھٹکارا پانا مشکل ہو گیا اور بے گناہ مسلمانوں کی جانیں اس دیوتا پر بھینٹ چڑھائی جانے لگیں تو لوگوں نے بیتاب ہو کر دعائیں مانگیں اور حضور سرور کونین کے مزار اقدس پر جا کر آہ و زاری کی آخر اللہ نے ان کی دعائیں قبول کیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پُر جلال اور باوقار بزرگ کو طلب فرمایا۔"

" مولوی جلال الدین احمد خاں رامپوری فرماتے ہیں۔ " حضرت دادا حیات جن کو کہتے ہیں وہ عبد اللہ ظہیر دار قلندر سرور کائنات فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حسب حکم یہاں تشریف لائے۔" [1]

حضرت دادا حیات قلندر اور ان کے ساتھیوں کے خلاف اس پہاڑ اور اس کے اطراف میں رہنے والے ہندوؤں اور پجاریوں نے انھیں ستانے ان پر ظلم و زبردستی کرنے۔ انھیں ہر طرح کی ایذائیں اور تکلیفیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ان فقرائے مسلمین کو وہاں سے ہٹانے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتے تھے کیا۔ لیکن حضرت دادا حیات قلندر اور ان کے رفقاء ان تمام مزاحمتوں کے باوجود کوہ عزم و استقامت کی طرح ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے اور وہ اللہ کی عبادتوں اس کے ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ اور اس پہاڑ کے دامن سے پنجوقتہ اذانیں اور اللہ اکبر کی دلآویز صدائیں برابر گونجتی رہیں۔ جب مخالفین اپنے تمام تر قوتوں اور وسیلوں کے آزمانے کے بعد بھی ناکام رہے تو انھوں نے ان اللہ والوں کو اس مقام سے بے دخل کرنے کے لیے حکومت وقت سے درخواست کرنے کا آخری سہارا اختیار کیا اور کنج راجا کے دربار میں پہنچے اور فریاد کی کہ چند مسلمان فقراء پربت گینہ کے مندر پر قابض ہو گئے ہیں اور ان کے ایک بزرگ مندر میں آسن جمائے بیٹھے ہیں

---

[1] قلندر برحق صفحہ ۹۴-۹۵

کنج رایا بلالا راجاؤں کی طرف سے بحیثیت ان کے نائب کلتی گری نامی ایک قلعہ میں بود وباش رکھتا تھا۔ کنج رایا کا وزیر بیرد تھا اور یہ دونوں بڑے ظالم اور زبردستی کے لیے بہت مشہور تھے یہ سن کر کنج رایا جوش وغضب میں بے قابو ہو گیا اور فوج کا ایک دستہ لے کر بیرد کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی تک پہونچ گیا۔

جب فوجی سپاہی زینے کے ذریعے نیچے اترنے لگے تو ان کے قدم ٹک نہ سکے اور نیچے گرنے لگے اس طرح ان کا کوئی سپاہی زندہ وسلامت نہیں رہا۔ اس حادثہ سے کنج رایا حیران ہو گیا اس کے بعد مندر میں کچھ ایسے عجیب وغریب حالات پیش آئے جنھوں نے کنج رایا اور بیرد کو زور آزمائی سے باز آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا اور عجز وانکساری کے ساتھ اپنے سروں کو حضرت دادا کے قدموں پر جھکانا پڑا۔ اور اس کے بعد تا زندگی ان کے خدمت گذار اور تابعدار رہے۔

آپ کس سنہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے اس کا ثبوت نہیں ملا۔ لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ آپ کا ورود مسعود ہندستان میں ۹۲ھ میں ہوا تھا قلندر برحق کے مولف لکھتے ہیں:۔

"۹۲ھ ہجری میں محمد بن قاسم سندھ پر حملہ کرتا ہے اور اس کے ایک سال بعد حضرت عبدالعزیز مکی قلندر اول بحق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس پہاڑ پر تشریف فرما ہوتے اور سکونت اختیار کرتے ہیں [1]

چندر درون پربت پر کافی عرصہ تک قیام کے بعد آپ شمال کے سفر کے لیے روانہ ہوتے ہیں چنانچہ قلندر برحق لکھتا ہے۔

"آپ اپنے خلفا کو لے کر شمالی ہند کا رخ کرتے ہیں۔ شیموگہ اور ساگر کے درمیان ایک پہاڑی کے دامن میں پانچ صدی کے وسط میں چلہ کرتے اور وہاں چند دن قیام کرکے اسلام کی اشاعت کرتے ہوئے کھشکل پہنچتے ہیں اور کھشکل کے سمندر کے کنارے پہاڑی پر چلہ کرتے ہوئے کوکن تشریف لے جاتے ہیں اور کوکن سے گجرات کا رخ فرماتے ہیں"

ہندوستان کے شمال وجنوب کے مختلف شہروں اور اہم مقامات کی سیر وسیاحت، تبلیغ واشاعت اور بزرگوں سے ملاقات کے بعد آپ پھر چندر درون پربت جس کو عام طور پر دادا کا پہاڑ کہا جاتا ہے اس عالم سے روپوش ہو گئے [2]

شیخ مخدوم فقیہہ علی مہائمی

اسم گرامی علی آپ مولانا شیخ احمد بن اسماعیل کے فرزند ارجمند تھے اہل نوائط سے تھے آپ کا

---

[1] قلندر برحق صفحہ ۱۲۲۔ [2] ایضاً۔

خاندان لقب پڑ رہا تھا آپ کا خاندان کوکن میں بود و باش رکھتا تھا۔ کلیان میں عرصہ دراز سے اہل نوائط تاجروں کی ایک اچھی خاصی تعداد توطن اختیار کرچکی تھی وہیں ۷۷۶ھ ہجری بماہ محرم کی دسویں شب آپ پیدا ہوئے۔

مخدوم کہلانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپکی والدہ محترمہ بی فاطمہ نے آپکو پانی لانے کیلئے بھیجا واپس آئے تو ان کی آنکھ لگ گئی اور آپ پانی لیے ان کی پائنتی کے پاس کھڑے رہے نہ آواز دی نہ ہی کسی طرح سے اظہار ہونے دیا اور اس انتظار میں رہے کہ آنکھ کھل جائے اور پانی طلب کریں لیکن رات بھر ان کی آنکھ نہ کھلنی تھی نہ کھلی اور یہ سعادت مند فرزند خاموشی کے ساتھ کھڑے ہی رہ گئے۔ آخر شب جب آنکھ کھلی تو دیکھا ان کا پیارا بیٹا پانی لیے کھڑا ہے اس اطاعت شعاری نے خدمت گذاری کا جو اثر ان کے دل پر ہوا ہے اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ اپنے بیٹے کی اس سعادت مندی پر یقیناً ان کے دل سے دعائیں نکل ہوں گی۔ ابھی آپ ۹ سال کے تھے کہ آپ کے والد ماجد مولانا شیخ احمد صاحب ۷۸۵ھ میں رحلت کر گئے۔ اس طرح آپ کمسنی ہی میں اپنے والد کے پرشفقت سایہ سے محروم ہو گئے۔ کم سنی ہی میں آپ علوم متداولہ، فقہ، تفسیر، حدیث، منطق و فلسفہ سے فراغت حاصل کرلی۔

آپ کی والدہ محترمہ بی بی فاطمہ ناخدا حسین انکولے ملک التجار کی بیٹی تھیں وہ اپنے لخت جگر کو لے کر مہائم اپنے میکہ میں آگئیں اور وہیں اقامت اختیار کی۔ مہائم اس وقت احمد شاہ فرماں روائے سلطنت گجرات کی ایک اہم بندرگاہ تھی اور جہاں عرب و عجم سے آئے ہوئے مسلمان اور ان کے ساتھ مخلوط النسل بھی کافی تعداد میں بود و باش رکھتے تھے۔ حضرت مخدوم مہائمی ایک جلیل القدر، وسیع النظر متبحر عالم اس کے ساتھ ایک بڑے پایہ کے عارف اور اللہ کے ایک مقرب و برگزیدہ مقبول بندوں میں سے تھے۔

چنانچہ تاریخ کوکن کے مؤلف لکھتے ہیں۔

"خدمت مادر ولایت کا باعث بنی یا خدمت خلق اللہ مگر یہ صحیح ہے کہ خوارق عادات یا کرامات سے کہیں زیادہ شیخ علی المہائمی کے علمی محاسن اور اخلاقی مناقب اتنے اعلیٰ تھے جنہوں نے ان کا درجہ ولایت تک پہنچا دیا۔

سلوک و طریقت میں ان کا عقیدہ اویسی تھا اور بہ اعتبار مسلک ان کا شمار وجودیوں میں ہوتا تھا شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف کتاب فصوص الحکم کی شرح ان کا ایک اہم تصنیفی کارنامہ ہے۔

مولانا محمد باقر آگاہ رح اپنی کتاب "نفحۃ العنبریۃ فی مدحۃ خیر البریۃ" میں لکھتے

گیا۔

ومن هٰذه الصفوة فاضل فيض الباري مولانا الشيخ علي ذا القاري المشهور بملا علي القاري الكوكني وهو غير ملا علي ذا القاري الحنفي والمتآخر عنه ومن مآثر البهية الشرح العربي على الغوثية وجدته في غاية التهذيب ذا الاتقان وذا بسط الكلام بالعلم والعرفان والذوق والوجد والحجة ذا البرهان الخ

(ترجمہ) اور اسی قوم میں سے ایک سرچشمہ فیض باری مولانا شیخ علی قاری۔ جو ملا علی قاری کوکنی کے نام سے مشہور ہیں اور وہ ملا علی قاری حنفی کے سوا ہیں اور ان کا زمانہ بھی ملا علی قاری حنفی کے بعد کا ہے ان کی روشن شناسیوں میں سے ایک عربی شرح ہے جو قصیدہ غوثیہ پر ہے میں نے اس کو نہایت تہذیب و تحقیق میں پایا اور یہ شرح نہایت مبسوط بدلل علم و عرفان، ذوق و ذوق و برہان کے طریقہ سے لکھی گئی ہے۔ [1]

حضرت مخدوم مہائمی کا تذکرہ مختلف کتابوں میں شرح و بسط کے ساتھ ملتا ہے ان میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔ سبحۃ المرجان (غلام علی آزاد بلگرامی) نفحۃ العنبریۃ (مولانا باقر آگاہ) حبل متین (شیخ عبد الوہاب شاذولی قادری) علمائے ہند (مولانا رحمٰن علی) تاریخ نوائط (عبد الفتاح گلشن آبادی) آئین اکبری (ابو الفضل)۔

اس کے علاوہ دیگر چند اہل علم و قلم نے اپنے طور پر جو تذکرے لکھے ہیں ان میں زیادہ تر بحث آپ کی کرامات و خرق عادات سے کی گئی ہے۔

آپ کی تصنیفات

تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان :- یہ آپ کی نہایت مشہور اور مقبول تصنیف ہے جس کو عام طور پر تفسیر رحمانی اور تفسیر مہائمی بھی کہا جاتا ہے یہ تفسیر اپنی نوعیت کی ایک بیش بہا اور بے نظیر تصنیف ہے جس میں قرآن پاک کی آیات کو نہایت خوبی اور تناسب کے ساتھ ان کے باہمی ربط و تطبیق کو واضح کیا گیا ہے مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ نے اس کی صفت ایجاز و تدقیق کی بہت تعریف کی ہے لکھتے ہیں کہ "تفسیر را بقرآن امتزاج زادہ است" "خصوص النعم" یہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی

---

[1] نفحۃ العنبریہ فی مدحۃ خیر البریہ۔ حضرت مولانا باقر آگاہ

مشہور و معروف کتاب "فصوص الحکم" کی شرح ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے "زوارف" بہ عوارف المعارف شرح ہے مصنفہ شیخ المشائخ شہاب الدین سہروردی کی شرح ہے۔ انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام اس کتاب کا دوسرا نام اسرار الفقہ بھی ہے اسرار شریعت میں یہ ایک نہایت معرکۃ الآرا کتاب ہے فقہی اسرار و نکات کا گنجینہ اور علم و حکمت کی نہایت مفید کتاب ہے۔

رسالۃ الوجود فی شرح اسماء المعبود۔ حادثۃ التوحید۔ اسرارۃ الدقائق شرح مرأۃ الحقائق۔

ترجمہ و شرح لمعات عراقی۔ مرأۃ الحقائق یا فتاوی مخدوم [illegible] اس سو اعلیٰ و ضخیم تصنیفات کا تذکرہ اکثر مختلف کتابوں میں کیا گیا ہے۔

بعض اکابر علماء مولانا عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ نے آپ کا شمار علماء صوفیہ موجودہ میں کیا ہے آپ کے شیوخ و اساتذہ کے بارے میں واضح تفصیل کہیں ہماری نظر سے نہیں گذری۔ غرض آپ کی علمی و دینی فضیلت مسلمہ اور روحانی مقام نہایت بلند تھا۔ آپ مختلف اوصاف و کمالات کے حامل علوم و معارف میں کامل، شریعت و طریقت کے جامع اور تقویٰ و دیانت کے بہت اونچے مقام و مرتبہ پر فائز تھے۔ آپ کی انہیں خصوصیات کی بنا پر آپ کو قطب الاقطاب، عالم معانی، قطب ربانی، آفتاب کوکن وغیرہ خطابوں سے یاد کیا جاتا ہے خدمت مادر کے علاوہ خدمت خلق سے آپ کو نہایت گہرا تعلق رہا تھا اسی لیے مخدوم کہلائے۔ فقہ میں آپ بہت بڑے پایہ کے فقیہ تھے اس وجہ سے آپ کو فقیہ کہا گیا۔ آپ کی وفات ۲، جمادی الآخر ۱۳۳۱ھ میں ہوئی۔

کشف المختوم۔ جنات الفردوس سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

ماہم کی موجودہ مسجد کے متصل گنج شہیداں کے قریب آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ اور جو اب عوام و خواص کا مرجع اور زیارت گاہ ہے۔

حضرت شیخ مخدوم اسماعیل فقیہہ اسکری الصدیقی

اسم گرامی اسماعیل آپ کے والد بزرگوار کا نام ابراہیم تھا۔ [1]

آپ کی جدی نسبت سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہونے کی وجہ سے آپ یقیناً صدیقی ہیں مگر آپ کے جو تھے سلسلے کے بزرگ شیخ مخدوم محمد کے بعد سے آپ سکری کہلانے لگے۔ حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے پایہ کے عالم و فاضل ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے فقیہہ بھی تھے

---

[1] بعض نسب ناموں میں آپ کا اسم گرامی اسحاق بھی لکھا گیا ہے لیکن ہم نے اپنے قدیم کتبات کے مطابق ابراہیم لکھا ہے۔

اسی بنا پر آپ عوام میں فقیہہ مشہور ہوگئے۔

احتمال کے علاوہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بامیمن کی اسلامی حکومت میں آپ فقیہہ کے منصب پر فائز تھے اس لیے فقیہہ مشہور ہوگئے۔ زہد و تقویٰ ذکر و فکر اور رجوع الی اللہ آپ کی زندگی کا معمول تھا۔ نفس کشی اور عبادت و ریاضت کے ذریعہ آپ کو باطنی کمالات بھی حاصل ہوچکے تھے۔ دور دراز سے لوگ آپ کی طرف کھنچے کھنچے چلے آرہے تھے اور آپ کے روحانی فیضان سے بہرہ اندوز ہوتے تھے ایک طرف تفسیر و حدیث اور فقہ کی درس و تدریس کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں اور دوسری طرف سلوک و عرفان اور تصوف و احسان پر آپ کے ارشادات و ملفوظات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا آخر لوگوں کے ہجوم سے آپ تنگ آگئے۔ اور آپ کو اپنے معمولات میں فرق محسوس ہونے لگا تو آپ لوگوں سے الگ تھلگ ایک پہاڑی کے دامن میں مختصر سے ایک کمرہ نما غار میں گوشہ نشینی اور چلہ کشی اختیار کی چنانچہ آج بھی مخدوم کالونی کی پہاڑی میں حضرت مخدوم کا چلہ کش مقام اسی نام سے بطور یادگار علی حالہ موجود ہے۔

حضرت مخدوم کا خاندان اور اس کی کچھ ضروری تفصیلات

حضرت مخدوم کے ابتدائی آنے والے بزرگ کے حالات کا کسی تاریخ سے کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔ بعض واقعات کے تتبع اور تاریخی حالات کے کڑی جوڑ سے یہ اندازہ ہوتا ہے اس خاندان کے سفر و ہجرت میں آنے والے ساتویں صدی ہجری میں بصرہ سے دکن میں پہونچے اس وقت دہلی میں سلطان محمد تغلق کے انتقال کے بعد ۷۵۲ھ میں اس کا چچا زاد بھائی فیروز شاہ تخت نشین ہوگیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ۷۴۸ھ میں پایہ تخت دہلی سے اپنا تعلق توڑ کر خود مختاری و آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور وہ دکن میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھر اتفا ان کے جاری سلسلہ کے ایک بزرگ شیخ معین الدین بہمنی سلطنت میں خاص طور سے بلائے گئے تھے۔ ان کے ساتھ عزت و اکرام کا برتاؤ کیا گیا اور انھیں حکومت کا ایک اہم اور بڑا عہدہ سونپا گیا۔ پھر بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد یہ خاندان بیجاپور پہنچا اور یوسف عادل شاہ ۱۴۸۹ء سے ۱۶۲۷ء تک عادل شاہ ثانی تک حکومت کے مختلف اہم ترین مناصب اور عہدوں پر فائز رہ کر اہم ترین خدمت کے بدولت حکومت اور عوام کے نزدیک معزز و مقبول رہے پھر غالباً ۱۵۲۶ء بیجاپور و دجیانگر کے راجہ کرشنا دیو رایا کے حملہ سے جو تباہی و بربادی آئی اس بنا پر حضرت مخدوم کا خاندان گوا میں آباد ہوگیا اور وہاں قضاءت، افتا، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور رشد و ہدایت صلاح و تقویٰ کے مختلف دینی و علمی خدمات میں لگ گیا۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۵۶۶ء میں گوا کا اقتدار چھننے جانے کے بعد وہاں کچھ بدنظمی و بے امنی کی فضا پیدا ہو گئی تو ان کا خاندان دکن، کرنول، بیدر، گلبرگہ، سندھوٹ وغیرہ مقامات میں منتقل ہو گئے اور حضرت مخدوم اسماعیل اور ان کے بھائی فقیہہ احمد وغیرہ مع خاندان و رفقاء کے بھٹکل اور ہاسیٹن جو اسلامی سلطنت کا پایہ تخت تھا تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار کی۔

ہاسیٹن کی اسلامی حکومت میں حضرت مخدوم کو بہت ہی امتیازی مقام حاصل تھا ان کے ذمہ اسلامی احکام کا نفاذ اور شرعی فتاوی کا اجرا، تھا اس کے علاوہ قرآن و تفسیر کے درس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں دو مختلف مقامات میں ان کا ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"فقیہہ اسماعیل کلام اللہ پڑھاتے ہیں نہایت خوش اخلاق اور فیاض تھے"۔

دوسری جگہ لکھتا ہے۔

"سلطان ہنور کے صفات و حسنات جبلہ کے ماتحت لکھتا ہے۔ "جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا۔ فقیہہ علی اور فقیہہ اسماعیل بھی موجود رہتے تھے زمین پر چار چھوٹی چھوٹی کرسیاں ڈال دیتے تھے ان میں سے ایک پر وہ خود بیٹھ جاتا تھا اور باقی پر ہم تینوں"۔ ؎۲

اس کی تفصیل میں حضرت مولانا علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ہنور جس کو ہوناور کہتے ہیں اور جو اب بھی احاطہ بمبئی میں؎۳ شمالی کنارا کے ضلع میں ہے یہ سلطان جمال الدین کا اصلی مرکز تھا یہاں ابن بطوطہ کو شیخ محمد ناگوری نام کے ایک صاحب خانقاہ بزرگ ملے اور فقیہہ اسماعیل جو قرآن پاک کے استاد تھے اور نور الدین علی قاضی سے اور ایک اور امام سے ملاقات ہوئی اس شہر میں اس نے ایک عجیب بات یہ پائی کہ یہاں عورتوں اور مردوں سب میں تعلیم کا بڑا چرچا تھا۔ شہر میں ۱۳ مکتب لڑکیوں کے اور ۲۳ لڑکوں کے دیکھے۔ ہنور کی مسلمان عورتیں بھی ہندوؤں کی طرح ساڑی باندھتی تھیں۔ باشندوں کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔

یہاں ابن بطوطہ کو اس سلطان جوگی کا ایک پیام اور تحفہ ملا۔ باشندے امام شافعی کے پیرو تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عرب تھے یا ان کی اولاد تھے۔ ؎۳

؎۱ سفرنامہ ابن بطوطہ ترجمہ جعفر نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۲۰۲، ؎۲ ایضاً صفحہ ۳۰۳، ؎۳ عرب و ہند کے تعلقات از مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۲۸۹ ؎۴ اس وقت اس کا تعلق احاطہ بمبئی سے تھے اور اب ہنور (ہوناور) ہاسیٹن احاطہ کرناٹک کا ضلع کاروار، شمالی کنارہ میں شامل ہے۔

پاسٹن کی سلطنت کا وجیانگر کے ہاتھوں تباہی کے بعد حضرت مخدوم اور ان کا خاندان بھٹکل ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لیا۔ بھٹکل میں بھی آبادی سے باہر جنگل کے پہاڑ کی ترائی پر جس کو مقامی بولی میں ڈونگر کہا جاتا ہے۔ اپنی رہائش کے لیے منتخب فرمایا۔ لیکن یہاں بھی آپ کی ظاہری و باطنی تعلیم کے چشمۂ فیض سے تشنگانِ علوم سیراب و بہرہ یاب ہوتے رہے کرناٹک کے مختلف مقامات کے علاوہ کوکن، ملیبار، معبر، رکار و منڈلا کایل پٹن، گوا وغیرہ اور دور دور سے آنے والوں کا ایک تانتا سا ہر دم لگا رہتا تھا۔ غرض آپ کی ذات جامع الصفات ایک بڑے پایہ کے عالم و فقیہ ہونے کے ساتھ عارف باللہ اور واصل بحق بھی تھی۔ آپ کی متعدد تصنیفات ہیں ان میں یہ دو کتابیں بہت ممتاز اور علوم و معارف کا ایک نہایت مفید ذخیرہ اور گنجینہ ہے۔ ایک کتاب کا نام مفاتیح السعادات ہے جس میں اسلامی اخلاق و سیرت و کردار کی نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں توضیح و تشریح اور آخری ابواب میں زیادہ تر سلوک و طریقت اور احسان و تصوف کے دقیق مسائل کی عقدہ کشائی کی گئی ہے دوسری کتاب المختصر ہے۔

اس میں اسلامی احکام قرآنی آیتوں اور حدیثوں سے استنباط کے ساتھ اس کے اسرار و رموز کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں تو تقریباً نایاب ہیں[1] دیگر تصانیف کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حضرت مخدوم کا زیادہ تر وقت اور خاص طور پر رات اسی غار میں تنہائی میں گذارتے اور دن میں زیادہ تر درس و تدریس اور تبلیغ و ارشادات میں بسر فرماتے آپ کے محاسن و اوصاف جمیلہ اور آپ کی کرامات و خرق عادات کے متعلق بہت سی روایتیں مشہور ہیں جن میں سے بعض باتوں کو اس زمانہ کے شعراء نے عربی اور مقامی نائطی زبان میں خوب سراہا ہے۔ ان کی تفصیل کے لیے ایک مستقل الگ کتاب چاہیے۔ جن کی اس مختصر تذکرہ میں گنجائش نہیں ہے۔

آخر عمر میں زیادہ وقت تعلق مع اللہ ہی میں گذرنے لگا۔ ۱۳/ جمادی الآخر شب جمعہ ۹۴۶ھ میں دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کے انتقال پر آپ کے ایک مسترشد مولانا شیخ عبدالقادر کایل پٹی نے عربی میں جو طویل مرثیہ پڑھا ہم یہاں اسے بجنسہ درج کرتے ہیں۔

شروع میں لکھتے ہیں ھذہ مرثیۃ "علی شیخنا وملاذنا وقدوتنا الشیخ الفقیہ المخدوم اسماعیل الصدیقی السکری رضی اللہ عنہ وارضاہ ورضی عنا بہ آمین۔

---

[1] حضرت مخدوم کی یہ کتابیں کایل پٹن میں مولانا شیخ عبدالقادر کے کتب خانہ میں موجود تھیں جو ان کے مسترشدین میں سے تھے ممکن ہے باقی دوسری تصنیفات بھی ان کے کتب خانہ میں مل جائیں راقم سطور کے بزرگوں کے قلمی ذخیرے میں جو کتابیں موجود تھیں ان میں سے اب دو تین کتابیں رہ گئی ہیں۔

بدأت بسم الله نظمي احمد | أو اذهر الكاني لمن هو مكمد
اصلي على من هو خير الخلائق | ومنجد نايوم المعاد محمد
وآل وصحب كل من هو تابع | لهم اهتدىٰ بالرشد في الحشر سيد
جرىٰ بقضاء الله موت الخلائق | ولم يبق الا الله والكل ينفد
تعفاء جرىٰ موتٌ على سيدٍ لنا | تقيهم عليم فاق من يتزهد
هو العالم المفتي الوحيد زمانه | هو المقتدي في الشرع والتعبد
هو الفاضل القمقام شيخ الطريقة | امام العلام وكنز ممجد
ولي الرحمٰن تقيٌّ ومهتدي | رشيدٌ نقيٌّ صاحب الكشف مرشدٌ
عفيفٌ شريفٌ طاهر القلب عارفٌ | حبيبٌ نسيب للمسالكين معضد
اكوشٌ بذكر الله في كل حالة | ومنبع بحر العلم منه يمد
مطيع لرب العرش في الليل ارق | قنوت خضوع خائف متهجد
رطيب بذكر قلبه وَلسانه | جفونين ليساعن الله يسهد
حليم صبورٌ ذو الانابة قلبه | مليين قلب كان بالحق يحمد
لوعظٍ شكور حاكم بعد الة | مصنف كتب محكمات وسند
منهامفاتيح السعادات مقتصد | فاحسن بهذين الكتابين مسعد
عنيت بهذ المدح سلطان عالم | وسيد عباد الدين يشيد
سماه السمي المشهور بصاحٍ قاسمٍ | بسمعاك اسماعيل في الله يحفد
ونسبه ذات مسكري بشهرة | وكنسبة دراجشكي تعدد
بتسع لمائة ثم تسع واربعين نا لهُ | من الله موت واجب المداوي تفقد
بشهر جمادا آخر يوم جمعة | باربعة والعشر منه يحدد
بسلام يزيل الضيق والضنك والعنا | على قبر هذا الشيخ روحا يرسل
سلامٌ نجي امن ذا السلام عليهم | كروب عارٍ في الجنان يخلد
سلامٌ على قبر ثوى فيه شيخه | وصيره الرحمٰن رضا يسر صد
سلامٌ سنيٌّ طيبٌ متجمّل | يروح الى في القبر دوما يعود
سلامٌ منيل ما اشتهى الميت قبره | على قبره المحصون بالنور يمد
وقرب جوار ذالك الشيخ ربنا | لنا وسلام عندك الحب تقصد

۱۲ رجمادی الثانی قریب عصر آپ کا جسد خاکی آپ کی رہائش گاہ سے متصل ایک گرے ہیں سپرد خاک کیا گیا۔

لہ حولن نقیاك یوم القیامۃ — مبوّاء صدق انزلنہ فیقعد
وعفوايعہ والرضوان والحب اعطین — لہٗ اسکنن وسط الفراد لیس یحتد
وناظم ھذن البیت عبدُ لقادرُ — ومنسوب دارقاً ئلیٌ یوطدُ
عفی اللہ بالافضال عنہ ووالد — صلوٰۃ سلاماً ما اختتم النظم اعقد

۱۔ میں نے اللہ کے نام اور اس کی تعریف کے ساتھ اس نظم کو شروع کیا اس لیے کہ وہی عزدہ کی کفایت کرنے والا ہے۔
۲۔ درود و سلام اس ذات پر جو بہترین خلائق ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو بروز حشر ہمارے نجات دہندہ ہیں۔
۳۔ آپ کے آل و اصحاب اور تابعین پر اور حشر کی سعادت مندی، کامیابی ان کی رشد و ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے لیے ہے۔
۴۔ اللہ کے فیصلہ قضا کے مطابق مخلوق پر موت کا سلسلہ جاری ہے۔ سب کے لیے فنا ہے اور ایک اللہ کی ذات باقی رہنے والی ہے۔
۵۔ اسی طرح قضا کا ایک فیصلہ ہمارے سردار کے حق بھی پیام موت لے کر صادر ہوا۔ جو فقیہہ عالم اور زہد و تقویٰ میں بھی فائق تھا۔
۶۔ وہ اپنے زمانے کے یکتا عالم و مفتی تھے اور پابندی شرع میں بھی ان کی ذات مقتدیٰ کی تھی۔
۷۔ وہ ایک عالم و فاضل ہونے کے ساتھ طریقت کے بھی شیخ تھے۔ وہ عالموں کے امام اور شرف و مجد کے خزانہ تھے۔
۸۔ وہ پاکباز شریف پاک دل عارف باللہ تھے حسب و نسب میں ممتاز اور سالکین کے مددگار بھی تھے۔
۹۔ وہ ایک پاکباز شریف پاک دل عارف باللہ تھے۔ حسب و نسب میں ممتاز اور سالکین کے مددگار بھی تھے۔
۱۰۔ ہر حال میں اللہ کا ذکر ان کا محبوب مشغلہ تھا اور آپ کی ذات علم کے سمندر کا ایک بہتا ہوا سمندر تھا۔
۱۱۔ رات میں نہایت رقت دل کے ساتھ اپنے رب کے فرماں بردار اور خشوع و خضوع اور عجز و خشیت کے ساتھ تہجد گزار۔

۱۲۔ دل کے ساتھ آپ کی زبان بھی ذکر میں رطب اللسان۔ آپ کی پلکیں اللہ کے ذکر میں جھکتی نہ تھیں۔

۱۳۔ آپ بڑے حلیم و صابر تھے اور آپ کا دل اللہ کی طرف جھکا ہوا۔ دل کے تو نرم تھے مگر اس نرمی کے ساتھ فسق و ویرانی کو روکنے والے بھی تھے۔

۱۴۔ شیریں بیان واعظ اور حاکم عدالت تھے۔ اور مختلف مستند اور محکم کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

۱۵۔ ان کتابوں میں مفاتیح السعادات اور مختصر ہے۔ اور مسند بھی ان دونوں میں بہترین کتاب ہے۔

۱۶۔ اس طرح سلطان عالم اور بزرگان دین کے ایک ہیئۃ الکی لتریف میں اپنا نشا بورا کر دیا۔

۱۷۔ سن لیجیے۔ آپ کا اسم گرامی اسماعیل ہے اور وہ اسی نام سے مشہور تھے۔ اور وہ اللہ کے معاملہ میں ایثار نفس و جذبۂ سابقت سے سرشار تھے۔

۱۸۔ آپ کا نسبی تعلق خاندان عکری سے تھا اور آپ کی وطنی نسبت شہر عجلس سے تھی۔

۱۹۔ ۱۳ رجمادی الآخر ۹۴۹ھ جمعہ کے دن پیغام اجل آپہونچا۔ جو بہت ہی اندوہناک اور ایک بڑی قیمتی متاع کو گم کر دینے والا تھا۔

۲۰۔ اس شیخ کی قبر پر سلامتی ہو ایسی سلامتی جس میں تنگی، پریشانی اور کسی طرح شقت کا گذر نہ ہو

۲۱۔ امن و سلام اور نجات اس کے لیے ہو اور یہ ہماری دعا ہیں مقرب فرشتے اس کی روح پر جنت میں پہونچا دیں جو ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔

۲۲۔ اس قبر پر سلامتی ہو جہاں آپ کا جسد خاکی سپرد کر دیا گیا اور اللہ مہربان کی رحمتیں اسے سدا بہار بنا دے۔

۲۳۔ پاکیزہ اور پرخلوص سلام اس پروقار بزرگ کی قبر روشن پر جس کا جواب ان کی قبر سے عبیر کی طرح لوٹایا جائے گا۔

۲۴۔ ایسا سلام جس کی دعائیں انھیں پہونچتی رہیں جب تک صاحب قبر کی خواہش اور تمنا ہو جس کی قبر کو اللہ کی رحمت اپنی آغوش میں ڈھانپے ہوئے ہے۔

۲۵۔ ہمارے رب کے قرب و جوار میں اب شیخ نے اپنا ٹھکانہ بنا دیا اور آپ ان کی محبت میں عازم دارالسلام ہوئے

آپ کی اولاد

خانوادۂ قاضی بدو الدولہ کے مورث نے حضرت مخدوم کی اولاد کا جو شجرا لکھا ہے وہ درج ذیل ہے۔

فقیہ عطا احمد شافعی ۔ فقیہ مخدوم ۔ فقیہ مخدوم اسماعیل شافعی فقیہ ابو محمد شافعی ۔ قاضی احمد شافعی
اسحاق شافعی وفات سنہ ۸۷۹ء

ملا خلیل اللہ وفات سنہ ۹۶۸
↑
ملا احمد وفات ۱۰ محرم سنہ ۹۸۵
↑
(۲)
بی بی خیرہ بنت سید ابو بکر
ولادت سنہ ۹۵۹ وفات سنہ ۱۰۰۵

۲ خلیل اللہ	۲ مولانا عبد اللہ بیجاپوری	۲ عطاء اللہ
	ولادت سنہ ۹۷۹	ولادت سنہ ۹۶۶
	وفات سنہ ۱۰۳۱	وفات سنہ ۱۰۰۹
	یکم شوال ۔ ۹ شعبان	۲۷ رجادی الاول
	(۱) ام حبیبہ بنت حاجی محمد سید اسحاق بن سید ابو بکر	۹ جمادی الاول
	(۲) ستی تفاحۃ الحبشیہ (جاریہ)	۲ جلال الدین احمد

(۲)
شیخ محمد صبغۃ اللہ عرف شاہ صاحب (از بطن جاریہ)
ولادت ۱۱ رشعبان
وفات ۲۰ رجب سنہ ۱۰۸۰ھ
بعمر ۲۶ سال ۔ شیخ محمد صبغۃ اللہ دو گیارہویں
سنہ ذکا الحجہ

شیخ حبیب اللہ
ولادت سنہ ۱۰۵۰ھ
وفات سنہ ۱۰۶۶ھ

قاضی محمود کبیر وفات سنہ ۹۹۵
↑
قاضی رضی الدین رضی — قاضی احمد
↓
اسماعیل
↑
شمس الدین محمد حافظ
عرف میراں صاحب
↑
میراں عبد القادر

(۲)	(۱)
محمد قاسم	دختر
عرف مرزا صاحب	زوجہ سید محمد رضا
↑	بن سید اسحاق
دختر	بن سید ابو بکر

زوجہ حاجی سید شاہ محمد
ابن سید محمد رضا مذکور

مولفِ خانوادۂ قاضی بدر الدولہ نے وفات ۹۶۹ھ کی جو تاریخ لکھی ہے وہ ہمارے یہاں کے کتبات اور قدیم بیاضوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ ہمارے قدیم کتبات و بیاضوں میں لکھا گیا ہے کہ حضرت مخدوم فقیہ اسماعیل کی وفات ۱۴ر جمادی الآخر شب جمعہ ۹۲۹ھ میں ہوئی اور یہی تاریخ مولانا شیخ عبدالقادر کابلی بھٹکلی کے مرثیہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

من اللہ موت واجب الذی تفقد[1] بتسع لمائة ثم تسع وعشرین ناله

خانوادۂ قاضی بدر الدولہ سے ثابت ہوتا ہے حضرت مخدوم فقیہ اسماعیل کے اکلوتے فرزند حضرت فقیہ اسماعیل کے اکلوتے فرزند حضرت فقیہ ابو محمدؒ صاحب اولاد بزرگ تھے ان کے فرزند قاضی احمد شافعی جن کے دو بیٹے تھے ایک ملا خلیل اللہ المتوفی ۹۶۸ھ اور دوسرے قاضی محمود کبیر المتوفی ۹۹۵ھ اور وہ امام العلماء بدر الدولہ مولانا قاضی صبغۃ اللہ بن محمد غوث مدراسی کے جد امجد اور مورث اعلیٰ تھے۔

حضرت مخدوم فقیہ اسماعیل سکریؒ کا مزار بھٹکل میں ڈونگر نامی مقام پر واقع ہے اور آپ کے والد حضرت مخدوم اسحاق سکریؒ، آپ کی والدہ ماجدہ اور آپ کے جد امجد قاضی فقیہ عطا احمد شافعی کے مزارات بھڑوچ (گجرات) میں تینوں ایک ہی گنبد میں واقع ہیں[2]

قاضی بدر الدولہ کے مؤلف لکھتے ہیں۔

"فقیہ مخدوم اسماعیل کے لڑکے کا نام فقیہ ابو محمد تھا فقیہ ابو محمد کے لڑکے قاضی احمد تھے اور دونوں کے حالات کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ان کے نام کے ساتھ قاضی کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس خاندان میں سب سے پہلے قضات کا عہدہ قاضی احمد ہی کو ملا تھا۔"

آگے لکھتے ہیں۔ "قاضی احمد کی اولاد میں دو کے نام ملتے ہیں ایک ملا خلیل اللہ المتوفی ۹۶۸ھ جو مولانا حبیب اللہ بیجاپوری المتوفی ۱۰۴۱ھ کے دادا تھے اس سے زیادہ ان کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔ دوسرے قاضی محمود کبیر۔ قاضی بدر الدولہ قاضی محمد کبیر ہی کی نسل سے ہیں[3]۔"

---

[1] تقریباً، اسی سال کا جو حرف پڑھا ہے گو وہ زیادہ صحیح نہیں ہے اور اس میں مولف فاضل کا کوئی تدبر نہیں انہیں مدراس کے مدرسہ محمدی کے کتب خانہ سے جو خیرات ملا اسے بعینہ درج کر دیا ہے۔
جامع مسجد قدیم بھٹکل کی تجدید سے پہلے اس کی پرانی عمارت کے دیوار پر خوش خط اور جلی قلم سے جو تاریخ لکھی گئی تھی وہ ۹۲۹ھ تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [2] جناب حاجی مولوی ابو محمد عبداللہ صاحب ابن مولوی حاجی عبدالرحمٰن صاحب معتمد مدرسہ محمدی مدراس اپنے سفر بھڑوچ کے دوران ان قبور کی زیارت کی اور اپنی تحقیق سے ہمیں بصورت تحریر مطلع فرمایا۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔ [3] خانوادۂ قاضی بدر الدولہ صفحہ ۲۴۔

قاضی محمود کبیر گودا میں سنہ ۹۸۱ھ تک ، قضاءت کے منصب پر فائز رہے ۔ اس وقت گوداوری جب گودا پر عادل شاہی اقتدار تھا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے قاضی رضی الدین کو قضاءت پر مامور کیا گیا۔ قضاءت سے سبکدوش ہو کر قاضی محمود کبیر حجاز تشریف لے گئے واپس آنے پر بیجاپور میں رہے اور آخردم تک درس و تدریس وعظ و تذکیر زہد و ریاضت میں مشغول رہے اور سنہ ۹۹۵ھ میں وفات پائی ان کی قبر قلعہ بیجاپور کے فصیل کے قریب ہے ۔

ان حالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت فقیہ ابو محمد مخدوم صاحب اولاد تھے ۔

حضرت فقیہ اسماعیل کی اولاد امجاد خاص طور پر جنوبی ہند میں آٹھویں صدی کے آغاز سے نہایت شاندار علوم و معارف کا خاندان رہا ہے اور وہ مسلسل دینی و ملی علمی و تصنیفی عظیم و بیش بہا خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے ۔

اس نامور خاندان کے بزرگان جہاں بھی گئے ان کے علم و فضل ان کے زہد و تقویٰ ان کی اعلیٰ صلاحیت اور بہترین قابلیت کی بنا پر انہیں بہت بلند نمایاں اور ممتاز مقام حاصل رہا ہے سلاطین وقت نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ علماء و صلحاء ان کے علم و فضل کے آگے سرخمیدہ اور عوام الناس ان کے محاسن اخلاق سیرت و کردار کی وجہ سے ان کے گرویدہ رہے ۔ خانوادہ قاضی بدر الدولہ کے مولف نے اس خاندان کے بزرگوں کے سلسلہ نسب کی جو ترتیب لکھی ہے وہ اس طرح ہے۔

قاضی محمد صبغۃ اللہ (۱) بدر الدولہ المتوفی سنہ ۱۲۸۰ھ فرزند مولوی محمد (۲) غوث شرف الملک بہادر المتوفی سنہ ۱۲۳۸ھ فرزند مولوی ناصر الدین محمد (۳) فرزند قاضی نظام الدین (۴) احمد صغیر سنہ ۱۱۸۹ھ فرزند محمد عبد اللہ شہید شہادت سنہ ۱۱۳۵ھ فرزند قاضی نظام الدین (۶) احمد کبیر المتوفی سنہ ۱۰۸۶ھ فرزند قاضی حسین (۷) لطف اللہ وفات نامعلوم

فرزند قاضی (۸) رضی الدین مرتضیٰ وفات نامعلوم ۔ فرزند قاضی (۹) محمود کبیر المتوفی سنہ ۹۹۵ھ فرزند قاضی احمد وفات نامعلوم ۔ فرزند فقیہہ ابو محمد (۱۱) وفات نامعلوم ۔ فرزند فقیہہ مخدوم اسماعیل وفات نامعلوم ۔ فرزند فقیہہ مخدوم اسحاق (۱۳) وفات نامعلوم ۔ فرزند فقیہہ عطا احمد شافعی وفات نامعلوم یہاں کا اوپر کا سلسلہ نسب نہیں ملتا۔ مگر نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عطا احمد شافعی زبردست فقیہہ تھے اور ان کے والد اور دادا وغیرہ بھی اچھے عالم رہے ہوں گے ۔ قاضی بدر الدولہ کے بعد سو سال گذر چکے ہیں ۔ ان کی نسل سے کئی اہل علم و قلم پیدا ہوئے جنہوں نے بڑی ناموری حاصل کی ۔

موجودہ دور میں ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی کی ہستی بہت ہی مشہور و معروف ہے ان کو ہندوستان کا ہر ایک اہل علم اچھی طرح جانتا ہے یہ قاضی بدر الدولہ کے حقیقی پوتے ہیں۔

وسعت کا اندازہ ہوگا! ایسی سلسلۃ الذہب نایاب ہے۔ ست واین خانہ ہمہ آفتاب است کے مصداق ان میں ہر ایک آفتاب و ماہتاب علم وعمل بن کر دنیائے علم کو منور کر چکا ہے اور پھر ہر ایک کی نسل سے کئی علماء و فقہا اور مؤلفین و مصنفین پیدا ہوئے جن کی علمی و ثقافتی کاوشیں یادگار ہمارے لئے چشمۂ آب حیات کا حکم رکھتی ہیں۔[1]

یہاں بحث اس سلسلۂ نسب کے گیارہویں بزرگ فقیہ ابو محمد سے ہے آپ کا مزار مبارک ٹھٹھہ سے نو میل کے فاصلہ پر ضلع ٹھٹھہ میں ساحل سمندر سے قریب ایک نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے آپ کے متعلق عام طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ آپ کی وفات کم سنی میں ہوئی تھی۔ گو عمر شریف کے بارے میں اختلاف ہے لیکن عام چلی ہوئی روایت کے مطابق رحلت کے وقت آپ کی عمر نو سال کی تھی۔ کیونکہ آپ کی ولادت سنہ ۹۲۰ھ میں اور وفات سنہ ۹۲۹ھ میں ہوئی تھی اور یہ کہ اپنے نو عمر کے حادثۂ رحلت کے وقت آپ کے جلیل القدر والد حضرت مخدوم فقیہ اسماعیل بقید حیات تھے۔ "آپ کی رحلت کا واقعہ" اگر اس عام روایت کو تسلیم کیا جائے تو حضرت مخدوم ابو محمد کے بچپنے کا مخصوص کا غیر مکلف زمانہ تھا اور یہ ظاہر ہے کہ ولایت کوئی موروثی چیز نہیں بلکہ ولایت کا مقام ان نفوس قدسیہ کو عطا ہوتا ہے جو تقویٰ شعار، نیک کردار، اللہ تعالیٰ کے کامل فرماں بردار اس کی رضا کے ہر دم طلبگار اور اس کے رسول کے خالص تابعدار ہوتے ہیں اور جو ما سویٰ اللہ سے کٹ کر اپنا رشتہ تمام تر اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھتے اور اس کے حصول تقرب کے لیے مجاہدہ اور ریاضت شاقہ کے ساتھ اسی کے ہو رہتے ہیں انہیں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اَلَاۤ اِنَّ اَولیاء اللہ لَاخوفٌ علیھم وَلَاھم یحزنون الَّذِیْنَ اٰمنوا وکانوا یتقون الآیۃ۔ آگاہ ہو جائیے۔ بیشک اللہ کے دوست جو ایمان لائے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کی۔ نہ ان پر کوئی ڈر ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہیں"

خانوادۂ قاضی بدر الدولۃ کی نسب نامہ کی تربیت تسلیم کر لینے کی صورت میں حضرت مخدوم فقیہ ابو محمد کم سن نہیں بلکہ ایک صاحب اولاد بزرگ ثابت ہوتے ہیں جن کی اولاد میں اجلہ علماء و اکابر صلحاء و اولیائے کرام گذرے ہیں جن کا سلسلۃ الذہب آسمان علم وفضل پر ستاروں کی طرح برابر چمک رہا ہے اور جن کے چشمۂ فیضان سے اور ان کے علوم ظاہری و باطنی سے ہندوستان کی اسلامی آبادی کا ایک بڑا حصہ سیراب و فیضیاب ہوا ہے۔ اور اب بھی ہو رہا ہے۔ اس لحاظ سے نہیں ایک کم سن تسلیم کرنے کا مسئلہ کچھ پیچیدہ اور حل طلب ہو جاتا ہے۔

---

[1] منقول از خانوادہ قاضی بدر الدولۃ مؤلفہ مولانا محمد یوسف کوکن صفحہ ۲۱

بلکہ وہ اپنے پدر بزرگوار کے نمونہ پر ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے صالح و باکمال تھے اور خانوادہ قاضی بدرالدولہ کی صراحت کے مطابق صاحب اولاد تھے جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آپ کی نظروں سے گذر چکی ہے۔

مولوی سید محی الدین باقوی مرحوم ٹیشوری مرحوم نے حضرت مخدوم ابومحمد کے مناقب میں گلستان مخدومی کے نام سے جو رسالہ لکھا ہے۔ اس میں آپ کی وفات کے متعلق لکھتے ہیں "واما وفاتہ ......
...... فی لیلۃ الخمسۃ عشر۔ وکانت لیلۃ الجمعۃ من شھر جمادی الاخر سنۃ تسعۃ وعشرین وتسع مائۃ من ھجرۃ سید الانام علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔

یعنی ان کی وفات ۱۵ جمادی الآخر شب جمعہ ۹۲۹ھ میں ہوئی تھی اور آپ اسکے والد بزرگوار اپنے صاحبزادے کی رحلت کے بعد ۲ سال تک بقید حیات تھے فعاش من بعد ولدہٖ عشرین سنین وتوفی سنۃ تسعۃ واربعین وتسع مائۃ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم فقیہہ اسماعیل سکری کی وفات ۹۲۹ھ میں ہوئی تھی اور یہی سنہ وفات قدیم کتبات اور مولانا شیخ عبدالقادر صاحب کے مشہور مرثیہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں خانوادہ قاضی بدرالدولہ میں درج کردہ ۸۹ھ کی سنہ وفات محتاج بحث نظر آتی ہے۔ یہی مولف ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"مخدوم فقیہہ اسحاق کا ان کی والدہ ہی کی زندگی میں انتقال ہوا تھا۔ فقیہہ مخدوم اسحاق کے ایک لڑکے فقیہہ مخدوم اسماعیل تھے قاضی بدرالدولہ کی خاندانی بیاضوں سے پتہ چلتا ہے کہ فقیہہ مخدوم اسماعیل ۸۹ھ میں انتقال ہوا تھا اس سے زیادہ ان کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر آگے لکھتے ہیں"
"فقیہہ مخدوم اسماعیل کے لڑکے کا نام فقیہہ ابو محمد تھا۔ فقیہہ ابو محمد کے لڑکے قاضی احمد تھے۔ ان دونوں کے حالات کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ نام کے ساتھ قاضی لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس خاندان میں پہلے قضاءت کا عہدہ قاضی احمد ہی کو ملا تھا۔ [۱]

قاضی احمد کی اولاد میں دو کے نام ہمیں ملتے ہیں ایک ملا خلیل اللہ متوفی ۹۶۸ھ جو مولانا حبیب اللہ بیجاپوری المتوفی ۱۰۴۱ھ کے دادا تھے اس سے زیادہ ان کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے قاضی محمود کبیر" قاضی بدرالدولہ قاضی محمود کبیر ہی کی نسل سے ہیں چونکہ قاضی محمود کے ایک پوتے کا نام بھی قاضی محمود تھا اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے دادا کے نام کے ساتھ کبیر اور پوتے کے نام کے ساتھ صغیر لکھا جاتا ہے۔ [۲]

---

[۱] خانوادۂ قاضی بدرالدولہ صفحہ ۲۷ [۲] خانوادۂ قاضی بدرالدولہ صفحہ ۲۷

جہاں تک شجرۂ نسب کا تعلق ہے اس کا خلاصہ ہم نے قدیم خاندانی بیاضوں سے انقابات کے باب میں سکری کے عنوان کے ماتحت لکھ آئے ہیں۔

اس میں گلستانِ مخدومی میں لکھے گئے نسب نامہ میں ایک دو سلسلوں کے ناموں میں معمولی سے فرق کے سوا باقی ناموں میں تطابق و توافق پایا جاتا ہے۔ لیکن خانوادۂ قاضی بدرالدولہ کے مؤلف نے حضرت مخدوم اسماعیل کے والد کا نام مخدوم اسحاق لکھا ہے اور ہمارے یہاں کی قدیم بیاضوں میں آپ کے والد کا نام شیخ ابراہیم سکری لکھا گیا ہے چونکہ انھوں نے قاضی بدرالدولہ کے خاندانی بیاضوں کے حوالے سے لکھا ہے اس لیے ہم اس کو غلط بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ سہواً ادھر ادھر دونوں طرف محتمل ہیں:

حضرت مخدوم شیخ زین الدین معبریؒ

پنّان جس کو عرب فنّان لکھتے ہیں وہ کالی کٹ سے قریب ملیبار کے جنوب جانب ایک مردم خیز اور مشہور شہر ہے وہ صدیوں سے ملیبار کے مسلمانوں کے مذہبی علوم و فنون کا ایک بہتا ہوا سرچشمہ اور ایک معروف دینی مرکز رہا ہے۔ مشائخین اور علمائے کرام کا ایک خاص قبیلہ نویں صدی ہجری سے اس شہر کو اپنی سکونت سے زینت بخشا۔ عام طور پر ایفیں پونانی کے مخادیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے وہاں ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کے ساتھ خانقاہ بھی۔ جن کا سلسلہ اب تک کم و بیش جاری ہے۔ انگریزوں کے اقتدار سے پہلے تک عرب و عجم سے بڑے بڑے علماء و مشائخ اکثر یہاں آتے رہتے تھے اور مدرسہ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔

"بعض تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ شیخ شہاب الدین ابن حجر مکیؒ جن کی ولادت ۹۰۹ھ/۱۵۰۴ء اور وفات ۹۷۴ھ/۱۵۲۶ء ہوئی تھی۔ وہ ملیبار میں اپنی تشریف آوری کے بعد متذکرہ مدرسہ کے زاویہ میں قیام فرمایا تھا اور جب تک وہاں رہے اس مدرسہ میں تفسیر و حدیث اور فقہ کا درس دیتے رہے۔"

اور شیخ علی بن احمد معبری جو پونانی کے مخادیم کے جدِ اعلیٰ ہیں وہ دراصل معبر کے ایک قصبہ شور چولمنڈل کے باشندے تھے اور جب وہ ملیبار آئے تو ابتداءً کوچین میں سکونت اختیار کی پھر یہ خاندان قاضی زین الدین ابراہیم بن احمد المعبری کے ساتھ کوچین سے پونانی میں منتقل ہوگئے اور حضرت مخدوم شیخ زین الدین ابویحییٰ بن شیخ علی بن احمد کی ولادت کوچین میں ۱۳ر شعبان ۸۷۴ھ پنجشنبہ طلوعِ شمس کے وقت ہوئی۔

ابتداء میں انھوں نے صرف ونحو اور فقہ کی کتابیں اپنے والد بزرگوار اور دوسرے اساتذہ کرام سے پڑھیں اس کے بعد اپنی جوانی کے آغاز میں شیخ شہاب الدین احمد بن عثمان ابیمنی سے تفسیر وحدیث کی کتابوں سے فراغت حاصل کی۔

اس زمانہ میں کالی کٹ ملیبار کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا جہاں بہت سے مشاہیر اصحاب علوم ومعارف اور ارباب فضل وکمال بیرونی ملکوں سے آکر قیام کرتے تھے۔

حضرت شیخ زین الدین تحصیل علم کے لیے کالی کٹ آئے اور قاضی فخر الدین ابو بکر بن قاضی رمضان شالیاتی جو ایک بہت بڑے پایہ کے عالم اور پورے ملیبار کے قاضی القضاۃ بھی تھے کی خدمت بابرکت میں پہنچے اور ان سے فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی پھر قاضی عبد الرحمٰن الآدمی المعبری کے حلقۂ درس میں شریک ہو گئے۔

ان سے حدیث کی متداول کتابوں سے فراغت حاصل کی۔ قاضی عبد الرحمٰن المعبری موصوف اس زمانہ کے علم حدیث کے ایک جلیل القدر حافظ تھے اور مسلم امام تھے۔ اور وہ شیخ شمس الدین جوجری شیخ ذکریا انصاری اور شیخ کمال الدین ابی شریف وغیرہ جیسے مشاہیر علماء حدیث کے شاگرد تھے اور شیخ الدین نے ان سے حدیث کی سند واجازت بھی حاصل کی۔

حضرت شیخ زین الدین جہاں علوم ظاہری کے ایک متبحر عالم تھے وہاں علوم باطنی میں اعلیٰ درجہ کی دستگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے شیخ جلیل خواجہ قطب الدین بن خواجہ عز الدین چشتی جو کہ شیخ الشائخ خواجہ فرید الدین اجودھنی کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور انہیں سے قادری، چشتی دونوں طریقوں کی خلافت سے مستفیض ہوئے اس کے بعد شیخ طریقت ثابت بن عیسیٰ بن محمود الزاہد کی طرف رجوع کیا اور ان سے رشد وہدایت اور تبلیغ وتلقین کی اجازت حاصل کی۔

شیخ زین الدین جمعہ کی شب ۱۷ شعبان ۹۲۸ھ میں دنیا سے رحلت کر گئے اور پونانی کی اس مشہور زاویہ میں انہیں دفن کیا گیا۔ اس وقت سے آج تک ان کا مزار خاص وعام کا مرجع اور زیارت گاہ ہے۔

شیخ زین الدین مخدوم کی تصنیفات میں متعدد مختلف کتابیں ہیں جو اپنی افادی حیثیت سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں ایک کتاب "مرشد الطلاب" جو فن تصوف میں ایک نہایت مفید اور ضخیم کتاب ہے۔ (۲) سراج القلوب" اس میں ان احوال کا ذکر ہے جو انسان کی موت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔"

(۳) شمس الہدیٰ: یہ مواعظ ونصائح کا ایک نہایت مجموعہ ہے (۴) "تحفۃ الاحبا" اس میں

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ذکر اذکار اور احزاب کا اسانید کے حذف کے ساتھ خلاصہ ہے جو بہت ہی کارآمد اور نفع بخش ہے۔

۵۔ "ارشاد القاعدین" یہ حجۃ الاسلام محمد بن محمد غزالی کی کتاب منہاج العابدین، عربی میں شرح اور تفصیل پر مبنی ہے۔

۶۔ "شعب الایمان" یہ علامہ نور الدین ایجی کی مشہور کتاب کا فارسی سے عربی میں ترجمہ ہے اور اس کا نام کتاب الفرائض ہے۔

۷۔ خلاصۃ کتاب الکافی فی الفرائض الامام صیر دفی۔ (۸) الصفاء من الشفاء، خلاصۃ کتاب الشفاء قاضی عیاض المالکی۔

۹۔ تسہیل الکافیہ یہ نحو میں ابن الحاجب کی کتاب پر مبسوط حواشی اور امام مالک کی الفیہ ابن الوردی کا تحفہ اور ابن المقری کے ارشاد پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ قصص الانبیاء کے طرز پر احوال انبیاء میں حضرت آدم سے حضرت داؤد علی نبینا وعلیہما السلام کے حالات پر مشتمل ایک متوسط کتاب ہے۔ آخر میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نہایت مدلل اور مبسوط بحث کی گئی ہے لیکن اس کا انداز زبان سے زیادہ تر واعظانہ اور ناصحانہ رنگ ابھرتا ہے۔ اور ابھی نصف حصہ لکھ پائے تھے تو ان کا وقت موعود آن پہونچا اور یہ کتاب نامکمل رہ گئی اس کے علاوہ ان کے بے شمار عربی کے قصائد ہیں۔

ان میں یہ تین نہایت معروف و مقبول ہیں۔

۱۔ "ھدایۃ الاذکیاء الی طریق الاولیاء" یہ قصیدہ فن تصوف پر ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔

۲۔ دوسرا قصیدہ "ارجوزۃ فی التصوف" اس کو اول الذکر کی تشریح یا تتمہ سمجھنا چاہیے تیسرا قصیدہ "تحریض اھل الایمان علی جہاد عبدۃ الطغیان" اس میں ابتداء میں پرتگیزوں کے ملیبار میں وارد ہونے کے بعد مسلمانوں پر ان کی طرف سے جو مظالم ہوئے ان کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں ان کافروں کے خلاف جہاد کی ترغیب و تحریص ہے۔ یہ قصائد بلاد عربیہ و دیار شرقیہ میں اس قدر مقبول ہوئے اور پسند کی گئیں کہ بہتوں نے اس کی شرحیں لکھیں۔ اول ان کی دو شرحیں میدان میں آئیں جسے ابن المصنف نے لکھا ہے پھر اس کا شارح عارف باللہ شیخ ابوبکر بن سید محمد شطا میاطی مقیم مکہ مکرمہ زادھا اللہ شرفاً وتعظیماً نے کفایۃ الاتقیاء فی مناہج الاصفیاء کے نام سے لکھا اور اس شرح کی طباعت ۱۳۰۳ھ میں مصر میں ہوئی۔ پھر شیخ نووی دکنی نے اس پر ایک شرح بنام "سالم الفضلاء" لکھی جو ۱۳۰۰ھ میں قاہرہ میں طبع ہوئی۔

شیخ زین الدین بن عبد العزیز بن زین الدین جو شیخ زین الدین کے پوتے تھے وہ سنہ ۹۳۲ھ میں پنان میں پیدا ہوئے وہ علامہ شیخ شہاب الدین احمد بن حجر مکی کے شاگرد رشید تھے اور وہ انہیں سے تفسیر وحدیث اور فقہ کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ ان کی تصانیف میں چار کتابوں کو بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ایک "ارشاد الاولیا" دوسری "مسالک الاتقیاء" تیسری "فتح المعین" اور چوتھی "تحفۃ المجاہدین"۔ "ارشاد الاولیاء"۔ "اسرار" "ہدایۃ الاذکیار" کی شرح ہے۔ جس میں مصنف نے تصوف کے اسرار وغوامض اور اس سے متعلق مسائل نہایت حسن وخوبی کے ساتھ حل کیے ہیں اور "مسالک الاتقیاء" اول الذکر کتاب کی ایک مفصل مبسوط اور مطول شرح لکھنا چاہیے۔

تیسری کتاب "فتح المعین" فقہ میں ایک مشہور ومقبول کتاب اور وہ درحقیقت شیخ عبد اللہ بن محمد بن علی الشنشوری خطیب جامع ازہر کی کتاب قرۃ العین فی مہمات الدین کی شرح ہے اور یہ کتاب سنہ ۹۸۲ھ تصنیف کی گئی تھی یہ کتاب فقہ شافعی میں ہے اور ان میں بہت معتبر مستند اور مقبولیت کا مقام رکھتی ہے اور یہ کتاب عرب اور جزائر شرقیہ میں بھی نہایت قدر ومنزلت سے دیکھی گئی اور اس کی خوب نشر واشاعت ہوئی یہاں تک کہ اکثر علمائے عرب نے اس پر مبسوط وطویل حواشی اور شرحیں لکھیں ان میں دو حواشی بہت مشہور ہیں اور معروف ہیں۔ ان میں ایک شرح "ترشیح المستفیدین علی فتح المعین" ہے۔ جو سید احمد علوی سقاف نے سنہ ۱۲۹۵ھ میں تصنیف کی اس کی دو جلدیں مصر میں شائع ہوئیں۔

دوسری شرح "اعانۃ الطالبین علی حل الفاظ فتح المعین" یہ کتاب شیخ عارف باللہ سید ابو بکر البکری بن سید محمد شطّا دمیاطی نے تیرہویں صدی ہجری میں مکہ معظمہ میں تصنیف کی۔ اور قاہرہ مصر سے چار جلدوں میں طبع ہو کر شائع ہو گئی۔

چوتھی کتاب "تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتگالیین" ہے یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں مصنف نے ملیبار کی تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا ہے پھر وہاں کے حالات پر بحث کی ہے۔ ابواب کی ترتیب یہ ہے (۱) فی احکام الجہاد (۲) فی دخول المسلمین فی ملیبار واشاعۃ الاسلام فیہا (۳) فی بیان عادات ورسوم الاقوام غیر مسلمین (۴) فی ذکر وصول البرتگالیین الی ملیبار وتمالکھم ببعض مقاماتہا واستقلال قدرتہم واستقلال اقتدارہم فیہا۔ اس آخری باب میں سنہ ۹۰۴ھ سے سنہ ۹۹۴ھ تک کے تمام تاریخی واقعات اور اس کے عام حالات کو نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے جو جلال الدین اکبر کے عہد سلطانی میں شائع ہوئی اور یہی طیبار میں پرتگیزوں کا عروج کا بھی دور تھا۔ اس میں زیادہ تر واقعات مصنف کے چشم دید ہیں اور بعض حالات مسموعہ بھی ہیں جن پر مصنف کو وثوق تام اور اعتماد کامل تھا۔

مصنف نے اپنی کتاب کے آغاز علی عادل شاہ ثانی بیجاپور کے نام سے کیا تھا لیکن کتاب کے مکمل ہونے تک سنہ ۹۹۲ھ میں وہ رحلت کر گیا تھا۔

یہ کتاب یورپ اور دور دراز ملکوں میں بہت مشہور ہو گئی اور انگریزی اور پرتگیزی وغیرہ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور اس کی خوب خوب نشر و اشاعت ہوئی۔

سلسلۂ عیدروسیہ

شیوخ عیدروسیہ دراصل عدن سے متصل ایک مشہور بندرگاہ عیدروس کے باشندے تھے اور اسی نسبت سے وہ عیدروسی کہلائے اور ان کا طریقہ عیدروسیہ مشہور ہو گیا اس کے بعض ان کی ایک شاخ حضر موت میں آباد ہو گئی پھر ان میں سے بعض گجرات میں آکر بس گئے اور ان کی ایک شاخ دکن میں بھی پہونچ گئی چنانچہ مولانا حکیم سید عبدالحئی لکھتے ہیں کہ :-

"سب سے اول سید شیخ بن عبداللہ حضرمی گجرات تشریف لائے اور احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے سنہ ۹۹۰ھ میں ان کا وصال ہوا۔ چند روز کے بعد ان کے خلف الرشید سید احمد بن شیخ تشریف لائے اور بھڑوچ میں مقیم ہوئے ان کی وفات سنہ ۱۰۲۳ھ میں ہوئی اور بھڑوچ میں مزار ہے سید محمد بن عبداللہ حضرمی سید شیخ کے پوتے تھے اپنے دادا کی زندگی میں تشریف لائے کچھ دنوں احمد آباد میں قیام فرمایا اور دادا سے مستفید ہوتے رہے اس کے بعد سورت میں بود و باش اختیار فرمائی۔

ابوبکر الشبلی نے المشرع الروی میں لکھا ہے :-

انعقد الاجماع علی فضلہ و کمالہ (ترجمہ ان کے فضل و کمال پر اجماع منعقد ہو چکا ہے) سنہ ۳۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ اور سورت میں مدفون ہوئے۔

شیخ جعفر بن علی حضرمی سید محمد بن عبداللہ کے بھتیجے تھے گجرات تشریف لا کر کچھ دنوں احمد آباد

میں رہے اس کے بعد سورت میں اپنے چچا کے جانشین رہے جو السادات قادری کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاہجہاں اور دارا شکوہ کو ان سے کمال عقیدت تھی۔ دارا شکوہ کی فرمائش سے سفینۃ الاولیاء کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا ۱۰۶۲ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ سورت میں چچا کے پاس مدفون ہوئے۔

شیخ نورالدین محمد بن علی راندیری اسی سلسلہ کے ایک بزرگ تھے انھوں نے رحیق المحمدیہ فی طریق الصوفیۃ بڑا جواب کتاب لکھا ہے۔ ان کی وفات ۱۰۶۶ھ میں ہوئی علاوہ ان کے اور بھی مشائخ اس سلسلہ کے گجرات تشریف لائے اور وہاں کے لوگوں کو اپنے فیوض و برکات سے مالامال کیا سب کا ذکر از طوالت سے خالی نہیں۔ ؎۱

اسی طرح انہیں شیوخ عیدروسیہ کی ایک شاخ بندر عیدروس سے غالباً ۱۱۵۰ھ میں ملیبار پہنچ گئی اور کویلانڈی نامی ایک قصبہ میں اقامت اختیار کی چنانچہ سید شیخ بن محمد الجفری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"ولد رضی اللّٰہ عنہ ببندر عدن المحروس المشہور بین الناس ببندر العید روس۔ ؎۲

اس کے بعد شیخ ابن علی باسلمی الحضرمی کے حوالہ سے لکھتے ہیں ولد الحبیب محمد بن حامد علوی لیلۃ الاربعاء خامس شوال سنۃ الف مائۃ وثلاثۃ وثلاثین (۱۱۳۳)۔ وعمرہ الحبیب محمد المذکور اذ ذاک ثلاثۃ وخمسین (۵۳) سنۃ۔ ؎۳

پھر آگے لکھتے ہیں اس حساب سے ان کی سال ولادت ۱۱۰۸ھ ہوتا ہے۔ اور ان کی وفات ۱۱۶۵ھ ۲۷ رجب شب معراج میں کویلانڈی نامی ایک قریہ میں ہوئی تھی۔ لان وفاتہ القضی اللّٰہ بہ لیلۃ المعراج فی سابع وعشرین من رجب سنۃ الف ومائۃ وستین (۱۱۶۵) کانت وفاتہ بقریۃ تسمی کویلانڈی من ارض ملیبار۔"

شیخ محمد بن حامد علوی نے اپنے زہد و تقویٰ رشد و ہدایت تذکیر و موعظت اپنے حسین و جمیل سیرت و کردار اور اپنے روحانی فیوض و برکات کے اس قدر گہرے نقوش و تاثرات چھوڑے کہ ان کی وفات پر شہر کویلانڈی ہی نہیں بلکہ سارا ملیبار غم و الم سے تڑپ اٹھا اور جو چھوٹے بڑے عوام و خواص سب کے سب اشکبار و سوگوار ہو گئے کہ گویا ان سے بہت بڑی نعمت چھن گئی ہے۔

؎۱ یاد ایام از مولانا حکیم سید عبدالحئی رائے بریلوی صفحہ ۲۷-۲۸۔ ؎۲ نتیجۃ اشکال قضایا مسلک جمہرا جواہر مشائخ الطریقۃ العیدروسیہ المعادریہ۔ ؎۳ کتب هکذا الشیخ المبارک باملا الحضرمی فی هامش کتاب لہٗ۔

وكان انتقاله مصيبة على العباد والصفاد وجزله عليه العالى والموالى له۔

اس خاندان کے ایک نامور بزرگ اپنے سلسلۂ نسب کی تشریح یوں لکھتے ہیں :۔

يقول كثير الخطايا بالوزرى من العاشر من اجداده يلقب بالجفرى، شيخ ابن محمد بن شيخ بن حسن بن علوى بن ابى اكبر الجفرى بن محمد بن على بن محمد بن احمد بن الفقيه المقدم محمد بن على بن محمد صاحب مرباط بن على بن علوى بن محمد بن علوى بن عبد الله بن احمد بن عيسى بن محمد بن على العريضى بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن على زين العابدين بن الحسين بن على بن ابى طالب و فاطمة بنت الرسول صلى الله عليه وسلم ؎

عیدروسیہ سلسلہ کے اکثر شیوخ اس خانہ میں آفتاب امت کی طرح رشد و ہدایت، علم و فضل صلاح و تقویٰ کے روشن ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور بعض تو مقامات عالیہ سے سرفراز اور علوم و معارف الٰہیہ میں بہت ہی ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس خاندان کی ایک شاخ دکن میں بھی آباد ہو گئی جس کے فیوض و برکات کا چشمہ وہاں اب تک جاری ہے۔ اور ہزاروں بندگان خدا اس سے سیراب، فیضیاب اور مالا مال ہیں۔ یہ شاخ ابتدا میں کہاں سے آئی تھی اس کے بارے میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں وہ گجرات سے آئے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں بیجاپور سے لیکن بعض کتابوں سے یہ ثابت ہے کہ وہ بندر عیدروس سے براہ راست آئے تھے۔ اس خاندان کی ایک شاخ کالیکٹ میں اگر بس گئی اور اپنے علمی اور روحانی فیضان سے اللہ کے بہت سے بندوں کو مستفیض فرمایا اور انکے سلسلہ کے بعض بزرگ وہیں رحلت پا گئے جن کی قبریں ان کی رہائش گاہ کے متصل ہیں اکثر سے ہیں زیارت گاہ عام ہیں۔

مولانا حبیب اللہ شہید بیدری نایطی بیجاپوری

ملا احمد کے تین صاحبزادے تھے، عطاء اللہ، حبیب اللہ اور خلیل اللہ ان میں حبیب اللہ ہی اپنے علم و فضل اور اپنے باطنی و روحانی کمالات کی بدولت زیادہ مشہور و مقبول ہوئے آپ شب عید الفطر ۹۷۱ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ مولانا حبیب اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ ؎

؎ ایضاً ؎ کتاب نجم الکمال فی الاسلک جواہر الجواہر بہ مشائخ از طریقۃ العیدروسیہ القادریہ !

؎ جس کی تفصیل ذکر مخدوم اسماعیل مکری میں آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہے۔

جیب اللہ بن ملا احمد ابن ملا خلیل اللہ بن قاضی احمد ابن فقیہہ ابو محمد ابن فقیہہ مخدوم اسماعیل سکری الصدیقی رحمۃ اللہ علیہ۔ خاندانی روایت کے مطابق قرآن پاک ختم کرکے فارسی اور عربی کی تعلیم قاضی سید علی محمد اور اس کے بعد میاں جی حضرت جیب اللہ جیسے مشہور اساتذہ کرام سے حاصل کی۔ چونکہ آپ کو مبداء فیاض کے طرف سے ذہانت اور ذکاوت کا بہرہ وافر عطا ہوا تھا اس لیے آپ اپنے باکمال استاد کی نگرانی میں مطالعہ کے ذریعہ منقولات کی اکثر متداول کتابوں سے فراغت پائی۔

شیخ حسن نجفی اپنے وقت کے ایک مشہور معقولی تھے وہ مذہباً شیعہ تھے اور اہل تشیع انہیں اپنا امام مانتے تھے اس کے ساتھ وہ نہایت صالح اور متقی بھی تھے مولانا جیب اللہ نے ان کی شاگردی اختیار کی اور ان کے علمی فیضان سے بہرہ ور ہوئے۔ اور فلسفہ، علم و کلام میں کافی دسترس حاصل کی۔ اس طرح مولانا موصوف اپنی عمر کے ستر ہویں سن میں پہنچتے علوم متداولہ سے فارغ التحصیل ہو گئے۔

مولانا کے ارد گرد کا سارا ماحول تصوف کے رنگ میں گھرا ہوا تھا اور ان کے والد بھی ایک پاکباز صوفی منش بزرگ تھے اس لیے ابتداہی سے آپ کا طبعی میلان اور رجحان طبعاً تصوف ہی کی طرف رہا تھا اس زمانہ میں لسبندی میں ایک بڑے پایہ کے بزرگ تھے آپ کا اسم گرامی قاضی محمد کلیانی تھا۔ وہ ایک عالم جلیل ہونے کے ساتھ عارف بھی تھے ان کی کشف و کرامات کی شہرت عام تھی۔ اب آگے مولانا جیب اللہ کے ان کی خدمت اقدس میں پہنچنے کا حال خانوادہ قاضی بدر الدولہ سے سنیئے۔

"مولانا جیب اللہ رمضان المبارک ۱۱۹۹ھ میں لسبندی پہنچے اور وہاں کی مسجد میں مقیم رہے۔ قاضی محمد کلیانی مولانا جیب اللہ سے بالکل واقف نہیں تھے اس کے باوجود انہوں نے اپنے خادم کو بھیجا کہ فلاں علاقہ کے فرزند فلاں مسجد میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہیں ہمارا اسلام پہنچانا اور انہیں ہمارے پاس بلا لانا۔ خادم نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور جب مولانا جیب اللہ تشریف لائے تو کہا کہ ہم نے محض فراست سے یہ بات معلوم کی تھی اس کو ہماری کرامت پر محمول نہ کریں۔

مولانا نے قاضی محمد کلیانی کی شاگردی اختیار کی چند دن ان کے ساتھ رہے ان سے کتاب البراہین پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی درس میں مولانا کی علمی صلاحیتیں آشکارا ہونے لگیں قاضی محمد کلیانی کے ساتھ دوسرے طلباء ان کی اعلیٰ استعداد پر حیران تھے۔"[1]

وہاں کچھ مہینے گذار کر مولانا بیجاپور چلے آئے پھر شاہ محمد مرزا عرف میراں صاحب کی خدمت

---

[1] ماخوذ از خانوادہ قاضی بدر الدولہ صفحہ ۵۰

بابانگر پہونچے ان میں جہاں اور فضائل وکمالات تھے وہاں طے ارض کا ایک عجیب کمال انہیں حاصل تھا مگر وہ اپنے اس وصف کو چھپائے رکھتے تھے۔ اب آگے ایک واقعہ کی تفصیل "واقعہ خانوادہ بدر الدولہ" سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"ایک دن مولانا (حبیب اللہ) کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کر کے کسی اچھے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیے۔ اور جب وہ میران صاحب کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے اپنا خیال وارادہ ظاہر نہیں کیا۔ میران صاحب نے اس روز ان کی پرتکلف ضیافت کی اور پھر صبح کی نماز پڑھ کر خالی میدان میں ٹہلنے کی غرض سے تشریف لے گئے ایک فرسنگ چلنے کے بعد انھوں نے ایک طرف اشارہ کرکے کہا دیکھو جس شخص کی تمہیں تلاش ہے وہ یہاں رہتا ہے۔ مولانا نے اس طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ عربستان کا لق ودق ریگستان نظر آرہا ہے۔ میران صاحب نے کہا تمہیں ہندوستان چھوڑ کر باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند دنوں میں وہی شخص یہاں ہندوستان آنے والا ہے جس کی تمہیں تلاش ہے اس سے تم وہ سب حاصل کر سکتے ہو جس کے حاصل کرنے کی تمہیں بے حد تمنا ہے۔ لہ

سید شاہ صبغۃ اللہ سنہ ۱۰۰۰ھ میں مدینہ طیبہ سے ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور پہونچ گئے۔

سید شاہ صبغۃ اللہ بھڑوچ میں ۹۲۵ھ میں پیدا ہوئے تھے آپ کے والد کا اسم گرامی سید شاہ روح اللہ حسینی اور ان کے دادا سید عبدالفتاح حسینی تھے ان کی والدہ سید شاہ کمال صوفی قدس سرہ کی دختر تھیں جو خواجہ سید محمد گیسو دراز کے خلیفہ اور داماد بھی تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ احمد آباد تشریف لے گئے۔ شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی جو مشہور ومعروف بزرگ حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری کے مسترشد تھے اور خلیفہ تھے سید شاہ صبغۃ اللہ نو سال تک ان کی خدمت میں رہے۔ اور فقہ وتصوف کی تعلیم ان سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں تین سال گذار کر غالباً سنہ ۱۰۰۰ھ بیجاپور میں مراجعت فرمائی۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کے ساتھ نہایت عزت واحترام سے پیش آیا۔ اور ان کے ساتھ انتہائی گہری عقیدت کا اظہار کیا اور بہت سے جویائے اہل علم وفضل وکمال ان کے حلقۂ ارادت سے منسلک ہو گئے۔

شہر کے اکثر عمائدین ومعززین برابر ان کی خدمت باسعادت میں پہونچتے تھے اور ان سے ہر طرح مستفیض ہوتے رہے۔ لیکن ایک مولانا حبیب اللہ ہی تھے جو ابتک ان کی خدمت میں باریاب نہیں ہو پائے تھے اور یہ بات لوگوں نے حضرت شاہ صاحب تک پہنچا دی کہ اس شہر کے چھوٹے بڑے سب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہو رہے ہیں لیکن ایک عالم دین حبیب اللہ

ہے جو ابتک اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ شاید وہ اپنے آپ کو کسی تعلیم کا محتاج نہیں سمجھتا۔ شاہ صبغۃ اللہ نے مولانا حبیب اللہ کے پاس اپنا آدمی بھیجا کہ وہ ذرا زحمت فرماکر ہم سے ملاقات کریں۔ جو چاہے تو پوچھیں ورنہ نہیں۔ یہاں کسی پر جبر کا معاملہ نہیں۔ مولانا کو شاہ صاحب کی یہ بات خوش لگی اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور وہ شاہ صاحب کے علمی اور باطنی کمالات سے نہایت متاثر ہوئے اور انہیں محسوس ہوا کہ جو کچھ ابتک انھوں نے حاصل کیا تھا وہ محض علم رسمی تھا اور حقیقی علم و معرفت کا چشمہ تو یہاں بہہ رہا ہے۔

پھر مولانا نے شاہ صاحب سے مختلف کتابوں کا درس لینا شروع کیا۔ شاہ صاحب کا معمول تھا کہ وہ صبح سے دوپہر تک علوم ظاہری کا اور عصر کے بعد سلوک و تصوف کا درس دیتے تھے۔

اس طرح مولانا حضرت شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت اور ان کے فیض صحبت سے بہت ہی محظوظ ہوئے اور اس چشمۂ صافی سے علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی سے سیراب و فیضیاب ہوئے تا آنکہ اوراد و وظائف کی اور زہد و ریاضت کی پابندی سے وہ ایسے مقام پر پہونچ گئے جہاں نہاں خانۂ خدا کے سوا کسی دوسرے کا گذر نہیں ہو سکتا اور آپ خواب و بیداری میں بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا سے مشرف ہونے لگے۔ چنانچہ ایسے ہی حال کا ذکر اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں۔

رأیت رسول اللہ فی عین یقظتی — علیہ صلوٰۃ اللہ فی کل لحظۃ

وما ھو الا فیض شیخی و قدوتی — مرادی و استاذی استنادی و قبلتی

(ترجمہ) میں عین بیداری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہوا آپ پر ہر دم اللہ کی رحمت ہو۔

میرے شیخ اور مرشد کے جو میری مراد، میرے استاد، میرے استناد اور میرے قبلہ ہیں کسی اور کا فیض نہیں ہے۔

آپ دوسری جگہ اسی مفہوم کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔

أرانی رسول اللہ فی عین یقظۃ — کرارا مرارا فیض صحبۃ صبغۃ

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا بحالت بیداری اپنا جمال جہاں آرا دکھایا ہے اور یہ بات سید شاہ صبغۃ اللہ کے فیض صحبت سے حاصل ہو سکی ہے۔

شاہ صاحب کا پانچ سال تک بیجاپور میں قیام رہا اسی اثنا میں مولانا نے ان سے بیعت کی درخواست کی اور وہ ان کے مرید ہو گئے سنہ ۱۰۰۰ھ کے آخر میں سید شاہ صبغۃ اللہ حرمین کے مقدس سفر پر تشریف لے گئے۔ مولانا بھی ان کے ہمراہ تشریف لے جانا چاہتے تھے۔

مگر شاہ صاحب نے انہیں اجازت نہیں دی۔

مولانا کو شاہ صاحب کا فراق نہایت شاق وگراں گذر رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے دس سال بعد ۲۶ جمادی الاولی ۱۰۱۵ھ میں مدینہ منورہ میں سید شاہ صاحب وفات پاگئے۔ شاہ صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد مولانا درس وتدریس تصنیف وتالیف، وعظ وتذکیر ورشد وہدایت میں ہمہ تن مشغول ہوگئے بیجاپور میں کوئی نہیں تھا جو بحث ومناظرہ میں آپ پر غلبہ حاصل کرتا۔ ابراہیم عادل شاہ کے یہاں آپ کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ اور وہ انہیں اکثر اپنا سفیر بناکر سلاطین وقت کی بارگاہ میں بھیجا کرتا تھا اور ان کی سفارت اکثر کامیاب رہتی تھی۔ سید شاہ صاحب کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد مولانا نے سلوک کے مقامات میں بہت ترقی کی اور اسی میں زیادہ تر مشغول رہنے لگے۔ ان مسلسل مجاہدوں اور ریاضتوں کا نتیجہ تھا کہ آپ کا باطن نکھر کر خوب منقح اور مصفا ہوگیا اور قلب وذہن کی لطیف قوت ابھر آئی اور آپ کو خواب وبیداری میں عجیب وغریب مشاہدات ومکاشفات ہونے لگے اس طرح جہاں آپ علوم ظاہری میں کامل وفائق تھے وہاں علوم ومعارف باطنی میں بھی اعلیٰ مقامات پر فائز تھے۔ شاہان وقت انہیں نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور خواص وعوام ان کی علمی تربیت اور باطنی کرامت کی بناپر ان کے گہرے معتقد اور گرویدہ تھے۔ ان کی زندگی کے تفصیلی حالات لکھنے کے لیے مستقل ایک کتاب کی ضرورت ہے یہاں ہم نے اجمالی طور پر صرف بعض اہم حالات پر اکتفا کیا ہے۔

آپ کے تفصیلی حالات راحت القلوب۔ مناقب شاہ حبیب اللہ اور خانوادۂ قاضی بدر الدولہ وغیرہ کتابوں میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔

مولانا اپنے پیر ومرشد کا باطنی اشارہ پاکر سفر حج کی تیاری میں لگے ہوئے تھے لیکن ادھر ان کے ایک دوسرے سفر کے لیے اسباب فراہم ہورہے تھے۔ ہوا یہ کہ شہنشاہ دہلی شاہجہاں کے حکم سے اس کا سپہ سالار نواب آصف خاں بیجاپور پر حملہ آور ہوا۔ اور پورے شہر کا محاصرہ کرلیا اس کی وجہ سے اہل شہر نہایت پریشانی اور خوف وہراس میں مبتلا ہوگیا۔ انہیں دنوں مولانا حبیب اللہ کی صحت ناساز ہوگئی اور یہ ناسازی روز بروز شدت اختیار کرنے لگی چنانچہ فوائد بدریہ کے مصنف لکھتے ہیں۔

"ایک دن ان کی بیوی اور لڑکے شاہ محمد حجۃ اللہ نے مغل فوج کی طرف سے شہر کی بربادی کا خطرہ ظاہر کیا تو مولانا نے کہا، کچھ خوف مت کرو۔ مغل فوج کی طرف سے کسی طرح کا صدمہ نہیں پہنچے گا۔ چند دن بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مولانا کے خلیفہ اور مرید عبدالفتاح کا بیان ہے کہ ایک دن مولانا نے کہا کہ بیجاپور سے مغل فوج کی بلا کو دفع کرنے کے لیے ہم نے اپنی جان نذر کردی ہے اسی دن یعنی ۹ رشعبان ۱۰۴۱ھ کو آخر شب میں وفات پائی اور دوسرے دن یعنی دوشنبہ کو دن

مدفون ہوئے جین وفات ان کی عمر تریسٹھ برس کی تھی۔ مولانا کی وصیت کے مطابق ان کو ان کی والدہ بی بی نجیمہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ ان کی وفات کے تیسرے دن یعنی ۱۲ شعبان کو آصف خاں نے بھی محاصرہ اٹھالیا۔" لہ

ان کے مرید شیخ حسن شوقی نے "قطب آخرالزماں" سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

ان کے متعلق مولانا باقر آگاہ لکھتے ہیں۔

کان جامعًا لعلوم الشریعة والطریقة حقیقتًا لرموز المعرفة والحقیقة لهٗ واقعات جمیلة وکرامات اثیلیة ورسائل محررة ومکاتیب متکررة وقصاید وحدیة وغزلیات لجذبیة ونکات وجدیة وکلمات شهودیة بعضها بالعربیة وبعضها بالفارسیة

علوم شریعت وطریقت کے ایک جامع عالم اور حقیقت ومعرفت کے رموز واسرار کے محقق تھے ان میں سے بعض خوشگوار واقعات ظہور میں آئے اور بعض واقعی کرامتیں صادر ہوئی تھیں۔ ان کی تحریر کردہ بہت سے رسائل ومکاتیب ہیں جو اپنے رنگ اور خوبیوں کی بنا پر منفرد ہیں ان میں ان کے قصائد اور غزلیات ہیں اور وجدی مسائل ہیں ان کے نکتے اور شہود کے متعلق ان کی مفید باتیں تحریر ہیں جن میں بعض تو عربی میں ہیں اور بعض فارسی میں۔

وہ اکثر اپنے قلبی واردات ومکاشفات اور اپنے باطنی احوال کو کسی طرح ظاہر میں لانا نہیں چاہتے تھے اور انہیں ہر چند پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی کسی طرح کی تشہیر نہ ہو۔ چنانچہ ان کے ایک مرید عبدالقادر لکھتے ہیں۔

(فارسی) عادات شریفہ وشمہ کریمہ حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ چناں بود کہ در اخفائے احوال باکمال احتیاط بکار می آید واردۂ عالیہ نہ بود کہ اشتہار گیرد وبار انتشار بر بیرد۔

حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ کی شریف اور بزرگانہ عادت یہ تھی کہ اپنے احوال کو پوشیدہ رکھنے میں کمال احتیاط سے کام لیتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی خبریں پھیل جائیں اور وہ شہرت پائیں۔

لہ خانوادۂ بدرالدولہ صفحہ ۷۰

مولانا محمد حسین بیدری نائطی

یہ بھی اسی خاندان مخدومی کے ایک جلیل القدر عالم و فاضل اور بڑے اونچے درجہ کے بزرگ گذرے ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے :۔

مولانا محمد حسین ابن مولانا خلیل اللہ ابن قاضی احمد ابن فقیہہ ابو محمد ابن مخدوم فقیہہ اسماعیل سکری۔

گلستان نسب اور تاریخ احمدی وغیرہ کتابوں میں آپ کے مناقب اور خصائل کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے اس کے علاوہ روضۂ قدسیان کے نام سے مولانا غلام محی الدین شائق نے آپ کی زندگی کے حالات پر ایک مستقل اور مفصل کتاب تالیف کی ہے جس میں الکفیل نے آپ کے نسبی تعلق کو سید اسماعیل بن سید جعفر صادق رضؓ تک پہونچایا ہے۔

اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"فقیہہ مخدوم اسماعیل سکری آپ کے جد اعلیٰ تھے جو ابتداءً عرب سے سواحل کوکن پر تشریف لائے تھے" ۱؎

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ روضۃ الاولیاء میں بھی بعض تذکرہ ملا زبیر ثانی آپ کا کچھ مختصر حال ملتا ہے۔

تاریخ النوائط کا مولف لکھتا ہے :۔

"آپ مادر زاد اولیائے کرام میں سے تھے شہر بیجاپور میں متولد ہوئے اور پھر کلبرگہ تشریف لائے اور آخر بر شہنشاہ عالمگیر کی درخواست پر ۱۰۹۸ھ ہجری میں محمد آباد بیدر آئے اور کم عمر میں آپ کو ملا محمد زبیر بیجاپوری سے تلمذ تھا ۱۴ سال کے سن میں جب کہ مصباح کا درس جاری تھا تو آپ کی توجہ ظاہری اپنے درس کی نسبت کم معلوم ہونے لگی آپ کے والد ماجد نے ملا صاحب سے اپنے شاگرد پر توجہ مزید فرمانے کی استدعا کی۔ ملا صاحب نے امتثالاً للامر بر سبیل امتحان اپنے شاگرد رشید سے چند سوالات کیے جب ان کے جوابات استعداد سے زیادہ پائے تو ملا صاحب کو سخت تعجب ہوا اور سوالات کا سلسلہ ترقی مطالب کے ساتھ جاری رہا جب جوابات درست ملنے لگے تو استاد کے استعجاب کو اور ترقی ہوئی۔ حاضرین خانقاہ میں کھلبلی مچی رفتہ رفتہ یہ خبر سارے شہر میں پھیلی علماء اور امرائے ذی علم کا مجمع بڑھنے لگا۔ ایک

۱؎ ملقب شاہ حبیب اللہ مولفہ عبدالقادر حبیب اللہی۔

خاصے مناظرہ تقابلہ کی شکل پیدا ہوئی تمام حاضرین مجلس جن کو شاگرد کی عمر اور مصباح
خوانی کی اطلاع تھی اس واقعہ سے متحیر تھے۔ جب ملا محمد زبیر نے اپنے شاگرد رشید کی یہ حالت
دیکھی اور تمام علوم میں کامل الاستعداد پایا تو وہ از خود رفتہ بن گئے۔ اور مسائل سلوک سے
بحث چھیڑ دی وہاں کسی بات کی کمی نہ تھی پھر کیا تھا ہر ایک سوال کا جواب اس خوبصورتی سے دیا
کہ استاد کو آپ کی تبحر دانی پر کامل یقین ہو گیا۔ شام تک جب مجلس کی یہ صورت رہی تو ملا محمد زبیر
نے بے ساختہ اپنی مسند چھوڑ کر شاگرد کے قدم لیے اور شاگرد کے ہاتھ پر بیعت کی اور فرمایا
جس کا علم لدنی ہو اس کے ساتھ کیا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس راز سربستہ کے افشا نے آپ کو
بیجاپور سے برداشتہ خاطر کر دیا۔ دوسرے ہی دن آپ نے گلبرگہ کا ارادہ کیا جہاں نہایت ہی
خاموشی کے ساتھ گوشہ عزلت میں بسر فرماتے رہے۔ لہ

شہنشاہ عالمگیر جب گلبرگہ پہنچے سب سے پہلے آپ کی تلاش کا حکم صادر فرمایا۔ تلاش
کے دوران آپ کا پتہ لگ گیا۔ جب شہنشاہ کی تشریف آوری کی اطلاع آپ کو مل گئی تو آپ
سخت پریشان ہو گئے اور اسی حال میں نکل پڑے راستہ میں عالمگیر سے ملاقات کی اور کہا کہ
میری رہائش گاہ آپ کے قابل نہیں۔ شہنشاہ عالمگیر اپنے ساتھ آپ کو لے گیا اور کہا محمد آباد
بیدر کا مقام آپ قبول فرمائیں جہاں شاہی مدرسہ خالی پڑا ہے اس کے اصرار سے مجبور ہو کر
آپ گلبرگہ سے بیدر چلے گئے۔ عالمگیر نے شاہی فرمان کے ذریعہ حاکم بیدر کو اطلاع دی
اور مدرسہ و خانقاہ کے مصارف کے لیے جاگیریں عطا کیں اور آپ کو امام المدرسین کے
خطاب سے نوازا۔

بیدر کا شاہی مدرسہ آپ کے انتظام اور خدمت میں آنے کے بعد اس کی تعریف
دور دور تک پھیل گئی اور ہر طرف سے تشنہ کامان علوم آتے اور اس علمی سرچشمہ سے سیراب
ہوتے رہے۔ طلبہ کی رہائش اور خوراک کا انتظام مدرسہ کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ سنہ ۱۱۰۹ھ
تک اس مدرسہ کا نہایت روشن اور کامیاب دور تھا۔

رمضان شریف کا مہینہ تھا جمعہ کی نماز کے بعد اکثر آپ وعظ بیان فرماتے تھے اس
جمعہ میں آپ کا بیان خلاف معمول عصر تک جاری رہا آپ نے دوران وعظ فرمایا کہ یہ ان
کا آخری وعظ ہے۔ اس کو سن کر اہل مجلس چلا اٹھے اور ایک کہرام مچ گیا اور یہ خبر پورے
شہر میں پھیل گئی اور گھر گھر اس کا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ رمضان کی ۱۱ تاریخ آ گئی
آپ اپنے گھر والوں سے وداعی رخصت حاصل کی پھر مدرسہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر
تراویح پڑھنے والوں کو خبردار کیا کہ وہ سب مدرسہ سے نکل جائیں اور اپنے آپ کو انے

والی آسمانی مصیبت سے بچا لیں۔ آپ کے چند خاص معتقدین آپ کے ساتھ نماز میں شریک رہے۔ پہلی رکعت کے آخر میں اچانک بجلی گری۔ مدرسہ سے متصل واقع شاہی مخزن اڑ گیا جس کے صدمہ سے مدرسہ کی عمارت کے ایک حصہ کو کافی نقصان پہنچا اور ادھر مسجد میں اس حادثہ برقی نے آپ اور آپ کے ساتھ شریک نمازیوں کو نذرِ اجل کر دیا۔ اور وہ درجہ شہادت سے ہمکنار ہو گئے آپ کی لاش مبارک دوسرے دن صبح کو نکالی گئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بحالت تشہد جاں بحق ہو گئے۔

روضۃ الاولیائے بیجاپور نے شہنشاہ عالمگیر کا آپ کے متعلق ایک مقولہ نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ مرد دکن تحفہ کہ بدست آمد ہمیں ایک ذات امام المدرسین مولانا محمد حسین آزاد و بس۔"

مولانا باقر آگاہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

" وقد انشا من هذا القوم نحاریر العلماء ومشاهیر العرفاء و سادات بن کوهم الرکبان وتقرطت بضوایین اوصافهم الآذان ومنهم مؤسس بنیان التعلیم والتدریس ومدرس من تبیان التقلین والتقدیس مولانا الشهید محمد حسین المعروف بامام صاحب مدرس کان جامعا للمنقول والمعقول وحاویا للفروع والاصول متحلیا بالفتح السنی ومتخلیا بالسر اللدنی قد حوی من الاستقامة اقصاها ومن الکرامة اجلاها ومن المعارف اسناها ومن المکاشف اسماها " لہ

بلاشبہ اس قوم میں علماء بار یک بیں، متقین اور زاہد نیا و مشاہیر پیدا ہوئے ہیں جن کا ذکر خیر سارے عالم پر آشکار ہے اور جن کے اوصاف کے یکتا موتیوں سے کان بہرہ ور ہیں انہیں میں سے ایک تعلیم و تدریس کی بنیاد اٹھانے والے اور تقلین و تقدیس کا درس دینے والے مولانا محمد حسین شہید جو امام المدرسین لقب سے مشہور تھے آپ منقول و معقول کے جامع اور فروع اصول پر حاوی اور فتوح برگزیدہ سے آراستہ اور علم لدنی کے فیضان سے متمتع تھے۔ استقامت کے انتہائی بلند مقام پر پہنچے ہوئے روشن کرامات اور بلند تر مکاشفات سے متصف تھے "

آپ کی تصانیف کا بہت سارا ذخیرہ آپ کے صاحبزادگان کی کم سنی کی وجہ سے ضائع ہو گیا روضۃ قدسیان کے مولف نے ان چند کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کی نظر سے گذری تھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

لہ نفحۃ عنبریہ فی مدحۃ خیر البریہ مولفہ حضرت مولانا محمد باقر آگاہ ؟

توحید وجودی، عقاید حسینی۔ انتخاب فن ریاضی، خلاصہ مواقف ومقاصد۔ شرح عقاید ملا سعد الدین تفتازانی، و ملا جلال دوانی مع حاشیہ، تجبیب الطیب و انصار الی حضرت سید الانبیاء رسم الخط عربی خلاصہ کافیہ الموسوم بہ کافی وغیرہ۔

شاہ محمد حسن علی نایطی (مشہور ڈولچی شاہ)

آپ کے والد کا اسم گرامی حافظ حبیب اللہ ابن حافظ محمد درویش ہے آپ کا سلسلہ نسب خلیل عرب کے توسط سے سید اسماعیل، سید جعفر صادقؓ تک پہونچتا ہے۔ ڈولچی شاہ سے شہرت ہو جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔

"آپ مدۃ العمر اپنے وضو کا پانی دست مبارک سے بھرنے کے پابند تھے اور کسی غیر سے مدد نہ لیتے تھے۔ اسی غرض سے ہمیشہ ایک چرمی ڈولچی اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے اسی ڈولچی کی وجہ سے عامہ خلائق نے آپ کو ڈولچی شاہ سے مشہور کیا تھا۔ لہ

آپ کے متعلق ایک واقعہ کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جس کو ہم تاریخ خورشید جاہی سے نقل کرتے ہیں۔

"آپ قصبہ الہور سے تشریف لانے لگے تو اثنائے سفر میں نماز کے لیے ایک نالہ پر ٹھہرے جہاں دفعتاً ایک صحرائی شیر سے مقابلہ ہوا۔ جب وہ آپ سے قریب ہوا تو آپ نے پانی بھری ڈولچی کو شیر پر دے مارا اور فرمایا کہ تیرا خوف وہی لوگ کرتے ہیں جو تیرے کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ خداوند کریم کی شان ہے کہ آپ کو اس کے درندے سے کوئی صدمہ نہیں پہونچا وہ واپس لوٹ گیا۔ ٹہ

تاریخ النوائط کے مولف لکھتے ہیں

"آپ کے جد اعلیٰ حاجی محمد مخدوم رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے بزرگ تھے آپ کی ذات بابرکات سے علی عادل شاہ کو خاص عقیدت تھی متعدد مواقع پر بادشاہ وقت نے آپ کے مراتب جلیلہ کی آزمائش فرمائی تھی۔ آگے لکھتے ہیں۔

شاہ محمد حسن کا زمانہ حضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر والی ریاست حیدر آباد کے عہد حکومت میں واقع تھا ______ بادشاہ وقت، شاہ صاحب ممدوح

لہ تاریخ خورشید جاہی بحوالہ تاریخ النوائط صفحہ ۴۴۲

ٹہ خورشید جاہی

کے نہایت معتقد تھے اور ہمیشہ اپنی عقیدت کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

حضرت مغفرت مکان نواب افضل الدولہ بہادر آصف جاہ خامس نے بھی آپ سے فیض پایا ہے آپ کے خرق عادات اور کشف وکرامات کے چشم دید واقعات ائی بوشاید العبض سال خوردہ افراد کی زبان پر واقعہ ہیں۔ ؎

مال و دولت دنیا کی آپ کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ تمول کے سب سامان فراہم تھے اس کے باوجود آپ فقیرانہ طریقہ پر زندگی بسر کی۔ ۱۲۸۶ھ میں حیدرآباد میں رحلت فرمائی۔ نام پلی میں آپ کا مزار ہے۔

مخدوم نائطی قدس سرہٗ

آپ کے والد کا نام شیخ احمد تھا۔ آپ ارکاٹ میں ایک صاحب دل بزرگ گذرے ہیں آپ کی زندگی عزلت اور تنہائی میں گذرتی تھی۔ نواب والا جاہ کے عہد حکومت میں اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ قحط سالی میں میر اسد اللہ خاں بہادر نائب صوبہ دار ارکاٹ نے باران رحمت کی التجا آپ سے کی ہے۔ جب آپ مجبور ہو کر اپنے مصلے سے اٹھتے تھے تو بارش بکثرت برسنی تھی۔ آپ اپنی زندگی ہی میں عالی سریع التاثیر سے مشہور تھے۔ علوم ظاہری کے سوا علوم باطنی بھی رکھتے تھے۔ سید علی محمد خلف الرشید حضرت شاہ عبدالرحمن بیجاپوری صبغۃ اللہی قدس سرہ سے آپ کو بیعت حاصل تھی ۲۶ ر شوال ۱۱۸۰ھ آپ نے رحلت فرمائی۔

تاریخ پورہ واقع ارکاٹ میں آپ کا مزار ہے۔ گلستان نسب میں آپ کا مختصر احوال لکھا گیا ہے۔

حقائق دستگاہ مولانا محمد باقر آگاہ

آپ کا تعلق نوائط سے ہے آپ کے والد کا اسم گرامی مرتضیٰ خاں تھا۔ آپ شافعی تھے آپ کے بزرگوں کا وطن تعلق بیجاپور سے تھا لیکن آپ ۱۱۵۸ھ ویلور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم کا آغاز مولانا سید ابوالحسن قریشی قدس سرہٗ سے کیا۔ اس کے بعد آپ ترچنا پلی میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے فیضان عام سے مستفیض ہوئے فراغت تعلیم

؎ تاریخ النوائط صفحہ ۴۴۲

کے بعد آپ اپنا تمام وقت مطالعہ کتب پر صرف کیا۔ انیس سال کی عمر میں حضرت ممدوح کے اشارہ پر دوبارہ بڑ چناپلی کا سفر کیا اور بیعت اور علوم اسرار باطنی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ کے ذاتی فضائل و کمالات کی شہرت عام ہو گئی۔ والی مدراس نے خاص طور سے آپ سے ملاقات کی اور اپنے صاحبزادے کی اتالیقی کے لیے آپ کا انتخاب کیا۔ جاگیری معاش سے سرفرازی بخشی۔ دربار والاجاہی سے علمائے حجاز کی خدمت میں جو مراسلت عربی زبان میں ہوا کرتی تھی اس کی کتابت و اہتمام آپ سے متعلق تھا۔ فصحائے عرب نے والی مدراس کو مطلع کیا کہ کاتب مراسلات کے علم و ادب سے وہ بہت محظوظ ہیں۔ اور اپنا تعجب ظاہر کرتے ہیں کہ علمائے ہند میں ایسا پایہ کے ادیب ہیں۔

آپ کا علم خداداد تھا۔ آپ کی روشن ضمیری اور دقیق النظری کا ثبوت مختلف مقامات اور مواقع پر ظاہر ہوتا تھا۔ امیر الہند نواب محمد غوث مصنف "تذکرہ گلزار اعظم" نے آپ کی بزرگی اور فضائل کا احوال نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے۔

مولانا رحمان علی ممبر کونسل ایوان نے بھی اپنی تالیف "تذکرہ علمائے ہند" میں آپ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"مولوی محمد باقر مدراسی علوم عجیبہ اور فنون غریبہ کے ماہر تھے، علم و ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، فیوض ظاہر و باطن سے آگاہ اور آگاہ تخلص فرماتے تھے" "نتائج الافکار" کے مصنف نے لکھا ہے:"

"ذات ہمایونش بحلیہ فضائل و کمالات آراستہ بود و وجود با وجودش بنقوش عجیبہ و غریبہ پیراستہ سرفتر ارباب فضل و کمال، سر حلقۂ بلند طبعان فرشتہ خصال، صاحب تصانیف متکاثرہ و کمالات باہرہ مرد میدان سخنوری و شمع ایوان نظم گستری العق در خیابان کرناٹک ہیچ سرو سے سر بر نہ کشیدہ واز گل زمین مدراس شل او گلے رنگ افروز نہ گردیدہ بطبع نقاد داد سخن پردازی دادہ ابواب فیوض نامتناہی بر روئے طالبان این فن کشادہ"

مصنف "گلدستۂ کرناٹک" لکھتے ہیں۔

"کہ شرح بود و باش حضرت علامی در میں جناب والتزام طریقہ انیقہ صحبت و آداب طول دارد کہ دریں مختصر نہ گنجد بہ عین کیمیا اثر مرشد کامل بکمال مطلوب فایز گردیدہ و رسید بانچہ رسید در نعت و مناقب قصاید بسیار، تخمیناً یکصد غزلیات و مثنویات مختصر بعد گفتہ بود۔ و بود وفات حضرت مرشد قدس سرہٗ

ہمہ راشتاہی آپ بخود وبعداوّل فکر سخن یک قلم ترک فرمودہ تا مدتے باختیار تخلص ہم سرے نہ داشت، ودر ابتدائے سنہ یک ہزار ویک صد و نود وشش بہ ایثار تخلص بنظم عربی وفارسی ہمت گماشت، تصانیف فایقہ براعت اثاثہ در السنہ ثلاثہ بسلک تدوین منسلک گردانید الحاصل امروز در دار الملک سخنوری خطبہ خلافت بنام شریفش میخوانند، وزیباست در اقلیم معانی بروی سکۂ زبان روانی باسم عالیش بیزنند و بجااست سہائے فکر رسائش توام ورنگینی باطبیعت شریفش منضم در اقسام سخن دستگاہ قدرنشاء بلند و در السنہ ثلاثہ فکر بالا دستش اعجاز کمند ساخت، جناب دا الیشں ازاں مبراست کہ کسے او در ابشعر و شاعری ستاید، بارگاہ رفیع المکانش ازاں منزہ کہ نادا قفی پایہ سخن سنجی او در اسرآید الخ [۱]

۲۴ رذی الحجہ ۱۲۲۰ھ میں آپ نے مدراس میں رحلت فرمائی۔ آپ کی تصانیف میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

تنویر البصیر والبصر فی الصلوٰۃ علی النبی بن کرالسیر۔ تقابیس النکات فی ارسالہ علیہ السلام الی جمیع المکونات۔ القول المبین فی ذراری المشرکین۔ الدر النفیس فی شرح قول محمد بن ادریس دیوان عربی مسمّٰی بالنفحۃ العنبریۃ فی مدحۃ خیر البریۃ۔ ثلاث عشرۃ کاملۃ ھندیۃ۔ درجۃ اب سبعۃ معلقہ، دغیرہ مقامۃ الشمامۃ الکافوریۃ فی وصف المعاھدۃ الابلوریہ مقامات الحنظفیہ العقابیہ للغاردۃ المسکینہ۔ مقامۃ ترشنا فلیہ۔ مقامۃ ارکانیہ شمایم الشمایل فی نظام الرسایل درمکاتیب عربیہ۔

حضرت نتھر اولیاء قدس سرہٗ

آپ کے بارے میں حضرت مولانا قاضی صبغۃ اللہ بن غوث مدراسی رحمہما اللہ اپنی بیاض جس پر ۱۲۳۶ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے لکھتے ہیں:۔

آپ کا سلسلۂ نسب:۔ حضرت سید احمد کبیر ابن سید اخینار ابن سید تقی ابن سید حسین ابن سید حسن

---

[۱] ان کی اصل تحریر فارسی میں کافی مفصل تھی جس کا ضروری اقتباس لیا گیا ہے۔
[۲] طبل عالم صفحہ ۱۲

ابن ابو القاسم ابن زین العابدین ابن امام حسین ابن علی کرم اللہ وجہہم

آپ کے والد ماجد سید احمد کبیر استنبول کے فرماں روا تھے ان کے دو فرزندوں میں ایک کا نام سید شمس الدین اور دوسرے کا جلال الدین تھا۔ ان کے والد شیخ احمد کبیر اس دنیائے فانی سے خلد بریں تشریف لے گئے جب کہ ان کے فرزند سید شمس کی عمر سات سال کی تھی۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد ان کی جگہ زینت آرائے تخت و تاج ہو گئے۔

بادشاہ ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے انھوں نے امور سلطنت و انتظام حکومت اپنے امراء کے سپرد فرما کر اپنے اوقات کا زیادہ تر حصہ ذکر و فکر اور عبادت حق تعالیٰ جل شانہٗ میں مشغول رہنے لگے۔

عدل و انصاف، سخاوت اور مہر و کرم میں ان کا دور شاہی بے نظیر تھا جس سے عامۂ خلائق اپنے مقاصد میں فیضیاب و مالامال ہوئے۔ لیکن وہ خود اپنے اوقات درس و تدریس وعظ و نصائح قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اوامر و نواہی سے آگاہ کرنے میں صرف فرماتے رہے۔

اس طرح اپنی بیس سال کی عمر میں وہ اپنے چھوٹے بھائی جلال الدین کو اپنا جانشین بنا کر خود امور سلطنت سے دست بردار ہو گئے پھر وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے بھائی کے سپرد فرما کر افکار دنیا سے یکسو ہو گئے۔ [1]

مرشد کی تلاش میں سفر

سعادت مند فرزند کو سفر کے لیے اپنی والدہ کی اجازت ہی ایک رکاوٹ تھی چنانچہ اسی مقصد کو لے کر ایک روز اپنی والدہ محترمہ سیدہ فخر النساء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ درخواست کی کہ میری دلی خواہش ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی جلال الدین کی شادی سے فراغت حاصل کر دوں اور تاج شاہی ان کے سر پر رکھ کر انہیں میری جگہ تخت نشین کر دوں اور میں اللہ کی راہ میں کسی مرشد کامل کی تلاش میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں چنانچہ طبل عالم کا مصنف سید عبدالغفور ذاکر لکھتے ہیں۔

"اس کو سن کر مادر مہربان نے سر جھکا لیا پھر تھوڑی دیر بعد بخوشی اجازت دے دی۔

---

[1] طبل عالم صفحہ ۱۳

اور کہا اے نورِ چشم خوش رہے جاؤ۔ اکیس سال کی عمر میں تم کو یہ تخت تمہارے والد بزرگوار نے عطا
کیا تھا اور تم اکیس سال کی عمر میں یہ تخت و تاج اپنے بھائی کے حوالے کر رہے ہو۔ جملہ تین برس بھی
پورے نہیں ہوئے تھے راہِ مولیٰ میں چلے جانا چاہتے ہو۔ خیر میرے دل کے چراغ میں اپنے دل سے
کہتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ خداوند تعالیٰ اپنے حبیب کے طفیل سے آپ کا دلی مقصد جلد
حاصل ہو جائے۔ آمین ثم آمین۔ [1]

جب روانگی کا وقت آیا تو آپ نے حاضرین کو جن میں اراکینِ سلطنت و عمائدین
بھی تھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "جیسا کہ میرے ساتھ گذارتے تھے اسی طرح میرے برادرِ عزیز
کے ساتھ گذاریں۔ اب تم کو خدا اور رسول کے حوالہ کرتا ہوں۔ تم سب سے میری درخواست
ہے کہ خوشی سے مجھے اجازت دو۔ اب میں یا والٰہی میں نکلنا چاہتا ہوں تاکہ کسی کامل شیخ سے
جا ملوں۔ یہ کہہ کر دوبارہ اپنی والدہ کے پاس تشریف لائے۔ اور والدہ ماجدہ کی دعائیں
لے کر روانہ ہوئے۔ چار وزراء اور شہر کے امراء و عمائدین کی ایک بہت بڑی جماعت ہمرکاب
تھی۔ [2]

آپ کے تذکرہ میں لکھا گیا ہے کہ نو سو رفقائے سفر آپ کے ساتھ تھے۔ والدہ ماجدہ
اور اپنے بھائی کے اصرار کے باوجود آپ نے خزانہ شاہی سے کسی چیز کو قبول نہیں کیا۔ سفر کی
صعوبتوں اور راستے کی مشقتوں کو جھیلتے ہوئے آخر شہر ہرات پہنچے جہاں سید ابراہیم گرم شیلی
کی قیام گاہ تھی جو اس زمانے کے بہت مشہور بزرگ اور بڑے پایہ کے قطب سمجھے جاتے تھے۔
اگر کوئی ان کا خادم بنتا اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونا چاہتا تو اس کو بعض نہایت
ہی سخت اور کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا اور جب وہ اس امتحان کو جو بہت مشکل بلکہ ناممکن
نظر آتا تھا سر کر لیتا تب کہیں وہ ان کے حلقہ میں داخل ہونے کا مستحق قرار دیا جاتا۔ غرض یہ کہ
صبح جب حضرت شہر خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سید ابراہیم گرم شیلی کی
خانقاہ ہے۔

حضرت نے اندر جانے کی اجازت طلب کی جو انہیں فوراً مل گئی اور یہ اپنے نو سو ہمراہیوں
کے ساتھ حضرت سید ابراہیم کی خدمت بامعادت میں پہنچ گئے۔ ملاقات میں آپ نے اپنا مقصد سفر
اس طرح ظاہر کیا کہ میں اپنا پیارا وطن عزیز و اقارب اور تخت شاہی کو اس لیے چھوڑ آیا
ہوں کہ دین کی نعمتیں حاصل ہوں اور کوئی رہبر ایسا مل جائے جو مجھ اور میری زندگی کو اللہ تعالیٰ

---

[1] قبلۂ عالم صفحہ ۱۳ [2] قبلۂ عالم صفحہ ۱۳

اور اس کے رسول پاک کی راہ پر لگائیے اور اسی مقصد کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ حضرت سید ابراہیم اس کو سن کر خوش ہوئے اور انہیں اپنے سینے سے لگایا۔ ساتھ ہی فرمایا خادم بنانے کے میرے کچھ شرائط و قیود ہیں جس پر میں سختی سے عرصہ دراز سے پابند رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ گذشتہ گیارہ سال سے کوئی ایک بھی میرا خادم برادر نہ ہو سکا۔ وہی آپ کے لیے بھی ہیں اس کے بغیر میرے لیے معذوری ہے اگر آپ کا مصمم ارادہ ہو تو اختیار کیجئے ورنہ دوسری جگہ تلاش کرو۔ حضرت نظر نے کچھ دیر بعد جواب دیا کہ آپ کی سب شرطیں سا تجھے منظور رہیں۔ ان میں ایک کڑی شرط گرم کھولتے ہوئے پانی میں غسل کرنے کی بھی تھی۔ چنانچہ سید نظر ان تمام آزمائشوں کو کامیابی کے ساتھ عبور کر گیا پھر آپ انہیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا اور اپنی طرف سے انہیں خلافت بھی عطا فرمادی۔ پھر ایک سال اپنی خدمت میں رکھ کر انہیں ضروری تربیت دیتے اور ان پر علوم و معارف کے اسرار کھول دینے کے بعد انہیں مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ پھر آپ منزل بہ منزل صعوبات سفر اٹھاتے ہوئے اپنے نو سو ہمراہیوں کے ساتھ مدینہ طیبہ پہونچے اور ایک سال تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روضۂ اطہر کے روضۂ مبارکہ کی جاروب کشی کی خدمت بجالاتے رہے۔

مدینے کے قریب ایک بزرگ تھے ان کا اسم گرامی سید عبد الرحمان تھا جو اپنے والد کی طرف سے حسینی اور والدہ ماجدہ کی طرف سے صدیقی تھے وہ بہت عرصے سے کسی مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ انہیں خواب میں یہ بشارت ہوئی کہ روضۂ اطہر میں اللہ کا ایک پاک و نیک بندہ ہے جلد وہاں پہونچ کر ان سے فیض حاصل کرو۔ سید عبد الرحمن خواب سے بیدار ہوئے اور مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے اور حضرت سید نظر کی بارگاہ میں باریاب ہوئے۔ اور اپنے خواب کا حال سنایا اس کے چند ہی روز بعد حضرت نے انہیں اپنے حلقہ میں شامل کر لیا اور وہ ان کے مرید ہو گئے۔

مدینے سے جانب ہند روانگی

یکشنبہ صبح صادق اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مدینہ منورہ سے بعزم ہندستان روانہ ہو گئے کئی منزلیں طے کرتے ہوئے آپ عدن پہونچے اور وہاں چند دن گذارے۔ اس اثنا میں ان کے بھائی سید جلال الدین وہاں تشریف لائے۔ اور کہا ہمارے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی ہے آپ کی واپسی کے انتظار میں ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا گیا۔ آپ میرے ہمراہ گھر چلئے بچی کا نام رکھئے والدہ ماجدہ کی شرف قدمبوسی حاصل کیجئے اور اپنے تخت و تاج کو پھر سے سنبھالئے۔ حضرت نے ان کے جواب میں فرمایا کہ شاہی منصب مبارک ہو۔ بچی کا نام سلطان النساء رکھو۔ اب ہمارا اس طرف آنا اللہ کی مرضی اور اس کے اختیار میں ہے جو خدمت ہمارے سپرد کی گئی ہے اسے ہیں۔ بہرحال انجام دینا ہے بھائی ناامید

ہوکر اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے۔

اس کے بعد حضرت نطہر ایک کشتی کے ذریعہ ہندستان کے ساحل پر واقع ایک پہاڑی پر پہونچ کر وہیں کچھ دنوں تک ٹھہر گئے اس کے بعد کا حال داستان طبل عالم کے مصنف سے سنیے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"اس کنارے دریا کے قریب ایک چھوٹا شہر تھا جس کا نام بھنگل ہے آج بھی اس زمانہ سے ابھی تک سمندر کے بیچ اس پہاڑ کا نام نطہر ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔ [۱]

وہ جہاز جب آگے روانہ ہوا تو سخت طوفان میں گھر گیا اور جہاز کے ڈوب جانے کا خطرہ عظیم پیدا ہو گیا تو ان جہاز رانوں نے اللہ تعالیٰ سے امن و سلامتی کے لیے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ جہاز سلامتی سے کنارہ پر پہونچ گیا۔

آگے طبل عالم کا مصنف لکھتا ہے "مالک جہاز شہر بھنگل پہونچا" اس شہر کے راجہ سے پہلے ملا۔ اور راجہ سے اپنے جہاز کے ماجرا کو سنایا پھر راجہ سے دریافت کیا کہ آیا کوئی عربی فقیر لوگ اس طرف آئے ہیں راجہ نے کہا ہم نے سنا ہے کہ عربی مسافر ان چند دنوں سے ہمارے علاقہ کے کسی جنگل کے اندر اپنا قیام کیا ہے۔ تب مالک جہاز ان لوگوں سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو راجہ کو بھی بے حد شوق بابا سے ملنے کا پیدا ہوا اور کہا ان سے ہم کو بھی کچھ شرف حاصل ہو جائے یہ کہہ کر مالک جہاز اور عمائدین شہر اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور پھر سب کے سب مل کر طبل عالم بادشاہ کے پاس حاضر خدمت ہوئے جب آپ کے روبرو ہوئے اور دیکھا تو سب کے سب قدموں پر گر پڑے آپ کی دید میں سرشار رہنے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سب کے دل سے کفر مٹ گیا دل نور سے منور ہو گیا پھر تو سب مل کر آن واحد میں مذہب اسلام قبول کر لیا اور ایمان سے مشرف ہوئے آپ کی اجازت سے لے کر راجہ اپنی سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ [۲]

آخر میں لکھتے ہیں کہ "یہ قصہ اب تک بھنگل میں گھر گھر میں کتابوں میں مرقوم موجود ہے ان کو "کرامات نطہر ولی" کہتے ہیں۔ [۳]

سید نطہر ولی کا نام دراصل مظہر الدین تھا اور شہرت نطہر کے نام سے ہوئی۔ مورخین نے عام طور پر نطہر بتائے حقّی لکھا ہے لیکن حضرت مولانا قاضی صبغۃ اللہ نے اپنی بیاض محررہ ۱۲۳۶ھ میں "نتھر" بتائے فرشتہ لکھتے ہیں جیسا کہ سطور بالا میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

---

[۱] داستان طبل عالم صفحہ ۲۱۔ [۲] داستان طبل عالم صفحہ ۲۲ [۳] ایضاً۔ صفحہ ۲۲

نوٹ :- یہ درست ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے تک حضرت نطہر کا تذکرہ جو منظوم صورت میں تھا بعض گھروں میں خاص طور سے عورتیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی تھیں لیکن اب یہ سلسلہ قائم نہیں ہے۔

میسور کی طرف کوچ آپ کشگل سے قریب ایک جنگل میں کچھ دن گذارنے کے بعد میسور کی جانب روانہ ہو گئے اور میسور سے متصل ایک پہاڑی پر قیام فرمایا۔ دراصل وہ راکشسوں اور رکشسوں کا مسکن تھا اور وہاں ان کے ایک بڑے سردار کی عالیشان رہائش گاہ بھی تھی۔ اس جگہ آپ نے اپنا اڈا جمایا راکشسوں نے دیکھا کہ ان کی جگہ پر دیسیوں کی ایک بہت بڑی جماعت اپنا ڈیرا جما بیٹھی ہے۔ ان راکشسوں نے اس صورت حال سے اپنے سردار کو آگاہ کیا وہ اس کو سنتے ہی غضب ناک ہو گیا اور فوراً موقع پر پہنچ کر دیکھا کیا ہے کہ وہ پہاڑی جس پر ابتک بلا شرکت غیرے قیام تھا اس کے قبضہ و اختیار میں تھی اب اس پر کچھ اجنبی قسم کے لوگ اپنے تصرف میں لیے بہ اطمینان بیٹھے ہیں۔ راکشسوں کے سردار نے جب ان نو واردان قافلے کے سالار اعلیٰ کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے اور ان سے نپٹنا کوئی آسان بات نہیں ہے چنانچہ اس نے حضرت نطہر سے شائستہ لہجہ میں پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں اور آپ کہاں جانا چاہتے ہیں آپ نے جواب دیا کہ ہم عرب سے آئے ہیں اور ہندستان کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں اور یہاں سے ہمارا ارادہ سیلون جانے اور قدم آدم کی زیارت کا ہے۔

اس کو سن کر راکشسوں کے سردار نے کہا آپ اس طرف کا رخ ہرگز نہ کریں کیونکہ راکشسی قوم ٹڈی دل کی طرح اطراف میں پھیلی ہوئی ہے اور بڑی زبردست طاقت کی مالک ہے وہ انسانوں کے دشمن اور ان کے خون کی پیاسی ہے۔ انسانی خون ہی ان کی مرغوب غذا ہے راکشسوں کا سردار ترسرا یعنی تین سر والا وہاں رہتا ہے اس نے ایک بہت بڑا مندر یعنی شوالہ تعمیر کر رکھا ہے وہ دیا سردار ان کا بھتیجا ہے اس بستی کا نام ترسرپلم ہے وہ آپ کو تکلیف پہنچانے میں کسی قسم کا دریغ نہیں کریں گے اور یہ ہماری راکشسوں کی جگہ ہے آپ کا یہاں قیام بھی مناسب نہیں ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ کسی اور جگہ اپنی اقامت کے لیے تجویز کریں۔ حضرت نطہر نے فرمایا کہ "مجھے اس بات کا علم نہ تھا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ساری زمین اور کل کائنات خدا کی ہے اور ہم اس کے بندے ہیں۔ رہی یہ بات کہ راکشسی قوم کثرت سے اس طرف پھیلی ہوئی ہے سو ان کی کثرت ہم کو مرعوب نہیں کر سکتی نہ ان کی دشمنی ہمیں کسی قسم کا ضرر پہنچا سکتی ہے راکشسی قوم کی آئے دن انسانوں پر کیے جانے والے مظالم سے نجات دلانے کے لیے آئے ہیں اس مقصد کے لیے ہمارا قدم جو آگے بڑھا ہے وہ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ہی دم لیں گے۔ اس واضح جواب سے راکشسی سردار کو طیش آگیا اور جوش و غضب میں بے قابو ہو کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تم سب تیار ہو جاؤ کہ راکشسی طاقت کا ان مسافروں کو کچھ اندازہ ہو جائے ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑو اور ان کے سردار کو مقید بنا کر میرے پاس لے آؤ اس کے بعد مقابلہ شروع ہو گیا حضرت نطہر نے اپنے سب رفقاء کو اپنے ارد گرد جمع کر دیا اور

ان کے اطراف اسم اعظم پڑھ کر ایک حصار کھینچ دیا اور تاکید کی کہ کسی کا قدم اس حصار سے باہر نہ جانے پائے راکھشسوں نے اس حصار میں داخل ہونے کے لیے اپنی تمام تر طاقت اور زور لگایا لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے ناچار انھوں نے اپنا دوسرا حربہ آزمایا اور اپنی شکلوں کو مہیب اور خوفناک روپ دے کر نہایت سنگین اور ہوشربا مناظر سے ان اللہ کے بندوں کو خوفزدہ اور درماندہ بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا آخر حضرت نطہر نے ان کے مقابلہ کا حکم دیا اس حملہ کا نتیجہ یہ نکلا اللہ کی نصرت اس کے بندوں کے شامل حال ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر میں سب دشمنوں کا صفایا ہو گیا اور اللہ والوں کو کامل فتح نصیب ہو گئی۔

پھر اسما پہاڑ کلے سے آپ سیتو سمندر کی طرف روانہ ہوئے اور جامنا نگر شہر کے قریب ایک پہاڑ پر قیام فرمایا یہاں بھی راکھشوں اور راکشوں کی بھرکثرت سے موجود تھی اور ان کے ظلم و تشدد سے ساری نوع بشر تنگ و عاجز تھی راکشوں نے ان بندگان خدا پر حملہ کر دیا پھر ان جانبازان حق کے جوابی حملہ نے ان سب کا خاتمہ کر کے رکھ دیا وہاں سے ترپانور ہوتے ہوئے اور راکشوں و راکسوں کا صفایا کرتے ہوئے ترچناپلی پہونچ گئے اور دیولک کے بھول باغ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہو گئے۔ وہاں بھی راکسی ایک بڑی طاقت کے روپ میں ابھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان کی دست درازیوں اور ایذا رسانیوں سے سخت مصیبت اور عذاب میں مبتلا تھے۔ بھول باغ سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر سوئل نامی ایک راجہ حکمراں تھا گو اس میں اور راکسی سردار میں آپس میں حدود و غیرہ کے بارے میں کچھ عہد و پیمان تھا تاہم راجہ سوئل، راکسی سردار سے بہت خائف اور اس کے آگے دبا ہوا تھا کیونکہ راکسی سردار کی طاقت بہت بڑی تھی کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس دو لاکھ سے زیادہ فوج تھی کسی کا دیولی بھول باغ میں ٹھہرنا تو کجا اس کے راستہ کے قریب سے گذرنے کی مجال نہیں تھی۔ راجہ سوئل اور راکسی وہاں سے ان نوواردوں کو ہٹانے کے لیے اپنے تمام زور دار حربے اور حیلے کیے لیکن وہ اللہ کے بندے کوہ استقامت کی طرح اپنی جگہ جمے اور ڈٹے رہے۔

آخر راکسی اپنی پوری طاقت اور بے شمار فوج کے ساتھ جنگ پر اتر آئے لیکن ان پیروان حق کے روحانی قوت قاہرہ کے آہنی حصار سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے نہ انھیں کوئی ضرر و نقصان پہنچا سکے اور ان مردان حق کی کارروائی کے نتیجہ میں انسانوں کی دشمن راکسی فوج جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس طرح خاموش ہو گئے پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ ترچی اور اس کے نواح میں بسنے والے انسانوں کو راکسوں کی قتل و غارت گری اور سنگ دلانہ مردم آزاری سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی اس حیرت انگیز فتح و نصرت نے راجہ سوالہ کو بھی عقیدت و احترام کے ساتھ اپنا سر حضرت کی بارگاہ میں جھکانے پر مجبور کر دیا چنانچہ وہ جھک گیا اور حضرت کے چشم الطاف و عنایات سے فیضیاب ہو گیا۔ راجہ سوالہ نے حضرت نطہر سے کہا کہ آپ کے احسان کو ہم کبھی بھول نہیں سکتے ان

ظالموں سے آپ کے ہی ذریعہ سے ہم سب کو نجات مل گئی اور ہمارے راج کو امن و امان نصیب ہوا اب ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ یہیں سکونت اختیار فرمائیں تاکہ آئندہ پھر کبھی ظالم سر نہ اٹھا سکے حضرت نے فرمایا یہاں رہنے میں ہمیں کوئی عذر نہیں ہے لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ میرے اور میرے نو سو ساتھیوں کے لیے کوئی مناسب جگہ تجویز کریں۔ راجہ نے کہا یہ ملک، میں اور میری رعایا سب آپ کے ہیں۔ جو جگہ آپ تجویز فرمائیں گے اس کو ہم بخوشی قبول کرلیں گے۔ حضرت نے ترسرامندر کے قریب مع اپنے ہمراہیوں کے اقامت اختیار کی اور باقی عمر وہیں گذاری۔ جہاں اب آپ کا مزار زیارت گاہ عام ہے۔

راجہ شوالہ کی اولاد کے لیے دعا کی درخواست

ایک دن راجہ شوالہ، رانی صاحبہ، پنڈت تیماں اور اراکین سلطنت حضرت نطھر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اولاد کی تمنا میں میری زندگی کا کافی حصہ گذر گیا ابھی تک اولاد سے محروم ہوں میرے بعد میرے راج کا کوئی والی وارث نہیں ہے اسی فکر میں عرصہ سے مبتلا ہوں، اور اکثر دیگر پریشان رہتا ہوں۔ حضرت سے یہ التجا ہے کہ آپ میرے لیے اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ اولاد جیسی نعمت سے میرا دل شاد اور میرا گھر آباد کردے۔ حضرت دیر تک مراقبہ میں رہے اور دو پھول دیے ایک راجہ کو کھلایا اور دوسرا رانی کو اور اللہ تعالیٰ سے اولاد کے لیے دعا کی اور راجہ سے اس بات کا اقرار لیا کہ پہلا بچہ انہیں دیا جائے گا اس کے بعد راجہ اور رانی اپنے درباریوں کے ساتھ واپس ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے رانی حاملہ ہوگئی اور نو مہینے گذرنے کے بعد ایک حسین و جمیل دختر پیدا ہوئی راجہ کو اپنے اقرار کے مطابق لڑکی کو حضرت نطھر کے سپرد کر دینا چاہیے تھا لیکن راجہ کچھ سوچ میں پڑ گیا اور عمائدین حکومت سے مشورہ کے بعد اس نے طے کیا کہ آئندہ جو اولاد پیدا ہوگی وہ حضرت کو دی جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ کی نیت کے فتور کا یہ نتیجہ نکلا نومولود بچہ کے اعضا یکایک اندر کی طرف کھنچنے لگے اور بچہ محض گوشت کا ایک مضغہ (لوتھڑا۔ ٹکڑا) بن کر رہ گیا اس کو دیکھ کر راجہ کے دل میں یہ وہم پیدا ہوگیا کہ کہیں یہ اقرار خلاف نیت بدل جانے کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ وہ پہلے اقرار کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اس بچہ کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا حضرت نے دعا کے ساتھ اس بچہ پر پانی کے چھینٹے دیے اس کے بعد ڈھک دیا گیا۔ بچے کے اعضا اپنی اپنی جگہ بحال ہو گئے۔ سب اس پر درویشوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور راجہ اور اس کے درباری مسرت اور حیرت سے دیکھتے رہے

اس بچی کا نام حضرت نے سب کے سامنے ماما جگنی رکھا اور اس کو بے پالک بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھا راجہ اور اس کے رفقا اپنے محل تشریف لے گئے۔ اس کے بعد رانی دوبارہ حاملہ ہو گئی۔ اور اب جو بچہ پیدا ہوا وہ لڑکا تھا۔ اس بچہ کا نام رکھائی کے لیے راجہ مع اراکین حکومت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے باہمی مشورے اور راجہ کی مرضی سے آپ نے اس لڑکے کا نام کری کال رکھا۔ لڑکا ابھی سال بھر کا تھا کہ اس کا باپ راجہ سوالا اس دنیا سے چل بسا۔ پھر اس کے چند ہی دنوں بعد اس کی ماتا رانی صاحبہ آنجہانی ہو گئیں جب کری کال تخت نشینی کے قابل ہوا حضرت کی اجازت سے ماما جگنی صاحبہ نے اپنے بھائی کی تاجپوشی کی رسم ادا کی اور جب اپنے بھائی کے پاس سے واپس ہونے لگی تو بھائی نے اپنی بہن سے کہا آپ جو کچھ چاہتی ہیں وہ مجھ سے لے جا سکتی ہیں انہوں نے جواب دیا۔

"میرے باپ کے پاس سب کچھ موجود ہے مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں یہ راج یہ شاہی اور یہ مال و زر سب تمھیں مبارک ہو۔ حضرت قطب ۱۴ رمضان المبارک ۶۲۲ھ رحلت فرمائی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ"۔

آپ کے انتقال کے پانچ سال بعد آپ کی متبنی دختر ماما جگنی کا انتقال ہوا دوشنبہ ۲ ربیع الاول ۶۲۷ھ۔

نوٹ:۔ طبل عالم کے مصنف لکھتے ہیں:۔

ہر ایک بزرگ کا نام جدا جدا ہوتا ہے اسی طور کہیں وداجات قلندر، کہیں مردان غیب کہیں طبل عالم بادشاہ اور کہیں قطب اولیا۔ یہ سب نام بھی آقا کے ہیں۔ [1]

اقطاب ویلور

یہ خاندان اپنے علمی و تعلیمی کمالات اور اپنے روحانی فیوض و برکات اپنی مفید تصنیفات اور اپنی روشن ترین دینی خدمات کی بنا پر جنوبی ہند میں ایک نہایت ممتاز اور نمایاں مقام رکھتا ہے۔

اس خاندان کے اولین اکابر مدینہ، بغداد، اصفہان، ہوتے ہوئے یہاں ہندوستان میں تقریباً گیارہویں صدی کے نصف اول میں گجرات، بیجاپور، شاہنور، سرا، ارکاٹ سے ویلور پہنچے اور وہیں کی سکونت اختیار کی وہ اپنی آبائی نسبت سے حسینی اور مادری نسبت سے

---

[1] داستان طبل عالم بادشاہ صفحہ ۳۰

حسنی ہیں اور آپ کا سلسلہ حضرت غوث پاک سے جا ملتا ہے یہ اپنے طریقہ کے لحاظ سے قادری ہیں اور اویسی کہلاتے ہیں اس خاندان میں یکے بعد دیگرے علوم ظاہری و باطنی کے کاملین عارفین، صالحین، اقطاب دین بن کر آفتاب کی طرح چمکے اور اپنے انوار روحانی اور فیوض و حسنات لاثانی سے بے شمار بندگان خدا کو مستفیض و محظوظ فرمایا خاص طور پر جو راہ حق سے ہٹے اور بھٹکے ہوئے تھے انہیں راہ حق و ہدایت پر لگانے دینی تعلیم کے پھیلانے اور گرد پھیلے ہوئے باطل خیالات کو دور کرنے، بے شمار بدعتیں اور غیر مشروع حرکتیں جو اس زمانے میں مسلمانوں میں بری طرح گھس گئی تھیں اور ان کی لپیٹ میں آ کر وہ ان کی زندگی کا معمول بن چکی تھیں ان کی اصلاح کرنے میں اس برگزیدہ خاندان نے جو بیش بہا گراں مایہ اور شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ اور خاص طور پر جنوبی ہند کے مسلمان انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحئی رائے بریلوی لکھتے ہیں۔

"شیخ عبدالفتاح عسکری شارح مثنوی معنوی اسی سلسلہ کے ایک مشہور و معروف بزرگ ہیں جو احمد آباد میں رہتے تھے انہیں کی نسل میں ویلور علاقہ مدراس کا متبرک خاندان ہے۔ جو اب تک اپنے علم و مشیخت کی وجہ سے ممتاز رہا ہے۔"[1]

یہ سید عبدالفتاح اسی خاندان کے ایک جد امجد تھے جن کا شمار گجرات میں مشاہیر علماء و صلحاء میں کیا جاتا تھا۔ شرح مثنوی جام جہاں نما آپ ہی کی تصنیفات ہیں جو آپ کی تبحر علمی کا نہایت روشن ثبوت ہیں۔ اسی طرح اس خاندان کا ہر بزرگ اپنے اپنے وقت میں علمی، عملی، روحانی و عرفانی شان اور بہترین خدمات کے ممتاز و نمایاں مقام پر فائز رہے۔ تحفۃ الحسن مولانا باقر آگاہ، جواہر السلوک، مطلع النور، انوار اقطاب ویلور وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری میں بیجاپور میں جب انقلاب آیا اور سیاسی حالات بگڑ گئے اور امن و سلامتی کے لیے ہر طرح کے خطرات پیدا ہو گئے تو سادات کرام کی ایک کثیر تعداد وہاں سے ہجرت کر گئی ان میں ایک بڑا قافلہ دکن اور کوکن کی طرف چلا گیا اور ایک جماعت اُدھر کرناٹک کا رخ اختیار کیا۔ ان میں سادات ویلور کا ایک بزرگ متبرک خاندان بھی تھا۔

سنہ ۱۱۳۱ھ اس خاندان کے ایک جد بزرگوار مولانا سید عبداللطیف قادری ذوقی اپنے

---

[1] یاد ایام صفحہ ۸۰ از مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اہل وعیال کے ساتھ بیجاپور سے روانہ ہو کر ہلی سے میسا ئیل بر دو قرح شاہ نور میں اقامت کی اور وہاں سے سرا تشریف لائے اور جب وہاں سے سیاسی فتنے ابھرے تو آپ ارکاٹ چلے آئے وہاں سے ۱۱۲۹ھ میں ویلور پہونچے اور ایک کھلے میدان میں فروکش ہوئے۔ بعد میں آپ کے قدم قدم سے یہ خالی میدان مختلف متبرک تعمیرات سے آباد ہو گیا اور عوام میں حضرت مکان کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چنانچہ مؤلف انوار اقطاب ویلور لکھتے ہیں :

" آپ نے خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ تشریف لائے اور فرما رہے ہیں " اے نور العین اسی جگہ قیام کرو دیکھو یہاں مسجد، یہاں مدرسہ اور یہاں خانقاہ تعمیر کرانا۔ تمہاری اولاد امجاد سے ہمیشہ اہل علم کو فیض پہونچے گا اور اس جگہ سے اسلام کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔ جب آپ خواب سے بیدار ہوئے تو ظاہر میں بھی اس خواب کے آثار کو پایا چنانچہ اسی فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت آپ نے تمام چیزوں کی تعمیر کی۔" [1]

ویلور تشریف لاکر ابھی چودہ سال ہی گذرے تھے۔ ۱۱۴۳ھ میں پیام اجل آپہنچا اور آپ اس دنیائے فانی سے سفر آخرت کی طرف رحلت کر گئے۔ آپ کا مزار پاک جامع مسجد ویلور کے شرقی جانب زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید مولانا رکن الدین محمد سید شاہ ابوالحسن قربی اپنے والد بزرگوار کے جانشین ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے اجداد والد سے اور اس کے بعد دوسرے اساتذہ سے تعلیم سے فراغت حاصل کی پھر سلوک و طریقت کے منازل طے کرنے میں ہمہ تن متوجہ اور مشغول ہو گئے۔ انہی دنوں میں آپ کو شیخ فخر الدین دہلوی جو ایک بہت بڑے پایہ کے عالم اور بزرگ تھے۔ شاگردی اور صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی فیض صحبت نے حضرت قربی کے خفیہ ملکات کو جلا بخشا اور ان کے باطنی فوائد کو چمکایا اور انہیں علم حقیقت سے آشنا اور سلسلہ نادریہ میں اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا صرف یہی نہیں بلکہ ان کے بڑھتے ہوئے میلان و ذوق کو دیکھ کر انہیں اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالحق محمد مخدوم ساوی دہلوی فی ۱۱۵۰ھ بارگاہ عالی تک پہونچا کر ان سے مزید استفادہ کا موقع فراہم کیا۔

حضرت مخدوم ساوی اپنے وقت کے ایک بلند پایہ عارف علوم ظاہری و معنوی سے خبردار اور ایک صاحب تصرف بزرگ تھے اس زمانہ میں کرناٹک میں رفض کا فتنہ بہت زور کے ساتھ سر اٹھا رہا تھا۔ سیلاب کی طرح اس بڑھتے ہوئے فتنہ کو کچلنے کے لیے کسی بڑی قابل قابلیں اور قوی ہستی کی ضرورت تھی اور وہ حضرت شیخ ساوی علیہ الرحمۃ جیسی ہی ہستی ہو سکتی تھی چنانچہ آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور کوششوں سے یہ فتنہ اس طرح دب گیا کہ پھر ابھر نہ سکا اور مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی رفض کے گرداب سے بچ گئی۔

---

[1] انوار اقطاب ویلور صفحہ ۱۲

چنانچہ حضرت قربیؒ لکھتے ہیں۔

"اگر قدوۃ المحققین زبدۃ العارفین شیخ مخدوم القادری قدس سرہ دریں ملک تشریف نیا وردے اکثر مردمان ایں جا در گرداب روافض افتادندے" یعنی اگر قدوۃ المحققین زبدۃ العارفین شیخ مخدوم القادری قدس سرہ اس ملک میں تشریف نہ لاتے تو اکثر اس جگہ کے لوگ رفض کے بھنور میں پڑ جاتے۔" [1]

حضرت قربیؒ سے چند کرامات کے صدور و ظہور کا تذکرہ بعض کتابوں میں کیا گیا ہے۔

تصنیفات:۔ آپ کی تصنیفات بکثرت ہیں اور یہ کتابیں مختلف فنون میں ہیں جن سے آپ کی علمی وسعت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ آپ کے صاحبزادے حضرت ذوقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔

"او رضی اللہ عنہ تصانیف بسیار است در علم عقائد و تصوف و فقہ و در ملاحدہ کان جامعاً بین الشریعۃ والحقیقۃ و داخواً علی جنبات اہل الالحاد والزندقۃ الخ ان میں سے چند کتابوں کے نام مؤلف انوار افطاب ذہلور کی صراحت کے مطابق یہ ہیں۔ رسالہ اثبات وجود حقیق۔ حق الحق، برھان القاطع فی البیان توحید الجامع، دلیل محکم فی توحید الاقوم، عین البیان، حق المعرفۃ، تحفۃ الذاکرین، رسائل وجدان، خلاصۃ العرفان، جمع الجمع، تجلا و امثال، افادہ از دلیل محکم۔ لب السلوک، رسالہ اسم اللہ تاب قوسین رسالہ توفیق، منطق کل، حلال و حل، نمک نامہ منظوم۔ میزان العقائد۔ تقویۃ الایقان منھج التحقیق فی افضلیت صدیق، دلائل المنیعۃ فی رد مذھب شیعۃ الشنیعۃ وغیر ذالک۔

سیرت و اخلاق کے لحاظ سے آپ کا مقام بہت بلند تھا حلیم الطبع، منکسر المزاج، شریعت کے ہر حال میں پابند۔ امر بالمعروف پر ہمیشہ کاربند اور اس کے لیے بلا خوف لومۃ لائم اکثر نصیحت در بند۔ قدم بہ قدم سنت نبوی کی اطاعت گزار بدعات و خرافات سے غایت درجہ نفرت و بیزار سخاوت، فیاضی اور رحم دلی اپنی نظیر آپ تھے۔

مولانا ابو الحسن گاہ گم تحفہ احسن اور حضرت ذوقی نے لطائف لطیفی میں آپ کے اوصاف جمیلہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ آپ کی وفات ۲۰ رمضان المبارک شب پنجشنبہ ۱۰۸۲ھ ویلور ہی میں واقع ہوئی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

---

[1] انوار افطاب ذہلور صفحہ ۲۰

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف قادری ذوقیؒ اپنے بزرگوں کی مسند پر رونق افروز ہوگئے۔ آپ ۱۲۵۱ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار حضرت قربلےؒ سے پائی پھر حافظ محمد حسین اور مولانا محمد عظیم اور مولانا محمد عظیم الدین وغیرہ اجلاء اساتذہ سے فارسی اور عربی سے فراغت حاصل کی۔ اسی دوران آپ اپنے والد کے ہمراہ حضرت شیخ ناصرؒ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور حصول ترقی علم کے لیے ان سے دعا کی درخواست کی۔ شیخ موصوف نے دعا کی اور ارشاد فرمایا کہ آپ کا علمی مقام اپنے معاصرین میں ممتاز اور برتر رہے گا اس کے بعد آپ مطالعہ کتب میں مشغول ہوگئے اور مختلف علوم و فنون میں کافی دسترس اور کمال حاصل کر لیا۔ اس کے بعد آپ اپنے والد حضرت قربیؒ کے دست حق پر بیعت کی اور انھیں کے زیر سایہ جملہ منازل سلوک طے کیے اور خلافت و اجازت سے مستفیض ہوئے۔ کتب بینی کا ذوق اور مطالعہ کا شوق اس قدر وافر تھا کہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں فراہم کرنے میں اکثر سرگرداں رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا جس نے آخر ایک بہت ہی مفید اور یادگار کتب خانہ کا روپ اختیار کیا۔ اس کے ساتھ آپ نے بہ نفس نفیس درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا جس سے ہزاروں طالبان علم اس سرچشمۂ علمی سے سیراب و فیضیاب ہوئے۔ آپ کا انداز درس نہایت دلکش مدلل اور موثر ہوتا تھا۔ کہ مؤلف انوار اقطاب ویلور لکھتے ہیں:۔

"جب درس دینا شروع فرماتے اور مسائل کی تحقیق اور مسائل کی تحقیق فرماتے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی رازی و غزالی وقت درس دے رہا ہے۔"[۱]

درس و تدریس کے بعد عرفانی مجالس کا بھی سلسلہ قائم رہتا تھا۔ ان سے اور دیگر مصروفیات سے فراغت کے بعد جتنا وقت آپ کو ملتا۔ آپ انہیں تصنیفات میں گذارتے۔ آپ کی جملہ تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو تک بتائی گئی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تصانیف مختلف علوم و فنون پر پھیلی ہوئی ہیں شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس میں آپ کی کوئی تصنیف نہ ہو اس سے جہاں آپ کی وسعت معلومات اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں آپ کی خداداد ذہانت فکر کی بصیرت اور حیرت انگیز جامعیت و صلاحیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح تصوف کے بعض عمیق و پیچیدہ مسائل کو اس خوبی سے کھول دیتے تھے انہیں دیکھ یا سن کر اس زمانہ کے بعض اکابر صوفیائے کرام بھی داد تحسین کے اظہار کیے بغیر نہ رہتے ایک طرف آپ علوم عقلیہ و نقلیہ کے عالم تھے تو دوسری طرف تصوف و معرفت میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت و مہارت رکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ آپ سے بکثرت خرق عادات کا بھی ظہور ہوا۔ آپ کو شعر و شاعری

---

[۱] انوار اقطاب ویلور صفحہ ۴۸

URDU HALL HIMAYATNAGAR LIBRARY
HYDERABAD-500029

سے بھی نہایت لگاؤ تھا اور یہ لگاؤ کم سنی ہی سے ابھرنے لگا تھا آپ کے اشعار میں کبھی عرفی کا رنگ ابھرتا تھا، اور کبھی انوری، نظامی و جامی کا طرز اختیار کرتا تھا۔ اس زمانے کے مسلم شعراء آپ کے کلام بلاغت نظام کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہتے تھے۔ آپ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ آپ کے اشعار کا شمار تین لاکھ تک پہونچتا ہے۔

وفات :- آخر وہ وقت موعود آپہونچا جو ہر ذی روح کے لیے مقدر ہے اور یہ آفتاب علم و عرفان ۱۳؍ رجب ۱۱۹۳ھ کو غروب ہو گیا اور اپنے رب سے جاملا۔ قدس اللہ سرہٗ۔

حضرت مولانا سید شاہ ابوالحسن قادری محویؒ

حضرت ذوقیؒ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادے تھے اور وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن قادری محویؒ تھے آپ ۱۰؍ شعبان ۱۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے آپ کی عمر ابھی پانچ یا آٹھ سال کی تھی کہ آپ کے والد کا مبارک سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔

آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو مدراس لے گئیں اور وہاں آپ کی تعلیم و تربیت کے لیے اس زمانہ کے سربرآوردہ مشاہیر اساتذہ کے سپرد کر دیا۔ اور آپ بیس سال تک مدراس رہے اور مختلف اساتذہ سے تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، سیرت، طب، منطق اور فلسفہ وغیرہ تعلیم سے فراغت حاصل کی اس کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ ویلور میں دوبارہ تشریف لائے۔ اس کے بعد منازل سلوک طے کرنے میں مصروف متوجہ ہوئے۔ اور کثرت ریاضت اور مجاہدے سے تیزی کے ساتھ نہایت بلند مقام تک پہونچ گئے مبداء فیاض کی طرف سے آپ کو دینی اور عوام کی خدمت کا بہت کافی حصہ ملا تھا آپ ہر طرح انسانی خدمت کے جذبے سے سرشار رہتے تھے اس لیے آپ کی ذات بابرکات سے عوام کو بہت زیادہ فیض اور نفع حاصل ہوا۔ آپ پر بعض اوقات جذب کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ استغراق اور محویت کی حالت پیدا ہونے پر آپ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بالکل محوی شان کا مظہر بن جاتے تھے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے جو مسائل تصوف، اسرار عرفانی اور مراتب حقوق و آداب انسانی پر مشتمل ہیں۔

آپ کے دو فرزند تھے ایک حضرت مولانا سید محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری نقویؒ اور دوسرے سید عبدالعلی عرف بڑے صاحب۔

حضرت محویؒ ۲۰؍ جمادی الآخر ۱۲۳۳ھ میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری نقویؒ

آپ ۱۲۰۶ھ ویلور میں پیدا ہوئے۔ آپ پدری تعلق سے حسینی اور مادری سلسلے سے حسنی ہیں اور

بتیس واسطوں سے حضرت امام حسنؓ تک پہونچتا ہے۔ تحصیل علم کا شوق تو آپ کو بچپن ہی سے تھا اور آپ نہایت ذہین اور ذکی بھی واقع ہوئے تھے۔ آپ کا پورا ماحول یکسر علمی اور تعلیمی تھا خوش قسمتی سے آپ کو نہایت بزرگ ترین اساتذہ بھی مل گئے اور آپ پورے انہماک کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے اور ۱۲۳۶ھ میں تمام علوم و فنون متداولہ سے فراغت حاصل کی اور بیس سال کی عمر میں قرآن پاک بھی حفظ کر لیا۔ پھر بھی آپ کی علمی تشنگی میں کمی نہیں آئی اور مختلف علمی سرچشموں سے سیراب ہوتے رہے یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے اکتساب فیض کے لیے دہلی جانے کا عزم مصمم کر لیا تو آپ کی والدہ کے اجازت نہ دینے سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ چنانچہ انوار اقطاب ویلور کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

"آپ نے سامان سفر تیار فرما کر عزم کیا تو والدہ ماجدہ نے اس ارادے سے مطلع ہو کر فرمایا پہلے یہاں اچھی طرح علوم کی تکمیل کر لو پھر حضرت محدث دہلوی کی خدمت میں جاؤ۔ حسب ارشاد والدہ ماجدہ ۱۲۳۷ھ میں آپ مدراس تشریف لے گئے اور تبرکاً و تیمناً آپ نے دو سبق حضرت مولانا عبدالعلی صاحب بحرالعلوم المعروف بہ ملک العلماء و فاضل عالی جاہ مولانا باقر آگاہ رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھ کر بعد ازاں فاضل متبحر مولانا علاء الدین صاحب جو ملک العلماء کے داماد و استاذ شہر تھے ان کی خدمت میں علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کے لیے تشریف لائے۔" لہ

تحصیل علم کے لیے آپ کی کد و کاوش اور انتھک محنت کے بارے میں مؤلف مطلع النور لکھتے ہیں:۔

"آپ کی تعلیمی محنت و مشقت کا یہ عالم تھا کہ صبح سے نیم شب تک دو اُٹھا کبھی ایک گھڑی بھی آرام نہ فرماتے اس دوران کبھی اپنی پشت زمین سے نہ لگنے دیتے ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے حتیٰ کہ اگر کوئی آپ سے ملنے آتا تو حضرت پہلے اس سے یہ فرماتے کہ یہ بتاؤ مجھ سے کتنی باتیں کرو گے اگر اس شخص نے مثلاً کہہ دیا کہ پانچ باتیں کروں گا تو قطعاً اس سے چھ بات نہ کرتے اس طرح آپ تضیع اوقات سے بچتے ہوئے مصروف مطالعہ رہتے۔" ۲ه ۱۲۴۳ھ میں مدراس سے تکمیل علم کے بعد دہلی کے سفر کے ارادہ سے ویلور تشریف لائے لیکن انہیں ایام میں ادھر حضرت محویؒ کے انتقال کا حادثہ پیش آگیا اور ادھر حضرت شاہ صاحبؒ بھی اس دنیا سے چل بسے اور آپ کا سفر دہلی رہ گیا۔

ارادت و سلوک کے منازل اپنے والد کے زیر سایہ طے کیے اور بیعت و اجازت بھی انہیں سے حاصل کی۔ اپنے بزرگوں کی طرح درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدہ مسلسل جاری رہتا تھا اور بے شمار طالبانِ دین و معرفت فیضیاب ہوتے رہے اس کے علاوہ مختلف مقامات سے روزانہ باہر سے بے شمار استفتا اور سیکڑوں تحقیق طلب خطوط آتے اور اس کے جوابات مع اپنے ہاتھ سے تحریر فرماتے۔ استفتاء کے جوابات

لہ انوار اقطاب ویلور صفحہ ۷۷   ۲ه مطلع النور

دینے میں اس قدر دسترس حاصل تھا کہ دقیق ترین مسائل بھی آپ بلا کسی تاخیر د مطالعہ کتب کے اس طرح تحریر فرما دیتے کہ گویا پہلے سے وہ آپ کے نہاں خانہ دماغ میں محفوظ رہے ہوں۔

صاحب مطلع النور لکھتے ہیں۔ "افتا کے اندر آپ کا اتنا بلند مقام تھا کہ عوام کے علاوہ استفادہ کی غرض سے ان حضرات کا بھی ہجوم رہتا جو اس منصب افتا پر فائز تھے۔

اس کے علاوہ دعوت و تبلیغ اور اصلاح عامہ کی طرف بھی آپ نہایت توجہ اور سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتے رہے مردوں اور عورتوں کی مجالس میں الگ الگ آپ کی وعظ و تقاریر کا دور برابر چلتا رہتا، اسی طرح تحریری صورت میں دعوت و تبلیغ کی اہم ترین خدمت بھی آپ برابر انجام دیتے رہتے تھے۔ دعوت و تبلیغ میں آپ کی سرگرمیاں اس حد تک پہونچ گئی تھیں کہ آپ غیر مسلموں کو اسلامی دعوت، عربی، انگریزی، اردو، فارسی وغیرہ مختلف زبانوں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ اسی طرح بعض اہل کتاب کے نام بھی آپ نے دعوت نامے ارسال کیے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دعوت نامہ ملکہ وکٹوریہ کے نام بھی جو ہندوستان کی بھی ملکہ تھی روانہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ ملکہ وکٹوریہ نے آپ کی خدمت میں ایک گراں قدر رقم بطور نذرانہ بھیجدی۔ لیکن آپ نے مذکورہ رقم نذرانہ شکریہ کے ساتھ واپس کرنے کے ساتھ انہیں جواباً تحریر فرمایا۔ "میرے لیے سب سے بڑی مسرت اور نذرانہ یہی ہے کہ تم اسلام قبول کر لو۔ وکٹوریہ نے اس دعوت کے جواب میں یہی لکھا "میں یہ مانتی ہوں کہ مذہب اسلام یقیناً حق ہے لیکن میرے سامنے چند وجوہات ایسے ہیں جس کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے قاصر ہوں۔" ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہماری اتنی بڑی وسیع سلطنت میں ہندوستان کے اندر ایک ایسا مومن کامل بھی ہے جو حق گوئی میں آپ اپنی مثال ہے اور خدمت اسلام کا صحیح جذبہ رکھتا ہے اور اس کا علمبردار ہے۔" [1]

بے شمار اللہ کے بندے آپ کے دست حق پرست سے مشرف ہوئے چنانچہ انوار انتخاب دلپذیر کے مولف لکھتے ہیں۔ "آپ کے دست حق پرست پر مرید ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہے عرب و عجم کے اندر لاکھوں حضرات نے آپ سے شرف بیعت حاصل فرمایا۔ پوری تعداد کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مریدوں کی تعداد کتنی ہے تاہم تتبع اور تلاش کے بعد جو مل سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے مریدین عرب و عجم میں سات لاکھ تھے۔ [2]

ان ساری مصروفیات کے باوجود مختلف علوم و فنون میں آپ نے متعدد کتابیں فارسی اور عربی میں تصنیف کیں جو نہایت مفید اعلیٰ درجہ کے مضامین و مباحث پر حاوی اور بیش بہا علمی

---

[1] ماخوذ از انوار انتخاب دلپذیر صفحہ ۸۰۔ [2] صاحب مقالات طریقت انوار انتخاب دلپذیر صفحہ ۸۴

نوادرات اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان سب کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں یہ کتابیں دارالعلوم لطیفیہ کے کتب خانہ میں مطبوعہ غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہیں۔

آپ سے علمی فیض پانے والوں، شاگردوں کا کوئی شمار نہیں، لیکن ان میں جن کا علمی پایہ بہت بلند اور جو اپنے وقت کے مشاہیر ممتاز علماء و صلحاء میں شمار ہوتے تھے، ان کی تعداد ان کے تذکرہ نگاروں نے اسی اس بتائی ہے ان حضرات نے حضرت قطب ویلوری کی خدمت میں اپنی زندگی کا کافی حصہ گذار کر ان کے زیر سایہ تربیت سلوک و معرفت کے مقامات بھی طے کیے اور خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے تھے۔ ان میں چند برگزیدہ اور نمایاں حضرات کے اسمائے گرامی پیش خدمت ہیں۔

۱۔ مولانا سید شاہ محمد صاحب قادری۔ (۲) حضرت مولانا سید شاہ فضل اللہ صاحب قادری۔

۳۔ سید شاہ شرف صاحب جو زبردست عالم و فاضل تھے (۴) شیخ محمد استنبولی ثم المکی، آپ عالم عامل اور حافظ بھی تھے۔ ہزاروں حدیثیں آپ کو زبانی یاد تھیں (۵) مولانا محمد خان بدخشانی ثم المدنی جو ایک بہت بڑے پایہ کے عالم اور سنت نبوی کے انتہائی شیدائی اور اس کے بڑے متبع تھے (۶) حضرت مولانا محی الدین صاحب ایک اعلیٰ درجے کے فقیہہ پاکباز، پارسا بڑے عبادت گذار تعلق مع اللہ سے سرشار اور ایک مسلم صاحب مقام بزرگ تھے۔ آپ دہلے محی الدین صاحب کے نام سے مشہور و عوام اور مقبول انام تھے۔ مولانا شاہ عبدالحئی صاحب قادری بنگلوری زبردست عالم، ایک بڑے پایہ کے عالم عارف اور بڑے ممتاز خطیب تھے۔ حضرت مولانا عبدالوہاب قادری بانی مدرسہ باقیات الصالحات حضرت قطب ویلوری کے شاگرد و ان کے مجاز اور انہیں سے بیعت اور خلافت بھی حاصل کی۔ وہ جنوبی ہند کے ایک مایہ ناز پاکباز صاحب عزم و ہمت، سراپا خدمت، متبع شریعت محب قوم و ملت جلیل القدر بزرگ ہیں۔ جنھوں نے ویلور ہی میں ایک عظیم الشان دینی مدرسہ قائم کیا جس سے ہزاروں تشنگان علوم و معارف سیراب ہوئے اور ابتک یہ سرچشمۂ فیض بڑی شان و آن کے ساتھ اپنی سابقہ روایات کے ساتھ بدستور جاری ہے۔

مولانا محمد حنیف صاحب، آپ علوم عقلی و نقلی کے جامع شریعت کے حقائق و اسرار سے واقف مئے حق و عرفان کے بادہ نوش اور پابند شریعت اور قدم بہ قدم سنت کی پیروی ملحوظ رکھنے والے بزرگ تھے۔

سید شاہ محی الدین عبدالغفار قادری المعروف مسکین شاہ آپ کا تعلق حضرت شاہ عالم گجراتی قدس سرہ العزیز کی اولاد سے ہے آپ کو معرفت میں نہایت بلند اور ممتاز مقام حاصل تھا۔ حضرت قطب ویلور کے خلفاء میں باعتبار علم و عرفانیت، زہد، تقویٰ، ذوق و شوق و باطنی میں آپ کی فضیلت مسلم تھی۔

دیوان مسکین کے نام سے آپ کی ایک کتاب بہت مشہور ہے یہ دیوان رموز و اسرار کا گنجینہ اور حقائق معرفت کا ایک ایسا دل آویز پند نامہ ہے جو طالبان راہ الہٰی کے لیے شمع نورانی کا کام دے سکتا ہے اور ان کے دامنوں کو نایاب جواہر سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت قطب ویلور سے رشد و ہدایت، فیض و تربیت پانے والے علماء فضلاء شیوخ و صلحاء کی ایک کثیر جماعت ہے جن کا ذکر طوالت کی وجہ سے نہیں کیا جا سکا۔

آپ کی تصنیفات:۔ ۱۔ احیاء التوحید (۲) احیاء السنۃ (۳) تنبیہ الجاہلین (۴) صراط المؤمنین ۵۔ مکتوبات طیبی (۶) رسائل بذکر الف مقام (۷) جواہر الحقائق (۸) فصل الخطاب فی الفرق بین الخطاء و الصواب (۹) غایۃ التحقیق۔ (۱۰) جواہر السلوک۔

اس میں اول الذکر کتابیں عوام کے لیے عام فہم انداز میں نہایت شستہ فارسی میں لکھی گئیں ہیں۔ غایۃ التحقیق، وحدت الوجود کے بارے میں سوالوں کے جواب میں تحریر کی گئی تھی جس پر وحدت الوجود پر عقلی و نقلی حیثیت سے مدلل و مشرح بحث کی گئی ہے۔

جواہر الحقائق اس میں عالم کی ہر شے کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے یہ نہایت مفید نفیس حقائق پر مشتمل اور قابل دید کتاب ہے۔

جواہر السلوک اس کتاب میں سلوک کے تمام مقامات پر تفصیلی بحث ہے اور توحید کے تمام حدود و لوازم کی وضاحت کے ساتھ بیعت کے تمام پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اس ضمن میں قادریہ چشتیہ، نقشبندیہ جیسے سلاسل کے اصول مراقب کی بڑی محققانہ وضاحت کی گئی ہے اس میں ایک سالک اور طالب حق کے لیے بہت سی نفع بخش چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

آپ کے اخلاق و اوصاف:۔ صاحب مقالات طریقت لکھتے ہیں:۔

"علم و عمل، تواضع و انکسار، تحمل و ایثار، توکل و قناعت، سخاوت و فراست میں عالم الوقت اور وحید العصر امراء و اغنیاء سے بالکل بے پرواہ اور فقراء و غرباء کے ملجاء و ماویٰ تھے۔ صبر و توکل میں زندگی بسر کی کسی سے جاگیر اور تنخواہ نہ لی۔

مؤلف انوار انقلاب ویلور لکھتے ہیں۔ "آپ کے اخلاق کریمانہ کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کسی سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے جو کوئی آپ سے ملنے آتا تو اٹھ کھڑے ہو کر استقبال کرتے اور مصافحہ کرنے میں اس وقت تک ہاتھ نہ کھینچتے جب تک کہ خود مصافحہ کرنے والا نہ کھینچ لیتا۔ کوئی کبھی تلخ، نازیبا باتوں سے اپنی زبان کو ملوث نہ ہونے دیا جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ آپ خلق محمدی کی پوری تصویر تھے۔ کسی نے کچھ بھی کہا لیکن آپ نے کبھی اس کا اثر نہ لیا۔ اپنے خلفاء و مریدین کے ساتھ شفقت

لہ مقالات طریقت ص۹۶

کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص یہی تصور کرتا کہ حضرت میرے ہی ساتھ سب سے زیادہ مہربان ہیں۔ ہر وقت آپ نے وجود فرمائی اگرچہ لوگوں سے زیادہ گزند و تکلیف پہونچی لیکن آپ کی شان کریمی میں سرمو فرق نہ آیا۔ ؎۱

آپ کی بلندی اخلاق کا ایک نمونہ صاحب مطلع النور لکھتے ہیں۔

"آپ کا ہمیشہ یہ دستور تھا اور رہا کہ روز وعظ و تقریر فرمایا کرتے تھے کچھ ادنیٰ بدبختوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ شیخ اپنے بیان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف مسلمانوں کو ابھارتے ہیں۔ یہ خبر جب کمپنی کو ملی تو اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور آپ نظر بند کر لیے گئے لیکن آپ کی برأت کا علم جب کوئین وکٹوریہ کو ہوا تو اس نے اس غلط فہمی کی معذرت چاہی۔ رہائی کے بعد ججوں نے آپ سے کہا کہ جو الزامات آپ پر لگائے گئے ہیں اور مخالفین نے آپ کو جو تکلیف پہونچائی ہے اسکے تحت آپ اپنی حرمت کا دعویٰ کر دیں۔ جواب میں آپ نے فرمایا کہ مجھے کسی نے تکلیف نہیں دی اور نہ دنیا کا کوئی انسان دے سکتا ہے لہٰذا اب میں بلاوجہ کسی کو کیوں تکلیف دوں اور میں اپنی ہر مرضی کو خدا کی مرضی و مشیت پر قربان کر دینا بھی کمال سمجھتا ہوں۔ ؎۲

آپ اپنا ہر عمل سنت نبوی کے مطابق رکھتے، خوف و خشیت الٰہی سے آپ کا قلب ہمیشہ معمور رہتا تھا زندگی بھر کوئی ایسا کپڑا نہیں پہنا جس کے پہننے کا ثبوت سنت نبوی سے نہ ملتا ہو آپ خواہ جلوت میں یا خلوت میں ہوں، ہر حال میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت آپ کے پیش نظر رہتی تھی، آپ کی تواضع و انکساری کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی موقع سے اپنی کوئی قولاً و فعلاً فضیلت نہ دی بلکہ ہمیشہ یہی فرماتے رہے کہ میں مسلمانوں کی خاک پا ہوں " ــــ آپ اپنی زندگی کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے سانچے میں ڈھال لیا تھا ؎۳

سفر حج سفر آخرت بن گیا

والدہ محترمہ کی رحلت کے بعد آپ نے حج ثانی کا مصمم ارادہ کر لیا اور ہر شوال ۱۲۹۹ھ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے اور منزل بہ منزل گذرتے ہوئے ہر ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ پہونچے اور فرائض حج کے تمام مراحل سے گذر کر مکہ تشریف لائے تو بخار نے آپ کو علیل و فریش بنا دیا بخار اس قدر تیز شدت کے ساتھ چڑھا کہ اترنے کا نام ہی نہ لیا اور اس نے آپ کو تقریباً مجسمہ سا بنا کر رکھ دیا جب اہل قافلہ مدینے جانے کی تیاری کرنے لگے تو آپ کی آنکھیں فرط غم و اضطراب سے اشکبار ہو گئیں اور کہنے لگے کہ میرا عجیب حال ہے "نہ تاب سفر ہے نے طاقت جدائی"۔

؎۱ انوار اقطاب ویلور صفحہ ۹۶ ؎۲ مطلع النور مقالات طریقت ایضاً انوار اقطاب ویلور ص ۹۶ ؎۳ انوار اقطاب ویلور ص ۹۵

سفر اور رکوب سے تو معذوری ظاہر ہے لیکن ہجر بھی گراں بار ہے اسی حال پر آپ کو خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ آنے کی بشارت مل گئی۔

اس بشارت کا پانا تھا کہ آپ دیار حبیب کے لیے مستعد ہو گئے علالت و نقاہت، ضعف و ناتوانی کے باوجود آپ نے یہ سفر نہایت صبر و استقامت اور سفر کی صعوبت و زحمت کو بطیب خاطر گوارا فرما کر طے کیا۔ رفقائے راہ مجبور رہے تھے کہ ایک مریض ناتواں کی یہ کیفیت اور جستی محض شوق زیارت کے لیے پیدا ہو گئی ہے درحقیقت خاک پاک مدینہ کی زبردست کشش انھیں اپنی آغوش میں اٹھا لینے کے لیے کھینچ لیے جا رہی تھی۔ قافلہ والے تو واپس آنے کے لیے جا رہے تھے اور یہ اللہ کا بندہ واپس آنے کے لیے نہیں جا رہا تھا بلکہ طیبہ کی پاک سرزمین میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خواب ہونے کے لیے جا رہا تھا ادھر جان ناتواں بیقرار اور ادھر نعال یا ولدی اشارہ دینے والا جان جہاں کو کسی کی آمد کا انتظار۔

بہرحال حضرت قطب ویلور اپنے مقام مقصود تک پہونچ گئے لیکن بظاہر اسہال اور تے کی شکایتوں نے شدت اختیار کی لیکن عجب نہیں کہ یہ اللہ کے ایک نیک اور پاک بندے کو اس کے اندر رہی سہی کثافتوں اور آلائشوں سے بالکل پاک و صاف کرنے کی تنقیہ کی ایک صورت ہے۔ آخر اار محرم الحرام ۱۲۸۹ھ میں مدینہ میں اس دنیائے ناپائدار سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئے رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری رح

۲۲ر شوال ۱۲۶۹ھ میں آپ پیدا ہوئے بچپنے ہی سے آپ کی ذہانت و زیرکی کے دن کے نمایاں تھے حضرت قطب ویلور نے اپنے خلیفہ اور شاگرد رشید حضرت مولانا محمد حنیف صاحب بنگلوری کو اپنے فرزند کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا اور آپ انہیں سے تمام علوم منقول و معقول و منقول سے فراغت پائی۔ اس کے ساتھ پدر بزرگوار کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ علم ظاہری کے ساتھ علم باطنی و روحانی تربیت دے کر اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے پیش رو بزرگوں کی جگہ لینے کے قابل بنایا اور آخر اپنی وفات سے قبل مدینہ منورہ میں مختلف باتوں کی وصیت فرما کر انہیں خلعت خلافت و اجازت سے سرفراز فرمایا۔ ۳ر جمادی الآخر ۱۲۸۹ھ خاندانی روایات کے مطابق رسم سجادگی عطا کی گئی۔

آپ نے اپنے بزرگوں کے طریقہ پر رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا آپ کو اسلام سے جو گہرا لگاؤ تھا اور تعلق خاطر تھا وہ تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں سے نہایت درجہ محبت اور ہمدردی تھی آپ انھیں سچے اور پکے "مسلمانوں" کی طرح دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ کے زمانہ میں انگریزی حکومت کا دور دورہ تھا اور انگریز اپنی حکومت کے ساتھ اپنا تہذیب و تعلیم کو پھیلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی اس رو میں بہہ کر اسی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے اس سے آپ کا

دردمند دل سخت بے چین اور اداس رہنے اور اس کی روک تھام کے لیے آپ اپنے بزرگوں کے پرانے مدرسہ کو ایک نئی شکل میں لانے پر کمربستہ ہوگئے۔ چنانچہ یہ آپ ہی کی فکر و کاوش بلند ہمتی اور فراخ دلگی کا نتیجہ تھا۔ چند ہی دنوں میں ایک باضابطہ درسگاہ جاری ہوگئی اس کے لیے ایک پختہ سنگی شاندار عمارت وجود میں آگئی۔

قابل و لائق اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں اور اس کے دروازے دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے تمام امکانی سہولتوں کے ساتھ کھول دیئے گئے اور سیکڑوں تشنگان علوم اس سرچشمہ علمی سے سیراب اور فیضیاب ہوئے اور اب تک برابر ہوتے آرہے ہیں اس کے بعد سنہ ۱۲۹۱ھ دارالعلوم کے پہلو میں ایک عالیشان مسجد تعمیر فرمائی۔

مدرسہ کے تمام مصارف یہ حضرات خود اٹھاتے ہیں نہ چندوں کا سوال ہے نہ عطیوں کا کچھ انتظام یہاں تک کہ دارالعلوم لطیفیہ کی تشکیل نو کے بعد حضور نظام نے پانچ سو روپیہ ماہوار علمی خدمات کے لیے پیش کیا لیکن آپ نے شکریہ کے ساتھ اس کو واپس کردیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔

آپ خلق و سیرت کے اعتبار سے بالکل ہی اپنے نمونۂ سلف تھے منکسر المزاج، حلیم الطبع، جمیل الخصال، احسن المقال، تقویٰ شعار، پاکیزہ کردار، احسان و مروت کے دلدار۔ اللہ کے فدا اور مسلمانوں کے مخلص خدمت گذار تھے۔" [1]

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ آپ اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کرگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خاندانی گنبد ہی میں سپرد خاک کئے گئے۔

---

[1] راقم سطور کے والد ماجد حضرت قاضی محمد امین اکرمی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زمانہ میں دارالعلوم لطیفیہ میں تعلیم پائی فارغ اوقات میں وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کی گرانمایہ فیض صحبت اور پرشفقت نصیحت سے برابر مستفیض ہوتے تھے اگرچہ وہ اپنے قیام حیدرآباد کے دور میں بیعت و خلافت کا تعلق حضرت سکین شاہ سے قائم کیا تھا جن کے بارے میں "انوار اقطاب ویلور" کے مؤلف لکھتے ہیں:۔

سید شاہ محی الدین عبدالغفار قادری المتخلص بہ سکین شاہ جو حضرت شاہ عالم گجراتی قدس سرہ کی اولاد و امجاد سے ہیں آپ شیخ ہی کے سایہ میں رہ کر سلوک طے فرمایا اور خلافت حاصل کی آپ کو میدان معرفت میں بہت ممتاز مقام حاصل تھا اور حضرت قطب ویلور کے ممتاز ترین خلفاء میں شمار کئے جاتے تھے آپ کی ایک مشہور کتاب "دیوان سکین" ہے مشہور ہے جس میں آپ نے حقائق و معرفت کے بے شمار نایاب ترین گوہر پرو دیئے ہے آپ اپنے شیخ کے بہت ہی فدائی تھے آپ پر بہت زیادہ جذب طاری رہتا تھا ہر وقت حقائق و معرفت کے دریا میں غوطہ زن رہتے تھے۔ [1] انوار اقطاب ویلور صفحہ ۹۱۔

اس کے باوجود والد محترم بزرگانِ دیلور سے گہری عقیدت و مودت رکھتے تھے اور ان کے عرفانی مقامات باطنی کمالات اور روحانی فیوض و برکات کا تذکرہ اکثر اپنی صحبتوں میں کرتے رہتے تھے، ان میں خاص کر حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری کے چشم دید حالات نہایت لطف و خوبی کے ساتھ بیان کرتے تھے، کہتے تھے کہ وہ اپنے بزرگوں کے نمونہ پر ان تمام اوصاف اور محاسن سے متصف تھے جو کسی مقتدائے دین اور اللہ کے مقبول بندے کے لیے مخصوص ہو سکتے ہیں۔

چہرہ مبارک پر رعب و وقار ایسا کہ قریب جانا تو درکنار سامنے سے گزرنے کی کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی لیکن قریب جائیے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک نہایت شفیق اور مہربان بزرگ کے ظلِ عاطفت میں پہنچ گیا ہے آنے والے سے خندہ پیشانی سے ملتے اٹھ کر مصافحہ کرتے اس کا حال دریافت کرتے اور اس سے اس طرح سلوک و برتاؤ کرتے اس کو ہر طرح سے سکون و اطمینان حاصل ہو جاتا کہتے تھے اور تو اور مجھ جیسے معمولی طالب علم کے ساتھ آپ کی شفقت ایسی تھی کہ جب تک دیلور میں آپ کے سایۂ عاطفت میں رہا ہمیشہ خوش و خرم رہا۔ میں بعد عصر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ مجھے پاس بلاتے حال دریافت کرتے اور پوچھتے کہ تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ایسے تھے اللہ کے نیک بندے اور یہ تھی ان کے سیرت و کردار کی ایک معمولی جھلک وقس علیٰ ھذا۔

حضرت مولانا محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادریؒ

ولادت ۲۶ ربیع الاول ۱۲۹۶ھ دیلور میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اس کے بعد دارالعلوم لطیفیہ میں داخل ہو گئے اس وقت دارالعلوم میں قابل ترین اساتذہ درسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان سے آپ نے خوب علمی استفاضہ کیا اور تمام کتب متداولہ سے فراغت حاصل کی۔ پھر والد ہی کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت و اجازت انہیں سے پائی اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۳۲۶ھ میں آپ سجادگی کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت آپ کی عمر ستائیس سال کی تھی آپ کے سر پر بیک وقت مختلف قسم کی ذمہ داریوں کا بارِ گراں آ پڑا۔ دارالعلوم لطیفیہ کا انتظام، خاندان کی نگرانی، سجادگی کے فرائض اور اس سے متعلقہ تقاضوں کی انجام دہی، اپنے پیشرو بزرگوں کی روایات اور حسنات کی برقراری۔ ان سب ذمہ داریوں کو جس تدبر، ہوشمندی، بالغ نظری، ہمت و حوصلہ مندی، سنجیدگی اور بشاشت قلبی اور حسن و خوبی سے آپ نے نبھایا وہ تو آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ نے اپنے دورِ انتظام میں دارالعلوم کو اچھی خاصی ترقی دی۔ مولانا حافظ عبدالجلیل جیسے مشہور و متبحر عالم و فاضل کو پشاور سے بلا کر انہیں مدرسہ لطیفیہ کا صدر مدرس بنایا۔ اور مولانا شہاب الدین احمد جیسے جامع الفضائل کی تدریسی خدمات

حاصل کی۔ اس طرح دیگر قابل مدرسین کا تقرر فرما کر طلباء کے لیے اکتساب علم کے بہترین مواقع فراہم کر دیے یہ غالباً ۱۹۱۸ء کی بات ہے جب کہ راقم سطور دارالعلوم لطیفیہ کا ایک طالب علم تھا۔ اور اعلیٰ حضرت مولانا سید شاہ عبداللطیف کے ظلّ عاطفت میں فارسی اور عربی کے ابتدائی تعلیمی دور سے گذر رہا تھا۔

اپنے تمام متعلقہ وظائف و خدمات کی انجام دہی کے بعد کم و بیش رات کے دس بجے دارالعلوم کے شمالی مشرقی حصہ میں فرش ہی پر ایک معمولی بستر پر لیٹ جاتے۔ لیٹنے کے پہلے راقم سطور اور میرے عزاد بزرگ مولانا حاجی محمد اسماعیل صاحب اکرمی المتوفی ۱۹۶۷ء کو خاص طور پر بلا لیتے ہم دونوں کے ذمے محض پیٹھ سہلانے کی خدمت رہتی اس کے ساتھ علم و حکمت پند و نصیحت کا سلسلہ بھی جاری رہتا اس طرح پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے کے عمل سے آپ پر نیند کا غلبہ ہونے لگتا اس کے ساتھ ہم اور جو اس وقت آپ کے پاس رہتے چلے آتے جب تک ہم لطیفیہ میں رہے یہ خدمت ہم دونوں بھائیوں کے لیے مخصوص رہا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ آپ کی اس معمولاً خدمت کی . . . سعادت ہم کو نصیب ہو گئی یوں تو آپ کا مشفقانہ برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا۔ لیکن ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ آپ کی شفقت خاص نوعیت کی ہے۔

راقم سطور رات کے ان جواہر پاروں کو لکھ لیتا تھا جو ایک متبرک علمی اثاثہ کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں جب آپ کو اس کا پتہ لگ گیا تو آپ نے ایک شب اسی مجلس میں فرمایا۔ ہماری اس خوابی مجلس میں مختلف النوع باتیں اور تذکرے ہوتے ہیں جن میں بعض بے تکلف اور مزاح کے قسم کی ہوتی ہیں انہیں ملفوظات میں نہیں لانا چاہیئے۔ باقی مفید باتوں کو لکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کل کسی وقت اپنا لکھا ہوا سارا مواد مجھے بتا دینا۔ جب حضرت نے اسے دیکھا تو چند اصلاحی ہدایت کے ساتھ راقم سطور کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

آپ نہایت سلیم الفطرت، حلیم الطبع، منکسر المزاج اور اس کے ساتھ نہایت خود دار اور وضعدار بھی تھے چہرہ پرنور بارعب و پُر وقار کسی کو آپ سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ پڑتی تھی آواز نہایت پرکشش اور وزن دار، مکارم اخلاق اور سیرت و کردار کی خوبیوں کے سرمایہ دار۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے سچے فرمانبردار، شریعت کے سختی سے پابند، ادھر آپ کا قلب اللہ سے واصل اور ادھر بظاہر ہماری نظروں میں ہمارے ساتھ شامل، اوراد، تلاوت قرآن وظائف میں اپنے اوقات کے ہر طرح پابند، علماء و فضلاء کے بڑے قدر داں، غریبوں ضعیفوں اور حاجتمندوں پر نہایت مہربان یہ تھے ہمارے اعلیٰ حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری اور یہ تھا آپ کی جلیل القدر شخصیت کے مختصر خدوخال۔

آپ کی دینی ذہنی خدمات کی مقبولیت کے ثبوت کے لیے یہی کافی ہے کہ ارض حرم بیتاب ہی سے

آپ کا انتظار کرنے لگی ۱۳۲۳ھ میں کچھ اندرونی تقاضے، کچھ خواب کے اشارے اور کچھ سرزمین حرم کی کشش سے آپ نے عزم ارادہ کرلیا۔

آپ اپنے بڑے صاحبزادے مولانا سید شاہ عبدالقادرؒ اور اپنی ایک مختصر جماعت کے ساتھ روانہ ہوگئے اور مختلف منازل سے گذرتے مکہ مکرمہ زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً پہونچ گئے اور حاکم شہر غالباً شریف مکہ کے مہمان ہوئے حج سے فراغت کے بعد ایک روز کچھ خفیف سا بخار رہنے لگا اور تیسرے ہی دن ۱۹ رذی الحجۃ الحرام ۱۳۲۳ھ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور ملاء اعلیٰ کی طرف پہونچ گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

رحلت سے قبل آپ اپنے صاحبزادے مولانا سید عبدالقادرؒ صاحب کو تحریری اسناد واجازت عطا فرمائی اور انہیں خرقہ خلافت پہنایا۔ اور اپنے بزرگوں کے روایتی سجادگی ان کو تفویض کی۔ جنت المعلیٰ میں آپ کی تدفین عمل میں آئی طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔ ۱۹۱۶ء آپ کو انگریزی سرکار کی طرف سے وائسرائے ہند نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا، آپ کو حضور نظام کے بارگاہ خسروی سے مدرسہ کے لیے ایک خطیر رقم پیش کی گئی لیکن آپ نے شکریہ کے ساتھ اس کو واپس کردیا۔ کہ ہم اس کو اپنے بزرگوں کے طریقہ پر اللہ کے فضل وکرم سے محض اس کے بھروسے پر چلاتے آرہے ہیں۔ لہٰذا اسکی ضرورت نہیں۔

آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت سلطان محی الدین سید شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۹۲۹ء میں سجادگی کا منصب عظیم سنبھالا اور نہایت حسن وخوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق انجام دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور دارالعلوم کی فکر اور اس کو ترقی دینے میں برابر لگے رہے راقم سطور کے تعلیم کے زمانہ میں آپ کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ حفظ قرآن مجید کا سلسلہ جاری تھا بچپنے ہی سے آپ کے عادات واطوار نہایت محمود اور ستودہ تھے اور آپ کے بعض اوصاف کو دیکھ کر اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ شخصیت آئندہ چل کر بڑے نماز اور بلند مقام پر پہونچنے والی ہے بزرگیت اور سعادت مندی کے آثار تو کمسنی ہی سے روشن اور نمایاں تھے۔

۲۲ رسال بعد جب ویلور گیا اور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تو راقم سطور آپ کو توقع اور اندازہ سے کہیں بڑھ کر بزرگ تر پایا، اور حیرت اور تعجب سے انکھیں دیکھتا رہ گیا اتنا بڑا تغیر آپ کے زہد وتقویٰ کثرت عبادت وریاضت اور اعمال حسنہ کی بدولت ہی واقع ہوا تھا اور کمال یہ کہ اتنے دنوں کے بعد بھی آپ نے راقم سطور کو نہ صرف پہچان لیا بلکہ نام کیسا سے خطاب کیا تین روز تک باصرار مجھے اپنا مہمان رکھا اپنی عنایت ومحبت اور سراپا خیر وبرکت صحبت سے مستفیض فرمایا اور آخر پرخلوص دعاؤں کے ساتھ رخصت فرمایا۔ بس یہی میری آپ کی سجادہ نشینی کے بعد پہلی ملاقات تھی جو بعد میں پیش آنے والے حادثہ کی بنا پر آخری ملاقات بھی ثابت ہوئی۔

۱۳۷۶ھ میں چند روز کی علالت کے بعد انقلاب دیلور کی یہ مایہ ناز شخصیت ہمیشہ کے لیے پردہ کر گئی۔ قدس اللہ سرہ۔

حضرت مولانا محی الدین سید شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد آپ کے برادر عزیز حضرت قطب الدین سید شاہ محمد باقر صاحب قادری مدظلہ مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے رسم سجادہ نشینی ۲۲ صفر ۱۳۷۶ھ میں علمائے کرام و مشائخین عظام کی موجودگی میں عطا کی گئی۔

آپ کی ولادت ۱۲ محرم ۱۳۲۴ھ میں ہوئی۔ آپ حضرت مولانا سید شاہ عبد اللطیف بیجاپوری کے سلسلہ کے آٹھویں سجادہ نشین ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ میں بھی آپ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

اخلاق و سیرت، امنت و مروت، محبت و شفقت میں ممتاز اور اہل علم و فضل کے قدر شناس مقبول بین الناس، دینی خدمت سے سرشار، سراپا ایثار اور اپنے بزرگوں کے نمونہ کی زندہ یادگار اور ہر طرح ان کے قائم جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمر طویل عطا فرمائے تاکہ ان بزرگان فیوض و برکات سے مسلمان بیش از بیش مستفیض ہو سکیں۔ آمین ثم آمین۔

تم سلامت رہو ہزار برس   اور ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

موجودہ ناظم دارالعلوم لطیفیہ مولانا صدر الدین سید شاہ محمد طاہر صاحب قادری

آپ حضرت مولانا سید عبد اللطیف قادری مکی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں ولادت ۱۵ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ لطیفیہ میں پائی۔ آپ کو دینی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم کے حصول کا شوق پیدا ہوا آپ کے اس میلان کو دیکھ کر آپ کے بزرگوں نے آپ کو اجازت دی اور آپ زینہ بہ زینہ ترقی کرتے ہوئے گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اس کے آگے قانون کی تعلیم بھی پائی پھر اپنے بزرگوں کے علمی تبرکات و برکات کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوگئے اور ۱۳۶۷ھ میں بیعت و خلافت سے سرفراز ہوئے۔ جدید تعلیم کا کوئی اثر آپ نے قبول نہیں کیا بلکہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ کاربند و پابند نظر آتے ہیں۔ دارالعلوم لطیفیہ کی نظامت اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اپنے بزرگوں کی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت تدبر، ہوشمندی اور حسن و خوبی کے ساتھ اس کی انتظامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور دلی لگن کے ساتھ اس کو ترقی دینے اور تعلیمی اعتبار سے اس کو زیادہ مفید اور اس سے عمدہ ثمرات کے حصول کی فکر اور کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے آپ اسی سانچے میں ڈھلے ڈھالے نکلے ہیں جو آپ کے بزرگوں کا تھا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے دینی و دنیاوی عزائم میں کامیابی عطا فرمائے اور آپ کو تادیر سلامت بعافیت رکھے۔ آمین!

الحاصل دیلور کا حضرت مکان، مردان خدا کا مسکن اور اہل اللہ کا مدفن ہے بڑے بڑے اللہ والے اور سچے انسان یہاں پیدا ہوئے جنھوں نے خدا کی تعلیم کو پھیلایا۔ ایمان و عرفان کے چراغ کو روشن کیا اور اپنے روحانی انوار کی ضیا پاشیوں سے عالم کو منور کیا۔

ہماری دعا ہے کہ ان اقطاب دیلور کے فیوض و برکات کا سلسلہ تا ابد قائم اور ان کے علوم و معارف کا سرچشمہ ہمیشہ جاری رہے۔ (آمین)

ختم شد

مورخہ ۶ر جون بروز جمعہ ۱۹۸۰ء

فہرستِ عنوانات

عنوان	صفحہ
پیش لفظ از مصنف	۹ تا ۱۲
مقدمہ از مولانا سید ابوالحسن علی میاں	"
عرب وھند تعلقات	۱۳
عربوں کی ھند میں آنے کی ابتدا	۱٤
عرب کا محل وقوع	۱۵
ھند	۱٦
سلیمان تاجر ۱	۱۷
بزرگ بن شہریار ۲	·
مسعودی ۳	·
ابن حوقل ٤	·
بشاری ۵	·
البیرونی ٦	·
اصطخری ۷	·
ابوزید حسن سیرافی ۸	·
ابو دلف بن مہلہل ینبوعی ۹	·
شیخ ابو عبداللہ ابن بطوطہ ۱۰	:
سید علی قلبی ۱۱	۲۱
مارکو پولو	۲۲ تا ۲٤
جنوبی ہند اپنے تاریخی آئینہ میں	۲٤ تا ۲٦
ڈریویڈین	۲٦ تا ۲۸
آرین قوم	۲۸ تا ۳۱
ہند میں اسلامی تعلقات کی ابتدا	۳۱ تا ۳٤
گنگا اور دجلہ کا ملاپ	۳٤ تا ۳۹
سراندیپ (سری لنکا عربوں اور ہندوؤں کا متبرک مقام)	۳۹ تا ٤۲
مالدیپ	٤۲ تا ٤٤
ملیبار (کیرالا)	٤۳ تا ٤۸

عنوان	صفحہ
راجا رامورن ساموری کا سفر مکہ	٤۸ تا ۵۲
ملیبار کے بعض اہم شہروں اور اہم مقامات کے حالات	۵۳ تا ۵٤
ایک مسجد کی بے حرمتی کا انجام	۵٤
کالی کٹ	۵۵ تا ۵۷
معبر (کارومنڈل)	۵۷
مسلمان اپنے ہندو راجہ کی حمایت میں / مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہ میں	۵۸
گجرات	٦۰ تا ٦٤
آٹھویں صدی کھمبایت سے کارومنڈل تک	
ہنرمند	٦٤
بیسر	٦۵
بیاسرہ مخلوط النسل مسلمان	٦٦
کوکن	
مسلم عرب سوداگروں کی آمد	
قبائلی اور سماجی زندگی کا آغاز	٦٦ تا ٦۸
موریہ اوئل سنہ ھ تا سنہ ھ	٦۹
بادامی چالوکیہ ۵۵۱ تا ۷۵۷	٦۹ تا ۷۲
جیپولی یسوع مسیح سے قبل	۷۳ تا ۷٤
سلاہار	۷٤
تھانہ کی راجدھانی	۷۵ تا ۷٦
سلاہاروں کا زوال	۷٦
ھند میں اسلامی تعلقات کی ابتدا	۷۸
مسلمانوں کا پہلا حملہ، دوسرا حملہ، تیسرا حملہ	۸۰
محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ	۸۱
شہاب الدین غوری کے حملے	۸۱ تا ۸۲
علاءالدین خلجی کا گجرات پر حملہ اور مسلمانوں کا تسلط	۸۲

گجرات میں خود مختار اسلامی سلطنت کا قیام	۸۳
ظفر خان گجرات میں	۸۴
ظفر خان کی خود مختاری	״
صوبیداروں کی خود مختاری	۸۵
احمد شاہ اول	۸۶
محمد شاہ	״
قطب الدین احمد شاہ	..
محمد شاہ اول	۸۷
مظفر شاہ حلیم	..
بہادر شاہ ظفر	۸۸
فرماں روایان گجرات کا ایک سرسری جائزہ	۸۹ تا ۹۲
مہائم کا بھیم راج	۹۲ تا ۹۴
تھانہ فرانسیسی سیاحوں کی نظر میں	۹۴ تا ۹۶
دورِ تغلق	۹۶ تا ۱۰۲
سیاسی فریب	۱۰۲ تا ۱۰۸
کوکن میں دورِ مسلم میں بندرگاہوں کا اقتدار	۱۰۹
بہمنی حکومت کا قیام	۱۰۹
عادل شاہی۔ نظام شاہی۔ قطب شاہی	۱۱۱ تا ۱۱۲
وجیا نگر	۱۱۲ تا ۱۲۲
مجاہد کا قتلِ ناحق	۱۲۲ تا ۱۲۴
ہری ہر دوم	۱۲۴ تا ۱۲۶
دیوراشٹر اول	۱۲۷ تا ۱۲۹
بکا رایا سوم	۱۲۹ تا ۱۳۱
دیورایا دوم	۱۳۱ تا ۱۳۹
راجہ ویرونیکٹا کا چل چلاؤ	۱۳۹ تا ۱۴۳
تلوا خاندان کا اقتدار	۱۴۳ تا ۱۴۵
ویر نرسمہا	۱۴۵
کرشنا دیورایا	۱۴۵ تا ۱۵۲
راجہ کرشن دیورائے کے زمانہ میں سلطنت کا نظم و انتظام	۱۵۲
کرشن دیورائے کے دور کا ایک اجمالی جائزہ	۱۵۳ تا ۱۶۶
تالی کوٹہ کا ہنگامۂ کارزار	۱۶۶ تا ۱۷۹

اراویدو خاندان کا نیا دور سرملا کی کارگذاریاں	۱۸۰ تا ۱۸۲
مغل جنوبی ہند میں	۱۸۲ تا ۱۸۸
جنوب کے متعلق مغل حکومت کی ایک نئی حکمت عملی	۱۸۸
جنوبی ہند کی تاریخ کا ایک نیا موڑ مرہٹوں کی کارگذاریاں	۱۸۹ تا ۱۹۱
مرہٹوں کا جنوبی ہند میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنا	۱۹۱ تا ۱۹۶
جنوبی ہند مغلیہ دور میں	۱۹۶ تا ۲۰۰
قوم نوائط	۲۰۰ تا ۲۰۶
بنوالنوائط	۲۰۶ تا ۲۱۲
نائیت بتائے فرشتہ	۲۱۳ تا ۲۱۴
نوایت کے متعلق تاریخ فرشتہ کا ایک نیا انکشاف	۲۱۴ تا ۲۲۲
نو آمدہ	۲۲۲ تا ۲۲۳
ناعط	۲۲۴ تا ۲۲۹
نسب	۲۲۹ تا ۲۳۰
سادات کرام آل رسولؐ کے متعلق کچھ تاریخی جھلکیاں	۲۳۰ تا ۲۴۰
عباسیہ	۲۴۰ تا ۲۴۳
زنادقہ کا ظہور	۲۴۳ تا ۲۴۵
صاحب الزنج کا ظہور	۲۴۵ تا ۲۴۶
مذاہب قرامطہ	۲۴۶ تا ۲۵۱
حسن بن صباح	۲۵۱ تا ۲۵۷
حسن بن صباح کے دست راست	۲۵۷ تا ۲۶۰
خلاصۂ بحث	۲۶۰ تا ۲۶۲
نوائط بحیثیت حاکم سلطنت یا ایڈمنسٹریٹر	۲۶۳ تا ۲۶۴
نواب سعادت اللہ خاں نائطی	۲۶۴ تا ۲۶۶
صوبیداروں کے رنگ ڈھنگ	۲۶۶ تا ۲۶۷
خاندان انوری	۲۶۷ تا ۲۶۸
کاروان سالار جنگ	۲۷۰ تا ۲۷۱
سلطان جمال الدین ہنوری	۲۷۱
اہل نوایط یا دیسی عربوں کی ایک نئی سلطنت	۲۷۱ تا ۲۷۶

معبر کے شیخ تقی الدین بن عبدالرحمٰن بن محمد الطیبی ۲۷۳ تا ۲۸۲
جنوبی ہند میں کافور کے حملے کے نتیجہ پر تاریخ جنوب ہند کا بیان اور شد گوزارت ۲۸۲ تا ۲۹۱
نواب معتبر خاں ۲۹۱ تا ۲۹۳
ہندو مسلم تعلقات ۲۹۳ تا ۲۹۵
ایک گجراتی ہندو راجہ کا عدل وانصاف کا بے مثال نمونہ ۲۹۵ تا ۲۹۶
پنجاب یا سرحد کے ایک راجہ کا اسلام ۲۹۶ تا ۲۹۷
ہندو اور مسلم عرب فاتحوں کے نزدیک ۲۹۷
ہندو مشابہ اہل کتاب تھے ۲۹۷ تا ۳۰۰
حقوق و اعزاز ۳۰۰
جزیہ ۳۰۰
ہندو مذہب کی تحقیق کا میلان ۳۰۰ تا ۳۰۳
پیغمبر اسلام کے ساتھ ایک ہندو راجہ کا احترام ۳۰۳
بہادر شاہ بگڑا ۳۰۳ تا ۳۰۶
جنوبی ہندو سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد ۳۰۷ تا ۳۰۹
جنوب کی طرف دوسرا حملہ ۳۰۹ تا ۳۱۰
جنوب کی طرف تیسرا حملہ ۳۱۰ تا ۳۱۱
جنوبی ہند پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ۱۳۱۰ء ۳۱۱ تا ۳۱۵
جنوبی ہند میں اہل نوایط کی آبادی ۳۱۵
اسلامی تعلقات کی ابتدا ۳۱۵ تا ۳۱۶
مسلمانوں کا پہلا حملہ ۳۱۶
دوسرا حملہ ۳۱۷
تیسرا حملہ ۳۱۷
چوتھا حملہ اور پہلا سلطان مصنف ۳۱۷
سلطان محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ ۳۱۷ تا ۳۱۸
شہاب الدین غوری کے متعدد حملے ۳۱۸ تا ۳۲۰
تھانہ کا افتخار ۳۲۰ تا ۳۲۷

ہجرت کی تاریخ پر ایک نظر ۳۲۷ تا ۳۳۱
نائطی القاب ۳۳۱ تا ۳۳۲
مروجہ القاب کے بنیادی اسباب ۳۳۲ تا ۳۳۴
القاب کی وضاحت ۳۳۴
افریقی ۳۳۵
شاہ بندری ۳۳۵ تا
محتشم - رکن الدین - سعدا یا سعدی - اکرمی - قاضی ۳۳۷ تا
خطیبی - دامودی - فقیہہ ۳۴۳
فقیہہ احمدا ۳۴۵
فقیہہ بھاؤ "
فقیہہ علی "
اشیکبری ۳۴۶
مصبا ۳۴۶
گوائی ۳۴۷
ھرآ ۳۴۸
اسرنتا ۳۴۹
معلم "
مولوی ۳۵۰
فکروے "
شنگٹی - چامنڈی ۳۵۱
جوکاکو - منبرا - نبیری ۳۵۲
نائطے ۳۵۳
کولیا ۳۵۴
مخدوم جیوبا ۳۵۵
حافظکا ۳۵۶
درگا ۳۵۷
سادات کرام ۳۵۸
زین العابدین رح ۳۵۸
سادات نوائط ۳۵۹
سید حسن ۳۶۱
سید جمال الدین - سید محمد الجبلیین ۳۶۲
برماور ۳۶۳

سادات کی سیاسی سیادت ۳۶۴
سیدوں کا ایک اور دور ۳۶۵
شیخ الاسلام ۳۶۶
امیر قطب الدین محمد المدنی ״
سادات کرام شاہ عالم بخاری ۳۷۱
سید جلال ۳۷۲
سید جعفر۔ سید علی ۳۷۳
عربی النسل مختلف طبقات
اور ان کے ناموں کا تعارف ۳۷۴
ملیبار۔ موپلے۔ ماپلا کی تشریح ۳۷۴
لبے اور مرکیبار ۳۷۶
اسماعیلی بوہرے ۳۸۰
خوجے ۳۸۵
میمن ۳۸۶
دالدی ۳۷۸
مرکیار۔ ملیار۔ راؤتھر ۳۸۸
دکھنی ۳۸۹
عرب قدیم ہندو راجاؤں کے عہد میں ۳۹۲
ان قدیم راجاؤں کے عہد کی چند جھلکیاں ۳۹۴
مسلم عرب سوداگروں کی آمد ۳۹۵
موریا اور نل ۵۰۰ء تا ۶۱۰ء ۳۹۷
بادامی چالوکیہ ۵۵۱ء تا ۷۵۲ء ۳۹۸
جھولی ۴۰۱
قدیم مسلمان ۴۰۲
عادل شاہی ۴۰۳
ہندو معاشرتی تعلقات ۴۰۳
واسسٹی یا انجسولی ۴۰۴
گروا ۴۰۷
گھلا دیو ۴۰۷
ہوناور ۴۰۷

اولیائے کرام و صلحائے عظام ۴۱۰
حاجی ملنگ ۴۱۱
نظر ولی شیخ عبد العزیز
معروف داداحیات قلندر ۴۱۱
شیخ مخدوم فقیہہ علی مہائمی ۴۱۱
آپ کی تصنیفات ۴۱۶
حضرت شیخ مخدوم فقیہہ اسمٰعیل
فقیہہ السکری الصدیقی ۴۱۷
حضرت مخدوم کا خاندان ۴۱۸
آپ کی اولاد ۴۲۴
حضرت مخدوم شیخ زین الدین ۴۲۹
سلسلہ عیدروسیہ ۴۳۳
مولانا حبیب اللہ شہید
بیدری نائطی ۴۳۵
مولانا محمد حسین بیدری نائطی ۴۴۱
شاہ محمد حسین علی
مشہور ڈولکی شاہ ۴۴۴
مخدوم نائطی قدس سرہٗ ۴۴۵
حقائق دستگاہ مولانا باقر آگاہ ۴۴۵
حضرت نظر اولیاء قدس سرہٗ ۴۴۷
مرشد کی تلاش میں سفر ۴۴۸
مدینہ سے جانب ہند روانگی ۴۵۰
میسور کی طرف کوچ ۴۵۲
راجہ شوالا کی اولاد کے لئے دعا
کی درخواست ۴۵۴
اقطاب ویلور ۱ ۲ ۳ ۴
اور ان کے اخلاف کرام ۴۵۵

ہوسپٹن (دہناور) کی شکستہ مسجد کے باقی ماندہ نشانات

محرابی دیوار کا درمیانی حصہ جہاں محراب اور منبر تھے

ہوسپٹن کی مسجد کا بیرونی منظر سامنے اس کے شکستہ
مینار کا باقی ماندہ حصہ صاف نظر آرہا ہے۔